بسم اللہ الرحمن الرحیم

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں عمدہ نمونہ ہے

سیدنا

محمد رسول اللہ ﷺ

۱۴۳۱ھ

سیرت النبی ﷺ کے شاداب پھول

(جلد اول)

ترتیب و تہذیب:

شیخ عمر فاروق

جامعہ تدبر القرآن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ میں عمدہ نمونہ ہے

سیّدنا
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۴۳۱ھ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شاداب پھول

(جلد اول)

ترتیب:
شیخ عمر فاروق

جامعہ تدبر القرآن

اِنتساب

ان نفوس قدسیہ کے نام جن کے
شب و روز اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ ﷺ
کی اِتّباع میں بسر ہوتے ہیں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران:۳/۳۱)

''(اے نبیؐ) آپ فرما دیجیے! اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اِتّباع کرو (زندگی کے تمام معاملات میں) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا وہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔''

جملہ حقوق محفوظ ہیں
(مرتب کی تحریری اجازت کے بغیر یہ کتاب شائع نہیں کی جاسکتی)

نام کتاب: سیدنا محمد ﷺ
(جلد اول)
مرتب: شیخ عمر فاروق
نظر ثانی: حافظ عمران الٰہی
تاریخ اشاعت: مارچ ۲۰۱۰ء
مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ لاہور
فون 7351007
مقام اشاعت: جامعة تدبر القرآن
15-بی وحدت کالونی لاہور، فون: 37585960

وقف للہ تعالیٰ

بسم الله الرحمن الرحيم

قاری (پڑھنے والے) کے لیے ضروری اندراج

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

فہرست

حرف اول	13
مقدمہ	25
تزکیۂ نفس کرنے والا رسول صلی اللہ علیہ وسلم	41
مومنوں پر رَءُوْف اور رحیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم	51
خلق عظیم صلی اللہ علیہ وسلم	60
رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم	67
انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم	74
خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم	81
رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم	89
سراجاً منیرا صلی اللہ علیہ وسلم	98
رہبرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم	105
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آغازِ وحی	115
مبلغِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم	124
پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم	134
بے داغ سیرت و کردار کا مالک صلی اللہ علیہ وسلم	141
روشن ضمیر رسول صلی اللہ علیہ وسلم	148
درِ یتیم صلی اللہ علیہ وسلم	154
داعی الی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	166

نڈر داعی الی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	176
عزیمت وصبر کے کوہِ گراں صلی اللہ علیہ وسلم	184
ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	195
صابر رسول صلی اللہ علیہ وسلم	205
صبر وثبات کا داعی صلی اللہ علیہ وسلم	212
جنات کی طرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم	220
دعوت عام دینے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم	228
دعوتِ رسول پر لبیک کہنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم	235
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ معراج	246
جاں نثارانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم	254
آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم	265
ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	271
اہل مدینہ کا ایثار اور استقبال	285
محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم	293
اسلام کا نظامِ مساجد	300
اہل اسلام کی نماز (ا)	312
اہل اسلام کی نماز (ب)	321
اِقامتِ صلوٰۃ (ج)	330
اِقامتِ صلوٰۃ (د)	340
اذن اور آدابِ مجلسِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	358
قرآن حکیم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معجزہ	368
نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم	379

دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار	390
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تبلیغ دین (ا)	397
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تبلیغ دین (ب)	407
داعی الی اللہ کی صفات	407
اَلْعِلمُ	407
اَلْعَمَلُ	409
الاخلاص	411
اَلْحِلُمُ	415
الاسْتِقَامَة	418
التواضع	421
عفو و درگزر	424
حق گوئی	429
اَلعِفة	432
اَلقناعةُ	440
اَلصبر	448
اَلصدق	458
حسن اخلاق	465
الحکمة	472
تقویٰ	483
معرفة اللّٰه عزوجل	492
قوة البیان	504
رسول اللہ ﷺ کا خطبۂ تبوک	507

اتباع رسول ﷺ اور حب الٰہی	613
خدمت خلق	613
ایثار	618
حسن معاملہ	620
حسن خلق	621
کھانے پینے کے انداز	633
سونے جاگنے کے آداب	641
آداب لباس	647
آداب گفتگو	651
استقامت	655
اخلاص	656
صبر و شکر	656
دعوتِ تعلیم و تعلم	659

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

سَیِّدُ الْمُرْسَلِین ﷺ

اللہ تعالیٰ نے جب سے انسان کو پیدا فرما کر اسے اس دنیا میں بسایا، تب سے زندگی گزارنے کے لیے مادی ضروریات کا بندوبست کیا تو اس کے ساتھ ساتھ اسے انسانیت کے بلند مرتبہ تک پہنچانے کے لیے روحانی غذا کا بھی سروسامان بہم پہنچایا، وہ انسانوں میں سے نیک اور صالح لوگوں کو منتخب فرما کر اپنی ہدایت سے نوازتا رہا تاکہ ان کی زندگیاں اس ہدایت کے سانچے میں ڈھل کر دوسروں کے لیے نمونہ بنیں یہ نفوس قدسیہ اَنبیا و رسل کہلائے، سب سے پہلے انسان اور سب سے پہلے نبی آدم علیہ السلام ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو درسِ اخلاق دیا۔

جب اولادِ آدم دھیرے دھیرے اس زمین پر پھیلتی گئی تو چھوٹی چھوٹی بستیوں سے بڑے بڑے دیہات اور قصبے وجود میں آئے اور ان میں ترقی ہوئی تو شہر بنے اور شہروں سے مل کر ملک آباد ہوئے اور پھر انسانی طبائع کے اختلاف سے لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں کی حد بندیاں کرلیں اور ایک دوسرے کے علاقہ میں نقل وحرکت کے لیے اصول اور ضابطے بنالیے۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے ہر شہر اور ہر مرکزی علاقہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو پیغامِ حق سنانے والے ضرور آئے اور انہوں نے لوگوں کو دعوتِ حق دے کر اِتمامِ حجّت فرما دی۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا﴾ (القصص:۲۸/۵۹)

’’اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا، جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا۔‘‘

ان سب داعیان حق کے پیغام کا مرکزی نکتہ ایک ہی تھا یعنی اللہ کی توحید کا اقرار کرنا اور اس کی بندگی اختیار کرنا۔

﴿وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ﴾

(الانبیاء:۲۱/۲۵)

’’ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔‘‘

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

’’اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّاۤ اَنَا‘‘ یہ عقیدہ ہوا توحید کا، ’’فَاعۡبُدُوۡن‘‘ یہ عمل ہوا توحید کا، یہ دینِ توحید جس کا دوسرا نام دینِ اسلام ہے، دنیا کا قدیم ترین دین ہے (جس کی ابتدا تاریخ انسانیت میں آدم علیہ السلام سے ہوئی) اور انبیاء کے ذریعے سے ہمیشہ تبلیغ اسی دین کی ہوتی رہی (اس کے برعکس) شرک تمام تر ذہن انسانی کی اِختراع ہے اور بہت بعد کی پیداوار ہے۔‘‘

(تفسیر ماجدی، ج:اول)

یہ تمام کے تمام رسول انسانوں میں سے ہوتے تھے بلکہ ان میں سے معزز خاندان کے چشم و چراغ ...... یہ چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور بالکل انسانی ضروریات و اِحتیاج رکھتے، یہ بھی عام انسانوں کی طرح شادی بیاہ کرتے اور بال بچوں کی تعلیم و تربیت کرتے، مگر ان کے اخلاق و اعمال لوگوں سے ممتاز ہوتے تھے، یہ صدق و صفا کے پیکر اور امانت و دیانت کی تصویر ہوتے تھے، ان کے قول و عمل میں رضائے الٰہی کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا اور ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے نمونہ کیونکر نہ بن سکتیں؟

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّاۤ اِنَّہُمۡ لَیَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَیَمۡشُوۡنَ فِی الۡاَسۡوَاقِ﴾

(الفرقان:۲۵/۲۰)

’’(اے نبیؐ) آپ سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے، وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے۔‘‘

پھر یہ پاکباز ایسے تھے جنہوں نے کلِمۃُ الحق بلند کرنے کے لیے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، زخم کھائے، تکلیفیں اٹھائیں اور بعض مرتبہ شہادت سے بھی سرفراز ہوئے۔

﴿وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ فَمَا وَ هَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوۡا وَ مَا اسۡتَكَانُوۡا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ﴾ (اٰل عمران:۳/۱۴۶)

’’کتنے ہی نبی گزر چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر اللہ والوں نے جہاد کیا، انہیں اللہ کی راہ میں جو مصائب و مشکلات پیش آئیں ان میں نہ انہوں نے ہمت ہاری نہ کمزوری دکھائی اور نہ ہی سرنگوں ہوئے، ایسے ہی ثابت قدم رہنے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔‘‘

یہ ایسے سچے اور فرمانبردار تھے کہ جنہوں نے لہو پسینے سے کما کر حق حلال کی روزی حاصل کی اور خلوص اور وفاداری سے دعوتِ حق کا فریضہ سرانجام دیا، اور کبھی بھی لوگوں سے کسی اجر اور معاوضہ کا مطالبہ نہ کیا، بلکہ اپنے مال سے ہمیشہ غربا و مساکین کی خدمت کی، ان میں سے ہر ایک نے بآواز بلند یہ کہا:

﴿فَمَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ﴾ (یونس:۱۰/۷۲)

’’میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلمان بن کر رہوں۔‘‘

یہ رسول اپنی اپنی قوم اور لوگوں کی طرف آتے رہے۔ جیسا کہ سیدنا نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ﴾ (ھود:۱۱/۲۵)

’’اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔‘‘

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ﴾ (البقرہ:۲/۵٤)

''اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔''

اور ھود علیہ السلام کا ذکر اس طرح آتا ہے:

﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا﴾ (الاعراف:۷/٦۵)

''اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔''

اور عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو یوں خطاب کرتے ہیں:

﴿وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ﴾ (الصّف:/٦)

''اور یاد کرو عیسی ابن مریم کی وہ بات جو انہوں نے کہی تھی' اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔''

اور خاتم النبیّین محمد رسول اللہ ﷺ کو تا قیامت نسل انسانیت کی طرف مبعوث فرمایا گیا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ (سبا:٤۳/۲۸)

''اور اے (نبی ﷺ) ہم نے آپ کو نسل انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔''

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اتنی صراحت کے ساتھ اپنے پیامِ ہدایت کی عالمگیری کا دعویٰ دنیا کے کسی دین نے بھی نہیں کیا، یہ خصوصیت آسمانی کتابوں میں صرف قرآن کی ہے، قرآن ہی اعلان کے ساتھ کہتا ہے کہ پیامِ محمدی ہر ملک، ہر قوم، ہر طبقۂ انسانیت اور ہر زمانہ کی ہدایت کے لیے ہے...... اسلام کے دو دعوے ایسے ہیں، جن میں دنیا کا کوئی دوسرا دین اس کا شریک نہیں، دونوں دعوے اسلام کے امتیازاتِ خصوصی میں سے ہیں، ایک یہ بار بار تصریح و وضاحت کے ساتھ کہنا کہ میری تعلیم ساری دنیا کے لیے ہے، دوسرے مذاہب جیسے اپنی قوم یا ملک کے باہر کسی کو جانتے ہی نہیں...... دوسرے پیغمبرِ اسلام ﷺ کو سلسلہ انبیاء کا خاتم قرار دینا۔'' (تفسیر ماجدی)

یقیناً تمام رسول ہمارے لیے واجب الاحترام ہیں اور قرآن حکیم نے یہی تعلیم دی ہے: ''لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ'' یعنی رسولوں کے درمیان باہم کوئی فرق نہیں کرتے، ہمارا یہ ایمان ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامِ حق لے کر تشریف لائے اور انہوں نے مِنۡ وعَنۡ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دیا مگر محمد رسول اللہ ﷺ سلسلہ انبیا کے سالارِ اعظم ہیں:

سالار کارواں ہے، میرِ حجاز اپنا
اِس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اور سلسلہ نبوت آپ ﷺ پر ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب:۳۳/۴۰)

''مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کو مسلمانوں کے لیے نمونہ ٹھہرایا اور فرمایا:

﴿لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۲)

''اور یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں پیروی کی عمدہ مثال ہے۔''

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

عربی میں ''اُسۡوَة'' کے معنی کسی شخص کے نقش قدم پر چلنے اور پیروی کرنے کے ہیں، آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی مسلمانوں کے لیے ایک عمدہ نمونہ اور کامل و جامع مثال کی حیثیت رکھتی ہے یعنی آپ کی سیرت و کردار کا ہر گوشہ اس لائق ہے کہ اس سے تابش و ضو حاصل کی جائے، چاہے اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا حیاتِ اِجتماعی سے، چاہے روحانیت کے اسرار و رموز کا سامنا ہو یا روزمرہ پیش آئندہ مسائل کا معاملہ، عبادت سے لے کر معاملات کا ایک ایک جزئیہ بہرحال سزاوارِ اطاعت ہے اس لیے بھی کہ عالم بشری میں تنہا آپ کی ذات گرامی ایسی ہے جو مکارمِ اخلاق کے لحاظ سے بلند ترین مقام پر فائز ہے اور اس بنا پر بھی کہ وحی و تنزیل کی دنیا میں آپ ہی وہ منفرد شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے پیغام و دعوت میں حق و صداقت کی تمام تجلیّاتِ ممکنہ کو اس جامعیت سے

سمولیا ہے کہ ان کے بعد اور کوئی مدعی نظروں میں جچتا ہی نہیں۔'' (لسان القرآن، ج:اول)

اور ربِّ کریم نے یہاں تک حکم دے دیا:

﴿وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ، وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا﴾ (الحشر:۵۹/۷)

''جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس بات سے وہ تمہیں منع کریں، اس سے رُک جاؤ۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین و شریعت کو سمجھنے کے لیے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنا ہوگا، آپ ﷺ نے قرآنِ حکیم کی جو تشریح و تفسیر بیان فرمائی ہے اسے دل و جان سے قبول کرنا ہو گا، وہی ہمارے اصل ہادی و رہنما ہیں، محض زبان سے عاشقِ رسول ﷺ ہونے کا دعویٰ کرنا اور عمل کے وقت غیروں کے حکم پر چلنا، عشق نہیں بلکہ سراسر شرّ ہے۔ جسے دینِ حق سے دور کا بھی واسطہ نہیں:

بمصطفیٰ برساں خویش راہ کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

''اپنے آپ کو جناب مصطفیٰ ﷺ تک پہنچا، کہ وہ سراپا دین ہیں، اگر تو اُن ﷺ تک نہ پہنچے یعنی ان سے دین حاصل نہ کرے تو تیری زندگی اسی طرح سراپا شر ہے جس طرح ابولہب کی زندگی تھی۔''

بلکہ آپ ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو فرما دیجئے کہ اگر تمہیں واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو تمہیں اس کا بارگاہ الٰہی سے محبت بھرا جواب ملے گا، بلکہ تمہیں مغفرت و بخشش کی خوشخبری ملے گی۔

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (آل عمران:۳/۳۱)

''اے نبیؐ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

دراصل رسول اللہ ﷺ کی اتباع اور اطاعت ہی کامیابی کا راز ہے اس بات کو آپ ﷺ نے کتنے

خوبصورت الفاظ میں ارشاد فرمایا:

((''كُلُّ أُمَّتِيْ يَدْ خُلُونَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ أَبٰى'' قِيلَ: وَمَنْ يَأْبٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ''مَنْ أَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ أَبٰى''))

(روا البخاری، ریاض الصالحین باب فی الامر بالمحافظة علی السنة)

''میری امت کا ہر شخص جنت میں جائے گا مگر جس نے انکار کیا، صحابہ نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! بھلا کون انکار کرے گا؟ ارشاد ہوا جس نے میری اطاعت کی، جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے (درحقیقت) میرا انکار کیا۔''

حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت کے بغیر ہمارا دین مکمل ہو ہی نہیں سکتا ہے:

اَزْ رِسَالت درجہان تکوینِ ما
اَزْ رِسَالت دِینِ مَا، آئینِ ما

''دنیا میں رسالت ہی ہم مسلمانوں کی جان پہچان ہے اور رسالت ہی سے ہمارا دین اور آئین قائم و دائم ہے۔''

جب تک ہم رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں پر راضی نہ ہو جائیں، ہمارا ایمان مکمل ہو ہی نہیں سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ، ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء:٤/٦٥)

''(اے محمدؐ) آپ کے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اِختلافات میں یہ آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔''

اگر ہم دنیا میں عزت و سر بلندی کے خواہاں ہیں تو اس کا طریقۂ کار صرف اور صرف یہی ہے کہ ہم اپنا دل اللہ تعالیٰ سے جوڑیں، اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں اور اس راہ پر چلنے کے لیے خاتم النبیین محمد ﷺ کا اسوہ اپنائیں اور متحد ہو کر اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کی ہر ممکن سعی و جستجو کریں:

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحقّ دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

''(مسلمانو) اگر تم اس دنیا میں اپنا مقام چاہتے ہو، تو اپنا دِل اللہ سے لگاؤ اور مصطفیٰ ﷺ کا راستہ اختیار کرو۔''

انسان ہونے کے ناطے سے اس کا سب سے بڑا شرف حسنِ اخلاق میں مضمر ہے۔

ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''روزِ جزا بندہ مومن کے ترازو میں حسنِ اخلاق سے زیادہ وزنی اور کوئی چیز نہ ہوگی۔''

(ریاض الصالحین...... باب حسن الخق)

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ لوگوں کو جنت میں لے جانے والی سب سے قیمتی کونسی بات ہے، ارشاد ہوا: ((تَقْوَی اللّٰهِ وَ حُسنُ الْخُلُقِ)) ''یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف اور پاکیزہ اخلاق'' اور آپ ﷺ سے یہ بھی پوچھا گیا کہ جہنم میں لوگوں کو لے جانے والی کونسی بات ہے، ارشاد ہوا ((اَلْفَمُ و الْفَرْج)) منہ اور شرم گاہ کا غلط استعمال۔ (حوالہ ایضاً)

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخِیَارُكُمْ، خِیَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ)) ''مومنوں میں کامل ترین ایمان ان لوگوں کا ہے جن کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کا برتاؤ اور رویہ اپنی بیویوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو۔'' (حوالہ ایضاً)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَحْسَنَ النَّاسِ خُلُقًا)) کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے بہتر اخلاق رکھتے تھے۔

اس بات کی شہادت رب کریم کی طرف سے ملتی ہے اور اس سے بڑھ کر کس کی شہادت ہو سکتی ہے۔

﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ (القلم:٦٨/٤)

''اور بلا شبہ آپ اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں۔''

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''یہاں خلق سے مراد، وہ عادات و اطوارِ حسنہ ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے کردار و سیرت میں سمو کر دکھایا، عظیم سے یہ مقصود ہے کہ خیر و خوبی کی تکمیل و جامعیت کا کوئی بھی نقشہ ترتیب دیجیے، ایک ایک نیکی اور خوبی کا تصور کیجیے اور پھر یہ دیکھیے کہ جامعیت اور توازن کے ساتھ بجز رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے تاریخ میں کوئی اور شخص ان کا حامل نظر آتا ہے؟ مزید برآں یہ خلقِ عظیم جو آپ کا خاصہ ہے، صرف آپ کی ذات ہی کی حد تک سمٹا ہوا نہیں، بلکہ اس کی تاثیرِ نفوذ کا یہ کرشمہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے مثالی معاشرے کی تشکیل کی جس میں ایک ایک فرد آفتاب و ماہتاب کی طرح تاریخ کے اوراق میں دمک رہا ہے اور رضائے الٰہی کی شہادت و سند کا سزاوار ہے۔'' (لسان القرآن، ج:۲)

مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا پالنہار ''رَبُّ الْعَالَمِینَ'' ہے۔ اُس نے جو کتابِ عظیم خاتم النبیین ﷺ پر نازل فرمائی۔ وہ ''ھُدی لِلنّاس'' ہے۔ (نسل انسانیت کے لیے ہدایت) اور جس نبی پر یہ کتاب نازل ہوئی وہ ''رحمۃ للعالمین ﷺ'' ہیں اور تمہیں نسل انسانیت کی رہبری کا شرف حاصل ہے ''اُخْرِجَتْ لِلنَّاس'' (بنی نوع انسان کی رہبری تمہاری ذمہ داری ہے) مگر افسوس اس قدر شرف و عظمت پانے کے باوجود تم بھٹک رہے ہو ذلیل و خوار ہو رہے ہو، یہ تمہارے دین و ایمان کی کمزوری کی واضح علامت ہے وگرنہ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

رسول اللہ ﷺ سے محبت کا مطلب یہ نہیں کہ زبان سے آپ ﷺ کی محبت کا دعویٰ کیا جائے، لیکن عملاً دوسروں کی غلامی کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو چھوڑ کر غیروں کے احکام مانیں جائیں، آپ ﷺ کی سنّت کا اتباع کرنے کی بجائے رسم و رواج کی پابندی کی جائے، توحید اختیار کرنے کی بجائے شرک و بدعت کے دروازے کھولے جائیں بلکہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے

ہر معاملے میں آپ ﷺ کی فرمانبرداری کی جائے اور آپ ﷺ کی سنّت کو حرزِ جاں بنایا جائے۔

جب کوئی شخص ہر معاملے میں قرآن وسنت کی روشنی سے فیض حاصل کرتا ہے اور عمل کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے تو اس کی ساری زندگی عبادت بن جاتی ہے اور اس کا ہر کام رضائے الٰہی کے مطابق ہو جاتا ہے، جس سے اس کی دنیا اور آخرت سنور جاتی ہے ۔

تابعِ حق دیدنش نا دیدنش	خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش

اس کا دیکھنا، اس کا نہ دیکھنا، اس کا کھانا، اس کا پینا، اس کا سونا (جاگنا) حق کے تابع ہو جاتا ہے۔

اور اسی بات کو قرآن حکیم اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ (الانعام:۶/۱۶۲-۱۶۳)

”(اے نبیؐ) کہو، میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیّت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا (مسلم) میں ہوں۔“

ہمارے اسلاف صدقِ دل سے اس دین پر عمل پیرا ہوئے اور خلوصِ نیّت سے اس پیغام کو بنی نوعِ انسان تک پہنچایا جس کا صِلہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس طرح ملا:

﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (المجادلہ:۵۸/۲۲)

”اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، وہ اللہ کی جماعت کے لوگ ہیں، (یاد رکھو) اللہ کی جماعت والے ہی (دنیا اور آخرت) میں فلاح پانے والے ہیں۔“

آج دنیا میں فتنہ وفساد کی چنگاریاں ہر طرف سلگ رہی ہیں اس کو بُجھا کر امن وراحت کی فَضا قائم کرنا امتِ مسلمہ ہی کا فریضہ ہے، اور اس امت کے پاس ایسا قانون اور دستور ہے جو نوع انسانیت کے لیے حیات کا پیغام ہے اور اس کے پاس خاتم النبیّین محمد رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ حسنہ ہے جن کی سیرت قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر تھی (کَانَ خُلُقُہُ القرآن) صرف اور صرف عزم وہمت کی ضرورت ہے:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''آج اگر ہم ایک صالح گروہ اس ذہنیت، اس اخلاق اور اس سیرت کے انسانوں کا منظّم کر سکیں جو اسلام کے منشا کے مطابق ہو تو ہم امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے ذرائع وسائل سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہم ایک اخلاقی و تمدنی انقلاب برپا کرسکیں گے۔'' (رسائل و مسائل ج:اول)

عاجز ہفت روزہ ایشیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور محض اس کے فضل سے مسلسل اور پیہم سالہا سال سے لکھ رہا ہے۔

قارئین ''الفرقان'' کے عنوان سے ہر ہفتہ دروس پڑھتے ہیں خاتم النبییّن محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کو قرآن حکیم کی روشنی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے......آمین!

یہ سیرتِ طیّبہ کی مستقل کتاب نہیں ہے، بلکہ قرآنِ حکیم کی روشنی میں دروس ہیں اور اس کی ابدی اور لازوال تعلیمات ہیں اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ تو قرآن کی جیتی جاگتی تصویر ہے، اللہ تعالیٰ مجھے روز قیامت اُن لوگوں کی صف میں شامل فرما دے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کو زبان یا قلم سے اجاگر کرنے کی سعی اور کوشش کی ہے اور زندگی کا ہر لمحہ سنت رسول ﷺ کے مطابق گزارنے کی توفیق عطا فرمائے......آمین! میں حافظ عمران الٰہی صاحب (سابق رکن دارالمعارف) کا ممنون ہوں کہ انہوں نے پروف ریڈنگ میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا، میں جمیل احمد صاحب ہفت روزہ ایشیا کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے محنتِ شاقہ سے کمپوزنگ کے فرائض سرانجام دیے، اللہ تعالیٰ ہمیں جنت الفردوس میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت عطا فرمائے......آمین!

شیخ عمر فاروق

۹ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ بمطابق ۲۴ فروری ۲۰۱۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

نبوتِ محمدی ﷺ کا عقلی ثبوت

تھوڑی دیر کے لیے جسمانی آنکھیں بند کر کے تصور کی آنکھیں کھول لیجیے اور ایک ہزار چار سو برس پیچھے پلٹ کر دنیا کی حالت پر نظر ڈالیے۔ یہ کیسی دنیا تھی؟ انسان اور انسان کے درمیان تبادلہ خیالات کے وسائل کس قدر کم تھے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کے ذرائع کتنے محدود تھے۔ انسان کی معلومات کس قدر کم تھیں۔ اس کے خیالات کس قدر تنگ تھے اس پر وہم اور توحش کا کس قدر غلبہ تھا۔ جہالت کے اندھیرے میں علم کی روشنی کتنی دھندلی تھی اور اس اندھیرے کو دھکیل دھکیل کر کتنی دقتوں کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ دنیا میں نہ تار تھا، نہ ٹیلیفون تھا، نہ ریڈیو تھا، نہ ریل اور نہ ہوائی جہاز تھے۔ نہ مطابع اور اشاعت خانے تھے۔ نہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت تھی۔ نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ نہ کتابیں کثرت سے لکھی جاتی تھیں، نہ کثرت سے ان کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے ایک عالِم کی معلومات بھی بعض حیثیات سے موجودہ زمانے کے ایک عامی کی بہ نسبت کم تھیں۔ اُس زمانے کی اونچی سوسائٹی کا آدمی بھی موجودہ زمانے کے ایک مزدور کی بہ نسبت کم شائستہ تھا۔ اس زمانہ کا ایک نہایت روشن خیال آدمی بھی آج کل کے تاریک خیال آدمی سے زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو باتیں آج ہر کس و ناکس کو معلوم ہیں وہ اس زمانہ میں برسوں کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد بھی بمشکل معلوم ہو سکتی تھیں۔ جو معلومات آج روشنی کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہیں اور ہر بچے کو ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہو جاتی ہیں اُن کے لیے اُس زمانہ میں سینکڑوں میل کے سفر کیے جاتے تھے اور عمریں ان کی جستجو میں بیت جاتی تھیں۔ جن باتوں کو آج اوہام و خرافات سمجھا جاتا ہے وہ اس زمانے کے ''حقائق'' تھے جن افعال کو آج ناشائستہ اور وحشیانہ کہا جاتا ہے وہ اُس زمانہ کے عام معمولات تھے۔ جن طریقوں سے آج انسان کا ضمیر

نفرت کرتا ہے اور وہ اس زمانے کے اخلاقیات میں نہ صرف جائز تھے بلکہ کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کرسکتا تھا کہ ان کے خلاف بھی کوئی طریقہ ہوسکتا ہے۔ انسان کی عجائب پرستی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ کسی چیز میں اس وقت تک کوئی صداقت، کوئی بزرگی، کوئی پاکیزگی تسلیم ہی نہ کرسکتا تھا جب تک کہ وہ فوق الفطرت نہ ہو، خلافِ عادت نہ ہو، غیر معمولی نہ ہو، حتیٰ کہ انسان خود اپنے آپ کو اس قدر ذلیل سمجھتا تھا کہ کسی انسان کا اللہ والا ہونا اور کسی اللہ والے کا اِنسان ہونا اس کے تصور کی رسائی سے بہت دُور تھا۔

اس تاریک دور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تسلط اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ جو ممالک اُس زمانے کے معیارِ تمدن کے لحاظ سے متمدن تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے اِردگرد ایران، روم اور مصر کے ملکوں میں علوم وفنون اور تہذیب وشائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے اور صرف اموال کا مبادلہ کر کے واپس آجاتے تھے۔ علم وتہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ ان کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کتب خانہ تھا، نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ علوم وفنون سے کوئی دلچسپی تھی تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنھیں کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اُس زمانہ کے علوم وفنون سے آشنا ہوتے۔ اُن کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا۔ مگر ان کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں اُن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدود تھیں، تہذیب و تمدن میں ان کا درجہ کس قدر پست تھا۔ ان پر اوہام کا کس قدر غلبہ تھا۔ ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی، ان کے اخلاقی تصورات کتنے بھدّے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی، کوئی ضابطہ اور قانون نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خودمختار تھا اور صرف جنگل کے قانون کی پیروی کی جاتی تھی، جس کا جس پر بس چلتا اسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہوجاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلہ کا نہیں ہے اُسے وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرف ہوجائے۔

اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی نہایت گندی تھی ان کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا، جوا، شراب، چوری، رہزنی اور قتل وخون ریزی ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں تک ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ وہ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کر دیتے تھے محض اس جاہلانہ خیال کی بناء پر کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انھیں کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ اُن تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اس زمانہ کی دنیا مبتلا تھی۔ بت پرستی، ارواح پرستی، کواکب پرستی، غرض ایک اللہ کی پرستش کے سوا اُس وقت دنیا میں جتنی ''پرستیاں'' پائی جاتی تھیں وہ سب ان میں رائج تھیں۔ انبیائے قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم ان کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ابراہیم اور اسماعیل ان کے باپ ہیں مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصے بھی ان میں مشہور تھے مگر ان کی جو روایتیں عرب کے مؤرخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھا جائے، کہیں آپ کو صالح اور ہود کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے اَنبیائے بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں۔ مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر اُن اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسرین اِسلام نے نقل کی ہیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور خود بنی اسرائیل جن اَنبیاء سے واقف تھے وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان لوگوں کا تصور کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا۔

خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت

ایسے زمانہ میں، ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے بچپن ہی میں ماں باپ اور دادا کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اس گئی گزری حالت میں ایک عرب بچے کو جو تھوڑی بہت تربیت مل سکتی تھی، وہ بھی اس کو نہیں ملتی۔ ہوش سنبھالتا ہے تو بدوی لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے جوان

ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے۔ اُٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا سب کچھ اُنہی عربوں کے ساتھ ہے جن کا حال اوپر آپ نے دیکھ لیا۔ تعلیم کا نام تک نہیں، حتیٰ کہ پڑھنا لکھنا تک نہیں آتا۔ کسی عالِم کی صحبت بھی میسر نہ ہوئی کہ ''عالِم'' کا وجود اس وقت تمام عرب میں کہیں نہ تھا۔

چند مرتبہ اسے عرب سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ضرور ہوا مگر یہ سفر صرف شام کے علاقے تک تھے اور ویسے ہی تجارتی سفر تھے جیسے اس زمانہ میں عرب کے تجارتی قافلے کیا کرتے تھے بالفرض اگر ان اَسفار کے دوران میں اس نے کچھ آثارِ علم وتہذیب کا مشاہدہ کیا اور کچھ اہل علم سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو ظاہر ہے کہ ایسے منتشر مشاہدات اور ایسی ہنگامی ملاقاتوں سے کسی انسان کی سیرت نہیں بن جاتی۔ ان کا اثر کسی شخص پر اتنا زبردست نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل آزاد، بالکل مختلف اور اتنا بلند ہو جائے کہ اس میں اور اس کے ماحول میں کچھ نسبت ہی نہ رہے۔ ان سے ایسا علم حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جو ایک اَن پڑھ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دنیا کا، اور ایک زمانہ کا نہیں تمام زمانوں کا لیڈر بنا دے۔ اگر کسی درجہ میں اس نے باہر کے لوگوں سے علمی استفادہ کیا بھی ہو تو جو معلومات اُس وقت دنیا میں کسی کو حاصل ہی نہ تھیں، مذہب، اخلاق، تہذیب اور تمدن کے جو تصورات اور اصول اُس وقت دنیا میں کہیں موجود ہی نہ تھے، انسانی سیرت کے جو نمونے اس وقت کہیں پائے ہی نہیں جاتے تھے۔ ان کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا۔

صرف عرب ہی کا نہیں تمام دنیا کا ماحول پیش نظر رکھیے اور دیکھئے۔

یہ شخص جن لوگوں میں پیدا ہوا جن میں بچپن گزارا جن کے ساتھ پل کر جوان ہوا، جن سے اس کا میل جول رہا، جن سے اس کے معاملات رہے، ابتداء ہی سے عادات میں، اخلاق میں وہ ان سب سے مختلف نظر آتا ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس کی صداقت پر اس کی ساری قوم گواہی دیتی ہے۔ اس کے کبھی بدترین دشمن نے بھی کسی اس پر یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ فلاں موقع پر جھوٹ بولا تھا۔ وہ کسی سے بدکلامی نہیں کرتا کسی نے اس کی زبان سے کبھی گالی یا کوئی فحش بات نہیں سنی۔ وہ لوگوں سے ہر قسم کے معاملات کرتا ہے، مگر کبھی کسی سے تلخ کلامی اور تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی زبان میں سختی کے بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو اس سے ملتا ہے گرویدہ ہو جاتا ہے وہ کسی سے بدمعاملگی نہیں

کرتا۔ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ برسوں سوداگری کا پیشہ کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقہ سے نہیں لیتا جن لوگوں سے اس کے معاملات پیش آتے ہیں وہ سب اس کی ایمانداری پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ساری قوم اس کو ''امین'' کہتی ہے۔ دشمن تک اس کے پاس اپنے قیمتی مال رکھواتے ہیں اور وہ ان کی بھی حفاظت کرتا ہے بے حیاء لوگوں کے درمیان وہ ایسا حیا دار ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برہنہ نہیں دیکھا۔ بداخلاقوں کے درمیان وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کبھی کسی بدکاری میں مبتلا نہیں ہوتا۔شراب اور جوئے کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ ناشائستہ لوگوں کے درمیان وہ ایسا شائستہ ہے کہ ہر بد تمیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں ستھرائی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔سنگدلوں کے درمیان وہ ایسا نرم دل ہے کہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا ہے، مسافروں کی میزبانی کرتا ہے، کسی کو اس سے دُکھ نہیں پہنچتا اور وہ دوسروں کی خاطر دکھ اٹھاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان وہ ایسا صلح پسند ہے کہ اپنی قوم میں فساد اور خونریزی کی گرم بازاری دیکھ کر اس کو اذیّت ہوتی ہے، اپنے قبیلہ کی لڑائیوں سے دامن بچاتا ہے اور مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش رہتا ہے۔ بت پرستوں کے درمیان وہ ایسا سلیم الفطرت اور صحیح العقل ہے کہ زمین وآسمان میں کوئی چیز اسے پوجنے کے لائق نظر نہیں آتی، کسی مخلوق کے آگے اس کا سر نہیں جھکتا، بتوں کے چڑھاوے کا کھانا بھی وہ قبول نہیں کرتا، اس کا دل خود بخود شرک اور مخلوق پرستی سے نفرت کرتا ہے۔

اس ماحول میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہے یا پتھروں کے ڈھیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے۔

تقریباً چالیس سال تک ایسی پاک، صاف، شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے وہ اس تاریکی سے گھبرا اٹھتا ہے جو اس کو ہر طرف سے محیط نظر آتی ہے۔ وہ جہالت، بداخلاقی، بدکرداری، بدنظمی، شرک اور بت پرستی کے اس ہولناک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے جو اس کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس ماحول میں کوئی چیز بھی اس کو اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دور پہاڑوں کی صحبت میں جا جا کر بیٹھنے لگتا ہے۔ تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزارتا ہے۔ روزے رکھ رکھ کر اپنی روح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف

کرتا ہے سوچتا ہے غور وفکر کرتا ہے کوئی ایسی روشنی ڈھونڈتا ہے جس سے وہ اس چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی کو دور کردے۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے اس بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے سنوار دے۔

یکا یک اس کی حالت میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوتا ہے۔ ایک دم سے اس کے دل میں وہ روشنی آجاتی ہے جو پہلے اس میں نہ تھی۔ اچانک اس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے جس سے وہ اس وقت تک خالی تھا۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل آتا ہے۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے اس سے کہتا ہے کہ یہ بُت جن کے آگے تم جھکتے ہو، یہ سب بے حقیقت چیزیں ہیں، انھیں چھوڑ دو، کوئی انسان، کوئی درخت، کوئی پتھر، کوئی روح، کوئی سیارہ اس قابل نہیں کہ تم اس کے آگے سر جھکاؤ اور اس کی بندگی وعبادت کرو اور اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرو۔ یہ زمین، یہ چاند، یہ سورج، یہ ستارے، یہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں ایک اللہ کی مخلوق ہیں وہی تمہارا اور ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی رزق دینے والا ہے وہی مارنے اور جلانے والا ہے اُس کی بندگی کرو اسی کا حکم مانو اور اسی کے آگے سر جھکاؤ۔ یہ چوری، یہ لوٹ مار، یہ قتل و غارت، یہ ظلم وستم، یہ بدکاریاں جو تم کرتے ہو، سب گناہ ہیں۔ انھیں چھوڑ دو۔ اللہ انھیں پسند نہیں کرتا۔ سچ بولو، انصاف کرو، نہ کسی کی جان لو، نہ کسی کا مال چھینو، جو کچھ لو حق کے ساتھ لو، جو کچھ دو حق کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو۔ انسان اور انسان سب برابر ہیں۔ نہ کوئی ذلت کا داغ لے کر پیدا ہوا اور نہ کوئی عزت کا تمغہ لے کر دنیا میں آیا۔ بزرگی اور شرف نسل اور نسب میں نہیں، صرف رب پرستی، نیکی اور پاکیزگی میں ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے وہی اعلیٰ درجہ کا انسان ہے، اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ مرنے کے بعد تم سب کو اپنے اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے تم میں سے ہر ہر شخص اپنے اعمال کے لیے اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، اُس اللہ کے سامنے جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔ تم کوئی چیز اس سے نہیں چھپا سکتے۔ تمہاری زندگی کا کارنامہ اس کے سامنے بے کم وکاست پیش ہوگا اور اسی کارنامے کے لحاظ سے وہ تمہارے انجام کا فیصلہ کرے گا۔ اُس عادل حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلے گی، نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا۔ وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوچھ ہوگی۔ جس کے پاس یہ سامان ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جس کے پاس ان میں سے

کچھ بھی نہ ہوگا وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

یہ تھا پیغام جسے لےکر وہ غار سے نکلا:

جاہل قوم اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے پتھر مارتی ہے ایک دن دو دن نہیں اکٹھے تیرہ برس تک اس پر سخت سے سخت ظلم توڑتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے وطن سے نکال باہر کرتی ہے۔ اور پھر نکالنے پر بھی دم نہیں لیتی۔ جہاں وہ جا کر پناہ لیتا ہے وہاں بھی اُسے ہر طرح ستاتی ہے۔ تمام عرب کو اس کے خلاف ابھار دیتی ہے اور کامل آٹھ برس اس کے خلاف برسر پیکار رہتی ہے۔ وہ ان سب تکلیفوں کو سہتا ہے مگر اپنی بات سے نہیں ہٹتا۔

یہ قوم اس کی دشمن کیوں ہوئی؟

- کیا زر اور زمین کا کوئی جھگڑا تھا؟
- کیا خون کا کوئی دعویٰ تھا؟
- کیا وہ ان سے دنیا کی کوئی چیز بھی مانگ رہا تھا؟

نہیں، ساری دشمنی صرف اس بات پر تھی کہ وہ ایک اللہ کی بندگی اور پرہیز گاری اور نیکو کاری کی تعلیم کیوں دیتا ہے، بت پرستی اور شرک اور بد عملی کے خلاف تبلیغ کیوں کرتا ہے، پجاریوں اور پروہتوں کی پیشوائی پر کیوں ضرب لگاتا ہے، سرداروں کی سرداری کا طلسم کیوں توڑتا ہے، انسان اور انسان کے درمیان سے اونچ نیچ کا فرق کیوں مٹانا چاہتا ہے، قبائلی اور نسلی تعصّبات کو جاہلیت کیوں قرار دیتا ہے، زمانہ قدیم سے سوسائٹی کا جو نظام بندھا چلا آ رہا ہے اُسے کیوں توڑنا چاہتا ہے۔ قوم کہتی تھی کہ یہ باتیں جو تو کہہ رہا ہے، یہ سب خاندانی روایات اور قومی طریقہ کے خلاف ہیں تو ان کو چھوڑ دے ورنہ ہم تیرا جینا مشکل کر دیں گے۔

اچھا تو اس شخص نے یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں؟

قوم اس کو بادشاہی دینے پر آمادہ تھی، دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار تھی، بشرطیکہ وہ اپنی اس تعلیم سے باز آ جائے۔ مگر اس نے ان سب کو ٹھکرا دیا اور اپنی تعلیم کی خاطر پتھر کھانا اور ظلم سہنا قبول کیا۔ یہ آخر کیوں؟ کیا ان کے رب پرست اور نیکو کار بن جانے میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ

تھا؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کے مقابلہ میں ریاست اور امارت اور دولت اور عیش کے سارے لالچ بھی ناقابل التفات تھے؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کی خاطر ایک شخص سخت سے سخت جسمانی اور روحانی اذیتوں میں مبتلا ہونا اور کامل ۲۱ سال مبتلا رہنا بھی گوارا کر سکتا ہو؟ غور کرو! کیا نیک نفسی، ایثار اور ہمدردی بنی نوع کا اس سے بھی بلند تر کوئی مرتبہ تمہارے تصور میں آ سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدہ کی خاطر نہیں، دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھائے؟ جن کی بھلائی اور بہتری کے لیے وہ کوشش کرتا ہے وہی اس کو پتھر ماریں، گالیاں دیں، گھر سے بے گھر کر دیں، غریب الوطنی میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں، اور ان سب باتوں پر بھی وہ ان کا بھلا چاہنے سے باز نہ آئے۔

پھر دیکھو! کیا کوئی جھوٹا شخص کسی بے اصل بات کے پیچھے ایسی مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی تیر تکّے لڑانے والا انسان محض گمان اور قیاس سے کوئی بات کہہ کر اس پر اتنا جم سکتا ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ اس پر ٹوٹ جائیں، زمین اس پر تنگ کر دی جائے، تمام ملک اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو، بڑی بڑی فوجیں اس پر اُمنڈ اُمنڈ کر آئیں، مگر وہ اپنی بات سے یک سرِ مُو ہٹنے پر آمادہ نہ ہو؟ یہ استقامت، یہ عزم، یہ ثبات، خود گواہی دے رہا ہے کہ اس کو اپنی صداقت پر یقین اور کامل یقین تھا۔ اگر اس کے دل میں شک اور شبہ کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ مسلسل ۲۱ سال تک مصائب کے ان پے در پے طوفانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ ٹھہر سکتا۔

یہ تو اس شخص کے انقلابِ حال کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔

چالیس برس کی عمر تک وہ ایک عرب تھا عام عربوں کی طرح۔ اس دوران میں کسی نے اس سوداگر کو ایک خطیب، ایک جادو بیان مقرر کی حیثیت سے نہ جانا۔ کسی نے اس کو حکمت اور دانائی کی باتیں کرتے نہ سنا۔ کسی نے اُس کو الٰہیات (اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق باتیں) اور فلسفہ اخلاق اور قانون اور سیاسیات اور معاشیات اور عمرانیات کے مسائل پر بحث کرتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس سے اللہ اور ملائکہ اور آسمانی کتابوں اور پچھلے انبیاء اور اُمم قدیمہ اور قیامت اور حیات بعد الموت اور دوزخ و جنت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ سنا۔ وہ پاکیزہ اخلاق، شائستہ اطوار اور بہترین سیرت تو ضرور رکھتا تھا۔ مگر چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک اس کی ذات میں کوئی بھی غیر معمولی بات نہ پائی گئی جس سے لوگ متوقع

ہوتے کہ یہ شخص اب کچھ بننے والا ہے۔ اُس وقت تک جاننے والے اُس کو محض ایک خاموش، امن پسند اور نہایت شریف انسان کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مگر چالیس برس کے بعد جب وہ اپنے غار سے ایک نیا پیغام لے کر نکلا تو یک لخت اس کی کایا ہی پلٹی ہوئی تھی۔

اب وہ ایک حیرت انگیز کلام سنا رہا تھا جس کو سن کر سارا عرب مبہوت ہو گیا۔ اس کلام کی شدّتِ تاثیر کا یہ حال تھا کہ اس کے کٹر دشمن بھی اس کو سنتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں یہ دل میں اُتر نہ جائے اس کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام قومِ عرب کو جس میں بڑے بڑے شاعر، خطیب اور زبان آوری کے مدعی موجود تھے، اس نے چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا کہ تم سب مل کر ایک ہی سورۃ اس کے مانند بنا لاؤ، مگر کوئی اس کے مقابلہ کی جرأت نہ کر سکا۔ ایسا بے مثل کلام کبھی عرب کے کانوں نے سنا ہی نہ تھا۔

اب یکایک وہ ایک بے مثل حکیم، ایک لاجواب مصلحِ اخلاق و تمدن ایک حیرت انگیز ماہرِ سیاست، ایک زبردست مُقنّن، ایک اعلیٰ درجہ کا جج، ایک بے نظیر سپہ سالار بن کر ظاہر ہوا۔ اس نے، اُس اَن پڑھ صحرانشین نے حکمت اور دانائی کی وہ باتیں کہنی شروع کر دیں جو نہ اس سے پہلے کسی نے کہی تھیں نہ اس کے بعد کوئی کہہ سکا۔ وہ اُمی الٰہیات کے عظیم الشان مسائل پر فیصلہ کن تقریریں کرنے لگا۔ تاریخِ اقوام سے عروج و زوالِ اُمم کے فلسفہ پر لیکچر دینے لگا۔ پرانے مصلحین کے کارناموں پر تبصرے اور مذاہب عالم پر تنقید اور اختلافاتِ اقوام کے فیصلے کرنے لگا۔ اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کا درس دینے لگا۔ اس نے معاشرت اور معیشت اور اجتماعی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قوانین بنانے شروع کر دیے اور ایسے قوانین بنائے کہ بڑے بڑے علماء اور عقلاء غور و خوض اور عمر بھر کے تجربات کے بعد بمشکل ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں، اور دنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں ان کی حکمتیں اور زیادہ کھلتی جاتی ہیں۔

وہ خاموش پُرامن سوداگر، جس نے تمام عمر کبھی تلوار نہ چلائی تھی، کبھی کوئی فوجی تربیت نہ پائی تھی، حتیٰ کہ جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ ایک لڑائی میں محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، دیکھتے دیکھتے وہ ایک ایسا بہادر سپاہی بن گیا جس کا قدم سخت سے سخت معرکوں میں بھی اپنے مقام سے ایک انچ

نہ ہٹا۔ ایسا زبردست جنرل بن گیا جس نے ۹ سال کے اندر تمام ملک عرب کو فتح کرلیا۔ ایسا حیرت انگیز ملٹری لیڈر بن گیا کہ اس کی پیدا کی ہوئی فوجی تنظیم اور جنگی روح کے اثر سے بے سروسامان عربوں نے چند سال میں دنیا کی دو عظیم الشان فوجی طاقتوں کو الٹ کر رکھ دیا۔

وہ الگ تھلگ رہنے والا سکون پسند انسان جس کے اندر کسی نے چالیس برس تک سیاسی دلچسپی کی بو بھی نہ پائی تھی، یکا یک اتنا زبردست ریفارمر اور مدبّر بن کر ظاہر ہوا کہ ۲۳ سال کے اندر اس نے ۱۲ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ریگستان کے منتشر، جنگجو، جاہل، سرکش، غیر متمدن اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والے قبائل کو، ریل اور تار اور ریڈیو اور پریس کی مدد کے بغیر، ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظام حکومت کا تابع بنا دیا۔ اس نے ان کے خیالات بدل دیئے، ان کے خصائل بدل دیے، ان کے اخلاق بدل دیے۔ ان کی ناشائستگی کو اعلیٰ درجہ کی شائستگی میں، ان کی وحشت کو بہترین مدنیّت میں، ان کی بدکرداری کو اور بداخلاقی کو صلاح وتقویٰ اور مکارمِ اخلاق میں، ان کی سرکشی اور انارکی کو انتہا درجہ کی پابندی قانون اور اطاعتِ امر میں تبدیل کر دیا۔ اُس بانجھ قوم کو جس کی گود میں صدیوں سے کوئی ایک بھی قابل ذکر انسان پیدا نہ ہوا تھا، اس نے ایسا مردم خیز بنایا کہ اس میں ہزار در ہزار اعاظمِ رجال اٹھ کھڑے ہوئے، اور دنیا کو دین اور اخلاق اور تہذیب کا درس دینے کے لیے چار دانگ عالم میں پھیل گئے۔

اور یہ کام اس نے ظلم اور جبر اور دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا بلکہ دل موہ لینے والے اخلاق اور روحوں کو مسخر کر لینے والی شرافت اور دماغوں پر قبضہ کر لینے والی تعلیم سے انجام دیا۔ اس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنایا۔ رحم اور شفقت سے دلوں کو موم کیا۔ عدل اور انصاف سے حکومت کی۔ حق اور صداقت سے کبھی یک سرِ مو انحراف نہ کیا۔ جنگ میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کیا۔ اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا۔ جو اس کے خون کے پیاسے تھے، جنھوں نے اس کو پتھر مارے تھے، اس کو وطن سے نکالا تھا، اس کے خلاف تمام عرب کو کھڑا کر دیا۔ حتی کہ جنھوں نے جوشِ عداوت میں اس کے چچا کا کلیجہ تک نکال کر چبا ڈالا تھا، ان کو بھی اس نے فتح پا کر بخش دیا۔ اپنی ذات کے لیے کبھی اس نے کسی سے بدلہ نہ لیا۔

ان سب باتوں کے ساتھ اس کے ضبطِ نفس بلکہ بےنفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام ملک کا بادشاہ ہو گیا اُس وقت بھی وہ جیسا فقیر پہلے تھا ویسا ہی فقیر رہا۔ پھونس کے چھپر میں رہتا تھا۔ بوریے پر سوتا

تھا۔ موٹا جھوٹا پہنتا تھا۔ غریبوں کی سی غذا کھاتا تھا۔ فاقے تک کر گزرتا تھا۔ رات رات بھر اپنے اللہ کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرتا تھا۔ ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں بھی اسے تامّل نہ تھا۔ آخر وقت تک اُس کے اندر شاہانہ تمکنت اور امیرانہ ترفع اور بڑے آدمیوں کے سے تکبر کی ذرا سی بو بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ایک عام آدمی کی طرح لوگوں سے ملتا تھا۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ عوام کے درمیان اس طرح بیٹھتا تھا کہ اجنبی آدمی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اس محفل میں قوم کا سردار، ملک کا بادشاہ کون ہے۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرتا تھا کہ گویا وہ اسی جیسا ایک انسان ہے۔ تمام عمر کی جدو جہد میں اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اپنا پورا ترکہ اپنی قوم پر وقف کر دیا اپنے پیروؤں پر اُس نے اپنے یا اپنی اولاد کے کچھ بھی حقوق قائم نہ کیے۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا، محض اس خوف سے کہ کہیں آگے چل کر اس کے پیرو اس کی اولاد ہی کو ساری زکوٰۃ نہ دینے لگ جائیں۔

ابھی اس عظیم الشان آدمی کے کمالات کی فہرست ختم نہیں ہوئی۔ اُس کے مرتبہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے آپ کو تاریخ عالم پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ صحرائے عرب کا یہ اَن پڑھ بادیہ نشین، جو چودہ سو برس پہلے اُس تاریک دور میں پیدا ہوا تھا، دراصل دورِ جدید کا بانی اور تمام دنیا کا لیڈر ہے وہ نہ صرف ان کا لیڈر ہے جو اسے لیڈر مانتے ہیں، بلکہ ان کا بھی لیڈر ہے جو اسے نہیں مانتے۔ ان کو اس امر کا احساس تک نہیں کہ جس کے خلاف وہ زبان کھولتے ہیں اس کی رہنمائی کس طرح ان کے خیالات میں، ان کے اصولِ حیات اور قوانین عمل میں اور ان کے عصرِ جدید کی روح میں پیوست ہوگئی ہے۔

یہی شخص ہے جس نے دنیا کے تصورات کا رُخ وہمیّت اور عجائب پرستی اور رہبانیت کی طرف سے ہٹا کر عقلیّت اور حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیا داری کی طرف پھیر دیا۔ اسی نے محسوس معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انہی کو معیارِ صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اسی نے خرقِ عادت میں اللہ کی قُدرت کے آثار ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور انھیں آثارِ فطرت (Natural Phenomena) میں اللہ کی نشانیاں دیکھنے کا خُوگر بنایا۔ اسی نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو قیاس

آرائی (Speculation) سے ہٹا کر تعقل اور تفکر اور مشاہدہ اور تحقیق کے راستے پر لگایا۔ اسی نے عقل اور حس اور وجدان کے امتیازی حدود انسان کو بتائے۔ مادیّت اور روحانیّت میں مناسبت پیدا کی۔ دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل سے دین کا ربط قائم کیا۔ مذہب کی طاقت سے دنیا میں سائنٹفک اسپرٹ اور سائنٹفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیّت پیدا کی۔ اسی نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا اور علم کی طاقت سے توحید کا اعتقاد ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مشرکوں اور بت پرستوں کے مذہب بھی وحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اسی نے اخلاق اور روحانیت کے بنیادی تصورات کو بدلا۔ جو لوگ ترکِ دنیا اور نفس کُشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے، جن کے نزدیک نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیوی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے کے ساتھ روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی۔ ان کو اسی نے تمدّن اور سماج اور دنیوی عمل کے اندر فضیلتِ اخلاق اور ارتقائے روحانی اور حصولِ نجات کا راستہ دکھایا۔ پھر وہی ہے جس نے انسان کو اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان اور اوتار اور ابن اللہ کے سوا کسی کو ہادی و رہنما تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، ان کو اسی نے بتایا کہ انسان اور تمہارے ہی جیسا انسان آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہو سکتا ہے جو لوگ ہر طاقتور انسان کو اپنا الٰہ بناتے تھے ان کو اسی نے سمجھایا کہ انسان بجز انسان کے اور کچھ نہیں ہے نہ کوئی شخص تقدّس اور حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق لے کر آیا ہے، اور نہ کسی پر ناپاکی اور محکومیت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔ اسی تعلیم نے دنیا میں وحدت انسانی اور مساوات اور جمہوریت اور آزادی کے تخیلات پیدا کیے ہیں۔

تصوّرات سے آگے بڑھیے۔ آپ کو اس اُمّی کی لیڈر شپ کے عملی نتائج دنیا کے قوانین اور طریقوں اور معاملات میں اس کثرت سے نظر آئیں گے کہ ان کا شمار مشکل ہو جائے گا۔ اخلاق اور تہذیب، شائستگی اور طہارت و نظافت کے کتنے ہی اصول ہیں جو اس کی تعلیم سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ معاشرت کے جو قوانین اس نے بنائے تھے، دنیا نے کس قدر ان کی خوشہ چینی کی اور اب تک کیے جا رہی ہے۔ معاشیات کے جو اصول اس نے سکھائے تھے ان سے دنیا میں کتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور اب تک پیدا ہوئے جا رہی ہیں۔ حکومت کے جو طریقے اس نے اختیار کیے تھے، ان سے دنیا کے سیاسی نظریات میں کتنے اِنقلاب برپا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ عدل اور قانون کے جو اصول اس نے

وضع کیے تھے انھوں نے دنیا کے عدالتی نظامات اور قانونی اَفکار کو کس قدر متاثر کیا اور اب تک ان کی تاثیر خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔ جنگ اور صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب جس شخص نے عملاً دنیا میں قائم کی وہ دراصل یہی عرب کا اُمّی ہے، ورنہ پہلے دنیا اس سے ناواقف تھی کہ جنگ کی بھی کوئی تہذیب ہوسکتی ہے اور مختلف قوموں میں مشترک انسانیت کی بنیاد پر بھی معاملات ہونے ممکن ہیں۔

انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند و بالا شخصیت اتنی ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتداء سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان جن کو دنیا اکابر (Heroes) میں شمار کرتی ہے جب اس کے مقابلہ میں لائے جاتے ہیں تو اس کے آگے بَونے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک دمک انسانی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پتلا ہے مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبیر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری جمی ہے کہ دوسرے پہلو اوجھل ہوگئے ہیں کسی نے اخلاق اور روحانیت کو لیا تو معیشت وسیاست کو بھلا دیا۔ کسی نے معیشت وسیاست کو لیا تو اخلاق و روحانیت کو نظر انداز کردیا۔

غرض تاریخ میں ہر طرف یک رُخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔ مگر تنہا یہی ایک شخصیت ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے اور خود ہی اپنے فلسفہ کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مدّبر بھی ہے فوجی لیڈر بھی ہے۔ واضع قانون بھی ہے، معلّم اخلاق بھی ہے، مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے اس کی نظر انسان کی پوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ اَحکام اور ہدایات دیتا ہے، اپنے نظریات کے مطابق ایک مستقل تہذیب (Civilisation) وجود میں لا کر دکھا دیتا ہے اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن (Equillibrium) قائم کرتا ہے کہ افراط وتفریق کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا کوئی دوسرا شخص اس جامعیت کا تمہاری نظر میں ہے؟

دنیا کی بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو کم وبیش اپنے ماحول کی پیدا

کردہ نہ ہو۔ مگر اس شخص کی شان سب سے نرالی ہے اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصہ نہیں آتا۔ اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عرب کا ماحول اُس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا مقتضی تھا۔ بہت کھینچ تان کر تم جو کچھ کہہ سکتے ہو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ تاریخی اسباب عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا تقاضا کرتے تھے جو قبائلی انتشار کو مٹا کر ایک قوم بناتا، اور ممالک کو فتح کر کے عربوں کی معاشی فلاح و بہبود کا سامان کرتا۔ یعنی ایک نیشنلسٹ لیڈر جو اس وقت کی تمام عربی خصوصیات کا حامل ہوتا ظلم، بے رحمی، خون ریزی اور مکر و دغا، غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوش حال بناتا اور ایک سلطنت پیدا کر کے اپنے پس ماندوں کے لیے چھوڑ جاتا۔ اس کے سِوا اس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تقاضا تم ثابت نہیں کر سکتے۔

ہیگل کے فلسفۂ تاریخ یا مارکس کی مادی تعبیرِ تاریخ کے نقطہ نظر سے تم حد سے حد یہی حکم لگا سکتے ہو کہ اس وقت اس ماحول میں ایک قوم اور ایک سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیے تھا، یا ظاہر ہو سکتا تھا مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعہ کی توجیہ کیونکر کرے گا کہ اُس وقت اُس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہوا جو بہترین اَخلاق سکھانے والا، انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا اور جاہلیّت کے اوہام و تعصّبات کو مٹانے والا تھا۔ جس کی نظر قوم اور نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پوری انسانیت پر پھیل گئی۔ جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں بلکہ عالم انسانی کے لیے ایک اخلاقی و روحانی اور تمدنی و سیاسی نظام کی بِنا ڈالی۔ جس نے معاشی معاملات اور سیاستِ مدن اور بین الاقوامی تعلقات کو عالم خیال میں نہیں بلکہ عالم واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھایا اور روحانیت و مادیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا ویسا ہی شاہکار ہے جیسا اُس وقت تھا۔ کیا ایسے شخص کو تم عربِ جاہلیت کے ماحول کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا، بلکہ جب ہم اس کے کارنامے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی، صدیوں اور ہزاروں (Milleniums) کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی اور عملی ہدایات دیتا

ہے جو ہر حال میں یکساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کو تاریخ نے پرانا کردیا ہے، جن کی تعریف صرف اس حیثیت سے کرسکتے ہیں کہ اپنے زمانے کے اچھے رہنما تھے۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز، وہ انسانیت کا ایسا رہنما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت (March) کرتا ہے اور ہر دور میں ویسا ہی جدید (Modern) نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دور کے لیے تھا۔

تم جن لوگوں کو فیاضی کے ساتھ ''تاریخ بنانے والے'' (Makers of History) کا لقب دیتے ہو وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوئے (Creatures of History) ہیں۔

دراصل تاریخ بنانے والا پوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے، دنیا کے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کیے ہیں ان کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ ہر ایسے موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے۔ اور وہ اسباب خود ہی اُس انقلاب کا رخ اور راستہ بھی متعین کر رہے تھے جس کے برپا ہونے کے وہ مقتضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضاء کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اس ایکٹر کا پارٹ ادا کردیا جس کے لیے اسٹیج اور کام دونوں پہلے سے معین ہوں۔ مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا کرنے والوں کی پوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے۔ وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کیا، جہاں انقلاب کا مواد موجود نہ تھا، وہاں اُس نے خود مواد تیار کیا، جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی وہاں اس نے خود اپنے مطلب کے آدمی تیار کیے، اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزار ہا انسانوں کے قالب میں اتار دیا اور ان کو ویسا بنایا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کی طاقت اور قوتِ ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان کیا، خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معین کی اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اس راستے پر چلایا جس پر وہ اسے چلانا چاہتا تھا۔ اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز تم کو اور کہاں نظر آتا ہے؟

آیئے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ ۱۴ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں، عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشہ میں ایک گلہ بانی اور سوداگری کرنے والے اَن پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکا یک اتنا علم اتنی روشنی، اتنی طاقت، اتنے کمالات، اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کونسا ذریعہ تھا؟ آپ

کہتے ہیں کہ یہ سب اس کے اپنے دل و دماغ کی پیداوار تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھیں تو اس کو اِلٰہ کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا تو وہ دنیا جس نے رام کو معبود بنا ڈالا، جس نے کرشن کو بھگوان قرار دینے میں تامل نہ کیا، جس نے بودھ کو خود بخود معبود بنا لیا، جس نے مسیح کو آپ اپنی مرضی سے ابن اللہ مان لیا، جس نے آگ اور پانی اور ہوا تک کو پوج ڈالا، وہ ایسے زبردست باکمال شخص کو معبود مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر دیکھو، وہ خود کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں سے ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ میں ایک انسان ہوں، تمھیں جیسا انسان میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں۔ سب کچھ اللہ کا ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوع انسانی عاجز ہے میرا کلام نہیں ہے، میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ لفظ بلفظ اللہ کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو میں نے دکھائے، یہ قوانین جو میں نے وضع کیے، یہ اصول جو میں نے تمھیں سکھائے ان میں سے کوئی چیز بھی میں نے خود نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں اللہ کی رہنمائی کا محتاج ہوں۔ ادھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔

دیکھو یہ کیسی حیرت انگیز صداقت ہے کیسی امانت اور راست بازی ہے جھوٹا انسان تو بڑا بننے کے لیے دوسروں کے ایسے کمالات کا کریڈٹ بھی لے لینے میں تامل نہیں کرتا جن کے اصل ماخذ کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے لیکن یہ شخص اُن کمالات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا جن کو اگر وہ اپنے کمالات کہتا تو کوئی اس کو جھٹلا نہ سکتا تھا۔ کیونکہ کسی کے پاس ان کے اصلی ماخذ تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ سچائی کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس شخص سے زیادہ سچا اور کون ہوگا جس کو ایک نہایت مخفی ذریعہ سے ایسے بےنظیر کمالات حاصل ہوں اور وہ بلا تکلف اپنے اصلی ماخذ کا حوالہ دے دے؟

بتاؤ کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟

(سید مودودیؒ ترجمان القرآن، شوال ۱۳۵۵ھ/ جنوری ۱۹۳۷ء)

تزکیۂ نفس کرنے والا رسول ﷺ

﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيۡهِمۡ وَ يُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ اِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ﴾ (آل عمران:۳/۱۶۴)

''یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر بڑا ہی احسان کیا کہ ان کے درمیان خود ان ہی میں سے ایک رسولؑ (اعظم و آخر) بھیجا، جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔''

﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ﴾

لغوی معانی: لَقَدۡ یقیناً، حرفِ تاکید، مَنَّ اللّٰهُ احسان کیا اللہ نے (مَنَّ، یَمُنُّ، مَنًّا) احسان کرنا، کرم کرنا، اچھا سلوک کرنا، اچھی چیز بطور انعام دینا۔ (القاموس الوحید) عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مومنوں پر، اِذۡ جب، بَعَثَ بھیجا، (بَعَثَ، یَبۡعَثُ) بھیجنا، مبعوث فرمانا، فِيۡهِمۡ (فِیۡ.هِمۡ) میں، اُن، یعنی ان میں (ان کے درمیان) رَسُوۡلًا، رسول، (یعنی خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ) مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ ان کی جانوں سے، یعنی انہی میں سے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ لکھتے ہیں:

اللہ کی بہترین نعمت ہونے کے لحاظ سے بعثتِ رسول کا احسان تو سارے عالم پر ہے، مسلمانوں کی تخصیص ذکر کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ بعثت سے فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ تھے۔"

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ کے بشر اور انسانوں ہی میں سے ہونے کو اللہ تعالیٰ ایک احسان کے طور پر بیان کر رہا ہے اور فی الواقع یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس طرح ایک تو وہ اپنی قوم ہی کی زبان اور لہجے میں اللہ کا پیغام پہنچائے گا جسے سمجھنا ہر شخص کے لیے آسان ہوگا، دوسرے، لوگ ہم جنس ہونے کی وجہ سے ان سے مانوس اور ان کے قریب ہوں گے، تیسرے، انسان کے لیے انسان یعنی بشر کی پیروی تو ممکن ہے لیکن فرشتوں کی پیروی اس کے بس کی بات نہیں اور نہ فرشتہ انسان کے وجدان وشعور کی گہرائیوں اور باریکیوں کا ادراک کرسکتا ہے، اس لیے اگر پیغمبر فرشتوں میں سے ہوتے تو وہ ان ساری خوبیوں سے محروم ہوتے جو تبلیغ و دعوت کے لیے نہایت ضروری ہیں، اس لیے جتنے بھی انبیاء آئے ہیں، سب کے سب بشر ہی تھے، قرآن نے ان کی بشریت کو خوب کھول کر بیان کیا ہے۔" (تفسیر احسن البیان)

مثلاً فرمایا:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡقُرٰی﴾(یوسف: ۱۲/۱۰۹)

"(اے نبی!) آپ سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے، وہ سب انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے انسان ہی تھے، انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔"

وہ بھی عام انسانوں کی طرح کھانے پینے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے اور مشقت و آرام جیسی صفات سے متصف تھے۔ایسی تمام ضروریات انہیں بھی درپیش تھیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّاۤ اِنَّہُمۡ لَیَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَیَمۡشُوۡنَ فِی الۡاَسۡوَاقِ﴾ (الفرقان: ۲۵/۲۰)

"(اے نبی!) آپ سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے، وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔"

ہیں، تو پھر آپ کو پیغمبر کیسے مان لیں؟ خود قریشِ مکہ کا خاتم النبیین محمد ؐ اعتراض یہ تھا کہ آپ کھانے پینے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے اور بود و باش میں بالکل عام انسانوں کی طرح جائے؟ گویا ان کے نزدیک پیغمبری عام بشری ضرورتوں کے منافی تھی:

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ﴿۷﴾ (الفرقان: ۲۵/۷)

''اور وہ لوگ کہتے کہ یہ کیسا رسول ہے، جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا۔''

قرآن حکیم نے اس بے جا اعتراض کا کس خوبصورتی سے جواب دیا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ﴿۹۵﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/۹۵)

''(اے نبی!) ان سے کہہ دیجیے کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔''

دراصل انبیا و رسل کی معاشرتی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی زندگی کا مکمل ڈھانچہ لوگوں کے لیے نمونہ ہوتا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب انبیاء بھی انسانی جنس ہی سے ہوں، چنانچہ قرآن مجید بالخصوص اس پہلو کو نمایاں کرتا ہے، ارشادِ گرامی ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ﴿۳۸﴾ (الرعد:۱۳/۳۸)

﴿رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ۚ اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ﴾ (ال عمران:۳/۳۸)

''اے رب! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر، تو ہی دعا (اور فریاد) کو سننے والا ہے۔''

سیدنا ایوب علیہ السلام بیماری میں اپنے رب کے حضور یوں درخواست کرتے ہیں:

﴿اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ (الانبیاء:۲۱/۸۳)

''مجھے بیماری لاحق ہوگئی ہے اور (اے میرے آقا!) تو رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے لختِ جگر سیدنا اسماعیل علیہ السلام اپنے مبارک ہاتھوں سے بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو رب کے حضور اس طرح فریاد کر رہے تھے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ وَ یُزَکِّیْهِمْ ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ (البقرہ:۲/۱۲۹)

''اے رب! ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول مبعوث فرما، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے، تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے ان نیک بندوں کی اخلاص سے کی ہوئی دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا، چنانچہ پھر خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ سیدنا اسماعیل ہی کی اولاد میں سے قبیلۂ قریش میں پیدا ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہمیشہ انسانوں کی رہنمائی کرتی رہی، ہر قوم اور ہر علاقے میں اللہ کے رسول آتے اور لوگوں کو پیغامِ حق سناتے رہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ﴾ (فاطر:۳۵/۲۴)

''اور کوئی امت ایسی نہیں گزری کہ جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَلِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (الرعد:۱۳/۷)

''ہر قوم کے لیے ایک رہنما رہا ہے۔''

مگر آپ ﷺ کی رسالت تمام نسلِ انسانی کے لیے اور ابدی و دائمی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ (سبا:۳٤/۲۸)

''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام نسلِ انسانی کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔''

ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد ہوا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانبیاء:۲۱/۱۰۷)

''(اے نبیؐ!) ہم نے آپ کو اہل جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

معلوم ہوا ہر قوم کی طرف نبی آیا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں بھر کے لیے اور قیامت تک کے لیے رسول ہیں۔ یہ آپ کے خصائص ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ نبوت میں وہی باتیں ہیں جن کی تمنا سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی تھی:

﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾

''وہ اللہ کی آیات پڑھ کے انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا اور انہیں کتاب و دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔''

﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ﴾

''وہ اس کی آیات پڑھ کے انہیں سناتا ہے۔''

یَتْلُوْا فعل مضارع، واحد مذکر غائب (تَـلَا، یَتْلُوْا، تِلَاوَةً) تلاوت کرنا، سنانا عَلَیْهِمْ (عَلٰی. هِمْ) پر، اُن، یعنی ان پر، اٰیَاتِهٖ (اٰیاتِ. هٖ) آیات، اس کی، یعنی رب کریم کی۔

کتاب اللہ کی محض تلاوت ہی مقصود نہیں بلکہ تلاوت کے ساتھ ساتھ توجہ اور غور و فکر بھی از حد ضروری اور مطلوب ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ (البقرہ:۲/۱۲۱)

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے، (یعنی قرآن پر غور و فکر بھی کرتے ہیں) پھر وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں۔''

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ اہلِ کتاب کے صالح عنصر (نیک طبیعت لوگوں) کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ دیانت اور راستی کے ساتھ اللہ کی اس کتاب کو پڑھتے ہیں جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، اس لیے وہ اس قرآن کو سن کر یا پڑھ کر اس پر ایمان لے آتے ہیں۔'' (مختصر حواشی)

آیات سے سابقہ آسمانی کتب اور قرآن حکیم دونوں کی آیات مراد ہیں۔ اس کے علاوہ انفس و آفاق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کرشمہ سازیاں بھی اس کی آیات ہی ہیں، نیز قرآن حکیم میں ایک دائرہ سے دوسرے دائرہ تک کی عبارت ایک آیت کہلاتی ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کا سب سے پہلا کام اپنی امت کے سامنے تلاوت آیات کا ہے یعنی اللہ کا کلام پہنچانا اور پڑھانا، گویا آپ ﷺ کی پہلی حیثیت مبلغ اعظم کی ہے۔'' (درس قرآن: ج،اول)

﴿وَ یُزَکِّیۡهِمۡ﴾ ''اور وہ ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے، پاکیزہ کرتا ہے۔''

(زَکّٰی. یُزَکِّیۡ) کے معانی ''بڑھانا، نشوونما کرنا، ترقی دینا، سنوارنا، اصلاح کرنا اور نیک بنانا کے ہیں۔ (القاموس الوحید)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کا فریضۂ نبوت یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ 'ان کی زندگیاں سنوارتا ہے' پاک کرتا ہے، بلند کرتا ہے، روشن کرتا ہے اور ان کے دلوں، ان کے تصورات اور ان کے شعور کو پاک کرتا ہے۔ ان کے گھرانوں کو پاک کرتا ہے۔ ان کی عزتوں کو پاک کرتا ہے اور ان کے باہم روابط کو پاکیزہ بناتا ہے۔ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صاف ستھرا بناتا ہے۔ ان کے ارادوں اور خیالات میں طہارت پیدا کرتا ہے۔ ان کو شرک اور بت پرستی کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ ان کو خرافات اور توہم پرستی کی آلائشوں سے نجات دلاتا ہے اور ان کی وجہ سے زندگی کے اندر جو رسم و رواج پائے جاتے ہیں ان سے انہیں چھٹکارا دلاتا ہے، نیز شرفِ انسانیت سے فروتر اور گھٹیا درجے کی حرکات سے انہیں نکالتا ہے۔ جاہلیت کی تمام گندگیوں سے انہیں صاف ستھرا بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جاہلیت اپنے ماحول میں کچھ غلاظتیں اور

گرد بکھیرتی ہے۔ اسی طرح عرب جاہلیت نے بھی بعض برائیاں پھیلا رکھی تھیں، جنہیں خاتم النبیین محمد ﷺ اسلام اور اس کی مصفّی تعلیمات کے ذریعے دور فرما رہے تھے۔

ان میں سے بعض جہالتوں کا تذکرہ سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے ہجرتِ حبشہ کے موقع پر وہاں کے بادشاہ کے دربار میں اس وقت کیا جب قریشِ مکہ کے وفد نے مسلمانوں کے خلاف نجاشی کے کان بھرنے شروع کیے کہ یہ مسلمان ہمارے بھاگے ہوئے غلام ہیں، لہٰذا انہیں وفد کے حوالے کیا جائے۔ تب سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''شاہِ محترم! ہم جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، فحاشی اور بے حیائی کی تمام حرکات کرتے تھے، صلہ رحمی کے تمام تعلقات کو منقطع کرتے تھے، پردیسی سے برا سلوک کرتے، ہم میں سے طاقتور ضعیفوں کو کھائے جا رہا تھا، زبردست زیردستوں کو دبائے جا رہا تھا، ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا، جس کے شجرۂ نسب سے ہم خوب واقف تھے، اس کی صداقت و امانت کو اچھی طرح پہچانتے تھے، اس کی عفت و طہارت ہمارے دلوں میں گھر کر چکی تھی، اس نے ہمیں ایک اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اسی کی عبادت کریں اور ہمارے آبا و اجداد جن پتھروں اور بتوں کی پوجا کرتے تھے، ان کا جُوا اپنے گلے سے اتار پھینکیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ ہم سچی بات کریں، امانت میں خیانت کرنے سے رک جائیں، صلہ رحمی کو اپنا شیوہ بنائیں، پڑوسیوں کے ساتھ مروت سے پیش آئیں۔ حرام باتوں سے پرہیز کریں، اس نے ہمیں فحاشی سے روکا، جھوٹ بولنے سے منع کیا، قتل و غارت گری سے ٹوکا، یتیموں کا مال کھانے سے باز رکھا، پاکدامن عورتوں پر بہتان لگانے سے بچنے کی تاکید کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور روزے رکھیں۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾

”اور وہ ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔“

وَ یُعَلِّمُھُمُ (یُعَلِّمُ.ھُمُ) وہ تعلیم دیتا ہے، ان کو۔ یُعَلِّمُ، فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب (عَلَّمَ، یُعَلِّمُ، تَعْلِیْمًا) تعلیم دینا، سکھانا، سمجھانا بجھانا، ’ھُمُ‘ ضمیر جمع مذکر غائب۔

محمد جمال الدین القاسمیؒ لکھتے ہیں:

”یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ“ اَیْ اَلْقُرْآنَ ”وَالْحِکْمَۃَ“ اَیْ اَلسُّنَّۃَ، یعنی آپ ﷺ لوگوں کو قرآن اور سنت کی تعلیم دیتے ہیں۔“ (تفسیر القاسمی)

﴿وَ اِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾

”حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔“

وَ اِنْ کَانُوْا اور تحقیق وہ تھے، مِنْ قَبْلُ اس سے پہلے، یعنی خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے لَفِیْ یہاں لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ گمراہی کھلی، مطلب ہے کہ کوئی شک نہیں وہ اسلام سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

آیتِ مبارکہ میں موجود حکمتیں اور بصیرتیں:

۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، نہ صرف اسے شکل وصورت کے لحاظ سے بلکہ عقل وفکر کے لحاظ سے بھی تمام مخلوقات پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی ہے۔

۲) انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں انبیا ورسل بھیجے۔ اس مقصد کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے نیک سرشت، باحیا، بااخلاق اور سلیم الطبع لوگوں کا انتخاب کیا، جنہیں رب کریم نے اپنی وحی سے نوازا، علم کی روشنی عطا فرمائی اور ان ابرار و صالحین کی زندگیاں دوسرے انسانوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیں۔

۳) نبوت کسبی نہیں ہوتی کہ اسے محنت سے حاصل کرلیا جائے بلکہ وہبی ہوتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے اور وہ علیم و قدیر ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کا صحیح حقدار ہے:

﴿اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ﴾ (الانعام:۶/۱۲۴)

”اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔“

۴) تمام انبیا و رسل علیہم السلام جنہیں اللہ تعالیٰ نے رسالت و نبوت کے لیے منتخب کیا، آسمانِ نبوت کے درخشندہ ستارے اور سب کے سب واجب الاحترام ہیں۔ سب نے انسانوں کو اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہ کی بندگی کی طرف بلایا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾(النحل:۱۶/۳۶)

”ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (خواہشات وشیاطین) کی بندگی سے بچو۔“

سب رسولوں میں محمد رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء، سالار انبیاء ہیں اور آسمانِ نبوت میں آفتابِ ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ﴾ (الاحزاب:۳۳/۴۰)

”مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔“

نیز ارشاد گرامی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًاۙ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا﴾ (الاحزاب:۳۳/۴۵-۴۶)

”اے نبیؐ! ہم نے آپ کو گواہی دینے والا (یعنی شاہدِ حق)، (جنت کی) بشارت دینے والا اور (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، نیز اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ (ہدایت) بنا کر بھیجا ہے۔“

گویا نسلِ انسانی کے لیے آفتابِ ہدایت آپ ﷺ ہیں۔ اب صرف آپ ﷺ کا اللہ کی طرف سے اتارا ہوا قرآن اور آپ کی حیاتِ طیبہ ہی ایسی روشنی ہے کہ جس کے ساتھ ہر شخص سفرِ حیات طے کر کے دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

۵) علمِ حقیقی کی آگاہی سے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا سامان مہیا ہوتا ہے، تزکیۂ نفس سے انسان کو باطن کی طہارت میسر آتی ہے اور وہ شرک، کفر، نفاق، فسق اور حسد و بغض

ایسے رذائل سے پاک ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان کا باطن ان غلاظتوں سے پاک نہ ہو تو ممکن نہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سیرتِ طیبہ سے روشنی حاصل کر سکے۔ ایسے ہی جیسے ایک تختی پر موجود بُرے نقش جب تک صاف نہ ہو جائیں خوبصورت اور دلکش نقوش ثبت نہیں ہو سکتے، لہٰذا تلاوتِ کتاب اور سیرتِ رسول ﷺ سے فیض یاب ہونے کے لیے باطن کی طہارت لازمی امر ہے۔

۶) فرائضِ نبوت کس قدر ارفع و اعلیٰ ہیں۔ علم، تزکیۂ نفس اور کتاب و حکمت کی تعلیم اس سے انسانوں کی روح نکھرتی ہے اور انہیں ابدی و دائمی کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔

۷) اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اس احسانِ عظیم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا ہے جس کی وجہ سے انہوں نے دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کو حاصل کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے مطلعِ عالَم پر جہل و جمود کے تاریک بادل چھا رہے تھے۔ دنیا اخلاقی برائیوں کی انتہا کو پہنچ چکی تھی، قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ ایران سے لے کر روم تک انسانیت کا کہیں نام ونشاں نہ تھا، ہندوستان جو حکمت و دانائی کے لیے بہت مشہور تھا اس وقت عقیم ہو چکا تھا۔ زبردست زیردستوں کا خون چوس رہے تھے اور زیردست نہایت ذلت ومظلومی کے ساتھ زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ علم کا آفتاب غروب ہو چکا تھا، مکمل عرب میں چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، باقی سارا جزیرہ جہل و نادانی کے اتھاہ گہرے سمندر میں غرق تھا۔ ان حالات میں دنیا کا ہر ذرہ کسی آفتابِ ہدایت کا منتظر تھا، جو آئے اور دنیا والوں کو نورِ عرفان سے روشن کر دے، چنانچہ وہ آیا اور فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا تو رات کی ظلمت دن کی تابندگی سے بدل گئی، اخلاق واصلاح کا غوغا بلند ہوا، امن وصلح کی طرح ڈالی گئی اور ایک دفعہ پھر انسانیت کو معراج کمال پر پہنچا دیا گیا۔ ساری دنیا حکمت و معرفت کے نشے میں چور ہو گئی۔ زیردستوں کو انصاف ملا اور علم کا پرچم نہایت شان سے لہرانے لگا، ایسا ہوا، اس لیے کہ جو رسول ﷺ آیا، وہ کامل تھا۔ جہاں اس نے اللہ کی آیات کی تفصیل و توضیح کی، وہاں تزکیہ اور تطہیر سے بھی کام لیا، جہاں دماغوں کو روشنی بخشی وہاں دلوں کو بھی جلوؤں سے معمور کر دیا۔“ (تفسیر سراج البیان)

مومنوں پر رَءُوف اور رحیم نبی ﷺ

﴿لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ﴾

(التوبہ:۹/۱۲۸-۱۲۹)

’’(لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسے رسول تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، اُن کو تمہاری تکلیف نہایت گراں گزرتی ہے اور ان کی نیک نفسی اور نرم دلی کا یہ حال ہے کہ (دنیا و آخرت میں) تمہاری فلاح و بہبود کے وہ حریص ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمان لانے والوں کے ساتھ وہ شفیق اور رحیم ہیں، (اے نبی) اگر یہ لوگ آپ (کی دعوت) سے روگردانی کریں تو ان سے کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، میں صرف اسی پر انحصار کرتا ہوں اور وہ مالک ہے عرشِ عظیم کا۔‘‘

﴿لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾

لغوی معنی: لَقَدْ حرف تاکید، اس سے پہلے لام زبر کے ساتھ مزید تاکید پیدا کرتا ہے جَآءَ کُمْ (جَآءَ. کُمْ) آئے، تمہارے (پاس) (جَاءَ، یَجِیْءُ، جَیْئًا وَ مَجِیْئًا) آنا، ’’کُمْ‘‘ تمہارے، ضمیر جمع مذکر مخاطب، رَسُوْلٌ رسول، یعنی رسول اللہ ﷺ، مِنْ اَنْفُسِکُمْ تمہاری جنس سے ہیں، نَفْسٌ اس کا مفرد ف کی جزم کے ساتھ، شخص، جنس، اور (ف کی زبر) کے ساتھ (نَفَسٌ) کے معنی سانس ہے اور اس کی

جمع اَنْفَاس آتی ہے، عَزِیْزٌ مشکل پڑنا، شاق گزرنا (عَزَّ، یَعِزُّ، عِزًّا وَ عِزَّةً) کہا جاتا ہے، عَزَّ الْاَمْرُ عَلَیْهِ اس پر یہ معاملہ شاق اور مشکل ہوا، مَا عَنِتُّمْ جو تکلیف تمھیں پہنچی، جس سختی میں تم مبتلا ہوئے، اس میں دنیاوی مصائب و آلام اور اُخروی عذاب و تکالیف دونوں آ جاتے ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی ؒ لکھتے ہیں:

''مِنْ اَنْفُسِكُمْ'' یعنی وہ رسول تمہارے ہی قبیلہ سے ہیں، تم ان کی زندگی بھر کے حالات اور عادات و خصائل سے خوب واقف ہو، ان کی دیانت و امانت اور صداقت کے شاہد ہو اور وہ تمہاری ہی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جو تمہارے لیے باعثِ فخر و رحمت ہے۔

''عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ'' آپ ﷺ کو مومنوں کی تکلیف کا شدید احساس تھا، یعنی جب تمھیں کوئی سختی یا دکھ پہنچے تو ان کی جان پر بن جاتی ہے اور انہیں اس کے دفعیہ کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر ممکن طریقہ سے یہ چاہتے ہیں کہ امت پر آسانی ہو، آپ ﷺ جو دین لائے وہ بھی سہل اور نرم ہے اور آپ ﷺ اپنے عمال کو بھیجتے وقت بھی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا، سختی نہ کرنا۔''

(تیسیر القرآن)

﴿حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾

''(دنیا و آخرت میں) تمہاری فلاح و بہبود کے وہ حریص ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمان لانے والوں کے ساتھ وہ شفیق اور رحیم ہیں۔''

حَرِیْصٌ کسی بات کا شدت سے چاہت رکھنے والا، رسول اللہ ﷺ لوگوں کی بھلائی اور خیر خواہی کی شدید رغبت رکھتے تھے۔

تیسیر القرآن میں ہے:

''سب سے زیادہ حرص آپ ﷺ کو یہ تھی کہ لوگ اُخروی عذاب، یعنی دوزخ سے بچ جائیں اور اس کا واحد راستہ یہی تھا کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لا کر اللہ اور اس کے رسول کے فرمانبردار بن جائیں، یعنی رسول ﷺ کے دل میں تمہاری خیر خواہی اور بھلائی کے لیے خاص تڑپ

تھی، یہی وجہ تھی کہ جب لوگ آپ ﷺ پر ایمان نہ لاتے تو آپ سخت بے قرار ہو جاتے۔ آپ ﷺ کی اس کیفیت کو قرآن میں متعدد بار دہرایا گیا ہے۔'' (تیسیر القرآن)

مولانا محمد یوسف اصلاحی لکھتے ہیں:

''کفر و شرک کے تاریک ترین ماحول میں ایک حسّاس انسان آنکھ کھولتا ہے، وہ اپنے چاروں طرف ہزارہا خداؤں کی پرستش ہوتے دیکھتا ہے، بدکرداری و بداخلاقی کی حیا سوز حرکتیں دیکھتا ہے اور ظلم وستم کے ختم نہ ہونے والے انسانیت سوز مناظر دیکھتا ہے، تو وہ کڑھتا ہے۔ آدمؑ کی اولاد کا یہ حال اس سے دیکھا نہیں جاتا، وہ ان کی ہدایت کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ شوقِ ہدایت میں گھلتا ہے اور اسی فکر وغم میں وہ اپنے رب کے حضور گڑگڑاتا ہے۔ پروردگار! مجھ پر صبر انڈیل دے اور میرے قدموں کو جما دے اور ان کافروں کے مقابلے میں میری مدد فرما:

﴿رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾

(البقرہ:۲/ ۲۵۰)

''اے ہمارے رب! ہمارے لیے راہِ صبر کشادہ کر دیجیے، ہمارے قدموں کو استقامت بخشیے اور ہمیں کافروں پر فتح و نصرت عطا فرمایئے۔''

اور رب کائنات صبر و ثبات کی بے پناہ قوت دے کر وعدہ کرتا ہے کہ ہم تمہارے پشت پناہ ہیں، تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو، ہم ایک لمحے کے لیے بھی تم سے غافل نہیں ہیں، ہم نہ تمھیں ضائع ہونے دیں گے اور نہ تمہارا اجر ضائع ہونے دیں گے، تم کھلم کھلا ایک اللہ کی دعوت دو، شرک کے ہولناک انجام اور جہنم کی عبرتناک تباہی سے اپنی قوم کو بچانے کے لیے جسم و جان کی ساری قوتیں لگا دو۔'' (دیکھیے النجم: ۴۸-۵۲)

اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ شوق اور درد سے سرشار ایک بے قرار انسان ہے جسے شب و روز ایک ہی فکر ہے، ایک ہی دھن ہے، ایک ہی غم ہے اور ایک ہی لگن ہے کہ اللہ سے بچھڑے ہوئے بندے دوبارہ اسی کے غلام بن جائیں۔ اسی غم میں اس کی راتیں کٹتی ہیں، اسی شوق

اور دوڑ دھوپ میں اس کے دن بیتتے ہیں، گمراہوں کو اپنے رب سے بے زار اور غافل دیکھ کر اس کا دل روتا ہے اور اس کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ وہ ایک ایک دل میں اللہ کا یہ پیغام جمانے اور بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے بے چین ہے کہ اللہ کے بندو! تمہارا خالق و مالک ایک ہی اللہ ہے، اسی نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تمھیں ماں کے پیٹ میں، تین اندھیروں کے اندر، پیدا کیا، حسین وجمیل جسم دیا، بے پایاں صلاحیتیں دیں اور اپنی تخلیق کا شاہکار بنا کر تمھیں دنیا میں بھیجا، وہی اب بھی تمہاری پرورش کر رہا ہے، زمین سے لہلاتی کھیتیاں وہی اُگاتا ہے، آسمان سے پانی وہی برساتا ہے، آفتاب و ماہتاب کو اسی نے تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے، شب و روز کی یہ گردش اسی کے حکم سے ہے، اس نے پوری کائنات کو اپنی قدرت سے تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے، نہ تمہارے پیدا کرنے میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ زمین وآسمان کے پیدا کرنے میں، نہ تمہاری پرورش میں کوئی اس کا معین و مددگار ہے اور نہ اس کائنات کی حکمرانی میں کوئی اس کا شریکِ کار ہے۔ وہ اللہ ایک ہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تمہاری بندگی کا تنہا وہی مستحق ہے، سو اسی کی عبادت کرو، اسی کی اطاعت کرو، اسی سے دعائیں مانگو، اسی کے سامنے عاجزی کرو، اسی سے مدد چاہو، اسی سے محبت کرو اور اُسی کی رضا کے طالب بنو۔

آپ ﷺ کی یہ دعوت شب و روز فضا میں گونجتی ہے، لیکن تھوڑے سے لوگ اس دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ وہ آپ ﷺ کے ساتھ اسی کام میں لگ جاتے ہیں، باقی مکے کے سارے سنگدل آپ ﷺ کے جانی دشمن بن کر آپ ﷺ کے ساتھیوں کو ستانے لگتے ہیں۔ کبھی نماز پڑھنے میں آپ ﷺ کو طرح طرح سے پریشان کرتے اور ستاتے ہیں، کبھی آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں، کبھی آپ ﷺ پر کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں، کبھی آپ ﷺ کو صابی، مجنون، شاعر اور کاہن کہہ کر آپ کا دل دکھاتے ہیں، کبھی آپ ﷺ کے ساتھیوں پر دست درازی کرتے ہیں، کبھی گرم ریت پر لٹا کر اوپر سے وزنی پتھر رکھ کر ایذا دیتے ہیں، کبھی دہکتے انگاروں پر لٹاتے ہیں اور کبھی زنجیروں اور رسیوں

سے باندھ کر مکے کی گلیوں میں گھسیٹتے ہیں اور کبھی طائف کے بازاروں میں پتھر برساتے ہیں۔ ان سارے حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شوقِ ہدایت کا حال یہ ہے کہ آپ ﷺ گڑگڑا کر ان ظالموں کے لیے دعائیں مانگتے ہیں، شب و روز ان کے غم میں جان گھلاتے ہیں اور ایک ہی دُھن ہے کہ کسی طرح یہ ایمان کی دولت سے محروم نادان، دولت ایمان سے مالا مال ہو جائیں، اللہ کو آپ کی اس بیقراری اور سوزِ غم پر پیار آتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا﴾

(الکهف ۱۸:۶)

’’شاید اس رنج و غم میں آپ اپنے آپ کو ہلاک ہی کر ڈالیں گے، اگر یہ لوگ اس کلام ہدایت پر ایمان نہیں لاتے۔‘‘

یہ مختصر سی آیت ایک صاف آئینہ ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی تصویر پیش کر رہا ہے اور ہم چشم تصور سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک بے قرار داعی ہے جس کا شوق، ولولہ، تڑپ، سوز و درد، لگن اور حوصلہ کسی طرح اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا، اسے اپنے مقصد سے سچا عشق ہے۔ وہ ہر وقت اسی دھن میں ہے کہ اپنے رب کو خوش کرنے کے لیے بھٹکے ہوئے بندوں کو اُس سے ملائے اور وہ اسی شوقِ ہدایت میں گھل کر اپنی جان ہلاک کیے دے رہا ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سچے کلام پر ایمان لے آئیں۔

یہ حسین اور دلکش زندگی جس کو چشم تصور سے دیکھ دیکھ کر آپ روحانی سرور و سکون اور ایمان کی تازگی محسوس کر رہے ہیں، یہ حیاتِ رسول ﷺ کے ایک اہم پہلو ’’داعیانہ کردار‘‘ کی ایک دلآویز جھلک ہے۔‘‘ (داعی اعظمؐ)

غور کیجیے کہ اس نیلگوں آسمان کے نیچے ایسا کوئی دوسرا محسن، ہمدرد، غمگسار، مہربان، منکسر مزاج، بردبار اور انسانیت کا رفیق و شفیق داعی الی اللہ کسی نے دیکھا ہوگا؟

جس کا جسمِ اطہر سنگدل لوگوں کے ہاتھوں زخموں سے چور چور ہو جاتا ہے مگر مبارک ہونٹ ان

کے واسطے دعائے خیر کے لیے وا ہو جاتے ہیں، وہ جو پتھروں کی بارش کا جواب خوشبو سے بھرے ہوئے پھولوں سے دیتا ہے اور ان کے برے سلوک کا بدلہ اخلاقِ حسنہ سے عطا کرتا ہے ۔

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوبِ سبحانی!
سلام اے فخرِ موجودات، فخر نوع انسانی!
تیرے آنے سے رونق آ گئی گلزارِ ہستی میں
شریک حال قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربانی
سلام اے صاحبِ خلق عظیم، انساں کو سکھلا دیے
یہی اعمال پاکیزہ یہی اشغال روحانی
تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

﴿حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾ اس (نبی رحمت ﷺ!) کو تمہاری بڑی فکر ہے، تمہاری دُھن اس کو لگی ہوئی ہے کہ تم اللہ کے مقبول بندے بن جاؤ، اللہ کی رحمت تم پر رہے، مغفرت رہے تمہاری تھوڑی سی غفلت سے تمہارا دامن کہیں خالی نہ ہو جائے، کفر کا کلمہ تمہارے حلق سے اترنے نہ پائے، انسان جہنم کے حلقے میں شامل نہ ہونے پائے، شیطان کے حلقے میں جانے نہ پائے۔ اللہ کے دین کی خدمت چھوٹنے نہ پائے وہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے تلے رہے۔

﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ ایمان والوں کے ساتھ نہایت شفقت کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت کے ساتھ جو تعلق تھا، فکر تھی اور جو درد تھا ہم اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کس درجے کا تھا، بس یوں سمجھیے کہ جیسے ایک ماں کی ایک اولاد ہو، ماں کا ایک چھوٹا بچہ ہو، اکلوتا اور ساری زندگی کا سہارا اور سارے گھر کا چراغ، اس ماں کو جیسے اپنے بچے کی فکر ہوتی ہے، اس کی ترقی سے خوشی ہوتی ہے، اس کی تکلیف سے

تکلیف ہوتی ہے، تو سمجھیے ایسا ہی کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ غور کیجیے کہ لوگ جو مکہ کے رہنے والے تھے، ان میں سے بعض آپ کے عزیز تھے اور بعض ان میں سے اہل شہر تھے مگر بدر میں قیدیوں کی حیثیت سے جب وہ پیش ہوئے تو نماز میں بھی آپ ﷺ بے چین رہتے (اور صحابہؓ نے آپ کی پریشانی کو دیکھ کر قیدیوں کی رسیوں کو ڈھیلا کر دیا تھا) اور نماز سے آپ کو جو عشق تھا، جو مزہ ملتا تھا اور جو طمانیت ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی تھی اس کا اندازہ ہم آپ کر ہی نہیں سکتے، آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((قُرَّةُ عَيْنِىْ فِى الصَّلٰوةِ))

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''۔

آپ فرماتے کہ اے بلالؓ!، بلال رضی اللہ عنہ آپ کے موذّن تھے، دنیا کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہاں کیسی باتیں ہوں گی؟ اچھی باتوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، اسلام کی تبلیغ کی باتیں، اسلام کو پھیلانے کی تدبیریں، کوششیں اور علمِ قرآن وحدیث، لیکن آپ کے نزدیک نماز کا جو مقام تھا، نماز سے جو تعلق تھا، آپ نماز کے لیے بے چین ہو کر بلالؓ سے کہتے:

''اے بلالؓ! اذان کہہ کر ہم کو آرام دو، بہت انتظار کیا، اب انتظار نہیں ہوتا، بلال! اللہ کے لیے اذان دو تا کہ ہم کو سکون حاصل ہو، تا کہ ہم کو آرام ملے۔''

نماز سے آپ ﷺ کا یہ تعلق تھا اور امت کے ساتھ آپ ﷺ کا جو تعلق تھا، آپ ﷺ کہتے ہیں کہ میں کبھی کبھی نماز میں ہوتا ہوں اور پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے، دل تو چاہتا ہے کہ نماز لمبی کروں، دل کھول کر قرآن شریف پڑھوں، اپنے رب کے سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ لمبے لمبے سجدے کروں، خوب اس سے باتیں کروں، خوب اس سے دعائیں کروں، اس کا نام لوں، اچھی طرح اس کو پکاروں، راضی کروں اور مناؤں، لیکن اس بچے کی آواز کان میں آتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اس کی ماں بھی نماز میں ہوگی (اس زمانے میں مسلمان عورتیں بھی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آتی تھیں اور وہ زمانہ فتنہ وفساد کا زمانہ نہیں تھا، خیر القرون کا زمانہ تھا، اس لیے عورتوں کو اجازت تھی کہ اپنے بھائیوں کے

ساتھ، اپنے باپ کے ساتھ، اپنی اولاد کے ساتھ وہ بھی اللہ کے گھر آئیں اور نماز پڑھیں)، چنانچہ میں اس وقت نماز مختصر کر دیتا ہوں۔

آپ ﷺ کا امت کے ساتھ یہ حال تھا، آپ نے فرمایا اے مسلمانو! میری مثال اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص نے الاؤ روشن کیا، بہت ہی تیز آگ جلائی، جیسا کہ جنگلوں میں آگ ہوتی ہے، لوگ اس کے چاروں طرف بیٹھ کر تاپتے ہیں، برسات کی راتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا، آگ کے پاس کیا ہوتا ہے؟ پروانے آکر گرتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں آکر جمع ہو جاتے ہیں، ایک بتی روشن کر دیجیے بس کافی ہے، روشنی پھیلتے ہی اللہ جانے کون ان کو خبر کر دیتا ہے، وہ بادلوں کی طرح امڈ آتے ہیں، وہ سب کے سب آگ میں آکر ٹوٹ پڑتے ہیں، تمہاری مثال ایسی ہی ہے، اے انسانو! تم جہنم کی آگ میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تم کو آگ سے ہٹاتا ہوں، یہ آپ کا اپنی امت کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہے، امت کے ساتھ آپ کو الفت تھی، ایسی الفت کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا﴾

(الکهف:١٨/٦)

”شاید اس رنج و غم میں آپ اپنے کو ہلاک ہی کر ڈالیں گے اگر یہ لوگ اس کلام ہدایت پر ایمان نہیں لاتے۔“ (قرآنی افادات)

دین اسلام اس قدر روشن اور شفاف ہے کہ اس میں ہمارے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی کی نوید ہے اور خاتم النبیین محمد ﷺ جنہیں رب کریم نے اس دین کے ساتھ مبعوث فرمایا وہ اس قدر مہربان اور ہمدرد ہیں تو (اس سچی راہ سے) روگردانی کر کے ہم کہاں کے رہ جائیں گے؟

اس لیے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰهُ، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، عَلَیۡهِ تَوَکَّلۡتُ وَ هُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ﴾

”اگر یہ لوگ آپ (کی دعوت) سے روگردانی کریں تو ان سے (واشگاف الفاظ میں) کہہ

دیجیے کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے، اس کے سوا کوئی اِلٰہ (معبود و مسجود، مطلوب و مقصود، حاکم و مطاع) نہیں، میں صرف اسی پر انحصار کرتا ہوں اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا۔

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں و بصیرتیں:

۱) آیاتِ مبارکہ میں مِنۡکُمۡ کی بجائے مِنۡ اَنۡفُسِکُمۡ لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لوگوں سے شدید ارتباط اور تعلق کی طرف اشارہ ہے، وہ نسلِ انسانیت کے محسن اور ہمدرد ہیں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہیں، وہ تمام انسانوں کے خیر خواہ ہیں اور انہیں مصائب و مشکلات سے نکالنا چاہتے ہیں، رب کریم کا ارشاد ہے:

”اے محمدؐ کہہ دیجیے کہ ”لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی پر جو اللہ اور اس کے احکام کو مانتا ہے اور اس کے (اسوۂ حسنہ) کی پیروی کرو، امید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔“

(الاعراف:۷/۱۵۸)

۲) ﴿عَزِيزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ﴾ میں واضح اشارہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعتِ اطہر پر وہ بات گراں گزرتی ہے جو تمھیں تکلیف دے، اسے تمہاری ادنی سی تکلیف پر بھی ملال ہوتا ہے، غور کیجیے کہ نماز کے دوران بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو وہ نماز مختصر فرما دیتے ہیں تا کہ بچے کی والدہ کو تکلیف نہ ہو، اُن کی اس نرم دلی پر قرآن شاہد ہے:

”(اے نبی!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہیں ورنہ اگر آپ تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ ﷺ کے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔“ (ال عمران:۳/۱۵۹)

خُلق عظیم صلی اللہ علیہ وسلم

﴿وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ﴾ ''اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں۔'' (القلم:٦٨/٤)

لغوی معنی: وَ اور، اِنَّکَ (اِنَّ. کَ) بلا شبہ، آپ (ہیں) 'ک' ضمیر واحد مخاطب، خاتم النبیّین محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے، لَعَلٰی (لَ. عَلٰی) ضرور بضرور ہیں، پر، خُلُقٍ عَظِیۡمٍ اعلیٰ اخلاق۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''خلق سے مراد وہ عادات و اطوارِ حسنہ ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے کردار و سیرت میں سمو کر دکھایا۔ 'عظیم' سے یہ مقصود ہے کہ خِرد و خیر کی تکمیل و جامعیت کا کوئی بھی نقشہ ترتیب دیجیے، ایک ایک نیکی اور خوبی کا تصور کیجیے اور پھر یہ دیکھیے کہ جامعیت اور توازن کے ساتھ بجز رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے تاریخ میں کوئی اور شخص ان کا حامل نظر آتا ہے، مزید برآں یہ خلقِ عظیم جو آپ کا خاصہ ہے صرف آپ کی ذات ہی کی حد تک سمٹا ہوا نہیں، بلکہ اس کی تاثیر نفوذ کا یہ کرشمہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے مثالی معاشرے کی تشکیل کی جس کا ایک ایک فرد آفتاب و ماہتاب کی طرح تاریخ کے اوراق میں دمک رہا ہے اور رضائے الٰہی کی شہادت و سند کا سزاوار ہے۔'' (لسان القرآن، جلد دوم)

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

''آپ ﷺ کے اخلاق کی بلندی یہ تھی کہ آپ ﷺ طعن و تشنیع کرنے والوں، تمسخر اڑانے والوں اور ایذا پہنچانے والوں حتیٰ کہ پتھر مارنے والوں، کے حق میں دعائے خیر ہی کرتے

رہے۔ پھر ایسے ہی لوگوں کی ہدایت پر آپ اتنے حریص واقع ہوئے تھے کہ اپنی جان تک اس کام میں ہلکان کر رہے تھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنی ذات کی خاطر انتقام نہیں لیا، پھر جب مکہ فتح ہوا، تو آپ ﷺ کے سب جانی دشمن آپ ﷺ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے آپ ﷺ کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور آپ کی جان کی قیمت لگا دی تھی پھر کئی بار چڑھ کر مدینہ آتے رہے تا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیں اور اس وقت آپ ان سے بدلہ لینے کی قدرت وقوت بھی رکھتے تھے، لیکن جب آپ ﷺ کے یہ دشمن آپ کو ملتجیانہ نظروں سے دیکھنے لگے تو آپ نے ایک ہی جملہ ((لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) کہہ کر سب کو معاف فرما دیا، یعنی آج تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں، جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو، یہ بلند اخلاق تو آپ ﷺ کی دشمنوں کے ساتھ تھی۔ آپ ﷺ کا عام اخلاق یہ تھا کہ ایک بڑھیا آپ ﷺ کی راہ روک کر آپ ﷺ کو اپنی بات سنا لیتی تھی اور آپ ﷺ برا نہ مانتے تھے، اس طرح آپ ﷺ کے بے شمار پہلو ہیں جن سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں، یہاں ان کا ذکر ناممکن ہے، چنانچہ ایک دفعہ کسی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ آپ ﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو سیدہ نے نہایت مختصر اور جامع جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ سارا قرآن ہی آپ کے اخلاق تھے۔" (تیسیر القرآن)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ خود اس کا مجسم نمونہ بن کر دکھا دیا تھا۔ جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا آپ ﷺ نے خود سب سے بڑھ کر اس پر عمل کیا، جس چیز سے اس میں روکا گیا، آپ ﷺ نے خود سب سے زیادہ اس سے اجتناب فرمایا، جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا، سب سے بڑھ کر آپ کی ذات ان سے متصف تھی اور جن صفات کو اس میں ناپسند ٹھہرایا گیا، سب سے زیادہ آپ ان سے پاک تھے۔ ایک اور روایت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے

کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا اور اپنی ذات کے لیے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپ کو پہنچائی گئی ہو اِلاّ یہ کہ اللہ کی حرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپ ﷺ نے اللہ کی خاطر اس کا بدلہ لیا ہو۔ آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب دو کاموں میں سے ایک کام کا آپ کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ﷺ آسان تر کام کو پسند فرماتے اِلاّ یہ کہ وہ گناہ ہو اور اگر کوئی کام گناہ ہوتا تو آپ ﷺ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے تھے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''میں نے دس سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی ہے، آپ نے کبھی میری کسی بات پر اُف تک نہ کی، کبھی میرے کسی کام پر یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کیوں کیا اور کبھی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کیوں نہ کیا؟'' (بخاری و مسلم، بحوالہ تفہیم القرآن)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''اسلامی نظریۂ حیات کا مطالعہ کریں یا خاتم النبیین ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں، نظر آئے گا کہ ان میں بنیادی عنصر اسلامی اخلاق کا ہے، اسی اخلاقی عنصر پر اسلام کا تہذیبی اور قانونی نظام قائم ہے، اس نظام میں طہارت، نظافت، امانت، سچائی، عدل، رحم دلی، نیکی، وعدہ وفائی، قول و فعل کے درمیان مطابقت نیت اور ضمیر کے درمیان مطابقت، ظلم اور زیادتی کی مخالفت، ظلم اور دھوکا بازی کی ممانعت، لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو اور اس نظام میں جس قدر قانون سازی بھی کی گئی ہے وہ ان اخلاقیات میں سے کسی نہ کسی اخلاق کی حفاظت کے لیے کی گئی ہے اور اس قانون سازی کے ذریعے لوگوں کے سلوک، ان کے شعور اور طرزِ عمل میں اخلاقی قدریں پیدا کرنے کی سعی اور کوشش کو بروئے کار لایا گیا ہے اور ان اخلاقیات میں بیک وقت انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی طرزِ عمل کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

''مجھے اس لیے بھیجا گیا کہ میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کر دوں۔''

آپ نے اپنی بعثت کا مقصد اخلاقی تطہیر کے اندر محدود کر دیا اور احادیثِ مبارکہ کا ایک

زمزمہ بہہ رہا ہے کہ خلقِ حسن اختیار کرو، کریمانہ انداز اپناؤ، آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اس کی ایک مثال ہے اور ایک اعلیٰ تصویر ہے۔ مکارمِ اخلاق کی اور فی الواقع آپ ﷺ اس بات کے مستحق تھے کہ خالق کائنات یہ شہادت دے کہ ﴿وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ جس طرح رسول اللہ ﷺ خُلقِ عظیم کے اعلیٰ درجے پر ہیں اسی طرح آپ کا پیش کردہ اسلامی نظامِ حیات بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں کا حامل ہے، اس اخلاق کے ذریعے زمین کی بستیوں کو آسمانوں سے ملا دیا گیا اور لوگوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ سے جوڑ دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ اللہ کن کن باتوں پر راضی ہوتا ہے۔

یہ اسلام کے اخلاقی نظام میں ایک ممتاز پہلو ہے، کیونکہ اسلامی اخلاقیات کسی سوسائٹی کی پیداوار نہیں ہیں، یہ زمینی اور مادی اصولوں سے ماخوذ نہیں ہیں، نہ یہ کسی رسم و رواج، عرف، مصلحت اور باہمی روابط و تعلقات سے ماخوذ ہیں، ان اخلاقیات کا دارومدار رضائے الٰہی پر ہے، اس دعوت پر ہے کہ لوگو! اللہ کی طرف رجوع کرو، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حمیدہ کو اپنے اندر پیدا کرو تاکہ تمہاری انسانیت کے آفاق آسمانوں سے مل جائیں تاکہ تم اخروی زندگی کو بہتر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پاؤ اور تم اللہ کے ہاں عزت و عظمت کے مرتبے پر فائز ہو سکو، جیسا کہ قرآن بتاتا ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾(القمر:٥٤/٥٥)

”نافرمانی سے پرہیز کرنے والے یقیناً باغوں اور نہروں میں ہوں گے، سچی عزت کی جگہ بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے ہاں۔“

یہ لامحدود اخلاقیات اور ان کے ثمرات ہیں، یہ ان انتہائی بلندیوں پر ہیں جہاں تک کوئی انسان پہنچنے کا تصور نہیں کر سکتا ہے کیونکہ یہ اخلاقیات اللہ کی صفات کی پیروی پر مبنی ہیں، گرے ہوئے مادی اصولوں سے ماخوذ نہیں ہیں۔

پھر غور کیجیے کہ اسلامی اخلاقیات منفرد اخلاقیات نہیں ہیں۔ صدق، امانت، عدل، رحم اور نیکی یہ سب ایسی اخلاقیات ہیں جن میں ایک سے زیادہ انسانوں کا باہم تعلق پیشِ نظر ہوتا ہے۔

یہ ایک نظام کے ساتھ متعلق اخلاقیات ہیں، باہم تعاون، باہم معاملہ تقسیم کار اور تقسیم حقوق اور اجتماعی تنظیم سے متعلق امور ہیں، ان کا تعلق زندگی کا ایک تصور ہے اور ان کا ماخذ رب کائنات ہے کہ اسی کا عطا کردہ یہ نظام ہے، اسی لیے یہ رہبانیت یا ذاتی اذن پر مبنی بھی نہیں ہیں اور مادی مفادات اور زمین کے اعتبارات ان کا ماخذ نہیں، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا ان کا اصل ماخذ ہے۔

یہ اخلاقیات اپنے کمال و جمال، توازن و اعتدال اور تسلسل وثبات کے پہلو سے خاتم النبیین محمد ﷺ میں مکمل طور پر منعکس ہوئیں اور اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا:

﴿وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ﴾

''اور بلاشبہ آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔''

اس تعریفِ عظیم کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا مستقبل نہایت تابناک ہے، آپ مشرکین سے کہہ دیں کہ تم اپنے برے انجام کا انتظار کرو، تم خلق عظیم کے مالک پر ایسے الزامات عائد کرتے ہو، تنبیہ کی جاتی ہے کہ تمہارے دعوؤں کی حقیقت تم پر جلد ہی کھل جائے گی کہ مجنون کون ہے؟

﴿فَسَتُبۡصِرُ وَیُبۡصِرُوۡنَ، بِاَیِّکُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ، اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَھُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُھۡتَدِیۡنَ﴾ (القلم:٦٨/٥-٧)

''آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ (کفار و مشرکین) بھی دیکھ لیں گے (جن کی عقلوں پر پردے پڑ گئے ہیں) کہ تم میں (واقعی) دیوانہ کون تھا؟'' (فی ظلال القرآن)

سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ، اوصافِ کریمہ اور خصائل شریفہ کا ذکر ہند بن ابی ہالہؓ نے (جوام المومنین خدیجہ ؓ کے فرزند اور سیدنا حسن اور حسین کے ماموں ہیں) بہت جامع اور بلیغ انداز میں کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''رسول اللہ ﷺ ہر وقت آخرت کی فکر اور امور آخرت کی سوچ میں رہتے اور اس کا ایک

تسلسل قائم تھا کہ کسی وقت آپ ﷺ کو چین نہیں ہوتا تھا، اکثر طویل سکوت اختیار فرماتے، بلاضرورت کلام نہ فرماتے، آپ ﷺ گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہنِ مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے اور اسی طرح اختتام فرماتے، آپ ﷺ کی گفتگو اور بیان بہت صاف، واضح اور دوٹوک ہوتا، نہ اُس میں غیر ضروری طوالت ہوتی اور نہ زیادہ اختصار، آپ ﷺ نرم مزاج ونرم گفتار تھے، درشت خو اور بے مروت نہ تھے، نہ کسی کی اہانت کرتے تھے اور نہ اپنے لیے اہانت پسند کرتے تھے، نعمت کی بڑی قدر کرتے، اس کو بہت زیادہ جانتے، خواہ کتنی ہی قلیل ہو اور اس کی برائی نہ فرماتے، آپ ﷺ کو اپنی ذات کے لیے نہ غصہ آتا، نہ اس کے لیے انتقام لیتے، ہاں جب اللہ تعالیٰ کے کسی حق کو پامال کیا جاتا تو اس وقت آپ ﷺ کے جلال کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکتی تھی، یہاں تک کہ آپ ﷺ اس کا بدلہ لیتے۔ جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو اس کو پلٹ دیتے، گفتگو کرتے وقت داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ملاتے، غصہ اور ناگواری کی بات ہوتی تو روئے انور اس طرف سے بالکل پھیر لیتے اور اعراض فرما لیتے، خوش ہوتے تو نظریں جھکا لیتے، آپ ﷺ کا ہنسنا زیادہ تر تبسم تھا، جس سے آپ ﷺ کے دندان مبارک جو بارش کے اولوں کی طرح پاک وشفاف تھے، ظاہر ہوتے۔" (نبی رحمت، حصہ دوم)

جناب ابوبکر الجزائری لکھتے ہیں:

جناب رسول اللہ ﷺ کے اخلاق بلند کیوں نہ ہوں کہ رب کریم نے ان کی تربیت فرمائی، آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((أَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَأْدِیْبِی))

"میرے رب نے مجھے ادب سے آراستہ کیا تو مجھے بہترین ادب سے نوازا۔"

پھر ارشاد ہوا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُ تَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ))

"مجھے اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (الاعراف:۱۹۹/۷)

معروف کی تلقین کیے جائیے اور جاہلوں سے نہ الجھیے (کہ آپ اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں)۔

پھر ارشاد ہوا:

﴿وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (ال عمران:۱۵۹/۳)

اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد وپیش سے چھٹ جاتے۔

(ایسر التفاسیر)

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) اخلاقِ حسنہ سے متصف ہونا کامل ترین ایمان کی علامت ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ ''کامل ترین ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔''

۲) اچھے اخلاق کے ذریعہ انسان اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو مسلسل روزے رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے ہمہ وقت چاق و چوبند رہتا ہے، نبی ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''مومن اچھے اخلاق کے ذریعے پے درپے روزے رکھنے والے اور شب زندہ دار کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے۔''

۳) نبی ﷺ کا فرمان ہے: یوم جزا کو بندے کی میزان میں اچھے اخلاق سے زیادہ کوئی چیز وزنی نہ ہوگی۔

۴) آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''قیامت کے روز مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے زیادہ میرے قریب وہ لوگ ہوں گے جو پسندیدہ اخلاق رکھتے ہیں۔

۵) آپ ﷺ کے حسن اخلاق کی رب کائنات نے توصیف فرمائی، تو جسے خاتم النبیین ﷺ کی جنت میں رفاقت مقصود ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرے اور اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا معمول بنائے۔

اے رب کریم! ہمیں پیارے رسول ﷺ کی سچی محبت عطا فرما اور زندگی کے ہر معاملے میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق سے نواز۔ آمین!

رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

﴿وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ (الانبیاء:۲۱/۱۰۷) ”(اے نبی!) ہم نے تو آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

لغوی معانی: وَمَا اور نہیں، اَرۡسَلۡنٰکَ (اَرۡسَلۡنٰکَ) بھیجا، ہم نے، آپ کو (اَرۡسَلَ، یُرۡسِلُ) پیغمبر بنا کر بھیجنا، اِلَّا مگر، رَحۡمَةً رحمت، لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (لِ. اَلۡعَالَمِیۡنَ) لیے، جہان والوں کے، عَالَمِیۡنَ کا مفرد عَالَمُ ہے (لام کی زبر کے ساتھ)۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

”آپ ﷺ اہل جہان کے لیے رحمت کیسے ہیں؟ اس آیت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ جہان والوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ﴾ (ال عمران:۳/۱۶۴)

”درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان خود ان ہی میں سے پیغمبر اٹھایا۔“

مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے کہ آپ ﷺ کی ذات بابرکاتِ اور آپ کی بعثت دراصل پوری نوعِ انسانی کے لیے رحمت ہے، آپ ہی کے ذریعہ غفلت میں پڑی ہوئی اور راہ سے بھٹکی ہوئی انسانیت کو ایسا علم نصیب ہوا جو حق و باطل کی راہوں کو ممیّز کر کے سیدھی راہ دکھاتا اور اس پر چلاتا ہے۔“

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''صفتِ رحمت، اللہ تعالیٰ کی محبوب صفت ہے، سورۂ فاتحہ کا آغاز بھی اس نے اپنی اس صفت کے بیان سے کیا ہے۔ بسم اللہ میں بھی یہی صفت غالب ہے﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ (الفاتحہ:۱/۱-۲)

قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ﴾ (الاعراف:۷/۱۵۶)

''اور میری رحمت سب پر حاوی ہوگئی۔''

دنیا کو رسول اللہ ﷺ کے دامن سے جو کچھ ملا، جو تحفہ ملا، جو زندگی ملی اس کے لیے اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہوسکتا تھا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

سب سے اہم، سب سے بنیادی، سب سے عزیز، سب سے محبوب اور سب سے زیادہ فراوانی کے ساتھ جو چیز ہر برادری، ہر طبقہ، ہر ملک، ہر قوم کو پوری فیاضی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی، وہ 'رحمت' ہے۔ آپ کے ذریعہ اللہ کی رحمت کے دروازے کھل گئے، ساری نسلِ انسانیت کی کھیتی ہری ہوگئی ؎

ہری ہو گئی، ساری کھیتی خدا کی — رہے اس سے محروم، آبی نہ خاکی

مردوں پر آپ ﷺ نے احسان کیا، عورتوں پر آپ نے احسان کیا، غلاموں پر آپ نے احسان کیا، غریبوں پر آپ نے احسان کیا اور یہاں تک کہ جانوروں پر آپ نے احسان کیا، اگر ان احسانات کا ذکر کروں تو پوری زندگی گزر جائے، قرآن مجید اور سیرت کی کتابوں کا آپ مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ کی شفقت و احسان سے ہر طبقہ زیر بار ہے۔

غور کیجیے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب ہے؟ جس نے ظلم کرنے سے روکا، مزدور کو پسینا خشک ہونے سے پہلے مزدوری دینے کا حکم دیا، جس نے سچے تاجر کو پیغمبروں

کے قرب کی بشارت دی، جس نے یتیم کی پرورش کرنے والے کی فضیلت بیان کی۔ جس نے عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی ہدایت فرمائی، جس نے غلاموں کو آقا کا ہمسر بنایا، جس نے رنگ ونسل کے امتیاز کو ختم کیا، جس نے قیدیوں کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمایا، وہی ہے رحمتِ عالم ﷺ، اس کا پرَتو زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کو نظر آئے گا، یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں بھی اخلاقی ہدایات سے نوازا، فوجیوں کو ہدایت کی گئی کہ زخموں سے نڈھال انسانوں کو نہ مارنا، عابدوں اور زاہدوں پر ہاتھ نہ اٹھانا، عورتوں اور بچوں کو ایذا نہ پہنچانا، پھل دار درختوں اور ہرے بھرے کھیتوں کو نہ اجاڑنا، کسی بھی قوم کی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچانا۔

کسی چیز کی اہمیت وعظمت اور قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے عام طور پر دو پیمانے ہوتے ہیں۔ ایک اس کی تعداد اور مقدار جس کو ہم جدید علمی اصطلاح میں ''کمیّت'' یا 'Quantity' کے لفظ سے ادا کرتے ہیں اور کسی شے کا جوہر یا صفت جس کو اصطلاحاً کیفیت 'Quality' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ قرآنی اعلان جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا گیا ہے کہ ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے، یعنی آپ کی بعثت ونبوت، آپ کے وجود گرامی اور آپ کی تعلیمات سے انسانیت کو جو فیض پہنچا، اس کو حیاتِ نو کا جو پیغام ملا، اس کی بیماریوں کا جو مداوا ہوا اور اس کے مصائب کا جو خاتمہ ہوا، اس پر رحمتوں اور برکتوں کا جو دروازہ کھلا، وہ اپنی وسعت و کثرت، اپنی مقدار وکمیت کے اعتبار سے بھی اور اپنی نوعیت وافادیت، اپنے جوہر وکیفیت کے اعتبار سے بھی بے نظیر و بے مثال ہے۔

''رحمت'' ہماری روزمرہ زندگی کا کثیر الاستعمال لفظ ہے، اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے کسی انسان کو فائدہ یا راحت حاصل ہو، اس کے انواع واقسام اور اس کے مراتب و درجات کا کوئی ٹھکانا نہیں، اگر کوئی کسی کو پانی پلا دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی 'رحمت' ہے، اگر کوئی کسی کو راستہ بتا دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی 'رحمت' ہے، اگر گرمی میں کوئی کسی کو پنکھا جھل دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی 'رحمت' ہے، ماں اپنے بچے کو پیار کرتی ہے، باپ

اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا ہے اور اس کے لیے زندگی کا ضروری سامان مہیا کرتا ہے، وہ اس سے بڑی ایک 'رحمت' ہے، استاد طالب علم کو پڑھاتا ہے، اس کو علم کی نعمت بخشتا ہے، یہ بھی ایک بڑی قابل قدر 'رحمت' ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑا پہنانا سب 'رحمت' کے مظاہر ہیں اور سب کا اعتراف ضروری اور شکریہ واجب ہے۔

لیکن 'رحمت' کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ کسی ''جاں بلب'' مریض کی جان بچائی جائے، ایک بچہ دم توڑ رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب آخری ہچکی لے گا، ماں رو رہی ہے کہ میرا لال دنیا سے رخصت ہو رہا ہے، اس سے کچھ نہیں ہوسکتا، باپ مارا مارا پھر رہا ہے، سب بے بس معلوم ہوتے ہیں کہ اچانک ایک طبیب حاذق فرشتۂ رحمت بن کر پہنچتا ہے اور کہتا ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں! وہ دوا کا ایک قطرہ بچے کے حلق میں ٹپکاتا ہے، وہ آنکھیں کھول دیتا ہے، سب اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھیجا ہوا فرشتہ کہیں گے اور وہ ساری رحمتیں جن کا میں نے نام لیا، اس 'رحمت' کے سامنے مات ہو جائیں گی، اس لیے کہ اس مریض ہی پر نہیں بلکہ اس کے چھوٹے سے کنبہ اور اس سے محبت کرنے والوں پر بھی احسان عظیم ہے کہ اس کی جان بچائی گئی۔

پھر غور کیجیے کہ کوئی نابینا چلا آ رہا ہے، راستہ میں کوئی خندق یا کوئی کنواں پڑ گیا، قریب ہے کہ اس کا اگلا قدم اسی خندق یا کنویں میں ہو، اللہ کا ایک بندہ عین وقت پر پہنچتا ہے اور وہ اس کی کمر پکڑ لیتا ہے اور اس کو اس خندق میں گرنے سے بچا لیتا ہے تو وہ اس کے حق میں فرشتۂ رحمت کہلائے گا۔

پھر غور کیجیے کہ ایک نوجوان جو اپنے باپ کی آنکھ کا تارا اور اپنے کنبہ کا سہارا ہے، دریا میں ڈوبنے لگا، وہ غوطے کھا رہا ہے، کوئی گھڑی ہے کہ وہ تہہ نشین ہو جائے، ایسے میں کوئی اللہ کا بندہ اپنی جان پر کھیل کر کود پڑتا ہے اور اس کی جان بچا لیتا ہے، اس کے ماں باپ اور بہن بھائی فرطِ مَسرت اور احسان مندی کے جذبہ سے اس سے لپٹ جاتے ہیں اور ساری عمر اس کا یہ احسان نہیں بھولتے۔

لیکن ''رحمت'' کا آخری مظہر یہ ہے کہ پوری انسانیت کو ہلاکت سے بچایا جائے، پھر ہلاکت ہلاکت اور خطرہ خطرہ میں بھی زمین وآسمان کا فرق ہے، ایک عارضی ہلاکت اورتھوڑی دیر کا خطرہ ہے، ایک ابدی ہلاکت اور دائمی خطرہ ہے، اللہ کے پیغمبر انسانوں کے ساتھ 'رحمت' کا جو معاملہ کرتے ہیں، وہ ان رحمتوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

یہ زندگی کا موّاج سمندر، یہ زندگی کا طوفانی دریا، جو انسانوں اور افراد ہی کو نہیں، قوموں اور ملکوں کو غرق کر چکا ہے، تہذیبوں اور تمدنوں کو لقمۂ اجل بنا چکا ہے، جس کی موجیں نہنگوں کی طرح منہ پھیلا کر بڑھتی اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح انسانوں پر حملہ کرتی ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ اس بے رحم دریا سے کس طرح پار اُترا جائے اور انسانی قافلہ کو ساحلِ مراد بلکہ ساحلِ نجات پر پہنچایا جائے۔

نوعِ انسانی کا سب سے بڑا محسن اور اسے فلاح وکامرانی سے ہمکنار کرنے والا وہ قرار پائے گا جو انسانی کشتی کو، جو ڈانواں ڈول ہورہی ہے، جس کے سوار موجود ہیں لیکن ملاح مفقود، ساحل تک پہنچادے۔ نوع انسانی ان کی بھی شکر گزار ہے جو اس کو علم وفن کا تحفہ دیتے ہیں، وہ ان کی بھی شکر گزار ہے جو اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں، وہ ان کی بھی شکر گزار ہے جنہوں نے اس کی زندگی کو پُر راحت بنایا، اس کی زندگی کی مشکلات کو ختم یا کم کیا، وہ کسی کے احسان کی ناقدری نہیں کرتی، لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ان دشمنوں سے بچایا جائے، جو اس کی جان کے دشمن ہیں اور اس کی کشتی کو ساحل سے ہمکنار کردیا جائے۔

پس جاہلیت کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ پوری زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی بلکہ ٹوٹ گئی تھی، انسان نہیں رہا تھا، انسانیت کا مقدمہ اپنے آخری مرحلہ میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش تھا، انسان اپنے خلاف گواہی دے چکا تھا، اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ارشاد ہوا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۷/۲۱)

اور (اے محمد!) ہم نے آپ کو جہان والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا۔''

آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر
مگر آیا نہ کوئی رحمتِ عالم بن کر

(قرآنی افادات)

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

ا) خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ غربا و مساکین، بیواؤں اور یتامیٰ، دکھیاروں اور مریضوں، اپنوں اور غیروں یہاں تک کہ دشمنوں کے لیے بھی شفقت اور رحمت کا نمونہ تھی، آپ ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

''آپ یتیم پر سختی نہ کیجیے اور سائل کو نہ جھڑکیے۔'' (الضحیٰ:۹، ۱۰)

آپ ﷺ نے نہ صرف خود یتامیٰ کی کفالت اور سرپرستی فرمائی، بلکہ ان کی دلجوئی اور کفالت کرنے والوں کو یہ خوشخبری سنائی:

''یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے'' انگشت شہادت اور درمیانی انگلی میں کچھ فرق رکھ کر بتایا کہ اس طرح۔'' (ریاض الصالحین، بحوالہ مسلم)

بیواؤں اور مساکین کی نہ صرف خود سرپرستی فرماتے بلکہ جو لوگ اس کارِ خیر میں حصہ لیتے انہیں بھی یہ خوشخبری سناتے:

''بیوہ اور مسکین کی خبر لینے والا اللہ کے راستہ میں ہمہ وقت مجاہد کی طرح ہوتا ہے اور راوی (ابو ہریرہؓ) کا کہنا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ایسے عابد کی طرح جو عبادت و ریاضت میں سست نہ پڑے یا ایسے روزہ دار کی طرح جو افطار نہ کرے۔'' (بخاری)

آپ کی تشریف آوری سے قبل خواتین کا طبقہ سب سے زیادہ مظلوم اور بے بسی کا شکار تھا، جاہلیت عرب میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب لوگ شرم و عار کی وجہ سے نومولود بچی کو زندہ دفن کر دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنی بیٹیوں کی بہترین تربیت کر کے اور مثالی شفقت دے کر عمدہ نمونہ قائم کیا بلکہ امت کو یہ خوشخبری بھی سنائی۔

''جو دو لڑکیوں کی پرورش اس وقت تک کرے کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن وہ

آئے گا اور (میرے ساتھ جنت میں اس طرح ہوگا) آپؐ نے اپنی دو انگلیوں کا اشارہ فرمایا اور انہیں ملا دیا۔" (مسلم)

ماں کی خدمت کرنے والوں کو جنت کی بشارت دی، فرمایا:

((اَلْجَنَّـةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّھٰتِکُمْ))

"جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔"

پھر ارشاد ہوا کہ "کامل ترین ایمان اس شخص کا ہے جو اخلاق میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ اچھا ہو" اور یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ "میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرتا ہوں۔"

(بخاری)

۲) آپ ﷺ کی سیرت طیبہ صرف اہل عرب کے لیے نہیں بلکہ اس کی روشنی سے پوری نسل انسانیت فیض یاب ہوئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد گرامی ہے:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِلنَّاسِ﴾

"(اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام نسلِ انسانیت کے لیے (بشیر و نذیر) بنا کر بھیجا ہے۔"

اور جس طرح آفتابِ دنیا کو ربِ کائنات نے اس مادی دنیا کے لیے بنایا، اسی طرح آفتاب رسالت کو روحانی دنیا کے لیے پیدا فرمایا ہے جس سے روح نکھرتی اور سنورتی ہے۔ پھر یہ روح جب نکھر جاتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا قُرب نصیب ہوتا ہے۔ ارشادِ گرامی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ فَضْلًا کَبِیْرًا﴾ (الاحزاب:۳۳/۴۵-۴۷)

"اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ہے، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن آفتابِ (ہدایت) بنا کر بھیجا ہے، بشارت دے دیجیے، ان لوگوں کو جو (آپ پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔"

انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

﴿لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱/۳۳) درحقیقت تم لوگوں کے لیے رسول اللہﷺ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

لغوی معانی: لَقَدۡ تحقیق، زورِ بیان کے لیے، كَانَ ہونا (كَانَ يَكُوۡنُ، كَوۡنًا) ہونا، لَكُمۡ (لَ. كُمۡ) لیے، تمہارے، فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اللہ کے رسول میں، اُسۡوَةٌ نمونہ، حَسَنَةٌ عمدہ، اچھا۔

مولانا محمد یوسف اصلاحی لکھتے ہیں:

''آپ کی سیرت نبیﷺ کی سیرت سے جس قدر مشابہ اور قریب ہے اسی قدر آپ اپنے ایمان واسلام میں سچے اور مخلص ہیں، اسلام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ کی پوری زندگی زیادہ سے زیادہ سیرتِ رسولﷺ کے مطابق ہو اور آپ ہر معاملے میں سنت رسول کی کامل اتباع کریں، نبیﷺ پر نبوت ختم ہوگئی اور اب رہتی زندگی تک کے لیے اللہ تعالیٰ کے بندوں کی فلاح و کامرانی صرف اور صرف آپﷺ کی اتباع اور پیروی میں ہے، رسولﷺ سے تعلق توڑ کر اور آپﷺ کی سنت سے منہ موڑ کر اگر کوئی اللہ کی رضا حاصل کرنے کو ممکن سمجھتا ہے تو وہ زبردست قسم کی جہالت اور فریب میں مبتلا ہے، اللہ کی نظر میں آپ کا کوئی بھی عمل قبول نہیں ہے اگر وہ سنت کے مطابق نہیں۔

آپ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، اس سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن آپ کا یہ ایمان

اور دعوی محبت ہرگز معتبر نہیں ہے اگر آپ نبی ﷺ کی اتباع میں سرگرم نہیں ہیں، آپ کا دعویٰ محبت اسی وقت قابل اعتبار ہوگا جب آپ نبی ﷺ کی اتباع کریں گے۔ آپ کی محبت کے جواب میں اللہ تعالیٰ آپ سے لازماً محبت کرے گا، وہ آپ کے گناہوں کی مغفرت بھی فرما دے گا، اس کے لیے آپ اس کا اپنے عمل سے ثبوت دیں۔ ارشاد گرامی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران:۳/۳۱)

”اے رسولؐ! لوگوں سے کہہ دیجیے، اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، وہ تو بہت ہی معاف کرنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس تعلق باللہ کی کوئی قیمت نہیں جو آپ نے سنتِ رسول سے بے نیاز ہو کر اپنے من مانے طریقے پر اللہ سے قائم کر رکھا ہے، رسول اللہ ﷺ سے بے نیازی رسول ﷺ ہی کی توہین نہیں مالکِ کائنات کی توہین ہے، وہ بھیجے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ اللہ کے اِذن سے ان کی اطاعت کی جائے اور بَرضا و رغبت کی جائے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (النساء:٤/٦٤)

”اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا، اس لیے بھیجا کہ اللہ کے اذن کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔“

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے بغیر رسول پر ایمان بالکل بے معنی ہے، جو لوگ رسول کی اطاعت سے آزاد ہو کر رسول ﷺ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ خود بھی فریب میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی فریب دینا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لانے اور اس کی اطاعت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت کی جائے۔ رسول کی اطاعت ہی دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور رسول ﷺ کی نافرمانی دراصل اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے منکر درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت کے منکر ہیں

اور رسول ﷺ کے حکم اور سنت سے سرتابی کرنے والے دراصل اللہ کے باغی ہیں، اس لیے کہ رسول ﷺ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، صرف اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم:۵۳/۳-۴)

”وہ اپنی خواہشِ نفس سے کچھ نہیں بولتے، یہ تو وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی پیروی اور رسول ﷺ کی اطاعت ہی ایک ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا، اس کے سوا اللہ تعالیٰ کی مرضی پر چلنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:۴/۸۰)

”جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی، اس نے یقیناً اللہ ہی کی اطاعت کی۔“

اور جس نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے تمام معاملات میں حکم تسلیم نہ کیا، وہ ایمان سے محروم ہے اور اللہ نے اپنی باعظمت ذات کی قسم کھا کر کہا ہے کہ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء:۴/۶۵)

”اے رسول، آپ کے رب کی قسم! یہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر آپ جو کچھ فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ آپ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیں۔“

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صرف رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے، رہتی دنیا تک آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ اسی پر ہے کہ رسول ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کی سنت کو آدمی زندگی کے ہر معاملے میں سند مانتا ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے دعوائے ایمان میں صرف وہی لوگ سچے اور مخلص ہیں جو دل و جان سے رسول ﷺ کے فیصلے کو تسلیم کریں اور دل کی پوری آمادگی سے

اس کا اتباع کریں۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر اب موسیٰ بھی آ جائیں اور تم ان کی اتباع اور پیروی کرنے لگو اور میری پیروی چھوڑ دو، تو یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میرا زمانہ نبوت پاتے تو میری ہی پیروی کرتے۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ:

''میری اتباع کے سوا ان کے لیے اور کوئی چارہ کار ہی نہ ہوتا۔'' (مسند احمد، مشکوۃ، باب الاعتصام)

یہ حدیث دوٹوک انداز میں بتاتی ہے کہ اب رہتی دنیا تک اتباع اور پیروی کے لائق صرف اور صرف خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، آج اگر موسیٰ جیسے صاحب شریعت پیغمبر بھی نمودار ہوں تو کسی کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر ان کی پیروی کرے اور خود ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا کہ وہ خاتم المرسلین محمد ﷺ ہی کی اتباع کریں۔

یہ انتہائی خطرناک قسم کی گمراہی ہے کہ آدمی شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر یا رسول ﷺ پر ایمان لائے بغیر بھی اسلام پر عمل کر سکتا ہے اور مسلم و مومن ہو سکتا ہے۔ مومن اور مسلم ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ ﷺ کی اطاعت کرے، اسلام کی اصطلاح میں مسلم وہی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سنت رسول ﷺ کے مطابق کرے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ سیدنا محمد ﷺ سے پہلے رسولوں پر ایمان لانے والے اور ان کی شریعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے سارے لوگ مسلم تھے، لیکن خاتم النبیین محمد ﷺ کی بعثت کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور مسلم ہونے کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی جائے اور آپ ﷺ کی سنت کے مطابق زندگی گزاری جائے، اس شخص کا دعوائے اسلام بالکل باطل ہے جو آپ ﷺ پر ایمان لانے

اور آپ ﷺ کی اطاعت کرنے کا قائل نہ ہو اور اسی طرح اس شخص کا ایمان و اسلام بھی معتبر نہیں ہے جو رسول کو صرف رسول سمجھ لینا ہی کافی سمجھتا ہے اور آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہش اس شریعت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

پس اسلام کی شاہراہ پر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دل میں نبی ﷺ کے لیے بے مثال محبت وعقیدت ہو، ایسی محبت جو دنیا کی ہر محبت پر غالب ہو اور عمل کی زندگی میں اس محبت کی علامت یہ ہے کہ آپ کو سنت رسول ﷺ سے محبت ہو اور آپ کے دل میں رسول ﷺ کی عزت و عظمت اور وفاداری و جاں نثاری کا زبردست جذبہ ہو، رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مطابق اپنی سیرت کو ڈھالنا اور دل و جان سے آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ہی دراصل ایمان و اسلام ہے ۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است''

(شعور حیات)

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عزم، استقلال، شجاعت، صبر، شکر، توکل، رضا تقدیر، مصیبتوں کی برداشت، قربانی، قناعت، استغناء، ایثار، جود وسخا، تواضع و خاکساری، غرض نشیب و فراز اور بلند و پست، تمام اخلاقی پہلوؤں کے لیے جو مختلف انسانوں کو مختلف حالتوں میں اور مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں، ہم کو عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے، مگر وہ کہاں مل سکتی ہیں؟ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہم کو سرگرم شجاعانہ قوتوں کا خزانہ مل سکتا ہے مگر نرم اخلاق کا نہیں، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ہاں نرم اخلاق کی بہتات ہے مگر سرگرم اور خون میں حرکت پیدا کرنے والی قوتوں کا وجود نہیں، انسان کو اس دنیا میں ان دونوں قوتوں کی معتدل

حالت کی ضرورت ہے اوران دونوں قوتوں کی جامع اور معتدل مثالیں صرف پیغمبرِ اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کی سوانح میں مل سکتی ہیں۔

غرض ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طبقۂ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہراور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے، اگر دولتمند ہوتو مکہ کے تاجراور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر بادشاہ ہوتو سلطان عرب کا حال پڑھو، اگر رعایا ہوتو قریش کے محکوم کوایک نظر دیکھو، اگر فاتح ہوتو بدروحنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ۔ اگرتم نے شکست کھائی ہےتو معرکۂ اُحد سے عبرت حاصل کرو، اگرتم استاد اور معلم ہوتو صفہ کی درسگاہ کے معلمِ اقدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہوتو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ اور ناصح ہوتو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگرتنہائی و بےکسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہوتو مکہ کے بے یارومددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگرتم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیراور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہوتو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم ونسق درست کرنا ہے تو بنی نضیر، خیبراور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروباراور نظم ونسق کو دیکھو، اگر یتیم ہوتو عبداللہ وآمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہوتو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگرتم جوان ہوتو مکہ کے اس شریف النفس جوان کی بے داغ سیرت پڑھو۔ اگر سفری کاروبار میں ہوتو بُصریٰ کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو، اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہوتو کعبہ میں نُورِ آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجراسود کو کعبہ کے ایک گوشے میں کھڑا کر کے قبائل کے درمیان صلح وصفائی کا بیج بو رہا ہے۔ مدینہ میں کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظرِ انصاف میں شاہ وگدا اور امیر وغریب برابر تھے۔

اگرتم بیویوں کے شوہر ہوتو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہوتو فاطمہؓ کے باپ اور حسن وحسین کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو

اور کسی حال میں بھی ہو، تمہاری زندگی کے لیے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لیے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد رسول اللہ ﷺ کی جامعیت کبریٰ کے خزانہ میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے، اس لیے طبقۂ انسانی کے ہر طالب اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔'' (خطباتِ مدراس)

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا اتباع ہی کامیابی کا راستہ ہے۔

۲) حقیقی اتباع وہی ہے جس میں آپ ﷺ کی ہر سنت کے ساتھ دل و جان سے محبت کی جائے اور اپنے عمل سے اسے آشکارا کیا جائے، آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

''میری امت کا ہر فرد جنت میں جائے گا مگر وہ شخص محروم رہے گا جس نے انکار کیا۔'' صحابہؓ نے عرض کیا، بھلا ایسا کون شخص ہے جو انکار کرے؟ ارشاد ہوا:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ أَبٰی))

''جو (دل و جان سے) میرے نقش قدم پر چلا وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔'' (ریاض الصالحین، باب المحافظة علی السنة)

آپ ﷺ فرماتے ہیں:

لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَ لَا یَزِیْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ۔

(رواہ الترمذی، کتاب القدر عن رسول اللہ، مشکوٰۃ،الدعوات)

''تقدیر کو دعا کے سوا کوئی چیز نہیں بدلتی اور نیکی کے سوا عمر میں کوئی چیز اضافہ نہیں کرتی۔''

خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الاحزاب:۳۳/۴۰)

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، وہ تو اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

لغوی معانی: مَا نہیں، نافیہ، کَانَ ہے، فعل ماضی واحد مذکر غائب، (کَانَ، یَکُوْنُ) ہونا، مُحَمَّدٌ محمد ﷺ، تَحْمِیْدٌ مصدر سے اسم مفعول واحد مذکر، جس کے معنی ہیں، وہ شخص جس کے اندر بکثرت فضائل اور اوصافِ حمیدہ ہوں، خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصفی اسم گرامی ہے، اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ، تم مردوں میں سے کسی کے والد، اَبَا والد، مضاف، اَحَدٍ کسی کے، مضاف الیہ، مِّنْ رِّجَالِکُمْ تم مردوں میں سے کَانَ کی خبر ہے، وَ لٰکِنْ اور لیکن، وَ عاطفہ ہے جو سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لیے استعمال ہوا، لٰکِنْ، لیکن، حرفِ استدراک کہلاتا ہے۔ رَّسُوْلَ اللّٰهِ اللہ کے رسول ﷺ ہیں، وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اور خاتم الانبیاء ہیں، وَ کَانَ اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ ہے، بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا، ہر چیز کا علم رکھنے والا۔

ڈاکٹر محمد لقمان سلفی لکھتے ہیں:

''منافقین اور بعض دیگر کمزور ایمان والے لوگ زینب سے رسول اللہ ﷺ کی شادی سے

متعلق چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ محمد ﷺ نے زید کی مطلقہ سے شادی کر لی ہے، اسی قولِ قبیح کی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تردید کی ہے کہ یہ بات قابل التفات اس وقت ہوتی جب آپ ﷺ زید کے حقیقی باپ ہوتے، لیکن آپ ﷺ صحابۂ کرام میں سے کسی کے بھی باپ نہیں ہیں تو زید کے بھی باپ نہیں ہیں اور پیار سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے وہ بیٹا نہیں ہو جاتا ہے، آپ ﷺ تو اللہ کے رسول ہیں، دنیا والوں کو اس کا پیغام پہنچاتے ہیں اور نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم ہو گیا ہے، اس لیے کہ آپ کا لایا ہوا دین قیامت تک تمام مسلمانوں کے لیے کافی اور وافی ہے اور قرآن کریم نے انسانی زندگی کے متعلق تمام احکام و آداب کو بدرجۂ اتم بیان کر دیا ہے۔" (تیسیر الرحمن لبیان القران)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"اس آیتِ مبارکہ میں لوگوں کو منع کیا گیا ہے کہ آئندہ زید بن محمد ﷺ نہ کہنا۔ آپ ﷺ زید کے باپ نہیں ہیں۔ گو آپ نے اسے بیٹا بنا لیا ہے (اور یہ محبت اور شفقت سے ایسا ہوا) رحمت عالم ﷺ کے ہاں بیٹے تو ہوئے مگر وہ کم سنی ہی میں فوت ہو گئے، ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا سے قاسم، طیب، طاہر تین بیٹے ہوئے، مگر تینوں ہی کم سنی میں فوت ہو گئے، پھر ام المومنین ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے ابراہیم پیدا ہوئے، وہ بھی مدتِ رضاعت ہی میں فوت ہو گئے، رحمت عالم ﷺ کی بی بی خدیجہؓ سے چار صاحبزادیاں تھیں۔ زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ الزہرا، تین صاحبزادیاں تو آپ کی زندگی ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئیں، صرف فاطمہؓ کے بعد آپ کی وفات کا صدمہ اٹھانے کے لیے چھ ماہ تک زندہ رہیں۔"

(تفسیر سراج المنیر، تلخیص ابن کثیر)

لفظِ خاتم کی لغوی تشریح:

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

"خاتم مہر کو کہتے ہیں اور مہر آخری عمل ہی کو کہا جاتا ہے، یعنی آپ ﷺ پر نبوت و رسالت کا خاتمہ کر دیا گیا، آپ ﷺ کے بعد جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا، وہ نبی نہیں کذّاب و دجّال

ہوگا، احادیث میں اس مضمون کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس پر پوری امت کا اجماع و اتفاق ہے، قیامت کے قریب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا جو صحیح و متواتر روایات سے ثابت ہے تو وہ نبی کی حیثیت سے نہیں آئیں گے بلکہ نبی ﷺ کے امتی بن کر آئیں گے، اس لیے ان کا نزول عقیدہ ختم نبوت کے منافی نہیں ہے۔'' (احسن البیان)

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''آپ ﷺ کو خاتمِ نبوت اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ نے نبوت کو اپنے تشریف لانے سے ختم اور مکمل کر دیا۔'' (مفردات القرآن)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''صفت خاتم الانبیاء ایک ایسی صفت ہے جو تمام کمالاتِ نبوت و رسالت میں آپ ﷺ کی اعلیٰ فضیلت اور خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے، کیونکہ عموماً ہر چیز میں تدریجی ترقی ہوتی ہے اور انتہا پر پہنچ کر اس کی تکمیل ہوتی ہے، جو آخری نتیجہ ہوتا ہے وہی اصل مقصود ہوتا ہے، قرآن کریم نے خود اس کو واضح کر دیا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ ۵:۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو (ہمیشہ کے لیے) مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

انبیائے سابقین کے دین بھی اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے مکمل تھے، کوئی ناقص نہ تھا، لیکن کمالِ مطلق اسی دینِ مصطفوی ﷺ کو حاصل ہوا، جو اولین و آخرین کے لیے حجت اور قیامت تک چلنے والا دین ہے۔ خاتم النبیین نے یہ بھی بتا دیا کہ آپ کے بعد قیامت تک آنے والی سب نسلیں اور قومیں آپ ہی کی امت میں شامل ہوں گی (جو بھی ایمان اور اسلام سے بہرہ ور ہوں گی) اس وجہ سے آپ ﷺ کی امت کی تعداد بھی دوسری امتوں سے زیادہ ہوگی (اور امت کا ہر فرد آپ کی روحانی اولاد میں شامل ہوگا) اور آپ ﷺ کی

روحانی اولاد دوسرے انبیاء کی نسبت سے بھی زیادہ ہو گی۔

''آیت مبارکہ'' میں ﴿وَلٰكِن رَّسُوْلَ اللهِ﴾ محمد رسول اللہ ﷺ کا ذکر بصفت رسول آیا ہے، اس کے لیے بظاہر مناسب یہ تھا کہ آگے 'خاتم الرسل'، 'خاتم المرسلین' کا لفظ استعمال ہوتا مگر قرآن حکیم نے اس کے بجائے خاتم النبیین کا لفظ اختیار فرمایا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک نبی اور رسول میں ایک فرق ہے، وہ یہ کہ نبی تو ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو حق تعالیٰ اصلاحِ خلق کے لیے منتخب فرمائیں، خواہ اس کے لیے کوئی مستقل کتاب اور مستقل شریعت تجویز کریں یا پہلے ہی کسی نبی کی کتاب وشریعت کے تابع لوگوں کو ہدایت کرنے پر مامور ہو، جیسے سیدنا ہارون علیہ السلام، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی کتاب و شریعت کے تابع ہدایت کرنے پر مامور تھے اور لفظ رسول خاص اس نبی کے لیے بولا جاتا ہے جس کو مستقل کتاب وشریعت دی گئی ہو، اس طرح لفظ نبی کے مفہوم میں بہ نسبت لفظ رسول کے عموم زیادہ ہے، تو آیت کا مفہوم کہ آپ ﷺ انبیا کے ختم کرنے والے ہیں اور سب سے آخر میں ہیں، خواہ وہ صاحبِ شریعت نبی ہوں یا صرف پہلے نبی کے تابع ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی جتنی قسمیں اللہ کے نزدیک ہوسکتی ہیں وہ سب آپ ﷺ پر ختم ہوگئیں، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہ ہوگا۔'' (معارف القرآن)

قرآن وحدیث سے ختم نبوت کا استدلال:

رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا﴾

(الفرقان:۲۵/ ۱)

''بہت بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر فرقان اتارا تاکہ وہ تمام اہل عالم کو ڈرائے۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اس سے بھی معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عالم گیر ہے اور آپ تمام انسانوں

اور جنوں کے لیے ہادی اور رہنما بنا کر بھیجے گئے ہیں جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ (الاعراف:۷/۱۵۸)

اے پیغمبر! فرما دیجیے ’’لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں۔‘‘

پھر ارشاد ہوا:

﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ (سبا:۳۴/۲۸)

اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپؐ کو نسلِ انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا (تاکہ لوگوں کو جنت کی خوشخبری دیں اور جہنم سے ڈرائیں)۔

اور یہ بھی فرمایا:

﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانبیآء:۲۱/۱۰۷)

’’اور (اے نبیؐ) ہم نے آپؐ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔‘‘

مندرجہ بالا آیاتِ مبارکہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت نسلِ انسانی کے لیے قائم و دائم ہے۔

پھر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا جو خاتم الانبیا محمد ﷺ پر نازل کی گئی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ فرما دیا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۱۵/۹)

’’ہم ہی نے اس قرآن کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔‘‘

(رب کریم کا فرمان ہے) کہ قرآن حکیم کو دست بردِ زمانہ سے اور تحریف وتغیر سے بچانا یہ ہمارا کام ہے، چنانچہ یہ کتاب مبین، فرقان حمید آج تک اسی طرح محفوظ ہے جس طرح محمد ﷺ پر نازل کی گئی تھی، گمراہ فرقے اپنے اپنے گمراہانہ عقائد کے اثبات کے لیے اس کی آیات میں معنوی تحریف تو کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں لیکن پچھلی کتابوں کی طرح یہ لفظی تحریف اور تغیر سے محفوظ ہے، علاوہ ازیں اہل حق کی ایک جماعت بھی تحریفاتِ

معنوی کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہر دور میں موجود رہی ہے، جوان گمراہانہ عقائد اور غلط استدلال کے تار و پود بکھیرتی رہی ہے اور آج بھی وہ اس محاذ پر سرگرم عمل ہے، علاوہ ازیں قرآن کو یہاں 'الذکر' نصیحت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے اہل جہاں کے لیے 'ذکر' (یاد دہانی اور نصیحت) کے پہلو کو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کے تابندہ نقوش اور آپ کے فرمودات کو بھی محفوظ کر کے قیامت تک کے لیے باقی رکھا گیا ہے، گویا قرآن کریم اور سیرتِ نبوی ﷺ کے حوالے سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کا راستہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہوا ہے، یہ شرف اور یہ محفوظیت کا مقام پچھلی کسی بھی کتاب اور رسول کو حاصل نہیں ہوا۔ (احسن البیان)

ان احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے:

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ تمام کتب حدیث میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اسناد صحیح کے ساتھ آتی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک مکان بنایا ہو اور اس کو خوب مضبوط اور مزین کیا ہو مگر اس کے ایک گوشہ میں دیوار کی ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو، تو لوگ اس کو دیکھنے کے لیے اس میں چلیں پھریں اور اس کی تعمیر کو پسند کریں مگر سب یہ کہیں کہ اس مکان بنانے والے نے یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی جس سے تعمیر مکمل ہو جاتی، جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (قصرِ نبوت کی) وہ آخری اینٹ میں ہوں اور بعض الفاظ حدیث میں ہے کہ میں نے اس خالی جگہ کو پر کر کے قصرِ نبوت کو مکمل کر دیا۔ (معارف القرآن)

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام خود انبیاء کے ہاتھ میں تھا جب ایک نبی کی وفات ہوتی تو دوسرا نبی اس کے قائم مقام ہو جاتا تھا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ میرے

خلیفہ ہوں گے جو بہت ہوں گے۔" (بحوالہ معارف القرآن)

صحیح مسلم کتاب المساجد میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((وَ خُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ))

"اور مجھ پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا۔"

سنن دارمی میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ وَ لَا فَخْرَ))

"اور میں سلسلۂ نبوت میں آخری نبی ہوں اور اس پر کوئی فخر نہیں۔"

(بحوالہ سیرت النبی، سید سلمان ندوی، جلد سوم)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"ختمِ نبوت کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث ہیں، اللہ کی اپنے بندوں پر یہ زبردست نعمت ہے کہ اس نے ان کی طرف رحمۃ للعالمین ﷺ کو بھیجا اور آپ کو خاتم الانبیاء بنایا اور آپ کے لیے توحید والا دین مکمل بنایا، اللہ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں اور اس کے رسول ﷺ نے احادیث متواترہ میں صاف صاف بتا دیا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تاکہ امت کو معلوم ہو جائے کہ آپ ﷺ کے بعد قیامت تک جو شخص نبوت کا دعوی کرے وہ جھوٹا، کذاب، مفتری اور دجال ہے، خود بھی گمراہ ہے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر رہا ہے، اگرچہ وہ شعبدے، کمالات، طلسمات اور کرتب دکھائے اور دیگر حیرت انگیز باتوں کا اظہار کرے، اہل علم و دانش خوب جانتے ہیں کہ یہ سب دھوکا، فریب، مکاری، عیاری، چال بازی اور سراسر گمراہی ہے۔" (سراج المنیر، تلخیص تفسیر ابن کثیر)

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) ختم نبوت سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ دین جس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے رب کائنات کی طرف سے ہزاروں انبیاء تشریف لائے، اب تکمیل و اتمام کی اس منزل تک پہنچ گیا کہ اس کے آگے رشد و ہدایت کی اور کوئی منزل ہی نہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ نے صلاح وفلاح اور رشد و

ہدایت کے وہ تمام طریقے اور پیمانے متعین فرما دیے جن سے نسلِ انسانی قیامت تک فیض یاب ہوتی رہے گی اور ''الدین'' زندگی گزارنے کے سنہری اصولوں کی تکمیل کی بشارت قرآن حکیم نے دے دی۔

۲) کلمۂ طیبہ پر غور کر لیجیے کہ 'لا اِلٰہ اِلاّ اللہ' میں رب کائنات کی وحدانیت کا صدقِ دل سے اقرار ہے تو محمد رسول اللہ ﷺ میں اس آخری رسول کی رسالت پر سچائی سے یقین بھی ہے کہ اس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی ہے، اور یہ اعلان دنیا بھر کی مساجد سے دن میں پانچ مرتبہ ضرور ہوتا ہے، کیا یہ اس بات کا زندہ ثبوت نہیں ہے:

﴿وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ﴾ (الا تشراح:٩٤/٤)

''اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا۔''

جب سے اذان کا سلسلہ شروع ہوا ہے، تواتر کے ساتھ یہ عمل جاری و ساری ہے اور جہاں جہاں اسلام کی آواز پہنچ رہی ہے، مسلمانوں کی ہر چھوٹی بڑی مسجد میں صبح و شام یہ صدا گونجتی ہے اور یہی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی، غلاموں کا مولا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾

(آل عمران:۳/۱۵۹)

”(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ ان لوگوں کے لیے بہت نرم خو ہیں، اگر آپ ترش رو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، سو آپ ان سے درگزر فرمایے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کیجیے اور دین کے کام میں ان سے مشورہ لیتے رہیے، پھر آپ کا عزم کسی بھی (امرِ خیر) میں مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کر کے اس کو سرانجام دینے میں (پورے صبرو ثبات سے) کمر بستہ ہو جایے اور (یقین جانیے) کہ اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

<u>لغوی معانی:</u> فَبِمَا (فَ.بِمَا) پس، ساتھ، رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ، اللہ تعالیٰ کی رحمت (کے ساتھ)، لِنْتَ نرم خو ہیں آپ، لِيْنٌ، (نرمی) مصدر سے صیغہ واحد مذکر حاضر (لَانَ، يَلِيْنُ، لَيْنًا وَ لَيَانًا) نرم خو ہونا (القاموس الوحید)، لَهُمْ (لَ.هُمْ) لیے، اُن کے، هُم ضمیر جمع مذکر غائب، لوگوں کی طرف جاتی

ہے، وَلَوْ اور اگر، کُنْتَ آپ ہوتے، فعل ماضی واحد مذکر حاضر (کَانَ، یَکُوْنُ، کَوْنًا و کِیَانًا) ہونا، فَظًّاً تُرش رو، (فَظَّ، یَفَظُّ، فَظَظًا وَ فَظَاظَةً) سخت مزاج، بدخلق ہونا، اَلْفَظُّ اکھڑ مزاج اور سخت کلام آدمی کو کہتے ہیں، اَلْفَظَاظَةُ، بدخلقی، سخت کلامی (القاموس الوحید) غَلِیْظَ الْقَلْبِ، سخت دل (غَلُظَ، یَغْلُظُ، غِلَظًا وَ غِلْظَةً) سخت ہونا، کہا جاتا ہے:

غَلُظَ الْخُلُقِ وَالطَّبْعِ وَالْقَوْلِ وَالْفِعْلِ وَالْعَیْشِ' عادت، مزاج، قول و فعل اور زندگی سخت ہونا۔ (القاموس الوحید)

لَ البتہ (تاکیدی معنی دیتا ہے)، انْفَضُّوْا، بھاگ جاتے، فعل ماضی جمع مذکر غائب (اِنْفَضَّ، یَنْفَضُّ، اِنْفِضَاضًا) منتشر ہونا، مِنْ حَوْلِکَ، آپ کے اردگرد سے، مِنْ حروف جارہ میں سے ہے جو اپنے بعد والے حرف کو عموماً زیر دیتے ہیں، حَوْل (ارد گرد) مضاف 'ک' ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، یعنی اگر آپ ترش رو اور سخت مزاج ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، فَاعْفُ عَنْهُمْ سو آپ ان سے درگزر فرمایئے، 'ف' پس (سو) عَفْوٌ مصدر سے اُعْفُ فعل امر واحد مذکر، آپ درگزر فرمایئے، عَنْهُمْ (عَنْ. هُمْ) سے، ان، یعنی ان لوگوں سے، هُم کی ضمیر جمع مذکر غائب لوگوں کی طرف جاتی ہے۔ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کیجیے، (اِسْتَغْفَرَ، یَسْتَغْفِرُ، اِسْتِغْفَارًا) اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی طلب کرنا، اس سے فعل امر واحد مذکر اِسْتَغْفِرْ، اللہ سے معافی طلب کیجیے، لَهُمْ (لَ. هُمْ) ان، کے لیے 'هُم' کی ضمیر جمع مذکر غائب لوگوں کی طرف جاتی ہے۔ وَ شَاوِرْهُمْ اور ان (یعنی صحابۂ کرامؓ) سے مشورہ لیتے رہیے، (شَاوَرَ، یُشَاوِرُ، مُشَاوَرَةً) مشورہ کرنا، رائے لینا، اس سے فعل امر واحد مذکر مخاطب ہے 'شَاوِرْ' مشورہ کیجیے، فِی الْاَمْرِ، سیاسی اور ملکی معاملات میں، امور خیر میں، فَاِذَا پس جس وقت، جب، عَزَمْتَ آپ پختہ ارادہ کرلیں، فعل ماضی واحد مذکر مخاطب، عزم کرنا، فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ پس توکل کیجیے اللہ تعالیٰ پر (تَوَکَّلَ، یَتَوَکَّلُ) بھروسا کرنا، توکل

نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ وعزم اور تدبیر وکوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ہی کامیاب فرمائے گا۔

(سیرت النبی، جلدپنجم)

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ﴾

بلاشبہ اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

ربط کلام:

غزوۂ احد میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابۂ کرامؓ کو درّہ پر نگرانی کے لیے مقرر فرمایا تھا اور انہیں تاکید کی گئی تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اس درّہ کی نگرانی کو نہ چھوڑیں، مسلمانوں کو فتح یاب ہوتے دیکھ کر نگرانی کرنے والوں کی اکثریت مورچہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے دوڑ پڑی جس سے جنگ کا رخ پلٹ گیا، دشمن پلٹ کر اسی درے سے حملہ آور ہوئے، فتح عارضی طور پر شکست میں تبدیل ہوگئی اور کئی جلیل القدر صحابۂ کرام نے جامِ شہادت نوش کیا، خود رسول اللہ ﷺ زخمی ہو گئے اور افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس پریشانی میں کئی صحابہؓ میدان جنگ سے نکل گئے، حقیقت حال معلوم ہونے پر بکھرا ہوا مسلمانوں کا لشکر پھر اکٹھا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح سے ہمکنار فرمایا۔

مولانا محمد جمیل لکھتے ہیں:

”درّے والوں کا درّہ خالی کرنا، گھمسان کے رن میں صحابہؓ کی اکثریت کا آپ ﷺ کو تنہا چھوڑ جانا، اس قدر ذاتی اور جماعتی نقصان کا اٹھانا، ان میں کوئی ایک معاملہ بھی قائد کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایسے موقع پر بڑے سے بڑے بہادر اور حوصلہ مند انسان کا پتہ پانی ہو جایا کرتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اشتعال، خفگی اور ترش کلامی کا مظاہرہ نہیں فرمایا، بلکہ نہایت حوصلے اور اعلیٰ اخلاق کے ساتھ حالات پر کنٹرول کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خراجِ تحسین سے نوازتے ہوئے فرمایا کہ میرے رسول! یہ صرف آپ کے رب کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے کہ آپ بردبار، رحمدل، نرم خو اور اعلیٰ اخلاق کے پیکر ہیں،

اگر آپ سخت خو، جذباتی، ترش کلام اور بد مزاج ہوتے تو یہ لوگ نفرت کھا کر آپ سے دور بھاگ جاتے، لہٰذا پاکیزہ اخلاق کا تقاضا ہے کہ انہیں دل سے معاف فرما دیجیے اور اپنے رب کے حضور ان کی معافی کی درخواست کیجیے، یہ نہیں کہ پہلے مشورہ کرنے سے نقصان ہوا ہے اور آئندہ مشورہ کرنے سے آپ احتراز کریں بلکہ یہ مشاورت جاری رہنی چاہیے۔

(فهم القرآن)

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ اللہ کی رحمت تھی جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے شامل حال تھی کہ رب کریم نے آپ کو لوگوں کے لیے رحیم و شفیق، نرم خو اور نرم مزاج بنا دیا، اسی نرم مزاجی کے باعث آپ نے ان سے باز پرس نہ کی، اگر آپ سنگ دل اور سخت مزاج ہوتے تو یہ جمعیت منتشر ہو جاتی، لوگوں کے خیالات آپ کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوتے۔ عوام الناس کو تو ایک پر شفقت بارگاہ درکار ہوتی ہے، جہاں اُن کے ساتھ نہایت رعایتی برتاؤ کیا جاتا ہو، جہاں خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا جاتا ہو، جہاں سے انہیں محبت ملتی ہو، جہاں ان کی غلطیوں، کمزوریوں، کوتاہیوں اور لاپرواہیوں سے درگزر کیا جاتا ہو، جہاں قائد اتنے بڑے دل کا مالک ہو کہ وہ انہیں سب کچھ دے رہا ہو لیکن ان سے کچھ نہ لے رہا ہو، جہاں قائد اپنے پیروکاروں کی مشکلات اپنے سر لیتا ہو لیکن ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالتا ہو اور جہاں پیروکاروں کو ہمیشہ رعایت، اہمیت، خندہ پیشانی، نرمی، محبت اور رضامندی ملتی ہو اور جناب رسول اللہ ﷺ کا دل ایسا ہی دل تھا اور آپ ﷺ کا برتاؤ لوگوں کے ساتھ بعینہ ایسا ہی تھا، کبھی وہ اپنی ذات کے حوالے سے کسی پر غصے نہیں ہوئے، کبھی بھی انسانی کمزوری کی وجہ سے آپ نے تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کبھی آپ ﷺ نے اس دنیا کے مفادات میں سے کسی مفاد کو اپنی ذات کے لیے مخصوص نہیں کیا، بلکہ آپ کو جو کچھ بھی ملا آپ نے کھلے ہاتھوں سب کچھ ان میں تقسیم کر دیا، غرض آپ کے صبر، حلم، ہمدردی، محبت اور شرافت نے ہمیشہ انہیں ڈھانپے رکھا اور ان میں سے جس نے بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یکجا زندگی کے کچھ دن

گزارے یا آپ کو محض ایک نظر دیکھ ہی لیا، وہ آپ کا گرویدہ ہو گیا، اس لیے کہ رب کریم نے آپ کو خلقِ عظیم سے نوازا اور رحمتوں اور شفقتوں سے بھرا دل عطا فرمایا۔

(فی ظلال القرآن)

قرآن وحدیث میں نرم دلی کی تعلیمات:

معاشرتی زندگی کا حسن آپس کے معاملات میں نرمی اور خوش اخلاقی میں مضمر ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ نرم اور شیریں گفتگو، نرم رویہ اور برتاؤ، نرمی اور خوش اسلوبی سے اپنے مطالبات منوانا، نرمی اور خندہ پیشانی سے دوسروں کے سوالات کا جواب دینا اور ایسا طرز اختیار کرنا کہ لوگوں کے دلوں کو موہ لیا جائے، یقیناً یہ طریق کار دشمن کو بھی دوست بنا سکتا ہے، قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾

(حٰمٓ السجدہ ۴۱:۳۴)

”آپ بدی کو اُس نیکی سے دفع کیجیے جو بہترین ہو، پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔“

اور اس طرح بھی ابرار وصالحین کی مدح سرائی کی گئی ہے:

﴿وَ الْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

(آل عمران:۳/۱۳۴)

”جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔“

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ (الاعراف:۷/۱۹۹)

”(اے نبیؐ!) نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کیجیے۔“

اور جو لوگ مصائب میں صبر کرنے اور دوسروں کو معاف کر دینے کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کی تعریف اس طرح فرمائی گئی ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (الشوری:۴۲/۴۳)

''اورجس نے صبر کیا اور دوسروں کو (ان کی دل آزاریوں پر) معاف کردیا تو یقیناً یہ اولوالعزمی کے کام ہیں۔''

اس صفت کا بدرجہ اتم ظہور رب کائنات سے ہوتا ہے کہ وہ بندوں پر ان کی خطاؤں اور گناہوں کے باعث فوری گرفت نہیں کرتا، انہیں اپنی کتاب مبین میں انتہائی محبت اور مہربانی سے سمجھاتا ہے، اپنے لطف وکرم، انعامات واحسانات یاد دلاتا ہے، کتاب کے آغاز ہی سے اس کی رحمتوں اور بخششوں کا مژدۂ جانفزا ملتا ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

''اس اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جس کی رحمتوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اور جس کی مہربانیاں اپنے بندوں پر ہمیشہ جاری وساری رہتی ہیں۔''

کہیں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (آل عمران:۳/۳۰)

''اوراللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔''

اورکہیں اُس کے لطف وکرم کا بیان اس طرح ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ﴾ (الشوری:۴۲/۱۹)

''اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔''

اوراس مہربان رب کی رحمت کا کیا ٹھکانا وہ تو ہر شے پر چھائی ہوئی ہے:

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف:۷/۱۵۶)

''اورمیری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔''

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ نرمی اور رحمدلی کا ظہوراس کے بندوں میں بھی ہونا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (النور:۲۴/۲۲)

''(لوگوں کو چاہیے) کہ اپنے (بھائی بندوں) کو معاف کردیں اور ان سے درگزر کریں

(ان کے ساتھ نرمی اور مروت کا معاملہ کریں) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں بھی معاف کر دے اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔"

اب ذرا اِن احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے۔

اُمّ المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْاَمْرِ كُلِّهٖ)) (متفق عليه، رياض الصالحين، باب الرِّفقِ)

"بے شک اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور وہ ہر کام میں نرمی کو پسند فرماتا ہے۔"

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَسِّرُوْا وَ لَا تُعَسِّرُوْا، وَ بَشِّرُوْا وَ لَا تُنَفِّرُوْا)) (حواله ايضاً)

"آسانی پیدا کرو، سختی نہ کرو، بشارت دو، نفرت نہ دلاؤ۔

اس نیلگوں آسمان کے نیچے انبیاء علیہم السلام وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہترین صبر و تحمل اور حلم و بردباری کے وصف سے نوازا ہے اور پھر درجہ بدرجہ یہ خوبی ابرار و صالحین میں پائی جاتی ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾ (التوبہ:۸/۱۱٤)

"بلاشبہ ابراہیم نرم دل و بردبار تھے۔"

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سعادت مند اور بردبار فرزند کی اس طرح خوشخبری دی گئی:

﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ (الصّافات:۳۷/۱۰۱)

"تو ہم نے ان (سیدنا ابراہیم) کو ایک بردبار فرزند (اسماعیل کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی۔"

سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کی سختی اور شقاوتِ قلبی کے باعث بہت سے مصائب و مشکلات سے گزرے اور صبر و تحمل سے یہ تمام وقت گزارا، اللہ تعالیٰ نے مصر میں انہیں بلند مرتبے پر سرفراز کیا، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ بھائی ان کے دربار میں کھڑے تھے اور سیدنا یوسف علیہ السلام کے لبوں پر یہ کلمات تھے:

﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (یوسف:۱۲/۹۲)

''آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔''

خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا حلم اور بردباری، نرمی اور شفقت اپنی مثال آپ ہے۔ قریش مکہ جنہوں نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مسلسل تیرہ برس ہر قسم کی تکلیفیں اور اذیتیں دیں، فتح مکہ پر آپ نے ان سب کو معاف فرما دیا اور وہی الفاظ دہرائے جو سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہے تھے۔

پھر غور کیجیے! جب آپ ﷺ دعوت و تبلیغ کی غرض سے طائف تشریف لے گئے تو اہل شہر نے آپ پر پتھر برسائے، جسدِ اطہر سے خون بہہ رہا ہے مگر لبوں پر ان لوگوں کے لیے دعائے خیر کے کلمات جاری و ساری ہیں ۔

سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں و بصیرتیں

۱) انسان میں جو بھی خوبی کی بات ہو وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوتا ہے، خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے نرمی اور حسنِ اخلاق سے بدرجہ اتم نوازا تھا اور یہ بات ہر رہبر اور رہنما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی میں لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے۔

۲) نرمی اور لطافت ہر داعی اور مبلغ کے لیے بھی ضروری ہے کہ دعوتِ حق اس کے بغیر موثر نہیں ہو سکتی، غور کیجیے! سیدنا موسیٰؑ اور سیدنا ہارونؑ کو اللہ تعالیٰ نے فرعون جیسے ظالم بادشاہ کے پاس دعوت حق کے لیے جانے کو کہا تو ساتھ ہی تاکید کر دی:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (طه: ۲۰/۴۴)

''دیکھو! اسے نرم لب ولہجہ میں کہنا، شاید وہ تمہاری نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔''

۳) اسلامی حکومت کے لیے مجلس شوریٰ کا قیام لازمی ہے، دیکھیے کہ نبی ﷺ کی رہبری اور رہنمائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، مگر پھر بھی حکم ہوتا ہے: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ یعنی آپ صحابہؓ کرامؓ سے مشورہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے درجہ بدرجہ انسانوں کو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کی اچھی رائے سود مند ثابت ہو۔

۴) توکل بے دست و پائی کا نام نہیں ہے، بلکہ ہمت و حوصلے سے انسان سعی و کوشش کو بروئے کار لائے اور پھر اللہ تعالیٰ سے اس کی مدد اور اس کی رحمت کا متلاشی ہو۔ عزم اور توکل کا تعلق چولی دامن کا سا ہے، عزم اگر نیک ارادہ ہے تو اس کے ساتھ کوشش لازمی امر ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَ صِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ وَ غِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَ فِرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَ حَيٰوتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ (مشکوۃ، کتاب الرقاق)

حالی مرحوم نے اس حدیث مبارک کا ترجمہ کتنا عمدہ کیا ہے۔

غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے
فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی بڑھاپے کی زحمت سے پہلے
اقامت مسافر کی رحلت سے پہلے
فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت
جو کرنا ہے کر لو تھوڑی ہے مہلت

سراجاً منیراً صلی اللہ علیہ وسلم

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًاۙ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا﴾

(الاحزاب:۳۳/۴۵-۴۷)

’’(اے نبی!) حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپ کو شاہد اور بشارت دینے والا اور (منکرین حق کو عذاب آخرت سے) ڈرانے والا، نیز اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور آپ کو ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے، اور (اے نبی!) مومنوں کو خوشخبری دے دیجیے کہ یہ ان پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:

’’شَاهِدًا: گواہی دینے والا، شہادت اور گواہی کا مدار مشاہدہ پر ہوتا ہے، یعنی قیاس اور گمان و تخمینہ کی بنا پر گواہی نہیں دی جاتی، بلکہ گواہی اس چیز کی دی جاتی ہے جو خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو یا اپنے کانوں سے سنی ہو، یہی وجہ ہے کہ شاہد کو اس چیز کا یقین ہوتا ہے جس کی وہ شہادت دے رہا ہے، اگر یقین نہ ہو محض گمان اور قیاس ہو تو شہادت دینا صحیح نہیں ہے، پس یہ لفظ ’’شاہد‘‘ ایک فلسفی اور نبی میں امتیاز پیدا کر دینے والا ہے۔

فلسفی کے پاس ایمان و یقین نہیں ہوتا، فلسفی کا سرمایہ محض فکر ہوتا ہے یا تجربہ۔ غور و خوض یا تجربہ سے جو نتیجہ برآمد ہو، اس پر اس کا یقین نہیں ہوتا کہ وہ قسم کھا سکے۔

اس کے برعکس نبی اس عالم کے فنا ہونے، قیامت اور محشر کے برپا ہونے پر قسم کھا سکتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس عالم کا آخری انجام قیامت ہے۔

فلسفی کے قیاس اور فکر میں اس عالم کا جو انجام بھی ہو وہ اس پر قسم نہیں کھا سکتا کیونکہ اس کے پاس یقین کی مضبوطی اور ایمان کی روشنی نہیں ہے، اس کے پاس ظن اور گمان ہے۔ وہ تخمینہ اور اندازہ سے یہی کہے گا، میری تحقیق یہ ہے، ممکن ہے غلط ہو، چونکہ فلسفی نورِ یقین سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے نظریہ کی دعوت بھی نہیں دیتا اور خود اس کا حوصلہ بھی پست رہتا ہے، نہ اس میں ذوقِ ایثار ہوتا ہے، نہ شوقِ فدائیت اور نہ جذبۂ قربانی۔ اس کے برخلاف نبی جو کچھ کہتا ہے، وہ شرح صدر سے کہتا ہے، کیونکہ اس کے پاس یقین کا نور اور ایمان کی روشنی ہوتی ہے، وہ علم اور انکشاف کے اس روشن مینارہ پر ہوتا ہے جہاں سے وہ غنیم کی فوجوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے جبکہ اہل شہر کو غنیم کا تصور بھی نہیں ہوتا۔

پھر غور کیجیے کہ فلسفی نے اگر کسی طرح اندازہ لگا لیا ہو کہ دشمن کی فوجیں قریب آ گئی ہیں اور اس اندازہ کے عقلی دلائل بھی اس کے پاس ہوں، تب بھی وہ اپنے اندر وہ جذبہ نہیں پاتا جو اس کو قربانی پر آمادہ کر دے، نہ اس کے دل میں وہ دہشت ہوتی ہے جو اس کو بے چین اور مضطرب کر دے کیونکہ اس کا یہ اندازہ تذبذب کی دلیل سے پاک اور آزاد نہیں ہوتا۔

جو شخص اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے کہ آگ کی خندق اس کے سامنے ہے اور وہ اس کے کنارے اس طرح کھڑا ہے کہ آگے قدم بڑھاتا ہے تو وہ ٹھیک خندق میں جاتا ہے، وہ صرف اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے نہیں روکے گا بلکہ وہ پوری قوت صرف کر دے گا کہ وہ اپنی جگہ جما رہے۔ اس کا قدم آگے نہ بڑھ سکے اور جس قوت سے وہ اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے روکے گا، اتنی ہی قوت سے وہ دوسروں سے بھی اصرار کرے گا کہ اس کی طرف نہ بڑھیں، اگر اس کو مزاحمت کرنی پڑے تو وہ مزاحمت میں کمی نہیں کرے گا، یہاں تک کہ اگر اس مزاحمت میں اس کی جان بھی جاتی رہے تو وہ اس کو شہادت سمجھے گا کہ اس نے بے شمار مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کی اور اپنی ایک جان دے کر بہت سی جانیں بچا لیں۔

یہ جذبہ، یہ جوش اور یہ ولولہ فلسفی میں نہیں ہوتا، جبکہ نبی ہر آن اور ہر لمحہ اس جذبہ سے سرشار رہتا ہے۔ لفظ 'شاہد' نے جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کے یقین کامل اور ایمان مکمل کی خبر دی ہے، اس نے یہ بھی بتا دیا کہ داعی کے لیے لازم ہے کہ اس کے پاس وثوق کامل اور اعتماد ہو اور وہ متاعِ یقین کا سرمایہ دار ہو۔ (سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ)

یہی یقین کامل اس شہادت کی بنیاد ہوگا جس کا ذکر اس آیت مبارکہ میں ہے:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (النساء: ٤/ ٤١)

اس آیت مبارکہ پر حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''ہر اُمت میں سے اس کا پیغمبر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گواہی دے گا کہ یا اللہ! ہم نے تو تیرا پیغام اپنی قوم کو پہنچا دیا تھا، جب انہوں نے نہیں مانا تو ہمارا کیا قصور؟ پھر اِن سب پر نبی کریم ﷺ گواہی دیں گے کہ یا اللہ! یہ سچے ہیں، آپ ﷺ یہ گواہی اس قرآن کی وجہ سے دیں گے جو آپ ﷺ پر نازل ہوا اور جس میں گزشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کی سرگزشت بھی حسبِ ضرورت بیان کی گئی ہے، یہ ایک سخت مقام ہوگا، اس کا تصور ہی لرزہ براندام کر دینے والا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن سننے کی خواہش ظاہر فرمائی، وہ سناتے ہوئے جب مذکورہ آیت پر پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''بس اب کافی ہے۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا تو آپ ﷺ کی دونوں آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔'' (احسن البیان)

مُبَشِّرًا: بشارت دینے والا، لفظ بشارت بشرہ سے ماخوذ ہے، کھال کے بیرونی اور ظاہر حصہ کو بَشرہ کہتے ہیں، غیر معمولی خبر کا اثر بَشرہ ہی پر پڑتا ہے، خوشی کی خبر سے بشرہ کھل جاتا ہے اور رنج کی خبر سے ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں، بسا اوقات بشرہ کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ ایمان لانے والوں کو یہ بشارت دیتے ہیں کہ ان کے مصائب کے بادل چھٹ جانے والے ہیں اور عنقریب اللہ تعالیٰ مومنوں کو اپنی فتح و نصرت سے سرفراز فرمائے گا اور مرنے کے بعد انہیں جنت اور اس کی نعمتیں میسر آنے والی ہیں۔'' (تیسیر القرآن)

نَذِیْرًا: مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنے والا، یہ دونوں لفظ ''مُبشرًا اور نذیرًا'' اس دعوت کی عظمت و اہمیت کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں، یعنی اس کو مان لینا غیر معمولی خیر و برکت کا ذریعہ ہوگا (جو اہل ایمان کے لیے بشارتِ عظیم ہے) اور انکار کرنا ایسا عمل ہوگا جس کا نتیجہ تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہوگا (یہ تنبیہ اور انذار ہے اہل کفر کے لیے)''

دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ: اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والا ''داعِیًا اِلَی اللّٰہ'' کے بعد بِاِذْنِہٖ کے لفظ نے وضاحت کر دی کہ آپ ﷺ جو پیغام یا تعلیم پیش کرتے ہیں وہ منجانب اللہ ہے اور اس کے حکم سے ہے، آپ کے ذاتی نظریات نہیں ہیں۔

سِرَاجًا مُنِیْرًا: چراغ، روشنی بخشنے والا، کہتے ہیں کہ آفتاب سراسر آگ ہے اور چاند اگرچہ روشن ہے مگر اس کا نور اپنا نہیں بلکہ وہ آفتاب کی عکاسی کرتا ہے، لیکن چراغ کی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو نہ آفتاب میں ہیں نہ چاند میں۔ سب سے پہلی خصوصیت وہ سوز و گداز ہے جو نہ آفتاب کو میسر ہے نہ چاند کو۔ دوسری خصوصیت یہ کہ چراغ شریک محفل ہوتا ہے جبکہ آفتاب اور چاند بزم انسان سے لاکھوں میل دور ہیں۔ تیسری خصوصیت فیض رسانی اور تکمیلِ تربیت ہے۔ آپ چراغ کی ٹمٹماتی بتی سے بھی بیشمار چراغ جلا سکتے ہیں اور متعدد قندیلیں روشن کر سکتے ہیں۔ چوتھی بات چراغ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مٹی اور روئی کا وہ گالا ہے جس سے اس کی بتی بنائی جاتی ہے، مٹی میں آگ نہیں لگتی، روئی آگ پکڑتی ہے مگر وہ شعلہ نہیں بنا سکتی، پس چراغ کی ہستی اور اس کی روشنی کا سرمایہ وہ تیل ہے جو چراغ روشن کرنے والا ہے، یہ ہیں چراغ کی خصوصیتیں، ان خصوصیتوں کے ملاحظہ کے بعد آیت پر نظر ثانی فرمایئے۔

آیت میں دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ کے بعد سِرَاجًا مُنِیْرًا فرما کر اس حقیقت کو طشت از بام فرما دیا کہ

(ا) محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا سرمایہ وحی الٰہی کا وہ روغن ہے جس سے داعی اِلی اللہ کا دل ہمہ وقت روشن رہتا ہے، یہاں تک کہ لب مبارک کی کوئی جنبش بھی اس روشنی سے محروم نہیں رہتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم:۵۳/۳-۴)

''وہ تو اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے، اُن کا کلام تو فقط وہی ہے جو ان پر وحی کیا جاتا ہے۔''

(ب) داعی کی دعوت شاعرانہ تفریح نہیں بلکہ شعلہ ہے، اس سوزش کا جوان کے بدن کو پگھلا رہی ہے، یہ سوزش ہمدردی نوع انسانی کی سوزش ہے، قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ○ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْـلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ○ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْـلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الحاقہ:۶۹/۴۰-۴۳)

''بے شک یہ (قرآن) معزز رسول (ﷺ) کا قول ہے (یعنی وہ اس کی تلاوت فرماتے ہیں) یہ کسی شاعر کا قول نہیں، (افسوس) تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ (افسوس) کہ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو، (یہ تو) رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔''

آپ ﷺ کا بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی وغمخواری اور ان کی ہدایت کے لیے غم میں گھلنے کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾

(الکہف:۱۸/۶)

''پس اگر یہ لوگ اس بات (قرآن) پر ایمان نہ لائیں تو کیا آپ ان کے پیچھے اسی رنج میں اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے۔''

(ج) اہل محفل مشغول ہیں مگر چراغ اپنا کام کر رہا ہے اور اس کی روشنی فیض عام پہنچا رہی ہے، جناب رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ بلا خوف وخطر اور بلا کم وکاست اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہیے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾

(المائدہ:۵/۶۷)

''اے رسول! جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے، اسے (لوگوں تک) پہنچا دیجیے اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔''

(د) سورج اور چاند روشنی بخشتے ہیں مگر ایثار اور قربانی کا سبق نہیں دیتے یہ خصوصیت چراغ کی ہے کہ اس کی بتی جل کر فنا ہو رہی ہے اور ہر ایک داعی کو داعیانہ جہاد میں فنا ہونے کا سبق دے رہی ہے، یعنی داعی کی دعوت اس وقت نور بخش ہو سکتی ہے جبکہ خود داعی سوز و گداز بن جائے، اپنے تن بدن کو مقاصدِ دعوت کے لیے قربان کر دے اور اس ایثار اور قربانی کو اپنے وجود کا مقصدِ اعظم اور اپنے ظہور کی آخری غرض و غایت بنا لے، حقیقت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری سیرت اسی لفظ سراجاً منیراً میں سموئی ہوئی ہے، آپ سیرت مقدسہ کا جتنا گہرا مطالعہ کریں گے آپ کا ضمیر اس کی شہادت دیتا رہے گا۔''

(افادہ از سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ)

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا﴾ (الاحزاب:۳۳/۴۷)

''اور (اے نبی!) مومنوں کو خوشخبری دیجیے کہ اُن پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔''

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

''مومنوں پر اللہ کا فضل کبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو ان کے درمیان روشن چراغ بنا کر بھیجا اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سب انبیاء سے افضل بنایا اسی طرح آپ کی امت کو دوسری امتوں پر فضیلت اور بزرگی عطا فرمائی۔''

(تیسیر القرآن)

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین بنایا تو آپ کی ذات گرامی کو چراغ سے تشبیہ دے کر آپ کے فیض علم کو دائمی اور ابدی بنا دیا، آپ غور کیجیے کہ سیرت طیبہ کا ہر پہلو روشن اور

نمایاں ہے اور آپ کا اتباع کرنے والوں کو بھی روشنی اور ہدایت نصیب ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور محبت کا مژدۂ جانفزا ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''(اے نبی!) فرما دیجیے کہ (لوگو!) اگر واقعی تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔''

۲) آپ ﷺ کی ذات گرامی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فیض اٹھایا، پھر ان سے تابعین نے، اس کے بعد تبع تابعین نے اور یہ سلسلہ، ان شاء اللہ، قیامت تک چلتا رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد ہوتا ہے:

''میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں دو انگلیوں کی طرح قریب ہونگے (یہ بتاتے ہوئے دونوں انگلیوں کو جوڑ کر دکھایا)۔''

(مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

'' اے عائشہ! کسی مسکین کو اپنے دروازے سے نامراد نہ پھیرو گو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اے عائشہ غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو اپنے نزدیک کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اپنے نزدیک فرمائے گا۔''

(مشکوۃ باب فضل الفقراء)

رہبرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾ (الکھف:۱۸/۶)

”(اے نبی!) اگر یہ لوگ اس بات (یعنی قرآن کریم) پر ایمان نہ لائیں تو کیا آپ ان کے پیچھے اسی رنج وغم میں اپنی جان کھو دیں گے۔“

لغوی معانی: فَلَعَلَّكَ (ف۔ لَعَلَّ۔ كَ) پس، شاید، (کہ) آپ 'ف' استنافیہ، آغازِ کلام کے لیے، 'لَعَلَّ' حرف ترجی کہلاتا ہے۔ شاید کہ، ک ضمیر واحد مذکر حاضر بَاخِعٌ (اسم فاعل) کسی کے لیے اپنی جان کھونے والا (بَخَعَ، يَبْخَعُ، بُخُعًا) ہلکان کرنا، غم اور غصے سے خود کو گھلانا۔ (القاموس الوحید) نَفْسَكَ (نَفْسَ۔ كَ) نفس۔ اپنا، ک ضمیر واحد مذکر حاضر، جناب نبی ﷺ کی طرف جاتی ہے، عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ (اٰثَارِ۔ هِمْ) نقش قدم۔ ان کے۔ آثار کا مفرد اَثَرٌ ہے اس کا معنی نقش، نقش قدم ہے، یعنی ان کے پیچھے لگ کر، اِنْ لَّمْ جو، نہ۔ يُؤْمِنُوْا، ایمان لائیں وہ، یہ لفظ دراصل يُؤْمِنُوْنَ تھا، لَمْ کی وجہ سے 'ن' جمع کا گر گیا، بِهٰذَا الْحَدِيْثِ، ساتھ اس بات کے (الحدیث کا معنی قرآنِ کریم ہے) جیسا کہ نبی ﷺ کے خطبۂ مبارکہ میں ہے:

((اِنَّ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَاَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صلى

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ))
اَسَفًا، رنج وغم، جیسا کہ سورۂ یوسف میں سیدنا یعقوب علیہ السلام سیدنا یوسف علیہ السلام کے کھو جانے پر بے اختیار فرماتے ہیں:

﴿یَا أَسَفٰی عَلٰی یُوسُفَ﴾ (یوسف:۸۴/۱۳) ''ہائے افسوس یوسف!''

مولانا محمد یوسف اصلاحی لکھتے ہیں:

داعی تمثیل کے آئینے میں:

کسی دومنزلہ عمارت پر ایک ننھا پیارا بچہ چھت کے کنارے بالکل آخر میں بیٹھا ہے اور برابر آگے کو کھسک رہا ہے، نادان بچہ بالکل نہیں جانتا کہ وہ اپنی خوفناک موت اور عبرت ناک تباہی سے قریب ہو رہا ہے، چھت سے گرتے ہی اس کی ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی اور اس کے جسم و جان کا تعلق انتہائی لرزہ خیز طریقے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ یہ منظر دیکھتے ہی آپ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں چیخنے لگتے ہیں اور حیرت انگیز بے تابی کے ساتھ اس کو بچانے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، کوئی ایک انسان بھی اس کی سسکتی لاش، پھٹے سر اور چور چور ہڈیوں کا لرزہ خیز منظر دیکھنے کے لیے تیار نہیں، کون ہوگا جو اس وقت اپنی جان پر کھیل کر اس بچے کو اُس خوفناک انجام سے بچانے کے لیے بے اختیار دوڑ نہ پڑے گا۔

اس تمثیل کے آئینے میں داعی اعظم ﷺ کی داعیانہ تڑپ، انسانی درد، پر زور جذبات اور اضطراب انگیز احساسات کو دیکھیے اور نظر و فکر کو ذرا وسعت دے کر تصور کی آنکھوں سے داعی اسلام کی بیقراری کا مشاہدہ کیجیے۔

داعی اسلام کا اضطراب

جہنم کے گہرے سیاہ شعلے دہاڑتے چنگھاڑتے لپک رہے ہیں اور انسانیت کے ان نادان افراد کو بھسم کرنے کے لیے پیہم بڑھ رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑ کر دین و اخلاق کی انتہائی بلندیوں سے کفر و شرک، معصیت و سرکشی اور بدعت و ضلالت کے گہرے گڑھوں

میں گر رہے ہیں اور برابر گرتے نظر آ رہے ہیں، بپھرے ہوئے شعلے ہولناک آوازوں کے ساتھ ان کو اپنی گرفت میں لے لینا چاہتے ہیں اور یہ نادان ان کی گرفت سے بچنے اور بھاگنے کے بجائے ان سے اور قریب ہو رہے ہیں اور اپنی حماقت سے ان میں گرے پڑ رہے ہیں۔

رسول ﷺ اپنے چاروں طرف یہ دردانگیز منظر دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے، انسانی درد سے بے قرار ہو جاتا ہے، کفر و شرک اور معصیت و ضلالت کے تباہ کن انجام کا تصور کر کے کانپ اٹھتا ہے اور رسالت کی گراں ترین ذمہ داری کا احساس کر کے لرزتا ہے اور پھر قوم کی سرکشی، بدزبانی اور طنز و تشنیع سے پریشان ہو کر فکر و غم میں گھلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (المدثر: ٧٤/١-٥)

''اے چادر میں لپٹنے والے! اٹھ (قوم کو) انجام بد سے ڈرا، اپنے رب کی تکبیر کہہ اور اپنے کپڑے صاف ستھرے رکھ اور (شرک) کی گندگی سے دور رہ۔''

مُدَّثِّرُ کا خطاب اور اس کا مفہوم

مُدَّثِّرُ یعنی چادر میں لپٹنے والا یہ خطاب دراصل داعیٔ اسلام کے فکر و اضطراب اور سوز و غم کی داعیانہ کیفیت کی تصویر کشی ہے، جب انسان کسی گہرے غم میں انتہائی پریشان ہو جاتا ہے تو وہ سب سے الگ تھلگ چادر تان کر پڑا رہتا ہے اور اندر ہی اندر اپنے غم کا مداوا سوچتا رہتا ہے، یہاں 'مُدَّثِّرُ' کہہ کر اسی فکر و اضطراب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ کو اس خطاب سے نوازنے کے دو پہلو ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے فکر و غم کو سراہتے ہوئے اس محبت آمیز خطاب میں اپنی رحمت و شفقت کا اظہار فرمایا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح نبی ﷺ نے دیکھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ زمین پر پڑے ہوئے ہیں اور جسم گرد آلود ہو رہا ہے تو آپ نے ((قُمْ يَا اَبَا تُرَاب)) کہہ کر اپنی شفقت و محبت کا اظہار فرمایا تھا۔

دل کھل سکتے ہیں اور نہ دوسرے یہ کہ آپ کی اس ـَـ یـ کہ داعیِ حق کا بنیادی وصف
سکتی ہے، جناب محمد رسول اللہ فکر و اضطراب ہے، اس داعیانہ تڑپ کے بغیر نہ حق کے لیے
اسلام کے ہمہ گیر تہذیبی انقلاب کو قبول کرنے کے لیے دنیا تیار ہو
اللہ ﷺ کا حال یہ تھا کہ آپ قوم کی اس گمراہی پر برابر کڑھتے تھے اور پہروں اس غم میں
ڈوبے رہتے کہ کسی طرح ان نادانوں کو اس ذلت اور تباہی سے نکالیں۔
آپ ﷺ کی کیفیت دیکھ کر اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور نہایت شفقت کے انداز میں کہا:
''اے چادر میں لپٹ کر کھلنے والے! غم سے اپنی جان ہلکان نہ کرو، بلکہ اٹھو اور یقین کی
پوری قوت کے ساتھ اپنی قوم کو بتاؤ کہ اس شرک و معصیت کا انجام انتہائی تباہ کن ہے، اس
سے بچو! اللہ ہی سب سے بڑا ہے، وہ اکیلا معبود ہے۔ اُس کی توحید کو اپناؤ اور اس کی تکبیر
کہو، جس کی مکمل ترین عملی شکل 'نماز' ہے۔ اعتقاد کے پہلو سے توحید پورے دین کا سرچشمہ
ہے اور عمل کے پہلو سے 'نماز' سارے دین کی بنیاد ہے، اللہ تعالیٰ کی تکبیر کا ایجابی نتیجہ یہ ہے
ـَبَـ کَـ ـَـَـَـ فَـ ـَطـ ـّـِطَھّـ ـُرۡ﴾ اپنی شخصیت کو پاک وصاف رکھو، ثیاب سے مراد صرف
یا ہونا چاہیے ﴿ ـَوَ ـِـِـِثِـ ـَیا
لباس ہی نہیں ہے بلکہ ثیاب سے مراد ذات اور شخصیت ہے 'طاہر الثوب' عربی زبان میں
اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا نفس اخلاقِ رذیلہ سے پاک اور اخلاقِ فاضلہ سے آراستہ ہو،
ہو ﴿ ـَوَ ـَـَـَـرَبَّـ کَـ ـَـَـَـ فَکَـکَـ ـّـِـِـّبَـّـ ـُرۡ﴾ کا سلبی نتیجہ ہے، ﴿ ـَوَالرُّ ـُّـُّجُجزَ
جو سچائی، خلوص اور وفا کا پیکر
ـُجُـ ـُرۡ﴾ شرک کی گندگی اور معصیت سے دور رہو، ہر وہ گندگی جو اللہ کے غضب اور اس
ـَفَا ـّاهُ
کے عذاب کی موجب ہو، وہ 'رُجز' ہے اور زندگی اس سے پاک ہونی چاہیے۔
چنانچہ نبی ﷺ اس حکم کو سن کر اپنے منصب کی عظمت کا احساس کرتے ہیں، حالات پر
پیغمبرانہ جرأت کی نگاہ ڈالتے ہیں اور ماحول کی ناسازگاری اور قوم کے بے جا خطابات:
برداشت کرنے کے لیے تیار ہو کر یقین کی پوری قوت کے ساتھ قوم کو خبردار کرتے ہیں کہ

ہے جس کی بھڑکتی ہوئی آگ کبھی ٹھنڈی نہ ہوگی، جیسا کہ ارشاد گرامی ہے:

﴿كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا﴾ (بنی اسرائیل:۹۷/۱۷)

''جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔''

اور پھر داعیِ حق جب یہ سوچتے ہیں کہ شرک و معصیت کی طرف لپکتے ہوئے اور جہنم کی لپیٹ میں آنے والے یہ نادان انہی جیسے انسان ہیں، انہی کی طرح گوشت پوست سے بنے ہیں اور انہی کی طرح تکلیف و راحت کا احساس رکھتے ہیں تو وہ ان کی محبت میں تڑپ اٹھتے ہیں، دردمندی کے جذبات سے بے چین ہو کر ان کو ہولناک انجام سے بچانے کے لیے اپنا سکون و آرام قربان کر دیتے ہیں، انتھک محنت، مسلسل جدوجہد، مشفقانہ جذبات، سکون انگیز اضطراب اور پرسوز دعاؤں کے ساتھ ان کو جہنم سے گھسیٹنے اور اللہ کے قدموں میں لا ڈالنے کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں اور اسی شوق و سوز اور فکروغم میں ڈوب کر اللہ سے دعائیں کرتے ہیں کہ رب کریم! اپنے ان بندوں کا تو ہی ہاتھ پکڑ، اپنے غضب سے ان کو محفوظ رکھ اور ہدایت کے لیے ان کے سینوں کو کھول دے۔

اور جب ان کا یقین انہیں جھنجوڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، شرک و الحاد، گمراہی و سرکشی، بغاوت اور رب کائنات سے بیزاری کا انجام پر ہول جہنم ہے، تو ان کا دماغ لرزنے لگتا ہے اور جب تصور ان کے سامنے جہنم کے بھیانک مناظر پیش کرتا ہے تو ان کی نبضیں چھوٹنے لگتی ہیں، وہ ہرگز تیار نہیں کہ انسانوں کی دلدوز چیخیں سنیں، ان کے جھلسے ہوئے بے تاب چہرے دیکھیں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو جہنم کے سیاہ ترین شعلوں میں تڑپتا، کراہتا اور موت کی نہ پوری ہونے والی آرزوئیں کرتا دیکھیں۔

نبی ﷺ نے اپنی پرسوز پیغمبرانہ کوششوں اور گمراہ بندوں کی احمقانہ حرکتوں کو ایک بلیغ تمثیل میں یوں بیان فرمایا:

((مَثَلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا، فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَاحَوْلَهَا، جَعَلَ الْفِرَاشُ وَ هٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِي تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيهَا، وَجَعَلَ يَحْجُزُهُنَّ))

''میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی اور جب آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اٹھا تو کیڑے پتنگے اُس پر گرتے ہیں اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑوں پتنگوں کو آگ سے روک رہا ہے لیکن پتنگے ہیں کہ اس کی کوششوں کو ناکام بنا رہے ہیں اور آگ میں گرے پڑ رہے ہیں (اسی طرح) میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ میں گرنے سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو۔''

داعیانہ اضطراب کے محرکات

اوپر کی تمثیل اور مدثر کے خطاب سے نبی ﷺ کے جس داعیانہ اضطراب، بے مثل انسانی محبت، بے پایاں شوقِ ہدایت اور غیر معمولی سوز وفکر کی تصویر کشی ہو رہی ہے، اس کے حقیقی محرکات چار ہیں، ان حقیقی محرکات کی حیثیت وہی ہے جو جسم انسانی میں روح کی ہے اور داعیانہ کردار کی ساری دلکشی اور رعنائی انہیں کے دم سے ہے۔

۱) فریضۂ رسالت کا شدید ترین احساس

۲) رضائے الٰہی کا بے پایاں شوق

۳) انسانیت کا سچا درد

۴) فلاح آخرت کی غیر معمولی فکر

ان چاروں محرکات پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے ایک بار ذرا تصور کی آنکھ سے نبی ﷺ کا دیدار کیجیے، آپ کا بے مثال شوق و ولولہ، بے پایاں سوز و تڑپ دیکھیے اور ایمانی جذبات کو تازہ کر کے یہ فیصلہ کیجیے، شعوری فیصلہ کہ آپ سے تعلق جوڑنے والے ہر مومن داعی کو یہی کردار اپنانا ہے، اس انقلابی فیصلہ کے بغیر سیرت رسول ﷺ کے مطالعہ سے نہ کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ اس فیصلے کے بغیر صحیح معنوں میں کوئی سیرت پاک کے مطالعہ کا حقدار ہو سکتا ہے۔

چشمِ تصور سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار

خیال کی ساری قوتوں کو سمیٹ کر چشمِ تصور سے ذرا اُس ''سراپا اضطراب'' ہستی کا دیدار

قرآن کے آئینے میں کیجیے:

﴿ لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التوبة:۹/۱۲۸)

''لوگو! تمھارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں، تمہارا گمراہی میں پڑنا ان پر انتہائی شاق ہے، تمہاری ہدایت کے لیے وہ انتہائی حریص ہیں اور مومنوں کے لیے انتہائی شفیق ومہربان ہیں۔''

کفروشرک کے تاریک ترین ماحول میں ایک حساس انسان آنکھ کھولتا ہے، وہ اپنے چاروں طرف ہزار ہا خداؤں کی پرستش ہوتے دیکھتا ہے، بدکرداری اور بداخلاقی کی حیاسوز حرکتیں دیکھتا ہے، ظلم وستم کے ختم نہ ہونے والے انسانیت سوز مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ کڑھتا ہے، آدمؑ کی اولاد کا یہ حال اس سے دیکھا نہیں جاتا، وہ ان کی ہدایت کے لیے بے چین ہو جاتا ہے، شوق ہدایت میں گھلتا ہے اور اسی فکروغم میں وہ اپنے رب کے حضور گڑگڑاتا ہے۔ پروردگار! مجھ پر صبر انڈیل دے اور میرے قدموں کو جما دے اور ان کافروں کے مقابلے میں میری مدد فرما:

﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرہ:۲/۲۵۰)

''اے اللہ! تو ہمارے لیے راہِ صبر کشادہ کردے، ہمارے قدموں کو استقامت بخش اور ہمیں کافروں پر فتح ونصرت عطا فرما۔''

اور رب کریم صبر وثبات کی بے پناہ قوت دے کر وعدہ کرتا ہے، ہم تمہارے پشت پناہ ہیں، تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو، ہم ایک لمحے کے لیے تم سے غافل نہیں ہیں، ہم نہ تمھیں ضائع ہونے دیں گے اور نہ تمہارا اجر ضائع ہونے دیں گے، تم کھلم کھلا ایک اللہ کی دعوت دو، شرک کے ہولناک انجام اور جہنم کی عبرتناک تباہی سے اپنی قوم کو بچانے کے لیے جسم و جان کی ساری قوتیں لگا دو۔

اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ شوق اور درد سے سرشار ایک بے قرار انسان ہے جسے شب و روز

ایک ہی فکر ہے، ایک ہی دھن ہے، ایک ہی غم ہے اور ایک ہی لگن ہے کہ اپنے خالق و مالک سے بچھڑے ہوئے اس کے بندے اس سے مل جائیں، اسی غم میں اس کی راتیں کٹتی ہیں، اسی شوق اور دوڑ دھوپ میں اس کے دن بیتتے ہیں، گمراہوں کو اپنے رب سے بیزار اور غافل دیکھ کر اس کا دل روتا ہے، اس کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور وہ ایک ایک کے دل میں اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام جمانے اور بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے بے چین ہے کہ اللہ کے بندو! تمہارا معبود حقیقی صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اسی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین اندھیروں کے اندر پیدا کیا ہے۔ (الزمر:۶/۳۹)

حسین وجمیل جسم دیا، بے پناہ صلاحیتیں عطا کیں اور اپنی تخلیق کا شاہکار بنا کر تمھیں دنیا میں بھیجا، وہی اب بھی تمہاری پرورش کر رہا ہے، زمین سے لہلہاتی کھیتیاں وہی اُگاتا ہے، آسمان سے پانی وہی برساتا ہے، سورج اور چاند کو اسی نے تمہاری خدمت پر لگا رکھا ہے، شب و روز کی یہ گردش اسی کے حکم سے ہے، اُسی نے پوری کائنات کو اپنی قدرت سے تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے، نہ تمہارے پیدا کرنے میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں، نہ تمہاری پرورش میں کوئی اس کا معین و مددگار ہے اور نہ اس کائنات کی حکمرانی میں کوئی اس کا شریک کار ہے، وہ خالق ایک ہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تمہاری بندگی کا تنہا وہی مستحق ہے، اسی کی عبادت کرو، اسی کی اطاعت کرو، اسی سے دعائیں مانگو، اسی کے سامنے عاجزی کرو، اسی سے مدد چاہو، اسی سے محبت کرو، اسی پر بھروسا کرو اور اسی سے خوشنودی حاصل کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعوت شب و روز فضا میں گونجتی ہے، لیکن تھوڑے سے لوگ اس دعوت کو قبول کر کے آپ کے ساتھ اسی کام میں لگ جاتے ہیں، باقی مکّہ کے سارے سنگدل آپ ﷺ کے جانی دشمن بن کر آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو ستانے لگتے ہیں۔ کبھی آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں، کبھی آپ ﷺ پر کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں، کبھی آپ ﷺ کو صابی، مجنوں، شاعر اور کاہن کہہ کر دل دکھاتے ہیں، کبھی آپ کے

ساتھیوں پر دست درازی کرتے ہیں، کبھی گرم ریت پر لٹا کر اوپر سے وزنی پتھر رکھ کر ایذا دیتے ہیں، کبھی دہکتے انگاروں پر لٹاتے ہیں اور کبھی زنجیروں اور رسیوں سے باندھ کر مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے ہیں، کبھی طائف کے بازاروں میں پتھر برساتے ہیں اور ان سارے حالات میں نبی ﷺ کے شوقِ ہدایت کا حال یہ ہے کہ آپ ﷺ گڑگڑا کر ان ظالموں کے لیے دعائیں مانگتے ہیں، شب و روز ان کے غم میں جان گھلاتے ہیں اور ایک ہی دھن ہے کہ کسی طرح یہ ایمان کی دولت سے محروم نہ رہیں، دولت ایمان سے مالا مال ہو جائیں، اللہ تعالیٰ کو آپ کی اس بیقراری اور سوزِ غم پر پیار آتا ہے اور کہتے ہیں:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾

(الکھف:۱۸/٦)

”(اے نبی!) اگر یہ لوگ اس بات (یعنی قرآن کریم) پر ایمان نہ لائیں تو کیا آپ ان کے پیچھے اسی رنج و غم میں اپنی جان کھو دیں گے۔“ (داعیِ اعظم)

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) یہ مختصر سی آیت مبارکہ ایک صاف آئینہ ہے جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی حقیقی تصویر پیش کر رہا ہے اور ہم چشمِ تصور سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک بے قرار داعی ہے جس کا شوق، ولولہ، تڑپ، سوز و درد، لگن اور حوصلہ کسی طرح اس کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا، اسے اپنے مقصد سے سچا عشق ہے اور وہ ہر وقت اسی دھن میں ہے کہ اپنے رب کو خوش کرنے کے لیے اس کے بھٹکے ہوئے بندوں کو اس سے ملائے اور وہ اسی شوق ہدایت میں گھل کر اپنی جان گھلا رہا ہے کہ اللہ کے بندے اس کے سچے کلام پر ایمان لے آئیں۔

۲) پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب داعی الی اللہ میں خلوص اور لگن ہو، جذبۂ قربانی و ایثار ہو، پیہم جدو جہد اور مسلسل کوشش ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل ہوتی ہے۔ وہ اس داعی کو سرفرازیاں اور کامیابیاں عطا فرماتا ہے، اسی کی دعوت پھلتی پھولتی ہے، غور کیجیے کہ وہ لوگ جنہوں نے سرزمین مکہ میں آپ ﷺ

کی دعوت پر آپ ﷺ کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے اس دعوت پر لبیک کہا، ستایا اور پریشان کیا، بالآخر فتح مکہ پر یہی لوگ آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کو دیکھ کر جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے جس کا قرآن اس طرح ذکر کرتا ہے:

''جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح کا پیغام مل گیا تو آپ نے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق (اسلام میں) داخل ہوتے دیکھ لیا، اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجیے اور اسی کی بخشش طلب کیجیے، وہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا ہے۔'' (سورۃ النصر)

فرمان رسول اللہ ﷺ

میری امت کا محتاج اور مفلس وہ ہے:

يَأتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَ صِيَامٍ وَ زَكٰوةٍ وَ يَاتِي قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَ قَذَفَ هٰذَا وَ اَكَلَ مَالَ هٰذَا وَ سَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا ـ

(صحیح المسلم)

''جو روز قیامت اپنی نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ اللہ کے پاس حاضر ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی اور کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا اور کسی کا ناجائز خون بہایا ہوگا اور کسی پر یونہی دست درازی کی ہوگی۔''

پھر ارشاد فرمایا:

فَيُعْطَى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ يُقْضٰى مَا عَلَيْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ (صحیح المسلم)

''پس (ظالم) کی بعض نیکیاں فلاں کو اور بعض نیکیاں فلاں کو دیدی جائیں گی۔ اب اگر اس کی سب نیکیاں ختم ہوگئیں اور ادائیگی باقی رہی تو پھر ان سب کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گیں اور پھر اسے آگ میں جھونک دیا جائے گا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آغازِ وحی

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ (العلق:٩٦/١-٥)

''(اے نبی!) اپنے رب کا نام لے کر (اس قرآن کو) پڑھیے جس نے (تمام کائنات) کو پیدا کیا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے! آپ کا رب تو بڑا ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ علوم وفنون سکھائے جن سے وہ بہرہ مند نہ تھا۔''

اِقْرَاْ پڑھیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (قَرَأَ، یَقْرَءُ، قِرَاءَۃً) پڑھنا، بِاسْمِ رَبِّکَ ساتھ نام رب اپنے کے، 'ک' ضمیر واحد مذکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، اَلَّذِیْ اسم موصول، جس نے (جس رب نے)، خَلَقَ پیدا کیا (خَلَقَ، یَخْلُقُ، خَلْقًا) پیدا کرنا ''اَلْخَالِقُ'' پیدا کرنے والا، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے، خَلَقَ الْاِنْسَانَ، اس نے پیدا کیا انسان کو، مِنْ عَلَقٍ جمے ہوئے خون سے، عَلَقٍ جما ہوا خون، اس کا مفرد عَلَقَۃٌ ہے، وَرَبُّکَ اور آپ کا رب، 'ک' ضمیر واحد مذکر حاضر، رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے، اَلْاَکْرَمُ کرم کرنے والا (کریم) ہے، کَرَمٌ سے اسم تفضیل کا صیغہ اَکْرَمُ، بہت زیادہ کرم کرنے والا، جس کا فیضانِ کرم کائنات کی ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔

اَلَّذِیْ اسم موصول وہ (کریم) عَلَّمَ، جس نے سکھایا (انسان کو) بِالْقَلَمِ، قلم کے ذریعے (عَلَّمَ، یُعَلِّمُ تَعْلِیْمًا) سکھانا، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ، اُس (مہربان رب) نے سکھایا انسان کو، مَا جو، اسم موصول، لَمْ

یَعۡلَمۡ، وہ نہیں جانتا تھا، لَمۡ حرف نفی و جزم، مضارع کے شروع میں آئے تو لفظاً اس کے آخری حرف پر جزم دیتا ہے اور معناً اسے ماضی منفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

آغاز وحی میں ''سورۃُ العلق'' کی یہ پہلی پانچ آیات خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئیں جسے جبریل امین اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ کے پاس غار حرا میں لے کر آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ تحنّث:

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''محدثین نے آغازِ وحی کا قصہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زہریؒ سے اور انہوں نے سیدنا عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے اپنی خالہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے، وہ فرماتی ہیں: ''رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتداء سچے (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی، آپ جو خواب دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپ ﷺ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں، پھر آپ ﷺ تنہائی پسند ہوگئے اور کئی کئی شب و روز غار حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے لیے ''تَحَنُّث'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زہریؒ نے ''تَعَبُّد'' سے کی ہے، یہ کس طرح کی عبادت تھی جو آپ ﷺ کرتے تھے، کیونکہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا، آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر زوجہ محترمہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپ ﷺ کو مہیا کر دیتی تھیں۔'' (سیرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم)

غار حرا میں خلوت گزینی کی وجہ:

''اس دور میں جن وجوہ سے آپ ﷺ مکہ کی آبادی چھوڑ کر سنسان پہاڑیوں کے درمیان حرا کے غار میں خلوت گزیں ہوتے تھے، اس پر کچھ روشنی 'سورۃ الم نشرح' کی اس آیت سے پڑتی ہے:

﴿وَوَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ۝ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ﴾ (الم نشرح:۹۴/۲،۳)

''اور ہم نے آپ ﷺ پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو آپ ﷺ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔''

اس آیت میں ''وزر'' کے معنی بھاری بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جاہلیت و جہالت کو دیکھ دیکھ کر آپ ﷺ کی حساس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپ ﷺ کے سامنے بت پوجے جا رہے تھے، شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا، زوردار کی زیادتیوں سے بے زور پس رہے تھے، لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں، قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سو سو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی، جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو، یہ حالات دیکھ دیکھ کر آپ ﷺ کڑھتے تھے، مگر اس بگاڑ کو دور کرنے کی کوئی صورت آپ ﷺ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپ ﷺ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی، جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپ ﷺ کے اوپر سے اتار دیا اور نبوت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان وہ شاہِ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس رہنمائی نے آپ ﷺ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپ ﷺ پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپ ﷺ نہ صرف عرب بلکہ پوری نوعِ انسانی کو ان خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔'' (حوالہ ایضاً)

ابتدائے وحی:

جب آپ ﷺ کی عمر چالیس سال چھ مہینے کی ہوگئی تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکایک آپ ﷺ پر غارِ حرا میں وحی نازل ہوئی اور فرشتے (جبریل امین) نے رُودررُو آپ ﷺ کے سامنے آ کر آپ ﷺ سے کہا: پڑھیے۔ بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل ہوا ہے۔ وہ خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ میں نے کہا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا،

یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھیے! میں نے کہا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اُس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا، یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾

''پڑھیے! اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔''

یہاں تک کہ ﴿مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ تک پہنچ گیا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ کر کہا:

''مجھے اڑھاؤ (چادر)، مجھے اڑھاؤ'' چنانچہ آپ کو اُڑھا دیا گیا، جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے خدیجہ رضی اللہ عنہا! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔''

پھر سارا قصہ آپ ﷺ نے ان کو سنایا اور کہا: ''مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔''

انہوں نے کہا:

﴿کَلَّا، وَاللّٰهِ، مَا یُحْزِنُکَ اللّٰهُ اَبَدًا، اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِیْثَ و تَحْمِلُ الْکَلَّ وَ تَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِی الضَّیْفَ وَ تُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ﴾

''ہرگز نہیں، واللہ! آپ ﷺ کو اللہ کبھی رنج نہیں دے گا، آپ ﷺ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں، نادار کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان کی تواضع کرتے ہیں اور تمام نیک کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔''

پھر وہ رسول اللہ ﷺ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے، اہل کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے، رسول اللہ ﷺ نے انہیں سارا واقعہ سنایا۔ ورقہ نے کہا: ''یہ وہی ناموس (عالم بالا سے وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ تعالیٰ نے

سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا، کاش میں آپ ﷺ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کو (وطن سے) نکالے گی۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟"

ورقہ نے کہا "ہاں! کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ ﷺ لائے ہیں اور اُس سے دشمنی نہ کی گئی ہو، اگر میں نے آپ ﷺ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ ﷺ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔" (حوالہ ایضاً)

پہلی وحی کا مضمون

رسول اللہ ﷺ پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا:

"پڑھیے! اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا، ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھیے اور آپ ﷺ کا رب تو بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو ایسے علوم وفنون سے بہرہ ور کیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک رسول اللہ ﷺ کو پیش آیا تھا، اس پیغام میں آپ ﷺ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں اور آگے کیا کچھ آپ ﷺ کو کرنا ہے، بلکہ ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپ ﷺ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپ ﷺ کی طبیعت پر جو شدید بار اس پہلے تجربہ سے ہوا ہے اُس کا اثر دور ہو جائے اور آپ ﷺ ذہنی طور پر آئندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

اس وقفہ کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو "سورۃ المُدَّثِّر" کی ابتدائی سات آیات نازل کی گئیں اور اس میں پہلی مرتبہ آپ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ اٹھیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو اس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے۔

مضمون وحی کی تشریح

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾

”(اے نبی!) پڑھیے! اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔“

فرشتے نے جب رسول اللہ ﷺ سے کہا: پڑھیے تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپ ﷺ کے سامنے پیش کیے تھے اور انہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا، کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا ہوں آپ ﷺ اُسی طرح پڑھتے جائیں تو آپ ﷺ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

”اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھیے“ یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے یا بالفاظ دیگر بسم اللہ کہیے اور پڑھیے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ اس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے، اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپ ﷺ کا رب کون ہے؟ بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے، یعنی جس رب کو آپ جانتے ہیں اسی کا نام لے کر پڑھیے۔

”جس نے پیدا کیا“ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس نے کس کو پیدا کیا؟ اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس رب کا نام لے کر پڑھیے جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور اس کی ہر چیز کو پیدا کیا۔

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾

”اس نے جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔“

کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اسے پورا انسان بنایا، عَلَقٌ جمع ہے عَلَقَةٌ کی، جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں، یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد چند دنوں میں رونما ہوتی ہے۔ پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ (اور پھر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے جیتا جاگتا خوش شکل انسان وجود میں آتا ہے:

﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ (المؤمنون:۲۳/۱۴)

”پس بابرکت ہے وہ اللہ، جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔“

﴿اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾

''پڑھیے اور آپ کا رب تو بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔''

یعنی یہ اس کا انتہائی کرم ہے کہ اس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اس نے انسان کو صاحب علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے اور صرف صاحب علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی اور نسل بعد نسل اس کی بقا اور تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اسے نشوونما پانے، پھلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾

''انسان کو وہ علوم وفنون سکھائے جن سے وہ بہرہ مند نہ تھا۔''

یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا، اسے جو کچھ بھی حاصل ہوا، اللہ کے دینے سے حاصل ہوا، اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولے، وہ اس پر کھلتے چلے گئے، یہی بات ہے جو آیت الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی ہے:

﴿وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ (البقرہ:۲/۲۵۵)

''اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ خود چاہے۔''

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک رسول اللہ ﷺ اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز کا طالب یا متوقع ہونا تو درکنار، آپ ﷺ کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپ ﷺ کے ساتھ پیش آئے گا، وحی کا نزول اور فرشتے کا اس طرح سامنے آنا آپ ﷺ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا، جس کا پہلا تاثر آپ ﷺ کے اوپر وہی ہوا جو ایک بے خبر انسان پر ایک اتنے بڑے حادثہ کے پیش آنے

سے فطری طور پر ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپ ﷺ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ﷺ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

۲) اس قصے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپ ﷺ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپ ﷺ کا کردار کتنا بلند تھا۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اِس واقعہ کے وقت ان کی عمر 55 سال تھی اور پندرہ سال سے وہ رسول اللہ ﷺ کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی، انہوں نے اس طویل ازدواجی زندگی میں آپ ﷺ کو اتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب آپ ﷺ نے ان کو غارِ حرا میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تامل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپ کے پاس وحی لے کر آیا تھا، اسی طرح ورقہ بن نوفل بھی مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے رسول اللہ ﷺ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ ﷺ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی جب یہ واقعہ سنا تو اسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی بول اٹھے کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے نزدیک بھی آپ ﷺ اتنے بلند انسان تھے کہ آپ ﷺ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابل تعجب امر نہ تھا۔

۳) خاتم النبیین جناب رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا آغاز اللہ تعالیٰ کے بزرگ و برتر اور بلند نام سے شروع ہوا، یعنی: ﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ﴾ سے اور قابل غور بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ یادِ الٰہی میں بسی ہوئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، ہر وقت اور ہر لمحہ آپ ﷺ اپنے رب کی کبریائی وعظمت بیان فرماتے تھے، احادیث مبارکہ میں دعاؤں کا یہ باب بڑا وسیع ہے۔

۴) ﴿رَبِّکَ﴾ رب کا لفظ لانے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ہر چیز رب کائنات کی

کرشمہ سازی کا ظہور ہے جو نہ صرف ہر چیز کا پالنہار ہے بلکہ اسے حد کمال تک پہنچاتا ہے اور ہمہ وقت اس کی نگہبانی بھی کرتا ہے۔

۵) ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ﴾ جس نے ساری مخلوق کو پیدا فرمایا اور محض اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر چیز کو نیست سے ہست میں لایا اور ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ﴾ کا خصوصی ذکر فرما کر انسان کا شرف اور مرتبہ بلند کرنا مقصود ہے۔

٦) ﴿مِنْ عَلَقٍ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان اپنی اصل کو نہ بھولے، وہ خاک سے پیدا ہوا ہے اور خاکساری ہی میں اس کی عظمت ہے۔

۷) علم اور قلم سے وحی کا آغاز ہوا جس سے انسان کے سر پر عظمت اور شان کا تاج سجایا گیا، اس وقت جب یہ آیات نازل ہوئیں نہ صرف عرب کا ماحول جہالت و نادانی میں گھرا ہوا تھا بلکہ پوری دنیا میں تہذیب و ثقافت کا نام ونشان نہ تھا، ''نبی امی'' جس نے کسی مکتب یا مدرسہ میں تعلیم حاصل نہ کی بلکہ رب قدیر کی طرف سے اس کی تعلیم و تربیت کا سامان ہوا اور اس بھولی بھٹکی انسانیت کو اس نے علم اور قلم کے رشتے میں جوڑ دیا، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام علوم وفنون اور تہذیب و تمدن اور جو عروج و کمال انسان کو ملا ہے۔ اس کی بنیاد علم اور قلم ہیں۔

۸) ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ میں یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ انسان کو اپنے جن علوم وفنون، ایجادات و اختراعات پر ناز ہے، یہ سب اگر حق تعالیٰ ہی کے سکھائے ہوئے، بتائے ہوئے سمجھائے ہوئے نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن مجید نے یہاں اسی گہری حقیقت کو یاد دلایا ہے۔

۹) ہمارے اسلاف نے اس علم اور قلم سے فائدہ اٹھا کر پوری دنیا میں روشنی پھیلائی، جہالت کو مٹایا اور زندگی کو تابندگی سے آراستہ کیا ؎

ہر اک علم کے فن میں جویا ہوئے وہ — ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ — سیاحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ
ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت — ہر ایک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

مبلّغِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝ وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ ۝ وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ ۝﴾
(المدثر ۷۴:۱-۷)

''اے (محمد ﷺ!) کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے، اٹھیے اور (لوگوں کو برے انجام سے) ڈرایے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑے پاک صاف رکھیے اور (شرک و بت پرستی) کی گندگی سے دور رہیے، اور احسان کر کے زیادہ لینے کی خواہش نہ کیجیے، اور اپنے رب کی راہ میں صبر سے کام لیجیے۔''

یٰٓاَیُّهَا حرف ندا، اے، **اَلْمُدَّثِّرُ**، اسم فاعل چادر یا کمبل اوڑھنے والا، (**تَدَثَّرَ، یَتَدَسَّرُ**) چادر یا کمبل وغیرہ سے ڈھانکنا۔ (القاموس الوحید)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی وہ ''**اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ**'' ہے۔ اس کے بعد وحی میں وقفہ ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت مضطرب اور پریشان رہتے، ایک روز اچانک پھر وہی فرشتہ جو غار حرا میں پہلی مرتبہ وحی لے کر آیا تھا آپ نے دیکھا کہ آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے جس سے آپ پر ایک خوف سا طاری ہو گیا اور گھر جا کر گھر والوں سے کہا کہ مجھے کوئی کپڑا اُڑھا دو، چنانچہ انہوں نے آپ کے جسم پر کپڑا ڈال

دیا، اسی حالت میں یہ وحی نازل ہوئی۔" (صحیح بخاری و مسلم)

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

"اسلام کی تحریکِ انقلاب کا آغاز کرنے کے لیے یہ وہ احکام ہیں جو پہلی وحی کے بعد جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئے۔"

۱- پہلا حکم "قُم" کا ہے جس میں مسلسل اور پیہم کوشش کا مفہوم سامنے آتا ہے، اس حکم الٰہی کی تعمیل آپ ﷺ پر اس وقت تک لازم تھی، جب تک آپ ﷺ کا مشن پورا اور اس کی جگہ دوسرا فرمان الٰہی نازل نہیں ہو جاتا، چنانچہ تاریخ، کتب حدیث اور خود قرآن مجید شاہد ہے کہ آپ نے اس تحریک کو اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ "قُم" کی جگہ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ﴾ (المائدہ:۵/۳) کا حکم نہیں آ گیا۔ اس تحریکِ انقلاب کو آخر تک جاری رکھنا کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ جان جوکھوں کا کام تھا، اس راہ میں آپ ﷺ کو قدم قدم پر سخت نامساعد، روح فرسا اور مایوس کن حالات سے دوچار ہونا اور پہاڑ جیسی رکاوٹوں کو عبور کرنا پڑا، لیکن آپ ﷺ نے نہ تو ہمت ہاری اور نہ تحریک سے کنارہ کشی ہی کی، اس لیے کہ آپ ﷺ کو اِذنِ 'قُم' ملا تھا۔ آپ ﷺ نے اس حکم کے پیش نظر ہر صورت حال کا مقابلہ کیا، نہ تو کبھی دم لیا، نہ ایک لحظہ کے لیے غافل ہوئے۔ (پیغمبر اعظم و آخر ﷺ)

۲- "فَاَنْذِرْ" اور (لوگوں کو برے انجام سے) ڈرایئے، فعل امر صیغہ واحد مذکر (اَنْذَرَ، یُنْذِرُ، اِنْذَارًا) کسی کو کوئی بات بتا کر چوکنا کرنا اور ڈرانا، آگاہ کرنا، انجام سے باخبر کرنا۔

(القاموس الوحید)

"قُمْ" کی طرح "فَاَنْذِرْ" میں بھی معنویت کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اس کے بنیادی معانی ہیں، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ڈرانا، اس زمانے میں بھی آج کی طرح لوگ قدرت کے اس قانون کے قائل نہ تھے، جو قائل تھے وہ عملاً منکر تھے، بت پرست اس زعم میں مبتلا تھے کہ لات و منات اور ہبل و عزّٰی وغیرہ بت ان کے سفارشی اور معاون و مددگار اور تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں، اس لیے وہ جو کچھ کریں، روا ہے، نصاریٰ بھی اس قانون کے قائل نہ تھے، ان کے نزدیک نجات حسن عمل پر

نہیں اصطباغ یا بپتسمہ عسائیت کے نزدیک (کسی کو عیسائی بناتے وقت اس پر متبرک پانی چھڑکنا) پر منحصر تھی۔ یہود بھی اس اعتبار سے اس کے منکر تھے کہ وہ اس وہم میں مبتلا تھے بلکہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی قوم ہیں، لہٰذا ان کی ہر خطا قابل معافی ہے، لوگوں کے ان عقائد کے پیش نظر قانون مکافاتِ عمل کی تبلیغ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

قدرت کے قانون مکافاتِ عمل کو تسلیم کرنے سے مندرجہ ذیل تین حقائق کو ماننا لازم آتا ہے: اولاً، اللہ تعالیٰ ایک فعال ہستی ہے اور عادل ہے، لہٰذا کسی غیر اللہ کی مجال نہیں کہ اسے عدل کرنے سے باز رکھ سکے، اس سے ان تمام نظریات کی تردید لازم آتی ہے جن میں (یہود و نصاریٰ، مشرکین و کفار کے غلط عقائد) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ثانیاً انسان مر کر فنا نہیں ہو جاتا، بلکہ دوبارہ زندہ ہو کر اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا کا مزہ چکھنا اس کا مقدر ہے۔ ثالثاً، یہ دنیا دارالامتحان اور آخرت دارالجزا ہے۔

غور سے دیکھیں تو شرک و بت پرستی کی ہر شکل میں قدرت کے قانون مکافاتِ عمل کا انکار پنہاں ہوتا ہے۔ چنانچہ ''فَاَنْذِرْ'' کے حکم میں بنیادی طور سے لوگوں کو شرک و بت پرستی کے انجام سے ڈرانا مقصود تھا۔

انسان میں دو قوتیں عموماً برسر پیکار رہتی ہیں: ایک قوتِ شہوانیہ اور دوسری قوت عقلیہ، ابلیس اپنے جمالیاتی فریب سے انسان کی قبیح سے قبیح خواہشات تک کو مزین، یعنی خوشنما اور دلکش بنا کر اسے دکھاتا ہے، اس کا نتیجہ عموماً یہ نکلتا ہے کہ عقل مغلوب النفس ہو جاتی ہے، اس عالم میں انسان جو جرم و گناہ بھی کرتا ہے وہ اسے اچھا لگتا ہے اور اپنے جرم و گناہ پر پردہ ڈالنے اور اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے کی خاطر وہ طرح طرح کے باطل دلائل و روایات کا سہارا لیتا ہے، لوگوں کو ابلیس کے جمالیاتی فریب کے بھیانک عواقب و نتائج سے متنبہ کرنا بھی ''فَاَنْذِرْ'' کے حکم میں داخل تھا اور آپ ﷺ نے اس حکم کی تعمیل اس جامع طریق سے کی کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مختصر یہ کہ ''فَاَنْذِرْ'' کے حکم میں بداعتقادی و بے ایمانی، شرک و بت پرستی، ظلم و استحصال، جرم و گناہ، بد نیتی و غفلت، تکذیب و دروغ گوئی اور منافقت و فجور کے فطری و لازمی عواقب و نتائج سے لوگوں کو ڈرانے کا مفہوم مضمر ہے، تاکہ ان میں ایقان و اذعان پیدا ہو۔

''فَاَنْذِرْ'' کے مثبت پہلو بھی ہیں، انسان میں جب مکافاتِ عمل کا شعور پیدا ہوتا ہے تو ایک طرف

اسے ظلم و گناہ سے خوف آنے لگتا ہے تو دوسری جانب اس کے دل میں خیر و حسنہ اور عدل و احسان کی خفتہ محبت بیدار ہو جاتی ہے، اس طرح جب انسان میں شرک و بت پرستی کے بھیانک عواقب کا یقین پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے دو نتائج نکلتے ہیں، سلبی اور ایجابی، سلبی نتیجہ جھوٹے معبودوں سے نفرت کی صورت میں اور ایجابی حقیقی ''اِلٰہ'' سے محبت کی شکل میں نکلتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان دونوں پہلوؤں پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

۳- ﴿وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ﴾ ''اور اپنے رب کی بڑائی کا بیان کیجیے۔''

وَ رَبَّ.کَ، اپنے رب، ک کی ضمیر جناب نبی کریم ﷺ کی طرف جاتی ہے، (کَبَّرَ، یُکَبِّرُ، تَکْبِیْرًا) اللہ اکبر کہنا، نعرۂ تکبیر بلند کرنا، اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا اعلان کرنا اور اسی کے احکام میں زندگی گزارنا۔''اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ سے جو محبت اور اپنائیت تھی اس کا اظہار وہ تیرا رب (رَبَّکَ) اور ہمارا بندہ (عَبْدُنَا) کے الفاظ سے کرتا ہے، یہ تو جملہ معترضہ ہے، اس حکم کے بھی دو پہلو ہیں: مثبت اور منفی، مثبت پہلو یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا ایقان و اذعان پیدا کیا جائے اور منفی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا لوگوں نے، جو جھوٹے اِلٰہ اور رب بنا لیے تھے، ان کی تکذیب و تذلیل کی جائے، اس حکم کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے، چنانچہ اسی حکم کی بنا پر آپ ﷺ نے اسلام کا نعرہ 'اللہ اکبر' مقرر کیا جو آج تک جاری و ساری ہے اور ہمیشہ کارزارِ ہستی میں گونجتا رہے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ جب لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا شعور پیدا ہو جاتا ہے تو پھر معاشرے میں فرعون یا قارون کا وجود باقی نہیں رہتا اور نتیجۃً انسان، انسان کا غلام نہیں رہتا اور نہ انسان، انسان کا معبود و رب بن سکتا ہے، فرعون، ہامان اور قارون نام اور بھیس بدل بدل کر ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں، یہ بنی نوع انسان کے کھلے دشمن ہیں کہ جس طرح ابلیس ہے، یہ انسانی معاشرے کے سرطان ہیں جو اس کا خون چوس چوس کر پھیلتے چلے جاتے ہیں لیکن انسان کو اپنے ظلم و جہل کی وجہ سے اس حقیقت کا بہت کم شعور ہوتا ہے، ''فَاَنْذِرْ'' کا ایک معنی مظلوم و غریب لوگوں میں اس شعور کو بیدار کرنا بھی تھا۔

اللہ تعالیٰ کی 'کبریائی' کا شعور عقیدۂ توحید کی روح ہے، انسان میں جب اس حقیقت کا اِذعان و ایقان پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قدرت، علم و حکمت وغیرہ تمام صفاتِ حسنہ میں سب سے بڑا ہے اور وہ میرا ''حقیقی رب'' ہے تو اسے نہ تو کسی فرعون یا ہامانِ وقت کا خوف رہتا ہے اور نہ اپنی ذات کا غم اس کے لیے سوہانِ روح ہی بنتا ہے۔ یہ عقیدہ اس کے قلب کی وُسعتوں کو آفاقی اور اُس کے حوصلے کو ناقابل تسخیر بنا دیتا ہے، مختصر یہ کہ یہ عقیدہ انسان کو اس کے مقامِ عبدیت سے آشنا ہی نہیں، اس پر متمکن کرتا ہے، اصل یہ ہے کہ مقامِ عبدیت ہی اس کا حقیقی مقام ہے جس کی عظمت و رفعت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اپنی عبدیت کا شعور ہوتا ہے۔

''کبریائی'' کے تمام مُدّعیانِ کاذب کے ظلم و استحصال سے بنی نوعِ انسان کو نجات دلانے کی خاطر آپ ﷺ کو لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا شعور بیدار کرنے پر مامور کیا گیا تھا اور یہ بے حد کٹھن کام تھا، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا میں شرک و بت پرستی کا دور دورہ تھا، انسان جب اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت میں غیر اللہ کو شریک کرتا ہے تو اس سے اس میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا شعور کمزور پڑ جاتا ہے اور دوسرے اس کی اپنی شخصیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے، لوگوں کی ایسی نفسیاتی صورت حال تھی جب آپ ﷺ کو لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا شعور بیدار کرنے کا فرمان الٰہی ملا تھا۔

۴- ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ ''اور اپنے کپڑے پاک وصاف رکھیے۔''

ثَوْبٌ کی جمع ثِيَابٌ کپڑے، 'ک' ضمیر واحد مخاطب، جناب نبی ﷺ کی طرف جاتی ہے، (طَهَّرَ، يُطَهِّرُ، تَطْهِيْرًا) پاکیزہ رکھنا، صاف ستھرا رکھنا۔

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اپنے کپڑوں کو پاک وصاف رکھو اور دوسرا یہ کہ اپنے دامنِ زندگی کو پاک وصاف رکھو، سب سے پہلے اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ صفائی اور پاکیزگی میں بہت فرق ہے، ایک کپڑا صاف ستھرا دکھائی دینے کے باوجود پاک نہیں ہو سکتا، اسی طرح کپڑا پاک ہونے کے باوجود صاف ستھرا نہیں ہو سکتا، اسلام صفائی اور پاکیزگی دونوں پر زور دیتا ہے۔ اور 'طہارت' کا لفظ ان دونوں معانی پر حاوی ہے، اس سے یہ مستنبط ہوا کہ اسلام میں صفائی اور پاکیزگی دونوں کو غیر

معمولی اہمیت حاصل ہے۔

اہل ذوق وصفا جانتے ہیں کہ پاکیزگی وصفائی جسم اور روح دونوں کی صحت اور نشوو ارتقا کی ایک لازمی شرط ہے، جس طرح انسان کا لباس اور جسم اس کرۂ ہوا میں ماحول کے غیر مرئی گرد و غبار سے میلا ہوتا رہتا ہے، اسی طرح قلبِ انسانی پر بھی غیر مرئی طور سے معاشرتی برائیوں کے اثرات پڑتے اور اسے گدلا کرتے رہتے ہیں، جب اس پر برائیوں کے اثرات تہہ بہ تہہ جم جاتے ہیں تو قلب طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے قویٰ کا نشوو ارتقا رُک جاتا ہے، اس صورت حال کے پیش نظر اسلام نے قلب کے تصفیہ وتزکیہ پر بجا طور پر بہت زور دیا ہے، تصفیۂ قلب کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ انسان طہارت پسند ہو اور اس کا جسم ولباس طاہر ہو۔

اس بات کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ جو شخص خود پاکیزہ نہ ہو اور اس میں ذوقِ طہارت نہ ہو تو وہ دوسروں میں ذوقِ طہارت پیدا نہیں کرسکتا، ذوقِ طہارت اس لحاظ سے ازبس اہم اور ضروری ہے کہ یہ تزکیۂ نفس کی ایک پیش شرط ہے اور تزکیۂ نفس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اس کے بغیر شخصیت اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

اس ارشاد باری تعالیٰ پر تاریخ کے حوالے سے غور کرنے سے اس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اقوامِ عالم میں اس وقت پاکیزگی کا وہ مفہوم نہیں تھا جو اسلام پیدا کرنا چاہتا تھا، عیسائیت جو مغرب میں سب سے بڑا تبلیغی دین تھا، اس پر رہبانیت کا غلبہ تھا اور رہبانیت میں جسم ولباس حتیٰ کہ ماحول کی پاکیزگی خلافِ تقویٰ بات تھی، چنانچہ جو شخص جتنا غلیظ ہوتا تھا، اتنا ہی زیادہ اللہ والا سمجھا جاتا تھا، خاص و عام سبھی بول و براز کر کے طہارت نہیں کرتے تھے، ہاتھ تک دھونے کا رواج نہ تھا، غسلِ جنابت سے کوئی آشنا نہ تھا، کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کو بدعت و ریاکاری خیال کیا جاتا تھا۔ میلے کچیلے لباس و ماحول میں رہنا زہد کی ایک ناگزیر پیش شرط تھی، لہٰذا عابد اس بات پر فخر کرتے تھے کہ انہوں نے برسوں پانی کو چھوا تک نہیں، کپڑوں، سر بلکہ جسم کے بالوں تک میں جوئیں پڑ جانے کو زہد کے ارفع مقام کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

قریب قریب یہی صورت حال مشرقی اقوام کی تھی، مشرق میں بدھ مت سب سے بڑا تبلیغی

مذہب تھا، وہ بھی عیسائیت کی طرح رہبانیت و خانقاہیت کا علمبردار تھا، اس مذہب کے زیرِ اثر مغرب کی طرح مشرق میں بھی لوگ پاکیزگی کے مفہوم سے کم آشنا تھے، جہاں تک ہندو قوم کا تعلق تھا، وہ بھی طہارت سے نا آشنا تھی اس میں شک نہیں کہ ہندو مت میں صبح کے اشنان (غسل) کو ہمیشہ اہمیت رہی ہے لیکن تھی وہ بھی ناپاک، پیشاب کر کے طہارت کرنا، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا، غسل جنابت وغیرہ کا رواج نہ تھا۔ گائے کے گوبر اور پیشاب کو پاکیزہ بلکہ پاک کرنے والا سمجھا جاتا تھا اور اس کا استعمال عام تھا، عرب کے کفار بھی پاکیزگی کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے، صحرا کے بدو تو پاکیزگی کے تصور تک سے نا آشنا تھے۔

یہود میں بلاشبہ لباس اور جسم کی طہارت کو ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن وہ اس معاملے میں حد سے زیادہ متشدد تھے، ان کی شریعت میں لباس ناپاک ہو جائے تو وہ پانی، صابن وغیرہ سے پاک نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا ناپاک حصے کو کاٹ پھینکنا ضروری تھا، جسم کی ناپاکی سے متعلق بھی ان کا عقیدہ متشدّدانہ تھا، لیکن بہت کم لوگ شریعت پر عمل کرتے تھے، یہود قوم چونکہ کہیں بھی اپنی الگ سیاسی حیثیت یا حکومت نہیں رکھتی تھی، لہٰذا عوام مقامی باشندوں کی تہذیب سے متاثر ہو جاتے تھے، اس لیے وہ بھی عملاً گندے اور گندگی پسند تھے۔

مختصر یہ کہ اقوام عالم طہارت اور پاکیزگی سے بے خبر تھیں، اس حال میں انہیں ظاہری اور باطنی لحاظ سے پاکیزہ اور پاکیزگی کے مفہوم سے آشنا کرنے اور اس کی اہمیت کا ان میں احساس و شعور بیدار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ارشاد فرمایا: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ ”اپنے کپڑے (یا دامن حیات کو) پاک و صاف رکھیے۔“

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں عیسائیت اور بدھ مت کے زیرِ اثر اقوام عالم جسم و لباس کی گندگی کو روح کی پاکیزگی کے لیے ایک پیش شرط سمجھتی تھیں اور اسلام اس تصورِ باطل کو مٹانا چاہتا تھا اور ان میں اس حقیقت کا اِذعان پیدا کرنا چاہتا تھا کہ روح کی پاکیزگی اور جسم و لباس لازم و ملزوم ہیں۔

عربی محاورے میں ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے جو اردو میں ”اپنا دامن پاک رکھیے“ کا ہے، اس اعتبار سے آپ ﷺ کو لباس اور جسم کی پاکیزگی کی طرح اخلاق کی پاکیزگی کا

بھی ایک مثالی معیار قائم کرنے کی ہدایت ملی، چنانچہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ آپ ﷺ نے اسلام کی ''تحریک رحمۃ للعالمینی'' کے ذریعے جو حَسین انقلاب پیدا کیا اور پھر اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی، اس کے افراد کا ''معیارِ اخلاق'' نہایت بلند تھا۔

۵- ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ ''اور (شرک و بت پرستی کی) گندگی سے دور رہیے۔''

وَالرُّجْزَ گندگی، بتوں کی پرستش (القاموس الوحید)، **فَاهْجُرْ (فَ.هْجُرْ)** پس دور رہیے (**هَجَرَ، يَهْجُرُ، هَجْرًا**) الگ ہونا، دور ہونا۔

اس ارشادِ الٰہی میں تَن اور مَن دونوں کی گندگی سے دور رہنے کی ہدایت ہے، تن سے مراد جسم، لباس اور ماحول ہے اور ماحول دو طرح کا ہوتا ہے: مکانی اور زمانی، مکانی ماحول کا مطلب گھر بار، محلّہ، گاؤں، شہر وغیرہ اور ان کی فضا اور آب و ہوا ہے۔ زمانی ماحول سے مراد زمانے کے اثرات ہیں، مثلاً تاریخی، ثقافتی، سیاسی، معاشرتی اثرات۔ یہ اثرات منفی یا سلبی نوعیت کے ہوں تو ان سے انسان کی شخصیت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

من کی گندگی سے مراد جرم و گناہ اور ظلم و عدوان کے طبعی اثرات ہیں اس کی بدترین شکل شرک ہے، اس کے بعد کفر، قتلِ انسانی، بخل، نفاق، ظلم و استحصال وغیرہ ہیں۔

اسلام نے تزکیہ پر بہت زیادہ زور دیا اور اسے ذریعۂ فلاح قرار دیا ہے، اس سے بھی مقصود یہ ہے کہ انسان تن اور من کو گندگی سے پاک و صاف رکھے تاکہ اس کی حسی و قلبی قوتیں حدِّ کمال تک نشو و نما پا سکیں، اصل یہ ہے کہ پاکیزگی انسانیت کا خاصہ ہے، لیکن ظہورِ اسلام کے وقت اقوامِ عالم کو نہ تو طہارت سے محبت تھی اور نہ گندگی سے نفرت، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کی جمالیاتی حس مردہ ہو چکی تھی اور وہ کور ذوق ہو چکے تھے، اسلام کی انقلاب انگیز ''تحریکِ رحمۃ للعالمینی'' کا بنیادی مقصد انسان کی جمالیاتی حِس کو زندہ و بیدار کرنا تھا تاکہ وہ حسن سے محبت اور گندگی سے نفرت کرے، یہ یاد رہے کہ پاکیزگی حسن کا ناگزیر عنصر ہے۔'' (پیغمبر اعظم و آخر ﷺ)

٦- ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ ''اور احسان کر کے زیادہ لینے کی خواہش نہ کیجیے۔''

وَلَا تَمۡنُنۡ اور نہ احسان کیجیے کہ اس کے بدلے میں، تَسۡتَكۡثِرُ زیادہ ملے مَنَّ، یَمُنُ، مَنًّا، احسان کرنا، اچھا سلوک کرنا (اِسۡتَكۡثَرَ، یَسۡتَكۡثِرُ، اِسۡتِكۡثَارًا) کسی چیز کی زیادتی کا خواہشمند ہونا۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''کسی شخص کی بے لوث خدمت کرنا بڑی حوصلہ مندی کا کام ہے، انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اگر وہ کسی پر کوئی دنیوی یا دینی بھلائی کرے تو کسی نہ کسی رنگ میں اس کو اس کا بدلہ ضرور ملنا چاہیے، بلکہ بسا اوقات انسان کی طبیعت یہ چاہتی ہے کہ کسی پر اس نے جو احسان کیا ہے، اس کا بدلہ اسے اس سے بڑھ کر ملنا چاہیے، یہ نظریہ خالصتاً خود غرضانہ اور مادی نظریہ ہے۔ لہٰذا جس عظیم مقصد کے لیے آپ ﷺ کو تیار کیا جا رہا تھا اور جس طرح آپ ﷺ کو پوری بنی نوع انسان کی ہدایت کی خدمت سپرد کی جانے والی تھی، اُس کے لیے ابتدا ہی میں آپ ﷺ کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کسی طرح کے فائدہ، لالچ، غرض اور معاوضہ کا طمع رکھے بغیر لوگوں پر دینی اور دنیوی دونوں طرح کی بھلائیاں کرنا ہوں گی۔ (تیسیر القرآن)

۷- ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ﴾ ''اور اپنے رب کی راہ میں صبر سے کام لیجیے۔''

وَلِرَبِّكَ (وَ. لِ، رَبِّ. كَ) اور، لیے، رب، اپنے (کے) یعنی اپنے رب کی راہ میں اور اس خالق و مالک کی رضا کے لیے، فَاصۡبِرۡ، پس صبر کیجیے، فعل امر صیغہ واحد مذکر (صَبَرَ، یَصۡبِرُ، صَبۡرًا) صبر کرنا، دعوتِ حق پیش کرتے ہوئے تکالیف برداشت کرنا، یعنی آپ ﷺ کو جتنی بھی مصائب پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے اللہ کی رضا کی خاطر برداشت کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ آپ کو ان باتوں کا بہت زیادہ اجر عطا فرمائے گا۔ (تیسیر القرآن)

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱- مندرجہ بالا آیات مبارکہ کے قیمتی جواہرات اور بے مثل موتیوں کے انمول خزانہ میں سب سے پہلا سبق رب کائنات کی توحید کا ہے۔ یہ تمام پھیلی ہوئی کائنات، رب کائنات کی قدرت کا ظہور ہے، لفظ ''رب'' کا 'كَبِّرۡ' پر مقدم رکھنا اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتا ہے اور (كَبِّرۡ) میں اس بات کا

پتا چلتا ہے کہ ہر قسم کی عزت وعظمت کے لائق صرف اسی کی ذات ہے، صرف اور صرف اسی کا سہارا انسان کو ساحلِ مراد سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

۲- دوسرا سبق صفائی اور پاکیزگی اور راہبانہ تصور کا رد ہے، اسلام ظاہر اور باطن دونوں کا نکھار پسند کرتا ہے، انسان کا باطن شرک وکفر، حسد وبغض ایسے رذائل سے پاک ہو تو اس کا ظاہر نجاست اور غلاظت سے صاف ہو، قرآن پاک نے ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ((اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ)) فرما کر پاکیزگی کو جزو ایمان ٹھہرایا ہے، اس میں راہبانہ تصور کا پوری طرح ردّ ہے کہ اس تصور میں انسان کے میلے کچیلے پن کو بزرگی اور فضیلت ٹھہرایا گیا ہے۔

۳- تیسرا سبق ان تمام باتوں سے اجتناب کا ہے جو عذابِ الٰہی کا موجب ہوں، اس میں ہر قسم کی معصیت ونافرمانی، ناپسندیدہ اخلاق، اور رذائل اور تمام شیطانی افعال آ جاتے ہیں جن سے انسانی روح کثیف اور غلیظ ہو جاتی ہے، ان سے بچنا لازم ہے۔

۴- چوتھا سبق بے لوث خدمت کا ہے، ہر محنت اور خدمت کا معاوضہ محض اللہ تعالیٰ سے چاہنا، اخلاص کا جذبہ عطا کرتا ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس جذبۂ ایثار واخلاص سے اسلام کی دعوت پھلی پھولی، جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو اسی بات کی تعلیم وتربیت دی گئی، یہی بات تمام مسلمانوں کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

۵- پانچواں سبق ''صبر'' اختیار کرنے کا ہے، حق کی اشاعت میں، نیز زندگی کی مشکلات میں 'صبر' بندۂ مومن کا زادِ سفر ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں لازوال اجر سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر: ۳۹/ ۱۰)

''بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ہم بلا حساب اجر سے نوازیں گے۔''

آیئے ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں کہ مندرجہ بالا زندگی کے قیمتی اصولوں میں سے ہمارے اندر کس کی کمی ہے اور پھر اس کمی کو دور کر کے دینی ودنیوی صلاح وفلاح کے حقدار ٹھہریں۔

پیغمبرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَاۨ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ کَلِمٰتِہٖ وَ اتَّبِعُوْہُ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴾ (الاعراف:۷/۱۵۸)

''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی پر جو خود بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے ارشادات کو (دل و جان سے) مانتا ہے اور اُن کا اتباع کرو، امید ہے کہ تم راہِ راست پا لو گے۔''

قُلْ آپ کہہ دیجیے، خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے (قَالَ، یَقُوْلُ) کہنا، اس سے فعل امر واحد مذکر کا صیغہ قُلْ ہے، یٰٓ کلمۂ ندا، پکارنے اور خطاب کرنے کے لیے، اَیُّھَا النَّاسُ اے لوگو! جس کو خطاب کیا جائے وہ منادیٰ کہلاتا ہے، اِنِّیْ بلا شبہ، میں، رَسُوْلُ اللّٰہِ اللہ کا رسول ہوں، اِلَیْکُمْ (اِلَیْ. کُمْ) طرف، تمہاری۔ 'کُمْ' ضمیر جمع مذکر مخاطب، تمام انسانوں کی طرف جاتی ہے، جَمِیْعًا، سب کے سب، یعنی انسانوں کی کوئی نسل اور گروہ اس سے خالی نہیں ہے، مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب میں بسنے والے تمام انسان شامل ہیں (بلکہ آپ ﷺ جنات کے بھی نبی ہیں)،

اَلَّذِیْ وہ جو، اسم موصول (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہیں) لَهٗ (لَ. هٗ) اس کے لیے ہے، هٗ کی ضمیرِ واحد مذکر اللہ جل جلالہ کی طرف جاتی ہے، مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی، لَآ اِلٰهَ کوئی معبود نہیں (کوئی عبادت کے لائق نہیں) اِلَّا هُوَ مگر، وہ (سوائے، اس کے)، یُحْیٖ وہ زندہ کرتا ہے مضارع واحد مذکر غائب (اَحْیٰ، یُحْیٖ، اِحْیَاءً) زندہ کرنا، زندگی بخشنا، وَ یُمِیْتُ وہ موت دیتا ہے، فَاٰمِنُوْا (فَ. اٰمِنُوْا) پس ایمان لاؤ، فعل امر جمع مذکر حاضر (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا، بِاللّٰهِ (بِ. اللّٰهِ) ساتھ، اللہ (کے) اس کو دل و جان سے رب واحد مان کر اُس کے احکام بجالاؤ، وَ رَسُوْلِهٖ رَسُوْلِ. هٖ رسول، اس (کے) 'هٗ' کی واحد مذکر ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے، یعنی اس کے رسول ﷺ کے اتباع میں احکامِ الٰہی کی پیروی کرو۔ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ (اس نبیؐ کی جو) نبی اُمّی ہے، یہ دونوں لفظ رسول اللہ ﷺ کی صفت ہیں، یعنی ایسا نبی جس نے کسی مکتب یا مدرسہ میں تعلیم حاصل نہ کی بلکہ آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت کا سروسامان رب کریم کی طرف سے ہوا اور آپ نے فرمایا:

((اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَأْدِیْبِیْ))

''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہتر طریق پر میری تربیت فرمائی۔''

اَلَّذِیْ، جو اسم موصول، یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ کَلِمٰتِهٖ ایمان لاتا ہے اللہ اور اس کے ارشادات پر، صیغہ واحد مذکر غائب فعل مضارع، یعنی جس نبیؐ کا پاکیزہ عمل یہ ہے کہ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے احکام پر مضبوطی سے عمل پیرا ہے، بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

((کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن))

یعنی آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر تھی، وَ اتَّبِعُوْهُ (اور مسلمانو! تم بھی ان کی حیاتِ طیبہ کا اتباع کرو)، لَعَلَّکُمْ (لَعَلَّ. کُمْ) تاکہ، تم، کُمْ ضمیر جمع مذکر مخاطب تمام مسلمانوں کی طرف جاتی ہے، تَهْتَدُوْنَ ہدایت پا جاؤ (اِهْتَدٰی، یَهْتَدِیْ) ہدایت پانا، راہ یاب ہونا۔

عالمگیر رسالت:

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ آخری رسالت ہے، یہ پوری دنیا کے لیے عام ہے، یہ کسی نوع یا کسی نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اس رسالت سے پہلے جو رسالتیں گزریں وہ مقامی تھیں یا محدود اور ایک محدود زمانے کے لیے تھیں اور زمانہ وہی تھا جو کسی رسول کے بعد دوسرے رسول کے آنے کے درمیان ہوتا ہے، ان رسالتوں کے دور میں انسانیت نے ترقی کی طرف چند ہی قدم رکھے تھے تاکہ انسانیت رفتہ رفتہ ترقی کرتی چلی جائے اور آخری رسالت تک یہ قافلہ پہنچ جائے۔

سلسلۂ رُسُل کا اختتام:

رسالت میں شریعت کے بعض احکام کے اندر اضافے و ترمیم کا کام ہوتا رہا ہے، یہاں تک کہ جب آخری رسالت کا دور آیا تو یہ آخری رسالت اپنے اصول و فروع کے اعتبار سے ایک مکمل رسالت تھی اور یہ ایسی تھی کہ اس کے اصول نئے قوانین کی شکل میں دنیا میں نافذ ہو سکتے تھے اور یہ آخری رسالت ساری دنیا کے لیے آئی، اس لیے کہ اس آخری رسالت پر سلسلۂ رُسل ختم ہو گیا ہے۔ اب اور کوئی رسالت آنے والی نہیں ہے اور یہ بالکل انسانی فطرت کے مطابق ہے جس میں نسلِ انسانیت کو جوڑنے کا پیغام ہے۔

فطری پیغام:

اس آخری رسالت کے لیے 'نبی امّی' کا انتخاب ہوا، تاکہ اس کا پیغام فطری پیغام ہو اور اللہ کی جانب سے ہو، جو کچھ اس نبی پر نازل ہو وہ مِن وعَن لوگوں تک پہنچا دے اور اس کا معلم صرف اللہ ہو، اس لیے اس آخری رسالت کے اوپر کسی دنیاوی تعلیم کی چھاپ نہیں ہے، نہ وہ انسانی افکار سے متاثر ہے، تاکہ فطری رسالت لوگوں کی فطرت تک پہنچے اور ذہنوں کو اپیل کرے:

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾

”(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔“

وسعتِ رسالت

یہ مکی سورت کی آیت ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ پوری دنیا کے لیے اپنی رسالت کا اعلان کر دیں، یہ اُن اہل کتاب اور مستشرقین کا ٹھوس اور واضح جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں اہل مکہ اور قریش سے آگے وسیع علاقے میں اپنی رسالت کے بارے میں نہ سوچتے تھے اور یہ کہ قریش سے آگے اہل عرب اور پھر اہل عرب سے آگے اہل کتاب تک اپنی دعوت کو وسعت انہوں نے اُس وقت دی اور جزیرۃ العرب سے بھی باہر پوری دنیا تک دعوت پھیلانے کا انہوں نے اُس وقت سوچا جبکہ کامیاب حالات نے اُن کو اس پر آمادہ کیا، یہ حقیقت میں ایک عظیم افترا ہے اور اسلام کے خلاف ان کی ایک قدیم نظریاتی جنگ ہے جسے وہ ہر وقت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مسلمان غور کریں:

پریشانی کی بات یہ نہیں ہے کہ اہل کتاب اس دین کے خلاف یہ سازشیں کیوں کرتے ہیں اور مستشرقین جو اہل کتاب کے سرخیل ہیں اور اسلام کے خلاف لڑنے والی ایک زبردست قوت ہیں، وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، پریشانی اور عظیم پریشانی کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ ان ملمع سازوں سے اپنا دین سیکھتے ہیں اور بڑے فخر سے ان کی شاگردی اختیار کرتے ہیں اور ان لوگوں کو اپنا استاد سمجھتے ہیں، وہ ان کی لکھی ہوئی ان خرافات کے حوالے اپنی کتابوں میں دیتے ہیں، وہ اسلامی تاریخ بھی ایسے ملمع کاروں سے لیتے ہیں اور اس قسم کے دھوکا کھائے ہوئے احمق پھر اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور مہذب بھی کہتے ہیں۔

رب کائنات:

اب ہم دوبارہ آیت کی تشریح کی طرف آتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دینے کے بعد کہ آپ اعلان کر دیں کہ آپ کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے، یہ بتایا جاتا ہے کہ جس

رب کی طرف دعوت دی جارہی ہے، اس کی پہچان کیا ہے:

﴿اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ﴾

''(میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں) جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔''

نبی ﷺ تمام لوگوں کے لیے رسول ہیں اور آپ ﷺ ہی اس کی مخلوقات میں سے بہترین ہیں، اللہ تعالیٰ تنہا معبود برحق ہے، تمام انسان اس کے بندے ہیں اور رب کائنات کی قدرت و بادشاہت کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ موت وحیات کا وہ اکیلا مالک ہے اور اس کائنات میں صرف اُسی کی حکومت کا سکہ رواں دواں ہے، وہی اس بات کا مستحق ہے کہ لوگ اس کی بندگی بجالائیں اور اس کے احکام کی دل و جان سے فرمانبرداری کریں۔

النبی الامّی ﷺ کا اتباع:

اس کے بھیجے ہوئے تمام رسول اسی دین کو پھیلانے والے تھے اور اسی طرح قرآن حکیم لوگوں کو ان کے رب کی شناخت کراتا ہے، تاکہ وہ اپنی زندگی کا نظام خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں قائم کریں:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

''سو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امّی پر جو خود بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے ارشادات کو (دل و جان سے) مانتا ہے اور ان کا اتباع کرو، امید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔''

آیت میں اہم اشارے:

اس پکار اور دعوت کے اندر نہایت ہی لطیف ارشاد ہے، چاہیے کہ ہم ذرا وقفہ کر کے ان پر غور کریں۔

- اس پکار اور دعوت میں سب سے پہلا امر یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ

اور یہ ایمان ((لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہ)) کے کلمۂ طیبہ میں منضبط کیا گیا ہے۔

- اور اس پر ایمان و اقرار کے بغیر اسلام اور ایمان کا تصور بھی ممکن نہیں ہے، لیکن یہاں ایمان لانے کی دعوت سے پہلے اللہ کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی شناخت دی گئی ہے کہ ایسے اللہ پر ایمان لاؤ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ وحاکم نہیں ہے، وہ زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، لہٰذا یہاں جس معبود برحق پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے اس کی صفات پہلے بیان کر دی گئی ہیں، اسی طرح جس رسول پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے کہ سب لوگ ان کو مانیں اور ان کی اطاعت کریں، ان کی صفات بھی پہلے بیان کر دی گئی ہیں۔
- دوسری بات یہ کہ نبی امی بھی اللہ پر اور اللہ کے کلام پر ایمان لاتے ہیں، یہ بات واضح ہے، لیکن اس کے اندر یہ اہم حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی بھی دعوت سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ داعی کا خود اس پر یقین ہو، اس کے دین میں دعوت کا مفہوم واضح ہو اور اسے اس پر یقین ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جس رسول کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے، وہ خود بھی ''اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان لاتا ہے'' اور اس کی طرف وہ لوگوں کو بھی دعوت دیتا ہے۔
- پھر یہاں ایمان کے تقاضے بھی دیے گئے ہیں کہ سب لوگ رسول کی اطاعت بھی کریں اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو بھی اپنے ہاں جاری و ساری کریں اور ان کی سنت کو مشعلِ راہ بنائیں۔ اس بات کی نشان دہی ان الفاظ میں کی گئی:

﴿وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

''اور ان کا اتباع کرو، امید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اگر لوگ رسول کی اطاعت نہیں کرتے تو ان کی کامیابی اور فلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ بات کافی نہیں ہے کہ لوگ دلوں میں ایمان لے آئیں اور پھر رسول کا اتباع نہ کریں، عملی اتباع ہی دراصل اسلام ہے۔

- دین اسلام اپنے مزاج اور اپنی ماہیت کی وضاحت ہر موقع ومحل میں کرتا ہے، اس طرح کہ اسلام مجرد عقیدہ ونظریہ نہیں ہے، نہ اسلام صرف مراسمِ عبودیت کا نام ہے، بلکہ اسلام خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے مکمل اتباع کا نام ہے۔

تمام ہدایات اور احکام جو رسول اللہ ﷺ پر اترے، تمام شرعی قوانین جو رسول ﷺ نے وضع فرمائے، ان کا اتباع لازمی اور ضروری ہے، اسلام نے ایک مکمل قانون اور نظام دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جب تک تم پورے کے پورے نظامِ شریعت اور اسلامی قانون کو اپنی عملی زندگی میں لاگو اور جاری نہیں کر لیتے، اس وقت تک تمہاری فلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔

یہ ہے دین اسلام اور اس دین کی کوئی اور تصویر قابل قبول نہیں ہے، صرف اس کی یہی شکل قابل قبول ہے جس میں کہا گیا ہے ﴿وَاتَّبِعُوْہُ﴾ یعنی اس رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرو، اس کی سنتِ مطہرہ کو اپنی زندگی کا شعار بناؤ، شاید کہ تم فلاح پاؤ، اگر صرف اعتقادی تصور ہی مطلوب ہوتا تو اللہ تعالیٰ صرف یہ بات کہنے پر اکتفا کرتے:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾

”تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔“ (فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں

۱) محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے انبیا ورُسل اپنی اپنی قوم اور قبیلوں کی طرف آئے اور انہیں اللہ کا پیغام سنایا، جبکہ آپ ﷺ کا پیغام نسلِ انسانی کے لیے ہے جو ختمِ نبوت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

۲) ہر نبی اور رسول نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی، اُسی کی عبادت کی طرف بلایا اور خود اس کی اپنی زندگی بھی احکامِ الٰہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، رب کریم کا ارشاد ہے:

”ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔“ (النحل:۳۶/۱۶)

❁......❁......❁

بے داغ سیرت وکردار کا مالک ﷺ

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَـلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (یونس: ۱۰/۱٦)

''میں اس سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں، کیا تم عقل وفکر سے کام نہیں لیتے؟''

لغوی معانی: فَقَدْ (ف. قَدْ) پس، تحقیق، قَدْ حرف تاکید ہے، فعل ماضی کے شروع میں آکر تاکیدی معنیٰ دیتا ہے، لَبِثْتُ (لَبِثَ، يَلْبَثُ، لَبْثًا، وَلُبْثًا) ٹھہرنا، بسر کرنا، فِيْكُمْ (فِيْ. كُمْ) درمیان، تمہارے۔ كُمْ ضمیر جمع مذکر مخاطب لوگوں کی طرف جاتی ہے، عُمُرًا زندگی، مِّنْ قَبْلِهٖ اس سے پہلے، یعنی نبوت ملنے سے پہلے، اَفَـلَا تو کیا نہیں، تَعْقِلُوْنَ تم عقل سے کام لیتے ہو؟ فعل مضارع جمع مذکر مخاطب (عَقَلَ، يَعْقِلُ، عَقْـلًا) سمجھنا، سوجھ بوجھ سے کام لینا، اَلْعَاقِلُ، دانشمند، اَلْعَقْلُ قوتِ ادراک، وہ قوت جس سے اچھے برے، خیر وشر اور حق و باطل کے درمیان فرق کیا جاتا ہے، قوتِ تمیز۔

(القاموس الوحید)

یتیمی میں پرورش:

جناب نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

''عرب کے ایک ممتاز، مہذب اور اعلیٰ روایات رکھنے والے خاندان میں سلیم الفطرت والدین کے قران السعدین سے ایک انوکھا سا بچہ یتیمی کے سائے میں پیدا ہوتا ہے، ایک غریب مگر شریف ذات کی دایہ کا دودھ پی کر دیہات کے صحت بخش ماحول کے اندر فطرت کی گود میں پلتا ہے، وہ خاص انتظام سے صحرا میں تگ و دو کرتے کرتے زندگی کی جولان گاہ

میں مشقتوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتا ہے اور بکریاں چرا کر گلہ بانیِ اقوام کی تربیت پاتا ہے۔ بچپن کی پوری مسافت طے کرنے سے پہلے یہ انوکھا بچہ ماں کے سایۂ شفقت سے بھی محروم ہو جاتا ہے، دادا (عبدالمطلب) کی ذات کسی حد تک والدین کے اس خلا کو پر کرنے والی تھی لیکن یہ سہارا بھی چھین لیا جاتا ہے، بالآخر چچا (ابوطالب) کفیل بنتے ہیں۔ یہ گویا مادی سہاروں سے بے نیاز ہو کر ایک آقائے حقیقی کے سہارے گراں بہا فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری کرائی جا رہی ہے۔

جوانی

جوانی کے دائرے میں قدم رکھنے تک یہ انوکھا بچہ عام بچوں کی طرح کھلنڈرا اور شریر بن کر سامنے نہیں آتا، بلکہ بوڑھوں کی سی سنجیدگی سے آراستہ نظر آتا ہے، جوان ہوتا ہے تو انتہائی فاسد ماحول میں پلنے کے باوجود اپنی جوانی کو بے داغ رکھتا ہے، عشق اور نظر بازی اور بدکاری جہاں نوجوانوں کے لیے سرمایۂ افتخار بنے ہوئے ہوں، وہاں وہ اپنے دامانِ نظر تک کو ایک آن بھی میلا نہیں ہونے دیتا، جہاں گلی گلی شراب کشید کرنے کی بھٹیاں لگی ہوں، گھر گھر شراب خانے کھلے ہوں، جہاں مجلس مجلس دخترِ رز (انگوری شراب) کے قدموں میں ایمان و اخلاق نچھاور کیے جاتے ہوں اور پھر جہاں بلانوشیوں کے چرچے فخریہ قصیدوں اور شعروں میں کیے جاتے ہوں، وہاں یہ جداگانہ فطرت کا نوجوان کبھی قسم کھانے کو بھی شراب کا ایک قطرہ تک اپنی زبان پر نہیں رکھتا، جہاں قمار قومی مشغلہ بنا چلا آ رہا تھا، وہاں یہ ایک مجسمۂ پاکیزگی تھا کہ جس نے کبھی مہروں کو ہاتھ سے نہ چھوا۔ جہاں داستان گوئی اور موسیقی کلچر کا لازمہ بنے ہوئے تھے وہاں کسی اور ہی عالم کا یہ نوجوان، لہو ولعب سے بالکل الگ تھلگ رہا اور دو مرتبہ ایسے مواقع پیدا ہوئے بھی کہ یہ نوجوان ایسی مجالسِ تفریح میں جا پہنچا لیکن جاتے ہی ایسی نیند طاری ہوئی کہ سمع و بصر کا دامن پاک رہا۔ جہاں بتوں کے سامنے سجدہ پاشی عین دین و مذہب قرار پا چکی تھی۔ وہاں خانوادۂ ابراہیمی کے اس پاکیزہ نوجوان نے نہ غیر اللہ کے سامنے کبھی اپنا سر جھکایا نہ اعتقاداً کوئی مشرکانہ تصور اپنے اندر جذب کیا،

بلکہ ایک مرتبہ بتوں کے چڑھاوے کا جانور پکا کر لایا گیا تو اس نے وہ کھانے سے انکار کر دیا، جہاں قریش نے زمانۂ حج میں اپنے آپ کو عرفات جانے سے مستثنیٰ کر لیا تھا، وہاں اس ممتاز مرتبے کے قریشی نے کبھی اس من گھڑت اِستثنا سے فائدہ نہ اٹھایا، جہاں اولادِ ابراہیمؑ نے مسلکِ ابراہیمی کو بگاڑ کر دوسری خرابیوں کے ساتھ کعبہ کا طواف حالتِ عریانی میں کرنے کی ایک گندی بدعت پیدا کر لی تھی، وہاں اس حیادار نوجوان نے کبھی اس بدعت کو اختیار نہ کیا، جہاں جنگ ایک کھیل تھی اور انسانی خون بہانا ایک تماشا تھا، وہاں احترامِ انسانیت کا علمبردار یہ نوجوان ایسا تھا کہ جس کے دامن پر خون کی ایک چھینٹ نہ پڑی تھی، نوعمری میں اس نوجوان کو حربِ فجار نامی جنگِ عظیم میں شرکت کا موقع پیش آیا اور اگرچہ اس نے قریش کے برسرِ حق ہونے کی بنا پر اس میں حصہ لیا، لیکن پھر بھی کسی انسانی جان پر ہاتھ نہ اٹھایا۔

جوانی میں تعمیری سرگرمیاں

پھر اس پاکباز عفیف نوجوان کی دلچسپیاں دیکھیے کہ عین بہک جانے والی عمر میں وہ اپنی خدمات اپنے ہم خیال نوجوانوں کی 'اصلاح پسند انجمن' کے حوالے کرتا ہے جو 'حلف الفضول' کے نام سے غریبوں اور مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی چیرہ دستیوں کے استیصال کے لیے قائم ہوئی تھی، اس کے شرکا نے اس مقصد کے لیے حلفیہ عہد باندھا۔

صلح کا علمبردار:

پھر اس نوجوان کی صفات اور صلاحیتوں کا اندازہ اس سے کیجیے کہ 'تعمیرِ کعبہ' کے موقع پر حجرِ اسود کو نصب کرنے کے معاملے میں قریش میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور تلواریں میانوں سے باہر نکل آتی ہیں لیکن تقدیر کے اشارے سے اس فتنے کو چکانے کا شرف اسی نوجوان کے حصے میں آتا ہے۔ انتہائی جذباتی تناؤ کی اس فضا میں یہ جج اور صلح کا علمبردار ایک چادر بچھاتا ہے اور اس پر حجرِ اسود کو اٹھا کر رکھ دیتا ہے اور پھر دعوت دیتا ہے کہ تمام قبیلوں کے لوگ مل کر اس چادر کو اٹھائیں، چادر پتھر سمیت متحرک ہو جاتی ہے اور جب

موقع پر جا پہنچتی ہے تو وہ نوجوان اس پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ نصب کر دیتا ہے۔ جھگڑے کا سارا غبار چھٹ جاتا ہے اور چہرے خوشی اور اطمینان سے چمک اٹھتے ہیں۔

تاجرِ امین:

یہ نوجوان میدانِ معاش میں قدم رکھتا ہے تو تجارت جیسا پاکیزہ اور معزز مشغلہ اپنے لیے پسند کرتا ہے، کوئی بات تو اس نوجوان میں تھی کہ اچھے اچھے اہلِ سرمایہ نے یہ پسند کیا کہ یہ نوجوان ان کا سرمایہ اپنے ہاتھ میں لے اور کاروبار کرے۔ پھر سائب مخزومی، سیدہ خدیجہؓ اور جن دوسرے لوگوں کو اس نوجوان کے حسنِ معاملت کا عملی تجربہ ہوا۔ ان سب نے اسے 'تاجرِ امین' کا لقب دیا۔ عبداللہ بن ابی الحمہاء کی گواہی آج بھی محفوظ ہے کہ بعثت سے قبل خرید وفروخت کے معاملے میں اس 'تاجر امین' سے طے ہوا کہ آپ ٹھہریں میں ابھی پھر آؤں گا، لیکن بات آئی گئی ہوگئی، تیسرے روز اتفاقاً عبداللہ کا گزر اسی مقام سے ہوا تو دیکھا وہ 'تاجر امین' وعدہ کی ڈوری سے بندھا اُسی جگہ کھڑا ہے اور کہتا ہے:

''تم نے مجھے زحمت دی، میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں۔'' (ابوداؤد)

رفیقۂ حیات کا انتخاب:

پھر دیکھیے کہ یہ نوجوان رفیقۂ حیات کا جب انتخاب کرتا ہے تو مکہ کی نوعمر شوخ وشنگ لڑکیوں کو ایک ذرا سا خراجِ نگاہ تک دیے بغیر ایک ایسی خاتون سے رشتۂ مناکحت استوار کرتا ہے جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاندان اور ذاتی سیرت وکردار کے لحاظ سے نہایت اشرف خاتون ہے، اس کا یہ ذوقِ انتخاب اس کے ذہن، اس کی روح، اس کے مزاج اور اس کی سیرت کی گہرائیوں کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ پیغام خود وہی خاتون سیدہ خدیجہؓ بھیجتی ہیں جو اس یکتائے روزگار نوجوان کے کردار سے متاثر ہوتی ہیں اور یہ نوجوان اس پیغام کو شرحِ صدر کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

صالحین کا حلقۂ احباب:

پھر کسی شخص کے ذہن وسیرت کو اگر اُس کے حلقۂ احباب کا جائزہ لینے سے جانچا جا سکتا

صدیقؓ سے تھا، ایک ہم عمری اوپر تو آیے دیکھیے کہ اس عربی تھے؟ غالباً سب سے گہری دوستی اور سب سے زیادہ بے تکلفانہ رابطہ سید ابوبکر صد

سے ہم مذاقی، اس نوجوان کے دوستوں میں ایک شخصیت حکیم بن حزام کی تھی جو سیدہ خدیجہؓ کے بھتیجے تھے، پھر حلقۂ احباب کے ایک رکن ضماد بن ثعلبہ ازدی تھے جو طبابت اور جراحی کا کام کرتے تھے۔ اس نوجوان کے حلقۂ احباب میں کیا کوئی ایک بھی دوں فطرت، پست ذوق اور کمینہ مزاج آدمی دکھائی دیتا ہے؟ مکہ کے اشرار میں کسی کا نام اس فہرست میں ملتا ہے؟ ظالموں اور فاسقوں میں سے کوئی اس دائرے میں آتا ہے؟

فرصت کے لمحات:

پھر دیکھیے کہ یہ یکتائے زمانہ نوجوان گھر بار کی دیکھ بھال، تجارت اور دنیوی معاملات کی گوناگوں مصروفیات سے فارغ ہو کر جب کبھی کوئی فرصت کا وقت نکالتا ہے تو اسے تفریحات وتعیّشات میں صرف نہیں کرتا، اسے کوچہ گردی میں، مجلس آرائیوں اور گپوں میں نہیں کھپاتا، اسے سوسو کر اور غفلت میں بے کار پڑے رہ رہ کر بھی نہیں گزارتا، بلکہ سارے ہنگاموں سے کنارہ کر کے اور سارے مشغلوں کو تج کر 'حرا' کی خلوتوں میں رب واحد کی عبادت اور اس کا ذکر اپنی فطرتِ مطہرہ کی راہنمائی کے مطابق کرتا ہے، کائنات کی گہری حقیقتوں کو اخذ کرنے کے لیے اور انسانی زندگی کے غیبی رازوں کو پا لینے کے لیے عالمِ انفس وآفاق میں غور وفکر کرتا ہے اور اپنی قوم اور اپنے ابنا ونوع کو اخلاقی پستیوں سے نکال کر مرتبۂ ملکوتی پر لانے کی تدبیریں سوچتا ہے، جس نوجوان کی جوانی کی فرصتیں اس 'تحنث' میں صرف ہو رہی ہوں، کیا اس کی فطرت کے بارے میں انسانی بصیرت کوئی رائے قائم نہیں کرسکتی؟

لمحۂ فکریہ:

ہونے والا آخری نبی ﷺ اس نقشۂ زندگی کے ساتھ قریش کی آنکھوں کے سامنے اور ان

کے اپنے ہی ملکی معاشرے کی گود میں پلتا ہے، جوان ہوتا ہے اور پختگی کے مرتبے کو پہنچتا ہے، کیا یہ نقشۂ زندگی بول بول کر نہیں بتا رہا تھا کہ یہ ایک نہایت ہی غیر معمولی عظمت رکھنے والا انسان ہے؟ کیا اس اٹھان سے اٹھنے والی شخصیت کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کی کچھ بھی گنجائش کسی پہلو سے ملتی ہے کہ نعوذ باللہ یہ کسی جھوٹے اور فریبی کا نقشہ ہو گا؟ یہ کوئی مردِ جاہ طلب ہوگا؟ یہ کوئی بندۂ مفاد و اغراض ہوگا؟ یہ اللہ تعالیٰ کے نام کو متاعِ کاروبار بنا کر اپنی دکان چمکانے والا کوئی سوداگر ہو گا؟ ہرگز نہیں! خود قریش نے اُسے صادق و امین، دانا و حکیم اور پاک نفس و بلند کردار تسلیم کیا اور بار بار تسلیم کیا، اُس کے دشمنوں نے اس کی ذہنی و اخلاقی عظمت کی گواہی دی اور سخت ترین کشمکش کرتے ہوئے دی، داعیِ حق کے نقشۂ زندگی کو خود قرآن نے دلیل بنا کر پیش کیا:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (محسنِ انسانیت ﷺ)

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں

۱) خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب کے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہاں ہر قسم کی برائی اور بے حیائی کے طوفان ہی نہیں جھکڑ چل رہے تھے مگر آپ ﷺ نے ہر قسم کی برائیوں کو پاؤں تلے روند ڈالا اور اللہ کی رحمت سے اخلاق و حیا سے اس طرح آراستہ ہوئے کہ اس کی گواہی آسمان پر رب کریم نے یوں دی:

﴿وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ (القلم:٦٨/٤)

”بلاشبہ آپ اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں۔“

اور زمین پر مخلوق میں سے نہ صرف اپنوں بلکہ مخالفین کو بھی آپ کے اخلاقِ عالیہ پر شہادت دینے کے علاوہ کوئی چارا نہ تھا۔

۲) آپ ﷺ نے حسنِ اخلاق سے جس طرح انسانی دلوں کو فتح کیا، اس کی مثال اس نیلگوں آسمان کے نیچے ملنا مشکل ہے۔

نرالی تھی متانت جس طرح اس کے لڑکپن کی
نرالی تھی جوانی بھی جوانِ پاک دامن کی

شرافت ہو جہاں حسنِ ازل کا دائمی گہنا
سکھاتا ہے وہی پاکیزہ رہنا، خوش چلن رہنا

الگ رہنا وہ رسمِ رزم و بزمِ جاہلیت سے
وہ نفرتِ شرک سے اور مشرکوں کے ساتھ شرکت سے

وہ عہد تام مظلوموں کی امداد و اعانت کا
وہ آوازہ صداقت کا، دیانت کا، امانت کا

وہ خوش خلقی، وہ دانائی، وہ شانِ نیک کرداری
صداقت کی تجارت پیشگی وہ راست گفتاری

مَنْ لَا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ (بخاری و مسلم)

''جو (دوسروں پر) رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔''

اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلٰی (بخاری)

''اوپر کا ہاتھ (صدقہ و خیرات کرنے والا) نیچے کے ہاتھ (مانگنے والے) سے بہتر ہے۔''

روشن ضمیر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ○ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ○ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ○ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ○ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ○ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ○ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ○ وَ اِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ○﴾ (الم نشرح:٩٤)

"(اے نبیؐ!) کیا یہ امرِ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ کر دیا، اور ہم نے آپ کے دل سے آپ کا بوجھ اتار دیا جو آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا اور آپ کے لیے ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا، پس یاد رکھیں، بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی اور ہر تنگی کے بعد فراخی ہے اور جب آپ فرصت پائیں تو ہمہ تن مشغول ہو جایئے اور اپنے رب سے لو لگائیں۔"

اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دعوت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کی راہ میں جو دشوار گزار گھاٹیاں تھیں اور آپ کے اردگرد سازشوں کا جو جال پھیلا ہوا تھا، اس سے آپ کی روح قلق و اضطراب میں مبتلا تھی، اس بارِگراں کے افکار و ہجوم سے آپ کا سینۂ مبارک سخت بوجھل تھا اور یہ بوجھ آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا اور آپ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے مدد، اس سے زادِ راہ اور اس کی جانب سے ہمت و حوصلہ کی ضرورت شدت سے محسوس فرما رہے تھے، اِن حالات میں یہ سورۂ مبارکہ آپ اور آپ کے صحابۂ کرام کا حوصلہ بڑھانے میں اکسیر ثابت ہوئی۔

﴿اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ﴾

''(اے نبیؐ) کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ کر دیا۔''

اَ کیا، حرفِ استفہام، لَمۡ نہیں، حرفِ نفی و جزم، یہ بعد والے حرف کو جزم دیتا ہے، جیسا کہ نَشۡرَحۡ کی ''ح'' پر جزم ہے (شَرَحَ، یَشۡرَحُ، شَرۡحًا) کھولنا، بیان کرنا، شَرَحَ صَدۡرَہٗ لِشَیۡءٍ کسی شے کو محبوب و مرغوب بنانا، کشادہ کرنا، (القاموس الوحید) لَکَ (لَ. کَ) لیے، آپ (کے) صَدۡرَکَ (صَدۡرَ. کَ) سینہ آپ کا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''کیا ہم نے اس دعوت کے لیے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟ کیا ہم نے آپ کے لیے دین کا کام آسان نہیں کیا؟ کیا اس کام کو آپ کے لیے محبوب نہیں بنایا؟ کیا ہم نے اس کی راہ آپ کے لیے متعین و مقرر نہیں فرمائی اور کیا اس راہ کو آپ پر واضح اور روشن نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ اِس کا مبارک انجام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ ذرا اپنے سینہ کو ٹٹول کر دیکھیے! کیا آپ اس میں روح، اِنشراح اور نور نہیں پاتے؟ کیا آپ اپنے احساسات میں اللہ تعالیٰ کی جود و عطا کا ذائقہ محسوس نہیں کرتے؟ کیا آپ ہر مشقت کے ازالہ کے لیے ساز و سامان، ہر تکلیف کے ساتھ راحت، ہر دشواری کے ساتھ فراخی اور ہر محرومی کے ساتھ خوشنودی و رضا کی نعمت نہیں پاتے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ﴾

''اور ہم نے آپ کے دل سے آپ کا بوجھ اتار دیا۔''

وَ وَضَعۡنَا اور اتار دیا ہم نے، وَ اور عاطفہ سلسلۂ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، وَضَعۡنَا اتار دیا ہم نے، فعل ماضی جمع متکلم، رب العزت کے لیے بطورِ عزت جمع کا صیغہ آیا ہے، واحد کے لیے جمع کا صیغہ عزت کے لیے آتا ہے، (وَضَعَ، یَضَعُ، وَضۡعًا)، عربی زبان میں وسیع معنوں میں آتا ہے، وَضَعَ کے بعد عَنۡ آ جائے تو اس کے معنی اتارنا، ہلکا کرنا، دور کر دینا، ہٹا دینا کے ہوتے ہیں۔ عَنۡکَ (عَنۡ. کَ) آپ سے، 'کَ' ضمیر واحد مذکر مخاطب، رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے، وِزۡرَکَ

(وِزْرَ. کَ) بوجھ، آپ کا۔

حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

’’یہ بوجھ کون سا تھا؟ ارد گرد کے ماحول میں جہالت، کفر، شرک، گمراہی دیکھ کر آپ ﷺ کڑھتے تھے، مگر آپ کو علم نہیں تھا کہ اس کا علاج کیا ہو؟ یہی وہ بوجھ تھا جسے اللہ نے نبوت کے ذریعہ ہٹا دیا۔‘‘ (تیسیر القرآن)

﴿اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾

’’جو آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا۔‘‘

اَلَّذِیْ جس نے، اسمِ موصول، اَنْقَضَ توڑ رکھی تھی، فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَنْقَضَ، یُنْقِضُ، اِنْقَاضًا) توڑنا، دبانا، ظَهْرَكَ (ظَهْرَ. كَ) کمر، آپ کی۔ ’’ک‘‘ ضمیر واحد مخاطب، آپ ﷺ کی طرف جاتی ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

’’یعنی ہم نے آپ کے بوجھ کو، جو آپ کی کمر کے لیے بارِ گراں بنا ہوا تھا، یہاں تک کہ وہ مارے بوجھ کے ٹوٹی جا رہی تھی، آپ کے اوپر سے اتار دیا، اس طرح کہ آپ کا سینہ (اسلام کے لیے) کھول دیا، آپ کو اس دعوت کی توفیق دی، آپ کے لیے دعوتِ حق کو آسان بنا دیا، نیز وحی نازل کی، جو حقیقت کو واضح کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ دعوتِ دین کو کس طرح دلوں میں سہولت و نرمی کے ساتھ اتارا جائے، اس طرح آپ کے بوجھ کو ہلکا کر دیا بلکہ اسے اتار دیا، کیا آپ اس بارِ گراں کے سلسلے میں، جو آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا، اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے؟ کیا آپ شرحِ صدر کے بعد اپنے بوجھ کو ہلکا نہیں پاتے۔‘‘ (فی ظلال القرآن)

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾

’’اور آپ کے لیے ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا۔‘‘

وَ اور، عاطفہ، رَفَعْنَا ہم نے بلند کیا، فعل ماضی جمع متکلم، جمع کا صیغہ رب العزت کے لیے بطورِ عزت استعمال ہوا ہے (رَفَعَ، يَرْفَعُ، رَفْعًا) شہرت دینا، ذکر خیر کرنا، رتبہ بڑھانا، فوقیت دینا، حیثیت دینا۔ (القاموس الوحید) لَکَ (لَ. کَ) لیے۔ آپ کے 'ک' ضمیر واحد مخاطب رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے۔ ذِکْرَکَ (ذِکْرَ. کَ) ذکر آپ کا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''ہم نے آپ کے لیے آپ کا آوازہ بلند کیا، ہم نے آپ کا ''رفعِ ذکر'' ملاء اعلیٰ میں کیا، ہم نے آپ کا رفع ذکر زمین میں کیا، ہم نے پوری کائنات میں آپ کا آوازہ بلند کیا۔ ہم نے اپنے نام کے ساتھ آپ کا نام لکھ دیا کہ جب بھی کلمہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه'' کسی کی زبان سے نکلے تو اللہ کے نام کے ساتھ آپ کا نام بھی آئے، اس سے زیادہ رفع ذکر اور کیا ہوسکتا ہے، اس سے بلند تر کوئی مقام نہیں، یہ مقام اس عالم میں صرف محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾

''پس بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی اور ہر تنگی کے بعد فراخی ہے۔''

فَاِنَّ (فَ. اِنَّ) پس۔ بلاشبہ، مَعَ الْعُسْرِ ساتھ، مشکل کے، يُسْرًا آسانی ہے، اِنَّ یقیناً، مَعَ الْعُسْرِ ساتھ ہر تنگی کے، يُسْرًا فراخی ہے۔ یعنی آپ صبر و استقلال سے دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھیں اور یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی اور ہر تنگی کے بعد فراخی ہوتی ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ آپ ﷺ کے لیے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے خوشخبری ہے کہ تم اسلام کی راہ میں جو تکلیفیں برداشت کر رہے ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے بعد اللہ ہی تمہیں فراغت و آسانی سے نوازے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا جسے ساری دنیا جانتی ہے۔''

(احسن البیان)

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ، وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

''اور آپ فرصت پائیں تو ہمہ تن مشغول ہو جایئے اور اپنے رب سے لَو لگایئے۔''

فَاِذَا (فَ. اِذَا) پس۔ جب، فَرَغْتَ آپ فارغ ہو جائیں، یعنی تبلیغ و جہاد کی مصروفیات سے فراغت پائیں، فعل ماضی واحد مذکر حاضر (فَرَغَ، یَفْرُغُ، فَرَاغًا) خالی ہونا، فارغ ہونا، اردو میں بھی انہی معنوں میں آتا ہے، فَانْصَبْ (فَ. انْصَبْ) پس، محنت کیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (نَصَبَ، یَنْصَبُ، نَصْبًا) محنت سے کام کرنا، جانفشانی سے کام کرنا، وَاِلٰی اور طرف، رَبِّکَ (رَبِّ. کَ) رب، اپنے کے، فَارْغَبْ (فَ. ارْغَبْ) پس۔ راغب ہو جایے، فعل امر واحد مذکر حاضر (رَغِبَ، یَرْغَبُ، رَغْبًا وَ رَغْبَةً) خواہش مند ہونا، راغب ہونا، رغبت، چاہت اردو میں بھی جانا پہچانا لفظ ہے۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اے محمد! (ﷺ) جب آپ مخلوق کو دعوتِ حق دینے سے فارغ ہو جائیں تو خالقِ کائنات کی بندگی میں مصروف ہو جائیں اور جب آپ دنیا کے کام کاج سے فرصت پالیں تو آخرت کی طلب اور چاہت میں لگ جائیں۔'' (صفوة التفاسیر)

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں و بصیرتیں

۱) نبوت ملنے سے پہلے خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل عرب کی بالخصوص اور دنیا کی بالعموم حالتِ زار دیکھ کر کڑھتے تھے، یہ بارِ گراں گویا آپ کی کمر کو توڑ رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شدید آرزو اور تمنا تھی کہ یہ لوگ راہِ راست پر آجائیں، ان کی عادات و اخلاق سنور جائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے نوازا، خاتم النبیین کے مرتبہ پر سرفراز فرما کر نسلِ انسانیت کے لیے رحمت بنایا تو یہ ابدی ہدایت اور پاکیزہ روشنی آپ کے لیے انشراحِ صدر کا باعث ہوئی اور جن لوگوں نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا، وہ بھی انشراحِ صدر کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔

۲) آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے اصحابؓ کو حکم ہوتا ہے کہ مصائب و مشکلات سے نہ گھبرائیں کہ دعوتِ حق پیش کرنے میں ان کا پیش آنا لازمی ہے، اِبتلا و آزمائش کے بعد ہی آسانیاں ملتی ہیں اور عنقریب آپ کو فتح و کامرانی کا مژدۂ جانفزا سنایا جائے گا، چنانچہ فتح مکہ مسلمانوں کے عروج اور سر بلندی کا نشان تھا، اس کے بعد چار دانگِ عالم میں انہوں نے حق کا پرچم لہرایا۔

۳) رسول اللہ ﷺ کو یہ بشارت بھی دی گئی کہ آپ کا آوازہ و شہرت اور عُلو مرتبت چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی۔ جو کیفیت اس وقت بظاہر گمنامی کی ہے اس سے نکل کر آپ ﷺ کا نامِ نامی پوری دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کر لے گا اور دنیا آپ ﷺ کی عظمت و رفعت کی قائل ہو کر رہے گی۔

۴) اس خوشخبری اور تسلی پر مبنی حکمِ الٰہی میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اپنی طرف راغب رہنے کے لیے بھی حکم فرمایا کہ یہ جہاد و قتال اور امورِ سلطنت بظاہر دنیاوی مشغولیتیں ہیں، لیکن حقیقتاً یہ نفاذِ اسلام اور غلبۂ اسلام کی جدوجہد ہے اور یہ خود عبادت ہے تاہم مشغولیت کے ان لمحات سے کچھ لمحات بالخصوص اللہ کے لیے مختص کر لیجیے جن کے اندر صرف اور صرف اسی سے لو لگائی جائے اور اسی سے راز و نیاز کیا جائے۔

اَلسَّاعِی عَلَی الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْکِیْنِ کَالْمُجَاهِدِ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ وَ کَالْقَائِمِ لَا یَفْتُرُ وَ کالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ
(صحیح البخاری، صحیح مسلم)

”بیوہ اور مسکین کی خبر لینے والا، اللہ کے راستے میں لڑنے والے کی طرح ہے اور میرا خیال ہے (راوی کا کہنا ہے) کہ یہ بھی فرمایا کہ وہ ایسے عابد کی طرح کی کی طرح ہے جو سست پڑے یا ایسے روزہ دار کی طرح جو افطار نہ کرے (قائم اللیل اور صائم الدھر کی مانند ہے)۔“

درِّ یتیم صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ وَالضُّحٰی ○ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ○ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ○ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ○ وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ○ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ○ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ○ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی ○ فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡھَرۡ ○ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡھَرۡ ○ وَاَمَّا بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ ﴾

(الضحیٰ:۹۳)

''گواہ ہے آفتاب کی روشنی (جو ہر سو پھیل جاتی ہے) اور گواہ ہے رات جب وہ ہر شے پر چھا جاتی ہے (اے پیغمبر!) نہ تو آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا اور آپ کے لیے انجام ابتدا سے بہتر ہے اور عنقریب آپ کو آپ کا رب اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے، (اے محمد!) کیا یہ امر حقیقت نہیں ہے کہ اُس (رب العالمین) نے آپ کو یتیم پایا تو اپنی پناہ میں لے لیا اور آپ کو تلاشِ حق میں سرگرداں پایا تو راہِ راست پر ڈال دیا اور نادار پایا تو غنی کر دیا، لہٰذا (بطورِ شکر) آپ کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے اور نہ کسی سائل کو جھڑکیے اور اپنے رب کے احسانات کو بیان کرتے رہیے۔''

لغوی معانی: وَالضُّحٰی گواہ ہے آفتاب کی روشنی، وَ قسمیہ ہے اور قسم بمعنی گواہی اور شہادت

کے ہوتی ہے، اَلضُّحٰی کے اصل معنی طلوعِ آفتاب کے بعد دھوپ پھیل جانے اور دن چڑھ آنے کے ہیں (مفردات القرآن) وَالَّیْلِ اور گواہ ہے رات، اَلَّیْلِ رات، اِذَا جب، سَجٰی (وہ) چھا جائے، (سَجَا، یَسْجُوْ، سَجْوًا وَ سُجُوًّا) ٹھہرنا، پرسکون ہونا، جیسے کہا جاتا ہے، سَجَا الْبَحْرُ، سمندر پر سکون ہے۔ مَا وَدَّعَکَ نہیں چھوڑا آپ کو (وَدَّعَ، یُوَدِّعُ) چھوڑنا (القاموس الوحید)، رَبُّکَ (رَبُّ.کَ) رب۔آپ کے (نے)، وَمَا اور نہ، قَلٰی (وہ آپ سے) ناراض ہوا، خفا ہوا، فعل ماضی۔واحد مذکر غائب (قَلٰی، یَقْلٰی، قِلًی) کسی کو ناپسند کرتے ہوئے چھوڑ دینا (القاموس الوحید)، وَلَلْاٰخِرَۃُ (لَ. لْاٰخِرَۃُ) ضرور بضرور، آخرت، لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے، خَیْرٌ بہتر ہے، یہ لفظ اردو میں بھی یہی معنی دیتا ہے، لَکَ (لَ.کَ) لیے، آپ کے ''کَ'' ضمیر واحد مذکر مخاطب، جناب نبی کریم ﷺ کی طرف جاتی ہے، مِنَ الْاُوْلٰی سے، ابتدا (یعنی دنیا سے)، وَلَسَوْفَ، وَ اور (لَ.سَوْفَ) ضرور بضرور، عنقریب، لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے، سَوْفَ فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے تو اسے مستقبل قریب کے لیے خاص کر دیتا ہے، کبھی یہ ڈرانے کے لیے آتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: ﴿کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''تم کو پتا چل جائے گا، جلدی تم کو پتا لگ جائے گا (قیامت آیا ہی چاہتی ہے) (القاموس الوحید)، یُعْطِیْکَ (یُعْطِیْ.کَ) عطا کرے گا، فعل مضارع واحد مذکر غائب 'کَ' ضمیر واحد مذکر مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، آپ کو (اَعْطٰی، یُعْطِیْ) عطا کرنا، رَبُّکَ (رَبُّ.کَ) رب، آپ کا، فَتَرْضٰی (فَ.تَرْضٰی) تو آپ راضی ہو جائیں گے۔

﴿اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی﴾

اَ کیا، کلمۂ استفہام، لَمْ نہیں، حرفِ جزم، فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے تو نفی کا معنی دیتا ہے، اسے ماضی کے معنی میں بدل دیتا ہے اور اس کے آخری لفظ کو ساکن کر دیتا ہے، جیسا کہ یَذْهَبُ (وہ جاتا ہے یا جائے گا) لَمْ یَذْهَبْ، وہ نہیں گیا، اَلَمْ یَجِدْکَ کیا نہیں پایا آپ کو (وَجَدَ، یَجِدُ) پانا، اَلْوِجْدَان، شعور، جذبہ، ضمیر، ادراک، اردو میں جانا پہچانا لفظ ہے 'کَ' ضمیر واحد مذکر حاضر، جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، یَتِیۡمًا یتیم، معروف لفظ ہے، نابالغ بچے کا شفقتِ پدری سے محروم ہو جانا، (مفردات القرآن)، فَاٰوٰی (ف.اٰوٰی) تو، اُس رب العالمین نے ٹھکانا بخشا، پناہ میں لے لیا، (اٰوٰی، یُؤْوِیۡ، اِیۡوَاءً) ٹھکانا بخشنا، پناہ میں لے لینا۔

﴿وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی﴾

وَ اور (وَجَدَکَ) اس نے پایا، آپ کو فعل ماضی واحد مذکر غائب ’کَ‘ ضمیر واحد مذکر حاضر جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے، ضَآلًّا گم گشتۂ راہ (ناواقفِ راہ) فَھَدٰی (ف.ھَدٰی) تو، اس نے ہدایت فرمائی، اسلام کی سیدھی اور سچی راہ سے نوازا، قرآن حکیم ایسی عظیم کتاب عطا فرمائی اور نسلِ انسانیت کے لیے آپ کو ہادی اور رہنما بنایا۔

﴿وَوَجَدَکَ عَآئِـلًا فَاَغۡنٰی﴾

وَ اور (وَجَدَکَ) پایا (رب العالمین نے)، آپ کو، عَآئِـلًا تنگ دست (عَالَ، یَعِیۡلُ، عَیۡـلًا) تنگ دست ہونا، نادار ہونا، اس سے اسمِ فاعل ہے: عَآئِلاً، تنگ دست، نادار، فَاَغۡنٰی (ف.اَغۡنٰی) پس، غنی کر دیا اس نے (رب العالمین نے)، کہا جاتا ہے: اَغۡنَی اللّٰہُ فُـلَانًا، اللہ تعالیٰ نے فلاں کو مال دار کر دیا، اَلۡغِنٰی، مالداری، تموّل، یہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے، اَلۡغَنِیُّ مالدار، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے، یعنی وہ کسی معاملے میں کسی کا محتاج نہیں، جبکہ کائنات میں ہر ایک اس کا محتاج ہے۔ (القاموس الوحید)

﴿فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَـلَا تَقۡھَرۡ﴾

فَاَمَّا (فَ.اَمَّا) لہٰذا، جو، اَلۡیَتِیۡمَ یتیم ہو، فَـلَا (ف.لَا) تو، نہ، تَقۡھَرۡ سختی کیجیے (اس پر) فعل نہی واحد مذکر حاضر (قَھَرَ، یَقۡھَرُ، قَھۡرًا) کسی پر غالب ہونا، سختی اور غصہ کرنا، وَ اور، اَمَّا جو کوئی (رہا یہ کہ) حرفِ شرط و تفصیل کہلاتا ہے، اَلسَّآئِلَ اسم فاعل، پوچھنے والا (کوئی مسئلہ، سوال پوچھنے والا) اور مانگنے والا، حاجتمند، فقیر، گداگر، سوال کرنا، فَـلَا (ف.لَا) تو، نہ، تَنۡھَرۡ آپ جھڑکیے (اسے) (نَھَرَ، یَنۡھَرُ) جھڑکنا، سختی سے ڈانٹنا، وَ اَمَّا اور جو، بِنِعۡمَۃِ (بِ.نِعۡمَۃِ) نعمت (ہے)، رَبِّکَ (رَبِّ.کَ)

اپنے، رب کی، فَحَدِّثُ تو اسے بیان کیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر 'ف' پس (تو) حَدَّثَ، یُحَدِّثُ بیان کرنا، ''تحدیثِ نعمت'' نعمت کے ملنے پر اس کا اعتراف کرنا، اردو میں مستعمل ہے۔

روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر کچھ عرصہ کے لیے وحی کا سلسلہ منقطع ہوا تو مخالفین نے یہ اعتراض شروع کر دیا کہ آپ ﷺ کا رب آپ سے ناراض ہو گیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں آپ ﷺ کو تسلی اور تشفی دی کہ نہ تو آپ ﷺ کے رب نے آپ کو چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا ہے بلکہ اپنی حکمت و مصلحت سے جب وہ چاہتا ہے آپ پر جبرائیل امین کے ذریعہ وحی نازل فرماتا ہے۔

عرب کے مشہور سیرت نگار محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

''اللہ اللہ! تجدیدِ وحی سے آپ ﷺ کو کس قدر خوشی حاصل ہوئی، روح میں سکینت بس گئی، لبوں پر مسکراہٹ، دل مسرور اور یاس وخوف، امید و مسرت سے بدل گئے، زبان حمدِ الٰہی اور تقدیسِ رب میں حرکت کرنے لگی، بدن کا رواں رواں شکر و انابت الی اللہ میں مصروف ہو گیا اور مخالفین کا خدشہ دل سے اس طرح دور ہو گیا جیسے انہوں نے کہا ہی نہ تھا۔

اعلانِ رسالت کا اہتمام

لوگوں کو اُس اللہ وحدہ لاشریک لہ کی طرف دعوت دینے کا اہتمام ہونے لگا، جس کے سامنے ارض و سماء کا ایک ایک ذرہ سربسجود ہے، مگر اسے چھوڑ کر ان بتوں کی پوجا کی جاتی ہے جن کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں، پس آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ اسی ایک ذات سے لو لگایئے اور اسی کی اطاعت میں روح کو فنا کر دیجیے ؎

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق — زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اس کے ہیں فرماں، اطاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار، خدمت کے لائق
لگاؤ تو لَو اُس سے اپنی لگاؤ — جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ
اُسی پر ہمیشہ بھروسا کرو تم — اُسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اُسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم — اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم

مبرّا ہے شرکت سے اس کی خدائی   نہیں اُس کے آگے کسی کو بڑائی

آخرت کا سروسامان:

اور یہ جو اس وحی: ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى﴾ فرمایا تو یہ اشارہ ہے اس طرف ہے کہ انسان تمام دنیوی علائق و تعلقات سے بے نیاز ہو کر خود کو رب کائنات کے لیے وقف کر دے کہ اس چند روزہ حیاتِ مستعار میں خالق و مالک سے لو لگا کر حیاتِ جاودانی کا سروسامان ہوتا ہے اور اسی 'آخرت' میں تو نور ''ضحٰی'' کی تابانی آفتابِ درخشاں کے جلوؤں میں صاف دکھائی دیتی ہے اور اس عارضی سفر حیات کے بعد یہی آخرت کا دلکش و پر فرحت مقام بندۂ مومن کی منزل مقصود ہے، یہی حقیقت ہے اور اس کے سوا ہر شے صورت بے معنی! اس حقیقت نے اپنے پرتو سے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی روح کو منور فرمایا اور اسی حقیقت نے آپ ﷺ کو لوگوں کے لیے رب کی طرف دعوت دینے کے لیے آمادہ کیا۔

آخرت میں رب تعالیٰ کے حضور جوابدہی ہی نے نبی ﷺ کو فرائض نبوت کو ٹھیک ٹھیک سر انجام دینے کے لیے آمادہ کیا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے روح و عقیدہ اور جسم و لباس کی طہارت و نظافت لازم قرار پائی اور اسی حقیقت نے آپ ﷺ کو ہر قسم کی برائی سے دور رہنے کا خوگر بنا دیا، نیز راہِ حق میں مصائب و آلام برداشت کرنے کا عادی بنا دیا اور آپ ﷺ کو رب کریم کی طرف سے گم کردہ راہوں کے لیے نورِ علم کی مشعل روشن کرنے کی ہمت و توانائی ملی ۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا   اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا   کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا   پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

پھر دیکھیے! اسی حقیقت و مقصد ''الاٰخِرة'' ہی نے رسول کریم ﷺ کو سائل اور یتیم پر زجر کرنے سے منع کرتے ہوئے جتا دیا کہ آپ ﷺ کا منصب دنیا جہاں کے مال و

دولت سے زیادہ بیش بہا ہے، اسے فراموش کرنا کیسا! ہمیشہ ہمیشہ اس نعمت (رسالت) پر رب العالمین کا شکر ادا کرتے رہیے۔ ﴿وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ﴾ اگرچہ اس نعمت کے بعد دوسری نعمتوں کی فراوانی کی بھی حد نہیں! کہ آپ کو یتیمی میں اپنے دادا (عبدالمطلب) کی سرپرستی حاصل ہوئی اور ان کے بعد عم بزرگوار (ابوطالب) نے آپ کی کفالت فرمائی، آپ ﷺ کی غریبانہ زندگی کا مداوا آپ کی شریکِ زندگی بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مال سے کیا۔ خلوتِ حرا کے زمانہ سے لے کر بعثت کے بعد اپنی زندگی تک نہ صرف آپ کے لیے ان کا مال و دولت ہی قربان تھا، بلکہ وفادار بیوی ہونے کے ساتھ وہ دانشمند، صائب الرائے اور برمحل مشورہ پیش کرنے میں بے مثل تھیں۔

اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت بھی دیکھیے کہ رسول اللہ ﷺ رسالت جیسی نعمتِ بیکراں سے آگاہ نہ تھے، مگر اللہ نے آپ کو اس سے بھی بہرہ مند فرمایا، چاہیے کہ آپ بھی دوسروں پر احسان جتائے بغیر انہیں توحید کی طرف آنے کی دعوت پیش کریں، یہ ہے اللہ تعالیٰ کا وہ امر جس کے لیے اس نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو منتخب فرمالیا اور اس رب کریم نے آپ ﷺ کو ناراض ہو کر فراموش نہ کیا، یعنی:

﴿مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی﴾

فرضیتِ نماز اور دعوت کا آغاز

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی تلقین فرمائی تو آپ ﷺ اور آپ کی رفیقۂ حیات بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا دونوں نے نماز پڑھنا شروع کر دی، فرضیت نماز کے موقع پر علی بن ابی طالب بھی رسول اللہ ﷺ ہی کے دولت کدہ پر آپ ﷺ کی کفالت میں تھے، ہوا یہ کہ قریش کی کاروباری حالت بہت خراب ہوگئی، ابو طالب کثیر العیال ہونے کی وجہ سے اپنے متعلقین کی آسانی سے کفالت پر قادر نہ رہے، رسول اللہ ﷺ کے دوسرے عمِ بزرگوار سیدنا عباس رضی اللہ عنہ تونگر تھے۔ آپ ﷺ نے جناب عباس سے فرمایا:

”اے عمِ بزرگوار! آپ کے بھائی ابو طالب کثیر العیال ہیں اور قریش کی مالی حالت خراب

ہو چکی ہے، ان کے ہاں تشریف لے چلیے، ہم دونوں مل کر ان کا بوجھ ہلکا کرنے کی تجویز کریں، ان کے فرزندوں میں سے ایک صاحبزادہ کو میں اپنے گھر لے آؤں اور ایک کو آپ اپنے ہاں لے جایے۔''

تب سیدنا عباسؓ نے جعفر کا ہاتھ پکڑ لیا اور رسول اللہ ﷺ علی رضی اللہ عنہ کو اپنے ہاں لے آئے اور تب سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد بھی علی رضی اللہ عنہ آپ ہی کے دولت خانہ میں رہے، اسی دوران میں ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ علی باہر سے لوٹے تو آپ ﷺ اور سیدہ خدیجہؓ دونوں نماز پڑھ رہے تھے۔ علی رکوع وسجدہ اور قراءت دیکھ کر بے حد متعجب ہوئے، وہ جہاں کھڑے تھے وہاں سے انہوں نے قدم نہ ہٹایا، نماز ختم ہونے پر علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''آپ دونوں کس کے آگے سجدہ کر رہے تھے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اے علی! ہم یہ سجدہ اس اللہ کے حضور کر رہے تھے، جس نے مجھے نبوت عطا فرما کر لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کا حکم دیا ہے۔''

اور اس کے ساتھ ہی بلا وقفہ کلام رسول اللہ ﷺ نے اپنے عم زاد برادر (علی) سے فرمایا:

''اے علی! اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرو، میری نبوت پر ایمان لاؤ، لات ومنات اور ان جیسے بتوں کی پرستش سے کنارہ کشی اختیار کرو۔''

اس تلقین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے تھوڑا سا قرآن پڑھ کر علی کو سنایا، وہ اس قرآن کی تاثیر میں گھر گئے اور اپنے برادر بزرگ جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ''اتنا وقفہ تو دیجیے کہ میں اپنے والد سے مشورہ کرلوں۔'' علی نے یہ شب گونہ اضطراب میں بسر کی، مگر صبح ہوتے ہی انہوں نے اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس معاملہ میں مجھے اپنے والد سے مشورہ کرنے کی حاجت نہیں۔ الفاظ یہ تھے:

((لَقَدْ خَلَقَنِیَ اللّٰہُ مِنْ غَیْرِ اَنْ یُشَاوِرَ اَبَا طَالِبٍ فَمَا حَاجَتِیْ اِلٰی مُشَاوَرَتِہٖ لِاَعْبُدَ اللّٰہَ))

"اللہ تعالیٰ نے مجھے ابو طالب سے مشورہ کیے بغیر پیدا کیا، تو میں اس کی عبادت کے لیے اپنے باپ سے مشورہ کیوں کروں؟"

اس طرح اظہارِ ایمان کرنے کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ مردوں میں سب سے پہلے مسلمان ہیں۔

زید بن حارثہ کا اسلام:

سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، جو بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے زرخرید غلام تھے، یہ دوسرے شخص ہیں جو ایمان لائے، اب اس زمرہ میں چار مومن داخل ہو گئے (رسول اللہ کے سوا) آپ کی رفیقۂ حیات، سیدنا علیؓ اور سیدنا زیدؓ، اب رسولِ امین کو یہ فکر ہوئی کہ قریش میں اس مہم کا آغاز کس طرح کیا جائے؟ آپ ﷺ کو خطرہ تھا کہ وہ آباواجداد کے دین اور بتوں کی پرستاری آسانی سے ترک نہ کریں گے۔

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:

ابوبکر (ابن ابی قحافہ تیمی) رسول اللہ ﷺ کے دلی دوست تھے، وہ شروع ہی سے رسول اللہ کی نیک دلی، حفظ امانت و صدق مقال کے مداح تھے، رسول اللہ ﷺ کو بھی ابوبکر کے اخلاص و وفا پر بھروسا تھا، چنانچہ آپ نے گھر سے باہر سب سے پہلے ابوبکر ہی کے سامنے اپنی دعوت کا اظہار فرمایا۔ جس میں نبوت اور وحی کے تمام مراحل کا تذکرہ بھی تھا، چنانچہ یارِ وفادار کسی شک و تردد کا اظہار کیے بغیر آپ کی دعوت پر ایمان لے آئے۔

دنیا میں ایسا حق پرست کون ہے جو پتھر کی بنی ہوئی مورتیوں کو اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت پر قربان نہ کر سکے!

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت و رہنمائی سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اپنی پوشاک کی طہارت و نظافت میں کوتاہی نہ کیجیے، سائل کا سوال رد نہ کیجیے اور یتیم بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک روا رکھیے۔ (سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کی طرف اشارہ ہے)

سب سے پہلے مبلغ ابوبکر رضی اللہ عنہ:

ابوبکر رضی اللہ عنہ، مردوجیہ اور پیاری شخصیت کے حامل ہونے کی وجہ سے مرجعِ انام تھے۔ قریش میں انساب (شجرہ ہائے قبائل) میں گہری واقفیت کے حامل، تجارت پیشہ ہونے کی بدولت فارغ البال، فراست اور دانشمندی میں ممتاز، احسان ومروت کا منبع اور قریش میں ذی وقار تھے، وہ توحید کو انسان کے لیے بے کراں سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے دوستوں کو بھی اس نعمتِ لازوال سے بہرہ مند ہونے کی دعوت شروع فرمادی۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تبلیغ کے اثرات:

اُن کی دعوت وتبلیغ سے مندرجہ ذیل جلیل القدر لوگوں نے اسلام قبول کیا:

عثمانؓ بن عفان، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، طلحہؓ بن عبیداللہ، سعدؓ بن ابی وقاص، زبیرؓ بن العوام اور چند دنوں بعد ابوعبیدہ بن جراحؓ، نیز مکہ سے باہر بھی سیدنا ابوبکرؓ کی تبلیغ سے بے شمار لوگ ایمان لے آئے۔

اہل ایمان کی تعلیم وتربیت:

اہل مکہ میں جو لوگ ایمان لاتے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریاب ہوکر اپنے ایمان کا اظہار کرتے اور رسول اللہ ﷺ سے ضروری مسائل اور عقائد واعمال کی تعلیم حاصل کرتے، مگر یہ لوگ قریش سے اپنا اسلام مخفی رکھتے، مبادا بتوں سے ان کی بیزاری مشرکین کو ان کے درپے آزار کردے، وہ ادائے نماز کے لیے پہاڑوں میں چلے جاتے اور وہاں چھپ کر نمازیں پڑھتے۔ اس طرح مسلسل تین سال گزر گئے، مسلمانوں کی تعداد یوماً فیوماً بڑھتی گئی اور اس دوران جو جو آیات نازل ہوئیں ان کی وجہ سے ان کے ایمان واستقلال میں اضافہ ہوتا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے اثرات:

ہر شے سے کہیں زیادہ خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ اخلاق نے لوگوں کو اسلام پر مائل کیا، آپ ﷺ تمام برگزیدہ صفات سے متصف تھے۔ جوہرِ

طینت سے بہرہ مند اور رحم و کرم طبیعت کا خاصہ تھا، تواضع اور ملنساری میں نمایاں، شجاعت و مردانگی میں بے مثل، شیریں گفتاری میں ضرب المثل، عدل پسندی اور مراعاتِ حقوق کی نگہبانی میں پیش پیش، کمزور، مسکین و محتاج اور یتیم پر پدرانہ شفقت کے خوگر، دوستوں کے ساتھ احسان و شفقت اور مروت و مودت میں بے نظیر، یہ تو جلوت کے معمولات تھے، یعنی ؂

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا | مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا | وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ | یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

اور خلوت کا حال سنیے، جونہی شب کی تاریکی دنیا پر چھا جاتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسترِ راحت پر آرام فرمانے کی بجائے عبادت و ریاضت میں مصروف ہو جاتے، خود پر نازل شدہ آیات پر غور فرماتے، کبھی زمین اور آسمان کی وسعتوں کو دیکھ کر خالقِ کائنات کی قدرت پر توجہ اور پھیلی ہوئی کائنات پر غور و فکر کرتے اور پھر ربِ واحد کی کبریائی و عظمت کے تصور میں زندگی کو مفید تر بنانے کے لیے اس کے حضور دعا و مناجات کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ اپنے محبوب قائد کی یہ مصروفیات دیکھ کر مومنین کے ایمان میں دن بدن اضافہ ہوتا، چنانچہ وہ کفار کے عناد اور دشمنی سے بے پروا ہو چکے تھے۔

ایمان لانے والوں میں مکہ کے تجارت پیشہ اور اشراف حضرات کے ساتھ چند غریب و نادار لوگ بھی شامل ہوئے، ان ﴿السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ میں کئی خوش نصیب بیبیاں بھی تھیں۔

اسلام کے متعلق اہل مکہ کی غلط امیدیں:

جناب رسول اللہ ﷺ کا چرچا مکہ کے گھر گھر میں ہونے لگا، اہل مکہ جن کے دلوں میں شقاوت کے پردے پڑے ہوئے تھے، ان کی محفلوں میں چرچے ہونے لگے۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ مسلمان کہلانے والے چند روز میں اپنے بڑوں کے دین میں لوٹ آئیں

گے۔ اُن کے لات و منات، ہبل و عزیٰ ایسے دیوتا اپنے منکروں کو یونہی آوارہ چھوڑے رکھیں گے؟ ہرگز نہیں! وہ ان مسلمان کہلانے والوں کو جلدی اپنے حضور سرنگوں کر کے رہیں گے۔ افسوس! اہل مکہ کو اس کی ہوا بھی نہ لگی تھی کہ ایمانِ صادق پر کوئی طاقت غالب نہیں آ سکتی اور کامیابی صداقت کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اور ربِ کائنات کی طرف سے یہ روشنی پھیل کر رہے گی ع

"پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا" (حیات محمد ﷺ)

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) رب کریم کے ان گنت انعامات میں سے اسلام ایسے پاکیزہ دین کی عطا، خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت، ان پر قرآن حکیم کا نزول اور ان کی حیاتِ طیبہ ہے۔

۲) دعوت وتبلیغ کا اصول یہ ہے کہ اس کی ابتدا اپنے گھر سے کی جائے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"اے ایمان والو بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو نار جہنم سے۔" (التحریم:٦٦/٦)

اُس کے بعد قریبی رشتہ دار، دوست واحباب اور عزیز واقارب آتے ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ترتیب کو قائم رکھا، اہل خانہ کے بعد آپ ﷺ کو حکم ہوا:

"اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔" (الشعراء:٢٦/٢١٤)

اور پھر ساری نسلِ انسانیت کی باری آجاتی ہے:

"اے محمد! کہیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔" (الاعراف:٧/١٥٨)

۳) غور کیجیے کہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ تنِ تنہا اخلاص نیت اور پاکیزہ عمل کے ساتھ دعوتِ اسلام لے کر اٹھتے ہیں، دھیرے دھیرے یہ دعوت پھلتی پھولتی ہے، راہ حق میں زبردست مصائب اور مشکلات پیش آتی ہیں، کفار کے ہاتھوں بے انتہا ظلم اور ستم سہنے پڑتے ہیں اور وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ تحریکِ اسلامی کو زور وزر سے کچل دیں، مگر رب کریم کی طرف سے

اہل ایمان کو صبر و استقامت کی تلقین کی جاتی ہے اور اس خوشخبری سے نوازا جاتا ہے:

''یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پوری طرح پھیلا کر رہے گا، خواہ کفار کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو، وہی (رب واحد ہی) تو ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے دیگر تمام مذاہب پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین ناخوش ہوں۔'' (الصف:۶۱/۸-۹)

۴) خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام کو پھیلانا امتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

''(اے مسلمانو!) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو، جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' (آل عمران:۳/۱۱۰)

۵) افسوس کہ امتِ مسلمہ اس سے غافل ہو چکی ہے، اس غفلت سے نہ صرف اسے نقصان پہنچا ہے، دشمن نے اس کا گھیراؤ کر رکھا ہے اور اسے زبردست نقصان پہنچا رہا ہے، بلکہ دنیا میں امن و سلامتی کا نمائندہ ہونے کے باوجود نسلِ انسانیت اس کے فیض اور عدل سے محروم ہو چکی ہے۔

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے۔

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ

''گناہ سے توبہ کر لینے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے سرے سے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔''

داعی الی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ○ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○ فَاِنۡ عَصَوۡکَ فَقُلۡ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ﴾ (الشعراء: ٢٦/٢١٤-٢١٦)

”(اے نبی!) اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو (عذابِ آخرت) سے ڈرایے اور مومنوں میں سے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں ان سے لطف و کرم کا سلوک کیجیے، جو لوگ آپ کے کہنے پر عمل نہ کریں تو ان سے صاف کہہ دیجیے کہ میں تمہارے اعمال سے بری الذمہ ہوں“

وَاَنۡذِرۡ اور آپ ڈرایے، فعل امر، واحد مذکر (اَنۡذَرَ، یُنۡذِرُ، اِنۡذَارًا) کسی کو کوئی بات بتا کر چوکنا کرنا اور ڈرانا، آگاہ کرنا، انجام سے باخبر کرنا، اَلاِنۡذَار آگاہی، تنبیہ (القاموس الوحید) عَشِیۡرَتَکَ (عَشِیۡرَۃَ. کَ) قبیلے، برادری، اپنے کو۔ ”کَ“ ضمیر واحد مذکر مخاطب جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، اَلۡاَقۡرَبِیۡنَ یعنی اپنے قریبی لوگوں کو اَلۡاَقۡرَبُ نزدیک ترین اور قریبی رشتہ دار، اس کی جمع اَلۡاَقۡرَبُوۡنَ ہے، وَاخۡفِضۡ اور جھکا دیجیے، فعل امر، واحد مذکر، (خَفَضَ، یَخۡفِضُ، خَفۡضًا) نرم ہونا، خَفَضَ فُلَانٌ جَنَاحَہٗ لِلنَّاس لوگوں سے تواضع، نرم خوئی اور بردباری سے پیش آنا (القاموس الوحید) جَنَاحَکَ (جَنَاحَ. کَ) بازو۔ اپنا، ’کَ‘ ضمیر واحد مخاطب جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، لِمَنۡ (لِ. مَنۡ) لیے، ان (لوگوں) کے، جو (جنہوں)، اِتَّبَعَکَ (اِتَّبَعَ. کَ) پیروی کی (اتبّاع کیا) آپ کا (اِتَّبَعَ، یَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا) پیروی کرنا، اتباعِ رسول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہونا، اِتَّبَعَ الْقُرْآنَ وَ الْحَدِیْثَ، قرآن و حدیث پر عمل کرنا، مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ مومنوں میں سے، فَاِنْ (فَ. اِنْ) پھر، اگر (یہ لوگ) عَصَوْکَ (عَصَوْا. کَ) نافرمانی کریں۔ آپ کی، (عَصَا، یَعْصِیْ، مَعْصِیَۃً وَ عِصْیَانًا) نافرمانی کرنا، معصیت، نافرمانی اردو میں استعمال ہوتا ہے، 'کَ' ضمیر واحد مخاطب جناب نبی ﷺ کی طرف جاتی ہے، فَقُلْ (فَ. قُلْ) تو، آپ ﷺ فرما دیجیے، اِنِّیْ بلاشبہ میں، بَرِیْٓءٌ بری ہوں (میری کوئی ذمہ داری نہیں)، مِّمَّا (مِنْ. مَا) اس سے۔ جو، تَعْمَلُوْنَ تم عمل کرتے ہو، فعل مضارع جمع مذکر مخاطب، (عَمِلَ، یَعْمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا عَمِلَ بِالْقُرْآنِ وَالسُّنَّۃِ، قرآن وسنت پر عمل پیرا ہونا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے دعوت وتبلیغ کو ابتدائی تین برس صرف افراد تک محدود رکھا، جس کے نتیجہ میں نیک دل اور پاکیزہ طینت لوگ اسلام کے پرچم تلے جمع ہو گئے اور صالحین کا یہ گروہ اس قابل ہو گیا کہ اب اس دعوت کا برملا اعلان کیا جائے، آپ ﷺ کو رب کریم کا حکم ہوتا:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ (الحجر:۱۵/۹٤)

''(اے نبی!) اپنی دعوت کو آشکار کر دیجیے اور شرک کرنے والوں کی ذرا بھی پروا نہ کیجیے۔''

چنانچہ اس ترتیب میں قریبی رشتہ دار سب سے پہلے آتے ہیں۔

تبلیغ کے لیے دعوتِ طعام کا اہتمام:

محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام قرابت داروں کو دعوتِ طعام کے لیے دولت خانہ میں جمع کر کے توحید کی دعوت دی، جن میں سے آپ ﷺ کے چچا ابولہب دورانِ کلام ہی آتشِ زیر پا ہو کر بڑ بڑا اٹھے اور لوگوں کو بہکا کر اپنے ساتھ لے نکلے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کا ایک موقع اور نکالا، دوبارہ انہیں دولت خانہ پر جمع کیا، جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

''اہل عرب میں سے آج تک کوئی شخص مجھ سے بہتر پیغام نہیں لایا، یہ پیام دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بھلائی کا راہنما ہے، اس پیام میں اللہ نے مجھے بتایا ہے کہ میں آپ لوگوں کو اس

کی طرف بلاؤں، آپ میں کون میرا پیام قبول کرتا ہے؟“

یہ سن کر تمام حاضرین نے منہ پھیر لیا اور اٹھ کر اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ مجلس میں علی بن ابی طالب بھی تشریف فرما تھے جو ابھی بالغ بھی نہ ہوئے تھے مگر ہمت اور جاں نثاری کا یہ عالم تھا کہ بھری مجلس میں لبیک کہتے ہوئے عرض کیا:

((أَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَوْنُكَ، أَنَا حَرْبٌ عَلٰى مَنْ حَارَبَكَ))

”یا رسول اللہ! میں آپ کی یاوری کروں گا اور جو شخص آپ سے جنگ کرے گا، میں اس سے جنگ کروں گا۔“

بنو ہاشم میں سے بعض اشخاص سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ان کلمات پر حقارت سے مسکرا اٹھے، بعض ہنس دیے، کسی نے ابوطالب کی طرف دیکھا، کسی نے علیؓ کے چہرے پر نظریں جمائیں، اس طرح سب کے سب تمسخر اڑاتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔

کوہِ صفا کی منادی:

اس حلقے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ میں علانیہ دعوت شروع فرما دی، ایک روز کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند قریش! قریش! کہہ کر پکارا۔ انہوں نے سنا تو امنڈ کر آ گئے اور آپ سے پکارنے کی وجہ دریافت کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

”اے قریش! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب میں ایک لشکر جرار چھپا بیٹھا ہے تو تم میری بات کی تصدیق کرو گے؟“

قریش نے جواب دیا:

((نَعَمْ، اَنْتَ عِنْدَنَا غَيْرُ مُتَّهِمٍ وَ مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا قَطُّ))

”ہاں! آپ کی بات کو صحیح تسلیم کریں گے، کیوں کہ آپ (ﷺ) نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں ہے۔“

کہا لوگوں نے ہاں سچا ہے تو، یہ جانتے ہیں سب
تو بچپن ہی سے صادق ہے، امیں ہے، جانتے ہیں سب

بھلا اس قول پر کیسے یقین ہم کو نہ آئے گا
بلا چوں و چرا مانیں گے کوئی شک نہ لائے گا

تو ارشاد ہوا:

''(دوستو!) تم پر عذاب نازل ہونے سے پہلے میں تمھیں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، اے بنو عبدالمطلب! اے خاندانِ عبد مناف! اے ابنائے زہرہ! اے اولادِ تیم! اے قبیلۂ مخزوم! اے فرزندانِ اسد! سب حضرات غور سے سنیں! کہ اللہ نے مجھے اپنے یک جدی قرابت داروں کو عذابِ آخری سے متنبہ کرنے کا حکم دیا ہے، اگر آپ لوگوں نے اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت نہ کی تو میری قرابت داری دنیا اور عقبیٰ کسی میں بھی کام نہ آسکے گی ۔

جہالت چھوڑ دو قرآن پر ایمان لے آؤ
بتوں کو توڑ دو رحمٰن پر ایمان لے آؤ
اگر ایمان لے آؤ تو بچ جاؤ گے، اے لوگو!
فلاحِ دنیوی و اُخروی پاؤ گے، اے لوگو!
نہ مانو گے تو بربادی کا بادل چھانے والا ہے
براوقت آنے والا ہے، براوقت آنے والا ہے

ابولہب کا شعلۂ حسد:

ابولہب (از قبیلہ ہاشم) جو اپنے بڑوں کے دین پر مضبوطی سے قائم تھا اور غضب وغصہ میں شعلۂ جوالہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ پر اس کی زبان سے نکلا:

((تَبًّا لَّکَ سَائِرَھٰذَا الْیَوْمِ، اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَاَ))

''(نعوذ باللہ) تو سدا برباد رہے، کیا اسی لیے تم نے ہمیں یہاں جمع کیا تھا۔''

اُس کی زبان سے یہ کلمات سن کر رسول اللہ ﷺ حیران رہ گئے (الٰہی! میرا چچا کیا کہہ رہا ہے، چنانچہ) ذرا وقفہ کے بعد وحی نازل ہوئی:

﴿ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ○ مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ○ سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ (اللھب:۱۱۱/۱-۳)

''(اے نبی!) ابولہب خود ہی سدا کے لیے تباہ ہوگیا، اس کا مال اور کوشش کوئی اس کی یاوری نہ کرسکیں گے، عنقریب ایسی آگ سے اسے دوچار ہونا ہے جس کے شعلے اسے بھسم

کردیں گے۔''

چنانچہ ابولہب کا غیظ وغضب اور اس کے یارانِ طریقت کی تدبیریں اہل مکہ کو اسلام لانے سے نہ روک سکیں، کوئی دن ایسا نہ تھا جب ان میں سے تھوڑے بہت لوگ اسلام میں داخل نہ ہوتے، یہ نفوسِ قدسیہ سلامتی کے اس حصار میں داخل ہوتے ہی دنیا کی طرف پشت کر کے اسلام پر اس طرح متوجہ ہوتے کہ نہ ان کی تجارت انہیں احکامِ الٰہی کی تعمیل سے روک سکتی اور نہ ان کی خرید وفروخت ان کے خلوص وتقویٰ میں رخنہ انداز ہونے پاتی، انہوں نے اپنے رہنما کی ہر بات پر بلا تردد عمل کرنا اپنا وظیفۂ حیات سمجھا، قرآن حکیم نے ایسے ہی ابرار وصالحین کے بارے میں خبر دی ہے:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوۡنَ يَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِيۡهِ الۡقُلُوۡبُ وَالۡاَبۡصَارُ﴾ (النور:۲٤/۳۷)

(ان صالحین کا حال یہ ہے) کہ جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی، وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے تک نوبت آ جائے گی۔

بلکہ میدان جنگ میں عین توپوں اور ٹینکوں کی گھن گرج کے درمیان بھی ان کا حال یہ ہوتا ہے ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایمان لانے والوں نے آپ ﷺ کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا کہ نہ تو آپ کو اپنی رفیقۂ حیات کی دولت کی طمع ہے اور نہ اپنے لیے مال وزر جمع کرنے کی ہوس، ان کی دولت تو غربا ومساکین پر صرف ہوتی اور یتامیٰ و بیوگان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی آپ کی زندگی کے بلندترین مقاصد کا حصہ تھے، پھر غور کیجیے! آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی جس میں مال وزر کو روحانیت کے لیے روگ بتایا گیا، ارشاد تھا:

﴿اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ○ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ○ ثُمَّ كَلَّا

سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ۝ (التکاثر: ١٠٢/١-٤)

’’(لوگو! زر اور زمین کی) بہتات کی حرص نے تمہیں (آخرت سے) غافل کر رکھا ہے، (اسی نشۂ تغافل میں) تم اپنی قبروں میں پہنچ جاتے ہو (ہوش میں آ جاؤ) تم جلدی ہی (اس غفلت کا مآل) دیکھ لو گے، تمھیں (پھر تاکید کی جاتی ہے کہ ہوش میں آ جاؤ) تم ہر حال میں اس کا انجام دیکھ کر رہو گے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے جس لازوال نعمت کی دعوت پیش کی، اس سے کون سا مال و جاہ بہتر ہوسکتا ہے اور یہ حریت اور آزادی کی نعمت تھی، یہ اہل عرب کے لیے عزتِ نفس اور بقائے دوام کا گنجِ گرانمایہ تھا، کیا رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو شرک کی ادنیٰ سے ادنیٰ قسم سے آزاد نہیں کیا؟ کیا ان بے مایہ بتوں کو جو رب واحد کی پرستاری میں مانع تھے، انہیں ملیا میٹ نہیں کیا؟ آپ نے لوگوں کے دل سے ہبل و لات، عزیٰ و منات جیسے فرضی معبودانِ باطل کی ہیبت حرفِ غلط کی طرح مٹا دی، مجوسیوں کے آتش کدوں کے صد سالہ الاؤ نم آلود ہو گئے۔ اہل مصر کی آفتاب پرستی کا ولولہ ماند پڑ گیا، ستاروں کے پجاری خالق کائنات کے حضور سجدہ ریز نظر آنے لگے، ان انسانوں نے فرشتوں اور جنوں کی تقدیس کا دامن پارہ پارہ کر دیا جن کی پرستش کی جاتی تھی اور جو صدیوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان حجابِ اکبر بنے ہوئے تھے۔ اس نبی ﷺ نے پرستشِ اعمال کی مختاری پر صرف ایک ذاتِ مطلق کی تعلیم دی، لوگوں کو بتایا کہ ان کی وہ نیکیاں شفاعت کریں گی جن کا وزن خود اُن کے ترازو نے راجح قرار دیا ہو، اس نے فرمایا کہ خود انسان کا ضمیر اس کے ایک ایک سانس پر اس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے اور آخرت کا محاسبہ بھی اسی ضمیر کی روشنی میں ہوگا ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ ایسی حریت ہے جس کی دعوت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، اگر اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو تردد ہو تو اسے اپنی آزادی کے حدود و معاملات کے مقابلہ میں جانچ کر دیکھ لے، کیا ابولہب اور اس کے ہمدم، لوگوں کو اسلام ہی کی متوازن و متساوی آزادی کی دعوت دے رہے تھے؟ یا

لوگوں کو غیر اللہ کی پرستش پر قائم رکھنے کے لیے خود کو بھی ہلاک کر رہے تھے، وہ جن کے خرافات دلائل، صدیوں سے نورِ حق اور ضیائے ہدایت کے درمیان حجاب بنے ہوئے تھے ۔

بہت اس طرح ان کو گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

حق کا واشگاف اعلان اور مشرکین کا ردعمل:

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ لکھتے ہیں:

جب اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا:

﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ﴾ (الحجر:۱۵/۹٤)

"(اے نبی!) آپ کو حکم ملا ہے، اسے کھول کر بیان کر دیجیے اور مشرکین سے رخ پھیر لیجیے۔"

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے شرک کی خرافات و اباطیل کا پردہ چاک کرنا اور بتوں کی حقیقت کو واشگاف کرنا شروع کر دیا، آپ ﷺ مثالیں دے دے کر سمجھاتے کہ یہ کس قدر عاجز اور ناکارہ ہیں اور دلائل سے واضح فرماتے کہ جو شخص انہیں پوجتا ہے اور ان کو اپنے اور اللہ کے درمیان وسیلہ بناتا ہے، وہ کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

مکہ ایک ایسی آواز سن کر جس میں مشرکین کو گمراہ کہا گیا تھا، احساسِ غضب سے پھٹ پڑا اور شدتِ استغراب و استنکار سے موج مارنے لگا، گویا بجلی کا کڑکا تھا جس نے پرسکون فضا کو ہلا کر رکھ دیا ۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

قریش اٹھ پڑے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غیر اللہ کی الوہیت کے انکار اور رسالت و آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس رسالت کے حوالے کر دیا جائے اور اس کی بے چوں و چرا اطاعت کی جائے، یعنی اس طرح کہ دوسرے تو درکنار خود اپنی جان اور اپنے مال تک کے بارے میں کوئی اختیار نہ رہے اور اس کے معنی یہ تھے کہ مکہ والوں کو دینی رنگ میں اہل عرب کو، جو بڑائی اور سرداری حاصل تھی، اس کا صفایا ہو جائے گا اور اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مقابل میں انہیں اپنی مرضی پر عمل پیرا ہونے کا اختیار نہ رہے گا، یعنی نچلے طبقے پر انہوں نے جو مظالم روا رکھے تھے اور صبح و شام جن برائیوں میں لت پت رہتے تھے ان سے دستکش ہوتے ہی بنے گی، قریش اس مطلب کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے، اس لیے ان کی طبیعت اس ''رُسوا کُن'' پوزیشن کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی، لیکن یہ بات کسی شرف اور خیر کے پیشِ نظر نہ تھی:

﴿بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ﴾ (القیامہ:۷۵/۵)

''بلکہ (خبثِ نفس کا شکار) انسان چاہتا ہے کہ آئندہ بھی برائی کرتا رہے۔''

قریش یہ سب کچھ کہہ رہے تھے، لیکن مشکل یہ آن پڑی تھی کہ ان کے سامنے ایک ایسا شخص تھا جو صادق و امین تھا، انسانی اقدار اور مکارمِ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھا اور ایک طویل عرصہ سے انہوں نے اپنے آبا و اجداد کی تاریخ میں اس کی نظیر نہ دیکھی تھی اور نہ سنی، آخر اس کے بالمقابل کریں تو کیا کریں؟ قریش حیران تھے اور انہیں واقعی حیران ہونا چاہیے تھا۔

کافی غور و خوض کے بعد ایک راستہ سمجھ میں آیا کہ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس جائیں اور مطالبہ کریں کہ وہ آپ کو آپ کے کام سے روک دیں، پھر انہوں نے اس مطالبے کو حقیت و واقعیت کا جامہ پہنانے کے لیے یہ دلیل تیار کی کہ ان کے معبودوں کو چھوڑنے کی دعوت دینا اور کہنا کہ یہ معبود نفع و نقصان پہنچانے یا اور کچھ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے درحقیقت ان معبودوں کی سخت توہین اور بہت بری گالی ہے اور یہ ہمارے آبا و اجداد کو

احمق اور گمراہ قرار دینے کے بھی ہم معنی ہے جو اسی دین پر گزر چکے ہیں۔ قریش کو یہی راستہ سمجھ میں آیا اور انہوں نے بڑی تیزی سے اس پر چلنا شروع کر دیا۔

قریش کا وفد ابو طالب کی خدمت میں:

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اشرافِ قریش سے چند آدمی ابو طالب کے پاس گئے اور بولے:

"اے ابوطالب! آپ کے بھتیجے نے ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا ہے، ہمارے دین کی عیب چینی کی ہے، ہماری عقلوں کو حماقت زدہ کہا ہے اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ قرار دیا ہے، لہٰذا یا تو آپ انہیں اس سے روک دیں یا ہمارے اور ان کے درمیان سے ہٹ جائیں، کیونکہ آپ بھی ہماری ہی طرح ان سے مختلف دین پر ہیں، ہم ان کے معاملے میں آپ کے لیے بھی کافی رہیں گے۔"

اس کے جواب میں ابو طالب نے نرم بات کہی اور راز دارانہ لب ولہجہ اختیار کیا، چنانچہ وہ واپس چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ اپنے سابق طریقے پر رواں دواں رہتے ہوئے اللہ کا دین پھیلانے اور اس کی تبلیغ کرنے میں مصروف رہے۔

ابو طالب سے ناکام لوٹنے کے بعد قریش نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف مختلف تدابیر اختیار کیں جسے آئندہ بیان کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ!

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) غور کیجیے کہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ جس عزمِ راسخ، صبر و استقامت، ہمت و استقلال اور جوش و ولولہ سے پیغامِ حق لے کر اٹھے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت ہر لمحہ اور ہر ساعت آپ کے ساتھ رہی، دعوت و تبلیغ کے تمام مراحل میں حالات نامساعد اور ناموافق ہونے کے باوجود بخیر وخوبی سرانجام پاتے رہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ حق پھیلانے میں مشکلات اور مصائب کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا یقینِ کامل رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے جو اس کا دین سر بلند کرنے کے لیے

اٹھیں اور خالص اسی کے ہو کر رہیں۔

۲) پھر غور کیجیے! دعوت و تبلیغ میں ترتیب کیا ہونی چاہیے اور داعی الی اللہ کو کیسا ہونا چاہیے، جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ قرآن حکیم کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، آپ کے اخلاقِ حسنہ دلوں کو موہ رہے تھے، دعوت کا آغاز اپنے گھر سے ہوا، پھر قریبی دوست احباب، عزیز و اقارب اور دور و نزدیک کے لوگ اہل ایمان کی صف میں داخل ہوتے گئے اور حجۃ الوداع کو جب آپ میدانِ عرفات میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو ایک لاکھ سے اوپر فرزندانِ توحید کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا اور آج کل موسمِ حج میں اطرافِ عالم سے آئے ہوئے چالیس پچاس لاکھ کا مجمع ہوتا ہے۔ الحمدللہ!

جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ

(صحیح البخاری)

”جو کوئی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ ہمیشہ کلمۂ خیر اپنی زبان سے ادا کرے ورنہ خاموش رہے۔“

نڈر داعی الی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ○ اِنَّا كَفَيۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَ﴾

''(اے نبیؐ!) جس بات کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے صاف صاف سنا دیجیے اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کیجیے، ہم آپ کی طرف سے ان مذاق اڑانے والوں (کی خبر لینے) کے لیے کافی ہیں۔'' (الحجر: ۱۵/۹۴-۹۵)

فَاصۡدَعۡ (ف. اصۡدَعۡ) پس آپ کھول کر سنا دیں، فعل امر واحد مذکر حاضر (صَدَعَ، يَصۡدَعُ، صَدۡعًا) اظہار کرنا، اعلان کرنا بِمَا (بِ.مَا) اس بات کا کہ، تُؤۡمَرُ (جس کا) آپ کو حکم دیا گیا ہے، فعل مضارع واحد مذکر مجہول (اَمَرَ، يَأۡمُرُ، اَمۡرًا) حکم دینا، وَاَعۡرِضۡ اور آپ اعراض کیجیے، فعل امر واحد مذکر (اَعۡرَضَ، يُعۡرِضُ، اِعۡرَاضًا) اَعۡرَضَ عَنۡهُ، منہ پھیرنا، بات پر توجہ نہ دینا، عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ مشرکوں سے، اِنَّا بلا شبہ ہم، كَفَيۡنٰكَ (كَفَيۡنَا.كَ) کافی ہیں ہم، آپ کے لیے یعنی رب کریم کا ارشاد ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ کے لیے کافی ہیں، اللہ تعالیٰ رب واحد ہے اور جمع متکلم کا صیغہ بطور عزت کے آتا ہے، اَلۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَ استہزا (مذاق) کرنے والوں (کی خبر لینے کے لیے)۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ لکھتے ہیں:

''اُن ہی دنوں قریش کے سامنے ایک مشکل آن کھڑی ہوئی، ابھی کھلم کھلا تبلیغ پر چند ہی مہینے گزرے تھے کہ موسمِ حج قریب آ گیا، قریش کو معلوم تھا کہ اب عرب کے وفود کی آمد

شروع ہو گی، اس لیے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ نبی ﷺ کے متعلق کوئی ایسی بات کہیں جس کی وجہ سے اہل عرب کے دلوں پر آپ ﷺ کی تبلیغ کا اثر نہ ہو، چنانچہ وہ اس بات پر گفت وشنید کے لیے ولید بن مغیرہ کے پاس اکٹھے ہوئے، ولید نے کہا اس بارے میں تم سب لوگ ایک رائے اختیار کر لو۔ تم میں باہم کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے کہ خود تمہارا ہی ایک آدمی دوسرے آدمی کی تکذیب کرے اور ایک کی بات دوسرے کی بات کو کاٹ دے۔ لوگوں نے کہا: تم ہی کہو، اس نے کہا: نہیں تم لوگ کہو، میں سنوں گا۔ اس پر چند لوگوں نے کہا: ہم کہیں گے وہ کاہن ہے، ولید نے کہا: واللہ! وہ کاہن نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، اس شخص کے اندر نہ کاہنوں جیسی گنگناہٹ ہے نہ ان کے جیسی قافیہ گوئی اور تک بندی۔ اس پر لوگوں نے کہا: تب ہم کہیں گے کہ وہ پاگل ہے، ولید نے کہا: نہیں وہ پاگل بھی نہیں، ہم نے پاگل بھی دیکھے ہیں، اس شخص کے اندر نہ پاگلوں جیسی دم گھٹنے کی کیفیت ہے اور نہ الٹی سیدھی حرکتیں ہیں اور نہ ان جیسی بہکی بہکی باتیں۔ لوگوں نے کہا: تب ہم کہیں گے کہ وہ شاعر ہے، ولید نے کہا وہ شاعر بھی نہیں، ہمیں رجز، ہجز، قریض، مقبوض، مبسوط سارے ہی اصنافِ سخن معلوم ہیں، اس کی بات بہر حال شعر نہیں ہے۔

لوگوں نے کہا: تب ہم کہیں گے کہ وہ جادوگر ہے، ولید نے کہا: وہ شخص جادوگر بھی نہیں، ہم نے جادوگر اور ان کا جادو بھی دیکھا ہے، وہ شخص نہ تو ان کی طرح جھاڑ پھونک کرتا ہے اور نہ گرہ لگاتا ہے۔ لوگوں نے کہا: تب ہم کیا کہیں گے؟ ولید نے کہا: واللہ! اس کی بات بڑی شیریں ہے، اس کی جڑ پائیدار ہے اور اس کی شاخ پھلدار، تم جو بات بھی کہو گے لوگ اسے باطل سمجھیں گے، البتہ اس کے بارے میں سب سے مناسب بات یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ جادوگر ہے، اس نے ایسا کلام پیش کیا ہے جو جادو ہے اس سے باپ بیٹے، بھائی بھائی، شوہر بیوی اور کنبے قبیلے میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ بالآخر لوگ اس تجویز پر متفق ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

بعض روایات میں یہ تفصیل بھی مذکور ہے کہ جب ولید نے لوگوں کی ساری تجاویز رد کر دیں تو

لوگوں نے کہا: پھر تم ہی اپنی بے داغ رائے پیش کرو، اس پر ولید نے کہا: ذرا سوچ لینے دو، اس کے بعد وہ سوچتا رہا یہاں تک کہ اپنی مذکورہ بالا رائے ظاہر کی۔

اس معاملے میں ولید کے متعلق ''سورۂ مدثر'' کی سولہ آیات (۱۱ تا ۲۶) نازل ہوئیں، جن میں سے چند آیات کے اندر اس کے سوچنے کی کیفیت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾ (المدثر:۷۴/۱۸-۲۵)

''اس نے سوچا اور اندازہ لگایا، وہ غارت ہو۔ اُس نے کیا اندازہ لگایا، پھر غارت ہو۔ اس نے کیسا اندازہ لگایا، پھر نظر دوڑائی، پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بسورا، پھر پلٹا اور تکبر کیا، آخر کار کہا کہ یہ نرالا جادو ہے، یہ پہلے سے نقل ہوتا آ رہا ہے، یہ تو محض انسان کا کلام ہے۔''

بہر حال یہ قرار داد طے پا چکی تو اسے جامۂ عمل پہنانے کی کارروائی شروع ہوئی، کچھ کفّارِ مکہ عازمینِ حج کے مختلف راستوں پر بیٹھ گئے اور وہاں سے ہر گزرنے والے کو آپ ﷺ کے ''خطرے'' سے آگاہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کے متعلق تفصیلات بتانے لگے۔

اس کام میں سب سے زیادہ پیش پیش ابو لہب تھا، وہ حج کے ایام میں لوگوں کے ڈیروں اور عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا، آپ ﷺ اللہ کے دین کی تبلیغ کرتے اور ابولہب پیچھے پیچھے یہ کہتا کہ اس کی بات نہ ماننا (نعوذ باللہ) یہ جھوٹا بے دین ہے۔

اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس حج سے اپنے گھروں کو واپس ہوئے تو ان کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ آپ ﷺ نے دعوائے نبوت کیا ہے اور یوں ان کے ذریعہ پورے عرب میں آپ ﷺ کا چرچا پھیل گیا۔

محاذ آرائی کے مختلف انداز:

جب قریش مکہ نے دیکھا کہ محمد ﷺ کو تبلیغِ دین سے روکنے کی حکمت کارگر نہیں ہو رہی تو ایک

بار پھر انہوں نے غور وخوض کیا اور آپ ﷺ کی دعوت کا قلع قمع کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے، جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱- ہنسی، ٹھٹھا، تحقیر، استہزاء اور تکذیب، اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو بد دل کر کے ان کے حوصلے توڑ دیے جائیں۔ اس کے لیے مشرکین نے نبی ﷺ کو طرح طرح سے سب وشتم کا نشانہ بنایا جس کا قرآن اس طرح ذکر کرتا ہے:

﴿وَ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِىْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ﴾ (الحجر:۱۵/۶)

''(یہ قریش مکہ کہتے ہیں) اے وہ شخص! جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل ہوا ہے (نعوذ باللہ) آپ یقیناً دیوانہ ہیں۔''

اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادوگر اور جھوٹے ہونے کا الزام لگاتے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ﴾ (ص:۳۸/۴)

''(ان لوگوں، یعنی قریش مکہ) کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آ گیا، (تو یہ منکرین کہنے لگے) آپ ساحر ہیں، جھوٹے ہیں۔''

یہ کفار آپ کے آگے پیچھے غضب، انتقامانہ نگاہوں اور بھڑکتے ہوئے جذبات کے ساتھ چلتے تھے، ارشاد ہے:

﴿ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ (القلم:۶۸/۵۱)

''جب یہ کفار کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو آپ ﷺ کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا آپ کے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے۔''

جب آپ ﷺ کسی جگہ تشریف فرما ہوتے اور آپ کے اردگرد کمزور اور مظلوم صحابۂ کرامؓ موجود ہوتے تو انہیں دیکھ کر مشرکین استہزا کرتے ہوئے کہتے:

﴿اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا﴾ (الانعام:۶/۵۳)

''کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل وکرم ہوا؟''

جواباً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا:

﴿اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰکِرِیۡنَ﴾ (الانعام:٦/٥٣)

''ہاں! کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟''

عام طور پر مشرکین کی کیفیت وہی تھی جس کا نقشہ ذیل کی آیات میں کھینچا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا کَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ ۝ وَاِذَا مَرُّوۡا بِہِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ ۝ وَاِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَہۡلِہِمُ انۡقَلَبُوۡا فَکِہِیۡنَ ۝ وَاِذَا رَاَوۡہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ ۝ وَمَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَیۡہِمۡ حٰفِظِیۡنَ﴾ (المطففین:٨٣/٣٣)

''مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے، جب ان کے پاس سے (اہل ایمان) گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے، جب (یہ کفار) اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے اور پھر جب (اہل ایمان) کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں، حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر بھیجے گئے ہیں۔''

محاذ آرائی کی دوسری صورت:

آپ کی تعلیمات کو مسخ کرنا، شکوک وشبہات پیدا کرنا، جھوٹا پروپیگنڈہ کرنا، تعلیمات سے لے کر شخصیت تک کو واہیات اعتراضوں کا نشانہ بنانا اور یہ سب اس کثرت سے کرنا کہ عوام کو آپ کی دعوت و تبلیغ پر غور کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے، چنانچہ یہ مشرکین قرآن کے متعلق جو کہتے تھے، خود قرآن نے اس کا ذکر کیا ہے:

﴿وَقَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَہَا فَہِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡہِ بُکۡرَۃً وَّاَصِیۡلًا﴾ (الفرقان:٢٥/٥)

''(یہ کفار) کہتے ہیں: ''یہ پرانے لوگوں کے افسانے ہیں''، جنہیں آپ ﷺ نے لکھوا لیا ہے اور وہ انہیں صبح وشام سنائے جاتے ہیں۔''

کبھی کہتے:

﴿اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکُ ۨافۡتَرٰىہُ وَاَعَانَہٗ عَلَیۡہِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ﴾ (الفرقان:٢٥/٥)

''یہ (قرآن) ایک من گھڑت چیز ہے، جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ

دوسرے لوگوں نے اس کام میں ان کی مدد کی ہے۔“

اور کبھی مشرکین یہ کہتے:

﴿اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ﴾ (النحل:۱۶/ ۱۰۳)

”یہ (قرآن) تو آپ کو ایک شخص سکھاتا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ پر ان کا ایک اعتراض یہ تھا:

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان:۲۵/ ۷)

”یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔“

قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر مشرکین کے ان اعتراضات کا رد کیا گیا ہے۔

محاذ آرائی کی تیسری صورت:

پہلوں کے واقعات اور افسانوں سے قرآن کا مقابلہ کرنا اور لوگوں کو اسی میں الجھائے اور پھنسائے رکھنا۔ چنانچہ نضر بن حارث کا واقعہ ہے کہ اس نے ایک بار قریش سے کہا: ”قریش کے لوگو! واللہ! تم پر ایسی افتاد پڑی ہے کہ تم لوگ اب تک اس کا کوئی توڑ نہیں لا سکے، محمدؐ تم میں جوان تھے تو تمہارے سب سے پسندیدہ آدمی تھے، سب سے زیادہ سچے اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھے، اب جبکہ ان کی کنپٹیوں پر سفیدی دکھائی پڑنے کو ہے (یعنی ادھیڑ عمر ہو چکے ہیں) اور وہ تمہارے پاس کچھ باتیں لے کر آئے ہیں تو تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہیں اور کبھی کہتے ہو وہ کاہن ہیں، شاعر ہیں اور کبھی انہیں دیوانہ بناتے ہو، یقین جانو ان میں سے وہ کوئی بھی نہیں ہیں، کیونکہ ہم نے اس اصناف کے سارے لوگوں کو دیکھا اور پرکھا ہے۔“

اس کے بعد نضر بن حارث حیرہ گیا، وہاں بادشاہوں کے واقعات اور رستم و اسفند یار کے قصے سیکھے، پھر واپس آیا تو جب رسول اللہ ﷺ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ کی باتیں کرتے اور اس کی گرفت سے لوگوں کو ڈراتے تو آپ کے بعد یہ شخص وہاں پہنچ جاتا اور کہتا ”واللہ! محمد کی باتیں مجھ سے بہتر نہیں۔“ اس کے بعد وہ فارس کے بادشاہوں اور رستم و اسفند یار کے قصے سناتا، پھر کہتا: ”آخر کس بنا پر محمدؐ کی بات مجھ سے بہتر ہے!“ قرآن حکیم اس کی

اس خرافات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَهۡوَ الۡحَدِیۡثِ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ﴾ (لقمان:۳۱/۶)

’’کچھ لوگ ایسے ہیں جو کھیل کی باتیں خریدتے ہیں تا کہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں۔‘‘

محاذ آرائی کی چوتھی صورت:

سودے بازیاں جن کے ذریعے مشرکین کی یہ کوشش تھی کہ اسلام اور جاہلیت دونوں بیچ راستے میں ایک دوسرے سے جاملیں یعنی ’کچھ لو اور کچھ دو‘ کے اصول پر اپنی بعض باتیں مشرکین چھوڑ دیں اور بعض باتیں نبی ﷺ چھوڑ دیں۔ قرآن حکیم میں اس بات کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

﴿وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَیُدۡهِنُوۡنَ﴾ (القلم:۶۸/۹)

’’وہ چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے پڑ جائیں تو وہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔‘‘

چنانچہ ابن جریر اور طبرانی کی ایک روایت ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو یہ تجویز پیش کی کہ ایک سال آپ ان کے معبودوں کی پوجا کیا کریں اور ایک سال وہ آپ کے رب کی عبادت کیا کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکٰفِرُوۡن نازل فرمائی جس میں برملا اعلان کیا گیا کہ جسے تم لوگ پوجتے ہو میں نہیں پوج سکتا اور اس فیصلہ کن جواب کے ذریعے ان کی مضحکہ خیز گفت وشنید کی جڑ کاٹ دی گئی اور اب کفار کے لیے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنانے کے سوا کوئی اور رستہ نہ رہا۔‘‘ (الرحیق المختوم)

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) حق وصداقت کا اعلان و اظہار ہے، یہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی مداہنت اور لچک نہیں ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ واشگاف الفاظ میں شرک سے بیزاری کا اظہار اور حق کا اعلان فرما دیجیے۔ جب آپ کے چچا ابوطالب نے بھی رسول اللہ ﷺ کو نرمی اختیار کرنے کا مشورہ دیا تو آپ نے اسے ٹھکرا کر صرف اپنے مولا و مالک کا سہارا

لیا ؎

چچا کے دامن شفقت کو بھی ہٹتا ہوا پایا
تو ہو کر آب دیدہ ہادیِ برحق نے فرمایا
قسم اللہ کی، سارا جہاں بھی ہو اگر دشمن
یہ سب شیطان کے ساتھی بڑھیں، ہو کر بشرِ دشمن
جفا و ظلم کی آندھی چلے، طوفان آ جائیں
مٹانے کو مرے، شدّاد اور ہامان آ جائیں
کسی دھمکی، کسی ڈر سے مرا دل گھٹ نہیں سکتا
مجھے یہ فرض ادا کرنا ہے، اس سے ہٹ نہیں سکتا
میرے ہاتھ میں لا کر چاند سورج بھی اگر رکھ دیں
مرے پیروں تلے روئے زمین کا مال و زر رکھ دیں
دین کے کام سے میں باز ہرگز رہ نہیں سکتا
یہ بت جھوٹے ہیں، میں جھوٹوں کو سچا کہہ نہیں سکتا
میں سچا ہوں تو بس میرے لیے میرا اللہ بس ہے
کسی امداد کی حاجت نہیں، اس کی رضا بس ہے
میرا ایمان ہے، ہر شے پہ قادر حق تعالیٰ ہے
وہی آغاز کو انجام تک پہنچانے والا ہے

۲) یہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی استقامت اور عزیمت تھی کہ آپ نے اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہر قسم کے مصائب و مشکلات برداشت کیے اور دعوت حق کا پرچم سرنگوں نہ ہونے دیا اور یہ دین ہم تک صحیح و سالم پہنچا۔ الحمد للہ!

عزیمت و صبر کے کوہِ گراں ﷺ

﴿وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ ۝ وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا تَكُ فِيۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ﴾

(النحل:۱۶/۱۲۶-۱۲۸)

''اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے (اے نبی!) صبر سے (دعوت و تبلیغ) کا کام کیے جاؤ اور آپ کا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے، جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔''

وَ لَئِنۡ اور اگر، صَبَرۡتُمۡ تم صبر کرو، فعل ماضی جمع مذکر مخاطب (صَبَرَ، یَصۡبِرُ، صَبۡرًا) صبر کرنا، ہمت سے کام لینا، مصائب و مشکلات برداشت کرنا اور اپنے فرائض پر ڈٹے رہنا۔(القاموس الوحید)

وَ مَا اور نہیں ہے، صَبۡرُكَ (صَبۡرُ. كَ) صبر، آپ کا، ک ضمیر واحد مخاطب جناب نبی کریم ﷺ کی طرف جاتی ہے، اِلَّا مگر، بِاللّٰهِ (بِ. اللّٰهِ) ساتھ، اللہ تعالیٰ (کی توفیق ہی سے ممکن ہے) وَ لَا اور نہ، تَحۡزَنۡ آپ غم کریں (حَزِنَ، یَحۡزَنُ، حَزَنًا) رنجیدہ اور غمگین ہونا، حزن و ملال اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، عَلَيۡهِمۡ ان پر، هِمۡ کی ضمیر جمع مذکر غائب، کفار اور مشرکین کی طرف جاتی ہے، وَ لَا تَكُ اور نہ ہوں آپؐ، ک ضمیر واحد مذکر مخاطب آپ ﷺ کی طرف جاتی ہے، فِيۡ ضَيۡقٍ تنگی میں

(ضَاقَ، یَضِیْقُ، ضَیْقًا و ضِیْقًا) تنگ ہونا، ضَاقَ بِالْاَمْرِ، کسی بات سے پریشان ہونا، ضَاقَ بِہٖ صَدْرُہٗ، پریشان ہونا، اَلضَّیْقُ تنگی، پریشانی، گھٹن اور تکلیف ضِیْقُ النَّفس، سانس لینے میں دشواری، اردو میں استعمال ہوتا ہے۔(القاموس الوحید)، مِّمَّا (مِنْ.مَا) اس (بات سے) جو، یَمْکُرُوْنَ وہ سازشیں کرتے ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (مَکَرَ، یَمْکُرُ، مَکْرًا) کسی کو دھوکا دینا، سازش کرنا، لفظِ مکروفریب اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، اِنَّ اللّٰہَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ، مَعَ الَّذِیْنَ ان لوگوں کے ساتھ ہے، اتَّقَوْا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، فعل ماضی جمع مذکر غائب (اِتَّقٰی، یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءً) اللہ کا خوف رکھنا، وَ الَّذِیْنَ اور (ساتھ) ان لوگوں کے (جو)، ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ نیکی کرنے والے ہیں، احسان کرنے والے ہیں، اسم فاعل جمع مذکر، اس کا مفرد مُحْسِنٌ ہے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ لکھتے ہیں:

''نبوت کے چوتھے سال میں جب پہلی بار اسلامی دعوت منظرِ عام پر آئی تو مشرکین نے اسے دبانے کے لیے وہ کارروائیاں انجام دیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، یہ کارروائیاں تھوڑی تھوڑی اور درجہ بدرجہ عمل میں لائی گئیں اور ہفتوں بلکہ مہینوں مشرکین نے اس سے آگے قدم نہیں بڑھایا اور ظلم و زیادتی شروع نہیں کی، لیکن جب دیکھا کہ یہ کارروائیاں اسلامی دعوت کی راہ روکنے میں مؤثر ثابت نہیں ہو رہی ہیں تو ایک بار پھر جمع ہوئے اور پچیس (۲۵) سردارانِ قریش کی ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کا سربراہ رسول اللہ ﷺ کا چچا ابولہب تھا۔ اس کمیٹی نے باہمی مشورے اور غور و خوض کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے خلاف ایک فیصلہ کن قرارداد منظور کی، یعنی یہ طے کیا کہ اسلام کی مخالفت، پیغمبرِ اسلام کی ایذا رسانی اور اسلام لانے والوں کو طرح طرح کے جور و ستم اور ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔'' (الرحیق المختوم)

ظلم کا مقابلہ ایمان اور صبر سے:

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

''کفر کو اپنانے والے صرف تمسخر تک محدود نہیں رہتے، بلکہ وہ اہل ایمان کے دلوں میں

ظلم کے تیر پیوست کرتے ہیں، ان مظالم کا جواب اللہ کے ماننے والے صبر اور صلوٰۃ سے دیتے ہیں اور جب تاریخ کا رخ مڑتا ہے تو ظلم کی کلائی مروڑ دیتے ہیں اور یہاں قریشِ مکہ کا واسطہ تو اس رحمۃ للعالمین سے پڑا تھا، جو مذاق اڑانے والوں کے لیے دعائیں کرتا اور صبر اس طرح کرتا کہ ظلم کو اپنی کمزوری کا احساس ہوتا، یہ وہ صبر نہیں جو ہجوری اور مجبوری کی پیداوار ہوتا ہے، بلکہ وہ صبر جو اپنے راستے پر پہاڑوں کی طرح جم کر کھڑے رہنے کی کیفیت ہے اور اسی صبر کا سبق اللہ تعالیٰ نے صابرِ اعظم ﷺ اور جماعت مؤمنین کو دیا ہے، اس سلسلۂ کلامِ ربانی سے صبر کے مرحلے اور صابروں کے مرتبے کس طرح سامنے آتے ہیں۔

اپنے موقِف پر قائم رہو اور مظالم کا مقابلہ کرو، پھر دیکھو کہ زخم کیسے پھول اور آنسو کیسے شبنم بنتا ہے، وہ شبنم جو وجود کی گہرائیوں میں اتر کر شادابی بن جاتی ہے اور یہ سب کچھ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے، اللہ سے رشتہ قائم رہے تو قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، اس طرح ظالم بہت چھوٹے نظر آتے ہیں، ان کی چالیں تارِ عنکبوت اور ان کے ظلم اظہارِ کمزوری ثابت ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق، صبر کے ساتھ تقویٰ بھی عطا کرتی ہے۔ ایسا تقویٰ جس کی طاقتِ کار زار حیات میں کردار کے ریشمی دامن کو کانٹوں سے مجروح نہیں ہونے دیتی اور ظلم کے مقابل احسان کا اظہار ظالموں کو رعشہ براندام کر دیتا ہے اور وہ حق کے آستانے پر جھک جاتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ ان کے لیے باقی نہیں رہتا۔ قرآن حکیم میں ربِّ جلیل اس کا ذکر اس طرح فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَکَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ (حمٓ السجدہ: ۴۱/۳۴-۳۵)

”(اور اے نبی!) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، آپ بدی کو اس نیکی سے دفع کیجیے جو

بہترین ہو، آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے، یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔"

اس صبر اور ظلم کے مقابلے کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

ایک دن صاحب کوثر ﷺ کعبے کے پاس سے گزر رہے تھے اور اس گہری سوچ میں تھے کہ یہاں ربِ ابراہیم علیہ السلام کی پرستش کب شروع ہوگی؟ اور انسانوں کے تراشے ہوئے دیوتاؤں سے یہ عمارت کب خالی ہوگی؟ کہ سردارانِ مکہ آپ ﷺ پر ٹوٹ پڑے، ایک دن پہلے بھی انہوں نے یہی ارادہ کیا تھا، مگر جب ان کے طنز و دشنام کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"اس ذات کی قسم، جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں تمہارے لیے عظیم خبر لے کر آیا ہوں۔"

تو ائمۂ کفر جیسے بے روح اور بے جان ہو گئے تھے، دوسرے دن انہوں نے اچانک حملہ کا فیصلہ کیا، درمیان میں سرورِ کائنات تھے اور چاروں طرف سردارانِ مکہ اپنے دائرے کو تنگ کر رہے تھے، پھر ان میں ایک نے آپ ﷺ کی چادر گھسیٹنی شروع کی، یہاں تک کہ چادر سے آپ ﷺ کے گلوئے مبارک پر خراش پڑنے لگی اور دم گھٹنے لگا، وہ گلوئے مبارک جس سے دشمنوں کے لیے بھی دعائیں نکلتی تھیں، اس عالم میں بھی کوئی خوف آپ ﷺ کے احساسات میں شامل نہ ہو سکا، زیرِ لب آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور چہرے پر وہ سکون، جو اللہ پر اعتماد کا نشان تھا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ درمیان میں آ گئے اور ظالم کے ہاتھ روک کر روتے ہوئے کہنے لگے:

﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ﴾ (المؤمن:٤٠/٢٨)

"تم اس انسان کو صرف اس لیے مار ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ میرا رب ہے۔"

سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے یہ آنسو اپنے صاحب، اپنے ہادی ﷺ کی تکلیف کے لیے تھے اور ان کا حلقۂ اعداء میں آ کر انہیں روکنا ان کے ایمان اور شجاعت کی دلیل تھی، اللہ اور

اسلام کے دشمنوں نے نبی ﷺ کو چھوڑ کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا، ان کے سر پر زخم آیا اور ریشِ مبارک نوچی گئی۔

خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا ہر دن آزمائش اور فتنہ کے مقابل استقامت کا دن تھا، کبھی آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے، کبھی راہ گزرتے آپ ﷺ پر کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا اور ایسا تو اکثر ہوتا کہ آپ ﷺ جدھر سے گزرتے، قریش طنزیہ جملے کہتے، تمسخر آمیز فقرے چست کرتے اور آپ ﷺ کی تکذیب کرتے، ان تمام موقعوں پر آپ ﷺ صبر و رضا کی تصویر بنے رہتے ؎

مگر وہ منبعِ حلم و صفا، خاموش رہتا تھا
دعائے خیر کرتا تھا، جفا و ظلم سہتا تھا

اور استقامت اور پامردی سے ان تمام مصائب کا مقابلہ کیا، اس لیے کہ رب کریم کا آپ کو حکم تھا:

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ (ھود:۱۱/۱۱۲، ۱۱۳)

”(اے نبی!) آپ اور آپ کے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، راہِ راست پر پوری طرح ثابت قدم رہیں، جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کیجیے، جو کچھ آپ کر رہے ہیں وہ آپ کے رب کی نگاہ میں ہے، تم سب ان ظالموں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا، ورنہ جہنم کی آگ کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمھیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو اللہ سے تمھیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔“

رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کا کفار کی طرف جھکنا بعید از قیاس ہے، یہ قرآن حکیم کا وہ انداز بیان ہے جو ایمان و کفر کے درمیان ہر تعلق کو کاٹ دیتا ہے اور سب سے بڑھ

کر آنے والے اہل ایمان بھی اس تخاطُب سے اپنے آپ میں حوصلہ پیدا کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

اہل ایمان کے چند صبر آزما واقعات

ا- سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ

جماعت مومنین میں ایمان اور اسلام کے داعی اور ہدایتِ مجسم جناب رسول اللہ ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، سب سے باعزت اور با اثر فرد تھے، لیکن قریش دینِ حق کی دشمنی میں سارے آدابِ قرابت اور تہذیب کے سارے آداب فراموش کر بیٹھے، ایک دن جناب رسول اللہ ﷺ کی معیت میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مجمع میں تبلیغِ اسلام کے لیے زبان کھولی ہی تھی کہ قریش نے ہر طرف سے یلغار کر دی۔ عتبہ بن ربیعہ نے پرانے اور سخت جوتوں سے آپ کے چہرۂ مبارک پر اتنی ضربیں لگائیں کہ چہرہ خون میں ڈوب گیا اور خدوخال چوٹوں کی وجہ سے پہچانے نہ جاتے تھے، بنی تمیم آپ کو بیہوشی کے عالم میں اٹھا کر لے گئے، موت ابوبکرؓ کو چھو کر گزر گئی، گھنٹوں کے بعد جب ہوش آیا تو جو لفظ زبان سے ادا ہوئے وہ یہی تھے کہ ”رسول اللہ ﷺ تو خیریت سے ہیں؟“

آپ کو اپنے قبیلہ کی حمیت کی بنا پر بچا کر لانے والے عمائدِ بنوتمیم برا بھلا کہنے لگے کہ دیکھو اپنی پروانہیں، اسی کا ذکر ہے جس کی وجہ سے اس حال کو پہنچے، ام جمیل مسلمان ہو چکی تھیں، وہ جب قریب آئیں تو ان سے بھی یہی سوال کیا، انہوں نے اشارہ سے کہا کہ کیسے بتاؤں؟ آپ کی والدہ سن لیں گی، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کے سامنے بتا دو، کوئی بات نہیں۔

ام جمیل نے رسول اللہ ﷺ کی خیریت سے مطلع کیا تو بے ساختہ ”الحمد للہ“ کہا، جب کوئی مشروب پیش کیا گیا تو جاں نثارِ محمد عربی ﷺ نے انکار کر دیا اور کہا ”اللہ کے حضور یہ میری نذر ہے کہ چہرہ زیبائے رسول اللہ ﷺ کو دیکھے بغیر نہ کچھ کھاؤں گا، نہ پیوں گا۔ جب قبیلہ والے چلے گئے تو اپنی والدہ اور ام جمیل رضی اللہ عنہا کا سہارا لے کر بڑی مشکل سے اپنے آپ کو

گھسیٹتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس نقشے کو دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی وہ لکیر نمودار ہوئی جس میں مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی اسلام کی ساری کامیابیوں اور فتوحات کی روشنی تھی، صاحب خلق عظیم ﷺ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی والدہ کا شکریہ ادا کیا اور یہی وہ مبارک ساعت تھی کہ ان کا دل اسلام کے لیے کھل گیا۔" (حیات محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں)

۲-سیدنا خباب بن الارت رضی اللہ عنہ:

تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے، ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانے میں اسلام لائے تھے جب رسول اللہ ﷺ سیدنا ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر موجود تھے اور صرف چھ سات شخص اسلام لائے تھے، قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، ان پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں۔ یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، خباب رضی اللہ عنہ نے مدتوں بعد جب یہ واقعہ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی۔ سیدنا خباب رضی اللہ عنہ جاہلیت میں لوہار تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کا بقایا تھا، مانگتے تو جواب ملتا، جب تک محمد ﷺ کا انکار نہ کرو گے، ایک کوڑی نہ ملے گی، یہ کہتے کہ نہیں ایسا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔

۳-سیدنا بلال رضی اللہ عنہ:

یہ وہی بلال ہیں جو موذنِ رسول ﷺ کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آؤ ورنہ یونہی گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گے لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے "اَحدُ" کا لفظ نکلتا، جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالے کیا، وہ ان کو شہر کے اِس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھرتے تھے لیکن اب بھی وہی رٹ تھی اَحد، اَحد!

۴-سیدنا عمار رضی اللہ عنہ:

یہ یمن کے رہنے والے تھے، ان کے والد یاسر مکہ میں آئے تو ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہ تھا، ان کی شادی کر دی تھی، عمارؓ اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لائے تھے، قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے، ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔ سیدہ سمیہؓ، سیدنا عمار کی والدہ تھیں، ان کو ابو جہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اس طرح وہ شہید ہو گئیں۔ سیدنا یاسر رضی اللہ عنہ، عمارؓ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

۵-سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ:

یہ رومی مشہور ہیں، لیکن درحقیقت رومی نہ تھے۔ ان کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے ابلہ کے حاکم تھے اور ان کا خاندان موصل میں آباد تھا، ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ بھی تھے، یہ روم میں پلے، اس لیے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے، ایک عرب نے انہیں خریدا اور مکہ لایا، یہاں عبداللہ بن جدعان نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے جب دعوتِ اسلام شروع کی تو یہ اور عمار بن یاسر ایک ساتھ آپ کے پاس آئے، آپ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے، قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے، جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا اپنا سارا مال ومتاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو، انہوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔

۶-سیدنا ابو فکیھہ رضی اللہ عنہ:

یہ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور سیدنا بلالؓ کے ساتھ اسلام لائے، امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پاؤں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں، ایک گبریلا (غلاظت کا کیڑا) راہ میں جا رہا تھا، امیہ نے ان سے کہا ''تیرا الہ یہی تو نہیں

ہے؟'' انہوں نے کہا: ''میرا اور تیرا دونوں کا الہ اللہ تعالیٰ ہے'' اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلہ گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا، ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

۷-سیدہ لبینہ رضی اللہ عنہا:

یہ بیچاری ایک کنیز تھی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ (جبکہ وہ ابھی اسلام نہ لائے تھے) اس بے کس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں۔ وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اس کا انتقام لے گا۔

۸- سیدہ زنیرہ رضی اللہ عنہا:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے سیدنا عمرؓ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے، ابوجہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

۹-سیدہ نہدیہ رضی اللہ عنہا اور ام عبیس رضی اللہ عنہا:

یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں ؎

کنیزوں کو شکنجے میں کوئی بے درد کستا تھا ۔۔۔ مسلمان بیبیوں پر چابکوں کا مینہ برستا تھا
صہیبؓ و ابوفکیھہؓ اور لبینہؓ اور نہدیہؓ ۔۔۔ بلالؓ و یاسرؓ و عمارؓ و خبابؓ اور سمیہؓ
مسلماں ہوگئے تھے،آگئی آفت میں جاں ان کی ۔۔۔ زنیرہ اور عامر تھے غلام اور لونڈیاں ان کی
اللہ پر تھی نظر ان کی زباں سے کچھ نہ کہتے تھے ۔۔۔ محمد کی محبت میں ہزاروں ظلم سہتے تھے

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دفترِ فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انہوں نے ان مظلوموں میں اکثر کو آزادی دلائی، سیدنا بلالؓ، عامرؓ بن فہیرہ، لبینہؓ، نہدیہؓ، امّ عبیسؓ سب کو بھاری بھاری داموں خرید ا اور آزاد کر دیا۔ یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت جسمانی اذیتیں پہنچائیں۔ ان سے کم درجہ پر وہ تھے جن کو طرح طرح سے ستاتے، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ، جو کبیر السن اور صاحبِ جاہ و اعزاز تھے، اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا۔ سیدنا ابوذر رضی

اللہ عنہ جو ساتویں مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا۔ سیدنا زبیر بن العوام جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا، جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔ سیدنا عمرؓ کے چچا زاد بھائی سعیدؓ ابن زید جب اسلام لائے تو عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا۔

مسلمانوں کا عزمِ راسخ:

یہ تمام مظالم، یہ جلّادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں ایک بھی مسلمان کو راہِ حق سے متزلزل نہ کر سکیں، ایک نصرانی مؤرخ نے نہایت سچ لکھا ہے:

''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو، محمد (ﷺ) کے خصائل نے وہ درجہ نشۂ دینی کا آپ ﷺ کے پیروؤں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لے گئے (یہ عیسائی عقیدہ ہے جبکہ قرآن کہتا ہے کہ رب قدیر نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا) تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے۔ برعکس اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کر دیا۔

(سیرت النبی ﷺ، ج:۱)

آیاتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں

۱) سید مودودیؒ کے الفاظ میں اس ظلم کے نتائج درج کیے جاتے ہیں:

''قریش نے مسلمانوں پر ظلم ڈھا کر بظاہر یہ فائدہ اٹھانا چاہا کہ لوگوں پر خوف طاری کر کے اسلام کے پھیلاؤ کو روک دیں، لیکن اس کے جو نتائج فی الواقع نکلے وہ ان کی توقعات کے بالکل خلاف تھے، اول تو اس سے یہ بات بالکل کھل کر سامنے آ گئی کہ اسلام جو اخلاق اور دلائل لے کر آیا ہے ان کا جواب کفر کے پاس ان خلافِ انسانیت حربوں کے سوا نہیں ہے۔

مت کے ساتھ مسلمانوں نے اس دوسرے اس بے رحمی و سنگدلی کو کی فطرت کفر اور اس کے علمبرداروں سے نفرت کرنے لگی اور جس صبر و استقا بے جا ظلم کو برداشت کیا اُس کی وجہ سے تمام غیر متعصب دلوں میں ان کے لیے ہمدردی بھی پیدا ہوئی اور قدر و منزلت بھی، بلکہ درحقیقت اس نے اسلام کی دھاک بٹھا دی کہ مکے ہی کے معاشرے میں اس کو ایسے پختہ، اولو العزم اور زبردست قوتِ ایمانی رکھنے والے انسان مل گئے ہیں جو کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں، صرف حق کی خاطر ہر بڑی سے بڑی مصیبت جھیل سکتے تھے۔ پھر کفار کے یہ حربے اسلام کے پھیلاؤ کو بھی نہ روک سکے، اس ظلم کے باوجود ایسے اللہ کے بندے نکلتے ہی رہے جنہوں نے کفار کے علی الرغم اسلام قبول کیا اور بہت سے لوگ دل سے ایمان لے آئے مگر اس کا اظہار انہوں نے نہیں کیا، جس کی وجہ سے اعدائے اسلام کبھی یہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ ان کے درمیان اس دین کے کتنے حامی چھپے ہوئے ہیں، جن کی پوشیدہ حمایت کفر کے حصار میں بڑے رخنے ڈال سکتی ہے۔ سب سے بڑا فائدہ اس ظلم کا اسلام کو یہ پہنچا کہ اس بھٹی سے گزر کر جو لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے وہ نسلِ آدم کے بہترین انسان تھے، اس حالت میں کوئی کمزور سیرت و کردار کا آدمی اس طرف کا رخ بھی نہ کر سکتا تھا۔

(سیرت سرور عالم ﷺ)

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک عدل اس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک

شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک تھا شجاعت وہ اک ہستیِ فوق الادراک

ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

﴿وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ١٦/٤١)

''جنہوں نے اللہ کی راہ میں ترکِ وطن کیا، ہم انہیں بہتر سے بہتر ٹھکانا دنیا میں عطا فرمائیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت ہی بڑا ہے، کاش کہ لوگ اس سے واقف ہوتے۔''

وَالَّذِيْنَ اور وہ لوگ جنہوں نے، اَلَّذِيْنَ اسم موصول، هَاجَرُوْا ہجرت کی، اللہ کی رضا کی خاطر ترک وطن کیا (مکہ سے حبشہ کی طرف یا مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی) هَاجَرُوْا ماضی جمع مذکر غائب (هَاجَرَ، يُهَاجِرُ) ہجرت کرنا، ترک وطن کرنا، فِي اللّٰهِ اللہ (کی راہ) میں یعنی اللہ کے دین کی اقامت کے لیے، مِنْۢ بَعْدِ اس کے بعد، مَا جو (کہ)، ظُلِمُوْا، وہ ظلم کیے گئے، ظُلْمٌ مصدر سے فعل ماضی مجہول جمع مذکر غائب (ظَلَمَ، يَظْلِمُ، ظُلْمًا) ظلم کرنا، لَنُبَوِّئَنَّهُمْ البتہ ہم اُن کو ضرور بضرور ٹھکانا دیں گے (بَوَّأَ، يُبَوِّءُ) ٹھہرانا، ٹھکانا بنانا اور جگہ دینا کہ انہیں عزت اور سرفرازی ملے، یعنی رب کریم کا ارشاد ہے کہ جنہوں نے راہِ حق میں دکھ اور مصائب برداشت کیے اور اللہ کی رضا کے لیے اپنے وطن کو خیر باد کہا تو اللہ تعالیٰ انہیں عزت وعظمت کی جگہ عطا فرمائے گا، فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً دنیا کی زندگی میں انہیں سرفرازی ملے گی، وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اور آخرت کا اجر (تو)، اَكْبَرُ کہیں زیادہ ہے، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش کہ لوگ اس کی (قدر وقیمت) سے آگاہ ہوتے۔

ہجرتِ حبشہ (۵ نبوی):

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی لکھتے ہیں:

"تین سال کی خاموش تبلیغ کے بعد دو سال انتہائی مصائب و آلام کے گزرے (جس کا تذکرہ الفرقان کی گزشتہ قسط میں کیا جا چکا ہے) مظالم اور جور وستم کا سلسلہ برابر جاری رہا، اہل اسلام کے لیے اگرچہ (لذت ایمان) کے ساتھ آزار وستم میں لذت گیری کا ایک پہلو بھی تھا لیکن آخر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے، ان مسلمانوں کو جتنا آزار پہنچایا جاتا، اتنی ہی ان میں پختگی پیدا ہو جاتی اور پھر جس قدر زیادہ ان میں استقامت نظر آتی اسی قدر آزار و ستم میں اضافہ ہو جاتا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس بڑھتے ہوئے ظلم وستم سے اور ذہنی تکلیف ہوتی، اس لیے انہوں نے مختصر سی امت کو محفوظ رکھنے کے لیے مسلمانوں کو کسی امن کی جگہ منتقل ہو جانے کی اجازت دی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ حبشے کا نجاشی (اصحمہ بن ابجر) اگرچہ عیسائی ہے مگر منصف مزاج ہے اور اس سے اہل مکہ جیسے ظلم وستم کی توقع نہیں، اس لیے وہیں جا کر عارضی طور پر پناہ لینی بہتر ہے۔

ایمان اور وطنیت کا مقابلہ:

رسول اللہ ﷺ کی یہ تجویز بلاشبہ مکے کی اذیت رساں آزمائشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تھی لیکن یہ ہجرت اور ترکِ وطن بجائے خود ایک آزمائش تھی، مسلمان اب تک ساری آزمائشیں جھیل چکے تھے۔ ہر قسم کی قربانی پیش کر چکے تھے لیکن وطن کو اپنے اعلیٰ نصب العین پر قربان کرنے کی نوبت نہ آئی تھی، اب وہ بھی آ گئی اور خاتم الانبیاء نے وطن کو بھی ایک اعلیٰ قدر اور برتر نصب العین پر قربان کرنے کی تعلیم دی۔

یہ ہجرتِ حبشہ بھی دراصل اسلام کے اسی زاویۂ نظر کی تکمیل تھی اور ایک آنے والی بڑی ہجرت (ہجرت مدینہ) کی تمہید تھی، یہ فقط مکہ کے جور وستم سے محفوظ رہنے ہی کی ایک سبیل نہ تھی بلکہ وطن کو راہ حق میں قربان کر دینے کا بھی ایک درس تھا جو آگے چل کر زیادہ وسیع پیمانے پر ظاہر ہوا۔

علاوہ ازیں اس پہلی ہجرت میں ایک مصلحت یہ بھی ضرور ہو گی، جیسا کہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں، کہ اشاعتِ اسلام کے پروگرام کو باہر بھی پھلنے پھولنے کا موقع میسر آئے اور اس کی توقع ان عیسائیوں سے زیادہ ہو سکتی تھی جو دینی مزاج میں اسلام سے قریب تر ہیں، ان کے اقرب الی المسلمین ہونے کی شہادت خود قرآن میں بھی ہے۔

اول اول بارہ مردوں اور چار عورتوں کا ایک قافلہ رات کی تاریکی میں بندرگاہِ شعبیہ پہنچا، حسنِ اتفاق سے حبشہ جانے والے دو تجارتی جہاز وہاں مل گئے، یہ سب لوگ پانچ درہم فی کس دے کر دونوں جہازوں میں بیٹھ گئے اور جلد ہی حبشہ روانہ ہو گئے، صبح کفار مکہ کو معلوم ہوا تو تعاقب میں دوڑے، مگر جہاز ان کی دسترس سے باہر ہو چکے تھے، اس مختصر سے قافلے میں سیدنا عثمان ذوالنورینؓ اور ان کی زوجہ سیدہ رقیہؓ بنت رسول اللہ ﷺ بھی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد ایک اور بڑا قافلہ بھی حبشہ روانہ ہو گیا۔ اس میں تراسی (۸۳) مرد اور اٹھارہ (۱۸) عورتیں تھیں، اس قافلے میں سیدنا جعفر بن ابی طالب بھی تھے، جنہوں نے آگے چل کر ایک بڑی مہم سر کی (یعنی نجاشی کے دربار میں ولولہ انگیز تقریر کی)، یہ دونوں ہجرتیں اسلام میں پہلی ہجرتیں تھیں، جس رب کی راہ میں یہ اہل مکہ کے ظلم و ستم جھیل رہے تھے اسی رب کے نام آزادی و اطمینان سے رہنے سہنے کے لیے یہ لوگ راہی حبشہ ہوئے تھے۔

ابھی بہت سے مسلمان مکہ میں موجود تھے، ان میں کچھ تو ایسے تھے جن کو بہ ظاہر بے مائیگی اور بے سروسامانی نے روک رکھا تھا لیکن اغلب یہ ہے کہ بہتوں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت کے شرف کو ترک کرنا پسند نہ کیا اور بہتیرے ایسے بھی ہوں گے جو لذت آزار سے سیر نہ ہوئے تھے۔

قریشی وفد حبشہ میں:

عربوں کی حبشہ میں آمد و رفت کوئی نئی بات نہ تھی، عرصۂ دراز سے تجارتی تعلقات قائم تھے، نیز وہ دور پاسپورٹ اور ویزا کی پابندیوں سے آزاد تھا، علاوہ ازیں نجاشی ایک

نیک دل اور فراخ ظرف حکمران بھی تھا، اس لیے ان مسلمانوں کا وہاں جا بسنا کوئی ایسی انوکھی بات نہ تھی جس پر وہاں کی حکومت کوئی نوٹس لیتی، یہ لوگ وہاں اطمینان سے رہ کر ان اسلامی احکام کی پابندی کے ساتھ زندگی گزارنے لگے جو اس وقت نازل ہو چکے تھے لیکن اہل مکہ کو ان لوگوں کا وہاں اطمینان کی سانس لینا گوارا نہ ہوا، قریش نے اپنا ایک وفد عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ کی سرکردگی میں دربارِ حبشہ کی طرف روانہ کر دیا۔

یہ وفد اس غرض سے حبشہ گیا تھا کہ کسی تدبیر سے ان پناہ گزیں مسلمانوں کو وہاں سے نکلوایا جائے اور یہ پھر مکے میں آنے پر مجبور ہو جائیں اور انہیں پھر ظلم وستم کا تختۂ مشق بنایا جائے، قریش مکہ دور رس نگاہ رکھتے تھے اور پیغامِ نبوت کے اندرونی قوت و زور اور اس کے پھلنے پھولنے کی بے پناہ فطری طاقت کو خوب سمجھتے تھے، وہ مکہ میں اس بات کا مشاہدہ کر چکے تھے کہ ان کی ہزار مخالفتوں اور شدید سے شدید آزار وستم کے باوجود اسلام کس طرح دلوں میں گھر کرتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ انہیں خوف صرف یہ تھا کہ کہیں حبشہ میں اسلام پھیل کر ایسی منظّم طاقت نہ بن جائے جس کی ایک ہی یورش ان کے اقتدار کی کمر توڑ کر رکھ دے، دراصل یہی خطرہ قریشی وفد کو حبشہ تک لے گیا تھا محض، آزار وستم کی جدّت طرازیوں کا شوق پورا کرنا مقصود نہ تھا۔

قریشی وفد کی دربار نجاشی میں رسائی:

دوسرے دن اس وفد نے دربار نجاشی میں باریابی حاصل کی اور حرفِ مطلب یوں ادا کیا کہ

''ہمارے شہر مکہ کے چند نادانوں نے نیا مذہب نکالا ہے، ہم نے ان کو نکال باہر کیا تو یہ لوگ یہاں آ کر پناہ گزین ہو گئے ہیں، لہٰذا ان مجرموں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔''

ذرا ملاحظہ فرمایے! یہاں بھی وہی مذہبی حربہ استعمال کیا جا رہا ہے جو مکہ کے عوام کو بھڑکانے کے لیے کیا جاتا رہا، یہ وفد اس زد کا ذکر نہیں کرتا جو مکہ والوں کی معاش یا اقتدار پر پڑ رہی ہے وہ آگے آگے مذہب ہی کو رکھتا ہے اور اس نفسیات سے بخوبی واقف ہے کہ ایک مذہبی (عیسائی نجاشی) کے جذبات اسی حربے سے برانگیختہ کیے جا سکتے ہیں۔'' (پیغمبر انسانیت ﷺ)

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ لکھتے ہیں:

''لیکن نجاشی نے سوچا کہ اس قضیے کو گہرائی سے کھنگالنا اور اس کے تمام پہلوؤں کو سننا ضروری ہے، چنانچہ اس نے مسلمانوں کو بلا بھیجا۔ مسلمان تہیہ کر کے اس کے دربار میں آئے کہ ہم سچ ہی بولیں گے، خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو، جب مسلمان آ گئے تو نجاشی نے پوچھا: ''یہ کونسا دین ہے جس کی بنیاد پر تم نے اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کر لی ہے، لیکن میرے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہو اور نہ ان ملتوں ہی میں سے کسی کے دین میں داخل ہوئے ہو؟'' مسلمانوں کے ترجمان سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے بادشاہ! ہم ایسی قوم تھے جو جاہلیت میں مبتلا تھی ہم بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، قرابتداروں سے تعلق توڑتے تھے، ہمسایوں سے بدسلوکی کرتے تھے اور ہم میں سے طاقتور کمزور کو کھا رہا تھا، ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا، اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور سمجھایا کہ ہم صرف ایک اللہ کو مانیں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے انہیں چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے امانت ادا کرنے، قرابت جوڑنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے اور حرام کاری و خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا اور فواحش میں ملوث ہونے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاکدامن عورتوں پر جھوٹی تہمت لگانے سے منع کیا، اس نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اس نے ہمیں نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا حکم دیا'' ے

کہا اے بادشاہ! ہم لوگ کافر اور جاہل تھے
ہم اس دارِ مشقت میں نکمے اور کاہل تھے

بہت بدکار تھے، بت پوجتے، مردار کھاتے تھے
غریبوں کو، شریفوں کو، ضعیفوں کو، ستاتے تھے

تکلف برطرف، جاتے تھے ہم سیدھے جہنم میں
اسی اثنا میں، اک سچا نبی پیدا ہوا ہم میں

نبیؐ، ! شہرہ ہے ساری قوم میں جس کی امانت کا
کوئی منکر نہیں جس کی صداقت کا، دیانت کا

وہ آیا اور اس نے دعوتِ اسلام دی ہم کو
نکالا موت کے پنجے سے، بخشی زندگی ہم کو

ہمیں تلقین کی ان پتھروں کا پوجنا چھوڑو زنا سے، جھوٹ سے، چوری سے، سرشوری سے منہ موڑو
ہمیں تلقین کی اک دوسرے کے حق کو پہچانو سبھی انسان ہو، انسانیت دکھلاؤ نادانو!
ہمیں اس نے نماز و روزہ کے ارکان سکھلائے پسند آیا ہمیں یہ دین، ہم ایمان لے آئے
ہمارا جرم یہ ہے، بت پرستی چھوڑ دی ہم نے ملی ہم کو اذیت، اپنی بستی چھوڑ دی ہم نے

اسی طرح سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کے کام گنائے، پھر کہا: ''ہم نے اس پیغمبر کو سچا مانا اس پر ایمان لائے اور اس کے لائے ہوئے دین اسلام میں اس کی پیروی کی، ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا اور جن باتوں کو اس پیغمبر نے حرام بتایا، حرام مانا اور جن کو حلال بتایا انہیں حلال جانا، اس پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی، اس نے ہم پر ظلم و ستم کیا، ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے فتنے کھڑے کیے اور ہمیں مختلف سزائیں دیں ۔

ستم ایجاد تھے، لاکھوں ستم ایجاد کرتے تھے
کوئی جلاّد کیا کرتا ہے، جو یہ جلاّد کرتے تھے

زمین و آسماں جب دھوپ کی گرمی سے تپتے تھے
غضب کی دل لگی تھی، ریت پر مسلم تڑپتے تھے

جھلس کر سرخ ہو جاتی تھی جب چھاتی چٹانوں کی
ہم آغوشی ہوا کرتی تھی ان سے بے زبانوں کی

نشانِ سجدۂ توحید تھا جن کی جبینوں پر
دھرے رہتے تھے پہروں سخت پتھر ان کے سینوں پر

جو ابراہیمؑ کے پوتوں کو پھول اور باغ دیتے تھے
سلاخیں سرخ کر کے لوگ ان کو داغ دیتے تھے

انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر بت پرستی کی طرف پلٹ جائیں اور جن گندی چیزوں کو حلال سمجھتے تھے انہیں پھر حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر ہر قسم کا ظلم وستم روا رکھا تو یہ زمین تنگ کر دی اور ہمارے درمیان اور ہمارے دین کے درمیان روک بن کر کھڑے ہو گئے تو ہم نے آپ کے ملک کی راہ لی اور دوسروں پر آپ کو ترجیح دیتے ہوئے آپ کی پناہ میں رہنا پسند کیا اور یہ امید کی کہ اے بادشاہ! آپ کے پاس ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

نجاشی نے کہا: ''وہ پیغمبر جو کچھ لائے ہیں اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہے؟''

سیدنا جعفر نے کہا: ''ہاں!''

نجاشی نے کہا: ذرا مجھے بھی پڑھ کر سناؤ۔

سیدنا جعفرؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں، نجاشی سن کر اس قدر روئے کہ داڑھی تر ہوگئی، نجاشی کے تمام اسقف بھی سیدنا جعفر کی تلاوت سن کر اس قدر روئے کہ ان کے صحیفے تر ہو گئے، پھر نجاشی نے کہا یہ کلام اور وہ کلام جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے، دونوں ایک ہی شمع دان سے نکلے ہوئے ہیں ۔

سنائیں سید جعفر نے چند آیاتِ قرآنی
نجاشی کے مکدّر دل نے پائی جن سے تابانی

ہوا دل پر اثر، آنکھوں سے آنسو ہو گئے جاری
کہا لاریب اللہ کی کتابیں ایک ہیں ساری

اس کے بعد نجاشی نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو مخاطب کر کے کہا کہ تم دونوں چلے جاؤ، میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا اور نہ یہاں ان کے خلاف کوئی چال چلی جا سکتی ہے۔ اس حکم پر وہ دونوں وہاں سے نکل گئے، لیکن پھر عمرو بن العاص نے عبداللہ بن ربیعہ سے کہا ''واللہ! کل ان کے متعلق ایسی بات لاؤں گا کہ ان کی

ہریالی کی جڑ کاٹ کر رکھ دوں گا۔'' عبداللہ بن ربیعہ نے کہا: نہیں ایسا نہ کرنا، ان لوگوں نے اگرچہ ہمارے خلاف کیا ہے، لیکن بہرحال ہمارے اپنے ہی کنبے قبیلے کے لوگ ہیں مگر عمرو بن العاص اپنی رائے پر اڑے رہے۔

اگلا دن آیا تو عمرو بن العاص نے نجاشی سے کہا: ''اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں ایک بڑی بات کہتے ہیں۔'' اس پر نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا، وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمان کیا کہتے ہیں۔ اس دفعہ مسلمانوں کو گھبراہٹ ہوئی، لیکن انہوں نے طے کیا کہ سچ ہی بولیں گے، نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو، چنانچہ جب مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے اور اس نے سوال کیا تو سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبی ﷺ لے کر آئے ہیں، یعنی سیدنا عیسیٰ اللہ کے بندے، اس کے رسول اور کلمۃ اللہ ہیں۔'' نجاشی نے یہ جواب سن کر زمین سے ایک تنکا اٹھا لیا اور کہا ''واللہ! جو تم نے کہا عیسیٰ علیہ السلام اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔'' (یعنی مسلمانوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کہا وہ عین حقیقت ہے) اس پر بطریقوں نے ''ہونہہ'' کی آواز لگائی (غیظ وغضب میں آ گئے) نجاشی نے کہا: اگرچہ تم لوگ ''ہونہہ'' کہو (یعنی مجھے تمہارے غضب کی مطلق پروانہیں ہے)۔

اس کے بعد نجاشی نے مسلمانوں سے کہا: ''جاؤ! تم میری سلطنت میں امن وامان سے رہو، جو تمہیں گالی دے اس پر تاوان لگایا جائے گا، مجھے گوارا نہیں کہ تم میں سے کسی آدمی کو ستاؤں اور اس کے بدلے مجھے سونے کا پہاڑ مل جائے۔''

اس کے بعد اس نے اپنے حاشیہ نشینوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ان دونوں کو (عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ، قریشی وفد) ان کے ہدیے واپس کر دو، مجھے ان کی ضرورت نہیں، واللہ جب اس نے مجھے میرا ملک واپس کیا تھا تو اس نے مجھ سے کوئی رشوت نہیں لی تھی کہ میں اس کی راہ میں رشوت لوں، نیز اللہ نے میرے بارے میں لوگوں کی بات قبول

نہ کی تھی کہ میں اللہ کے بارے میں لوگوں کی بات مانوں۔" (الرحیق المختوم)

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) جب کسی سرزمین میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے اور انہیں احکامِ شریعت پر عمل کرنا دشوار ہو جائے تو حکم ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ منتقل ہو جائیں جہاں وہ امن اور سلامتی سے رہ سکیں اور احکامِ شریعت پر عمل پیرا ہونا ان کے لیے آسان ہو جائے، قرآن حکیم کی اس آیتِ مبارکہ پر غور کیجیے، رب کریم کا ارشاد ہے:

"اے میرے ایمان والے بندو! میری زمین بہت کشادہ ہے (مشکلات میں وہاں ہجرت کر جاؤ) اور میری ہی عبادت کرو۔" (العنکبوت:۲۹/۵۶)

۲) قریش کے ظلم وتعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمتِ عالم ﷺ نے جاں نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کی طرف ہجرت کر جائیں کہ وہاں کا فرماں روا نجاشی اپنے عدل وانصاف کے باعث مشہور تھا جبکہ آپ ﷺ اور بعض جلیل القدر صحابہ حکم الٰہی کے انتظار میں تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو یثرب ہجرت کرنے کا حکم ملا کہ اہل یثرب میں اسلام کا نور پھیل چکا تھا اور مدینۃ النبی کو اسلامی ریاست کی مرکزیت کا شرف ملنے والا تھا۔

۳) حق وصداقت کا اعلان کامیابی کی نوید بنتا ہے، مسلمانوں نے نجاشی کے دربار میں بھی برملا اور واشگاف الفاظ میں حق بات کا اعلان کیا جو بہت موثر ثابت ہوا۔ قریش مکہ کے وفد کو ناکام لوٹنا پڑا۔

۴) ہجرت اور جہاد ہی میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز پنہاں تھا، ہمارے اَسلاف کو اس سے بڑی بڑی کامیابیاں ملی تھیں، جسے دور حاضر کے مسلمانوں نے نظر انداز کر رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ انہیں دشمن کے ہاتھوں زک اٹھانا پڑ رہی ہے۔

۵) حق شناس اہل کتاب میں سے چند ایسے بھی تھے جن کے ذہن وفکر صداقت سے آشنا تھے۔ جونہی حق ان کے سامنے روشن ہو گیا انہوں نے صدقِ دل سے اس کا اقرار کر لیا، انہی میں سے نجاشی

شاہِ حبش بھی تھا، اسے دیکھ کر کئی اور بھی مسلمان ہوئے، قرآن حکیم ایسے ہی نیک دل لوگوں کے بارے میں کہتا ہے:

''اور جب وہ رسول کی طرف نازل کردہ (کلام) کو سنتے ہیں تو آپ ان کی آنکھیں آنسو سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں، اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا، وہ کہتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، پس تو ہم کو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ جو تصدیق کرتے ہیں۔'' (المائدہ:۵/۸۳)

ابوذر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

حضور ﷺ! مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔

ارشا ہوا کہ ''تقویٰ اختیار کرو کہ اس سے تمام معاملات سنور جائیں گے۔''

میں نے عرض کیا مجھے کچھ اور نصیحت فرمایئے۔

ارشاد ہوا کہ ''تلاوت قرآن اور اللہ کا ذکر کیا کرو کہ اس سے تمہارا ذکر (فرشتوں میں) آسمان پر ہوگا اور زمین تمہارے لیے بقعۂ نور بن جائے گی۔''

میں نے عرض کیا کچھ اور فرمایئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا ''کم بولنے اور خاموش رہنے کی عادت ڈالو کیونکہ یہ بات شیطان کو دفع کرنے والی اور دین کے معاملہ میں تم کو مدد دینے والی ہے۔''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کچھ اور ارشاد فرمایئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا ''زیادہ ہنسنا چھوڑ دو کیونکہ یہ عادت دل کو مردہ کر دیتی ہے اور چہرے کا نور زائل ہو جاتا ہے۔''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے مزید درخواست کی تو فرمایا:

''ہمیشہ حق وصداقت کا بول بولو اگرچہ وہ لوگوں کے لیے ناخوشگوار اور کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔'' (رواہ امام بیہقی فی شعب الایمان)

صابر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

﴿وَ لَقَدۡ کُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَصَبَرُوۡا عَلٰی مَا کُذِّبُوۡا وَ اُوۡذُوۡا حَتّٰۤی اَتٰھُمۡ نَصۡرُنَا وَ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ وَ لَقَدۡ جَآءَکَ مِنۡ نَّبَایِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ﴾ (الانعام:٣٤/٦)

''(اے نبی!) بہت سے رسول جو آپ سے پہلے ہوئے، ان کی بھی تکذیب کی جا چکی ہے، سوانہوں نے اس پر صبر ہی کیا، ان کی تکذیب کی گئی اوران کو ایذائیں پہنچائی گئیں، یہاں تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچی اور اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والانہیں اورآپ کے پاس بعض رسولوں کی خبریں پہنچ چکی ہیں (تکالیف کے بعد فتح ملی)''

وَ لَقَدۡ اور بلاشبہ، قَدۡ حرفِ تاکید، کُذِّبَتۡ جھٹلائے گئے، تَکۡذِیۡبٌ مصدر سے ماضی مجہول واحد مؤنث غائب (کَذَّبَ، یُکَذِّبُ، تَکۡذِیۡبًا) جھٹلانا، مِّنۡ قَبۡلِکَ آپ سے پہلے، ک ضمیر واحد مذکر مخاطب جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، فَصَبَرُوۡا تو انہوں نے صبر کیا، فعل ماضی صیغہ جمع مذکر غائب، ف حرف عطف، گزشتہ کلام سے ربط کے لیے، (صَبَرَ، یَصۡبِرُ، صَبۡرًا) صبر کرنا، مصائب کوخندہ پیشانی سے برداشت کرنا، عَلٰی مَا اس (بات) پر جو، کُذِّبُوۡا وہ جھٹلائے گئے، تَکۡذِیۡبٌ مصدر سے فعل ماضی جمع مذکر غائب، وَ اُوۡذُوۡا اور وہ ایذا دیے گئے، تکلیف دیے گئے، فعل ماضی مجہول جمع مذکر غائب (آذٰی، یُؤۡذِیۡ، اِیۡذَاءً) تکلیف دینا، ایذا پہچانا، یہ لفظ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، حَتّٰی حتیٰ کہ، اَتٰھُمۡ (اَتٰی.ھُمۡ) آ گئی، ان (کے پاس) ھُمۡ ضمیر جمع مذکر غائب (اَتٰی، یَاۡتِیۡ، اَتۡیًا وَ اِتۡیَانًا) آنا،

قریب کرنا، نَصۡرُنَا (نَصۡرُ.نَا) مدد۔ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) وَ لَا اور نہیں، مُبَدِّلَ کوئی تبدیل کرنے والا، اسم فاعل (بَدَّلَ، یُبَدِّلُ، تَبۡدِیۡلًا) تبدیل کرنا، لفظِ تبدیل اردو میں استعمال ہوتا ہے، لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ، اللہ کے کلمات کو، یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو (اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا) وَ لَقَدۡ اور یقیناً، جَآئَکَ (جَآءَ.کَ) آ چکی ہیں، آپ کے پاس 'کَ' ضمیر واحد مذکر مخاطب، جناب نبی ﷺ کی طرف جاتی ہے، نَّبَاِی خبریں، اس کی جمع انباء آتی ہے۔ اَلۡمُرۡسَلِیۡنَ رسولوں کی، اس کا مفرد مُرۡسَلُ ہے، وہ نبیؑ جسے شریعت دے کر بھیجا گیا ہو۔

قریش کی طرف سے قومی بائیکاٹ:

مولانا سید محمد میاںؒ لکھتے ہیں:

''پے در پے ناکامیوں نے قریش کو اور زیادہ مشتعل کر دیا، کھلم کھلا قتل کرنے میں قبائلی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا، لیکن خفیہ طور پر قتل کرنے میں پہلے ثبوت کی ضرورت تھی جس کا مہیا کرنا بنو ہاشم کے لیے تقریباً ناممکن تھا، چنانچہ خفیہ طور پر جانِ جہاں محمد رسول اللہ ﷺ کی جان لینے کی سازش ہونے لگی، ابو طالب کے چوکنے دماغ نے اس کو بھانپا، انہیں صرف محمد ﷺ کے متعلق ہی نہیں بلکہ خاندان ہاشم کے دیگر لوگوں کے متعلق بھی خطرہ ہوا، مثلاً ابو طالب کے بڑے صاحبزادے سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ اگرچہ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے، لیکن چھوٹے صاحبزادے سیدنا علی رضی اللہ عنہ یہیں تھے جو ہر دم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے، ابو طالب نے خاندان کے لوگوں سے مشورہ کیا اور طے یہ کیا کہ شہر کے خطرناک ماحول سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پناہ لی جائے۔

شِعب ابی طالب:

پہاڑیوں کے بیچ میں ایک مقام ''خیف بنی کنانہ'' تھا، یہ بنو ہاشم کا موروثی رقبہ تھا، طے یہ ہوا کہ وہاں جا کر قیام کیا جائے، چنانچہ پورا خاندان (جس کے بہت سے افراد ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) اس مقام پر چلا گیا جس کا دوسرا نام شعب ابی طالب تھا، صرف ابولہب اور اس کا گھرانہ مکہ میں رہ گیا، جو اپنے خاندان کے خلاف قریش کا سرگرم حامی تھا، ابو

طالب یہاں پہنچ کر بھی اپنے بھتیجے کی نگرانی راتوں کو کیا کرتے تھے، ان کے سونے کی جگہ بھی بدلتے رہتے تھے۔

قریش کے سرداروں نے اس کا جواب یہ دیا کہ تمام مخالف گروپوں کو ملا کر ان سب کا مقاطعہ کر دیا جو ابو طالب کے ساتھ اس گھاٹی میں پناہ گزیں ہوئے تھے، قریش کے ساتھ قبیلۂ بنو کنانہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہوا، مقاطعہ صرف رشتے ناتے کی حد تک نہیں تھا بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی بند کر دی گئیں، ایک عہد نامہ لکھا گیا کہ ان کے ساتھ نہ نکاح، بیاہ کیا جائے گا، نہ خرید وفروخت اور کوشش کی جائے گی کہ مکہ سے باہر بھی کہیں سے یہ لوگ کچھ نہ خرید سکیں۔ بیوپاریوں کو آمادہ کیا گیا کہ مکہ کے راستے کی نگرانی رکھیں اور باہر سے آنے والی جنس کو مکہ میں پہنچنے سے پہلے ہی خرید لیا کریں۔ سردارانِ قریش کے اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یہ عہد نامہ قومی حفاظت خانہ (خانہ کعبہ کے خزانہ) میں محفوظ کر دیا گیا ۔

بڑی سختی سے کرتے تھے قریش اس گھر کی نگرانی
نہ آنے دیتے تھے غلہ ادھر تا حدِّ امکانی
کوئی غلّے کا سوداگر اگر باہر سے آ جاتا
تو رستے ہی میں جا کر بو لہب کمبخت بہکاتا
پہاڑوں کا درہ اک قلعۂ محصور تھا گویا
اللہ والوں کو فاقوں مارنا منظور تھا گویا
رسول اللہ لیکن مطمئن تھے اور صابر تھے
اللہ جس حال میں رکھے اُسی حالت پہ شاکر تھے

نبوت کے ساتویں سال محرم کی پہلی تاریخ سے مقاطعہ شروع ہوا تھا جو تقریباً تین سال تک رہا، اس عرصہ میں درختوں کے پتے اور جڑیں کھا کر زندگی گزارنی پڑی، بچے بلبلاتے تھے مگر ان کو دودھ میسر نہیں آتا تھا، خوراک نہ ملنے سے دودھ پلانے والی ماؤں کے دودھ بھی خشک ہو گئے۔ سیدنا ابو بکر صدیق اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما

جیسے رفقاء اگرچہ بنو ہاشم نہیں تھے مگر وہ ان کے ساتھ تھے تو مقاطعہ ان سے بھی اتنا ہی سخت تھا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی ملا کر کھایا۔

(سیرت طیبہ محمد رسول اللہ ﷺ)

وہ بچوں کا تڑپنا ماہیٔ بے آب کی صورت
علیؓ کے ضبط میں غصے کے پیچ و تاب کی صورت
نبیؐ کے حکم کی تعمیل کرنا اور چپ رہنا
غضب کو ضبط کرنا، قہر اپنی جان پر سہنا
گزارے تین سال اس رنگ سے ایمان والوں نے
دکھا دی شانِ استقلال اپنی آن والوں نے
رضا و صبر سے دن کٹ گئے ان نیک بختوں کے
کہ کھانے کے لیے ملتے رہے پتے درختوں کے

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''تین سال اس سخت حال میں گزرے، اس زمانہ میں کچھ ضروریاتِ زندگی ان کے پاس پہنچ پاتی تھیں، قریش کے وہ لوگ جو ان کے ساتھ سلوک و صلہ رحمی کا معاملہ کرنا پسند کرتے تھے، ان (شعب ابی طالب میں ٹھہرے ہوئے لوگوں) کی در پردہ مدد کرتے، رسول اللہ ﷺ اس حال میں بھی اپنی قوم میں تبلیغ و دعوت کا فریضہ دن رات، خفیہ و علانیہ ہر طریقہ سے انجام دیتے اور بنو ہاشم صبر اور امید و اجر کے ساتھ ان تمام تکلیفات کو برداشت کرتے۔

عہد نامہ کی تنسیخ اور مقاطعہ کا خاتمہ:

اسی دوران قریش کے کچھ باضمیر اور عالی حوصلہ اشخاص کے دل میں، جن میں ہشام بن عمرو بن ربیعہ پیش پیش تھے، اس ظالمانہ معاہدہ کے خلاف ناپسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوا اور اس کو انہوں نے ایک خلافِ انسانیت فعل قرار دیا، ہشام حسن سلوک اور صلہ رحمی والے

شخص تھے، اپنی قوم میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں قریش کے ان اشخاص سے جن کے اندر کچھ نرم خوئی، حوصلہ مندی اور عالی ظرفی محسوس ہوئی، رابطہ قائم کیا اور ان کی شرافت وانسانیت کو غیرت دلائی اور اس پر آمادہ کیا کہ اس ظالمانہ معاہدہ کو ختم کیا جائے۔ یہ پانچ اشخاص تھے اور ان سب نے اس کو کالعدم قرار دینے پر اتفاق کر لیا، دوسرے دن جب قریش کی محفلیں آراستہ تھیں، عین اس محفل میں زُہیر بن امیہ جن کی ماں عائکہ بنت عبدالمطلب تھیں، لوگوں کے سامنے آئے اور کہنے لگے: ''اے مکہ والو! ہم مزے سے کھائیں پییں اور بنو ہاشم دانہ دانہ کو ترسیں اور جاں بلب ہوں۔ ان کے ساتھ خرید وفروخت تک بند ہو۔ واللہ! میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ اس ظالمانہ معاہدہ کو پرزہ پرزہ نہ کر دیا جائے۔''

اس موقع پر ابوجہل نے مداخلت کرنا چاہی، لیکن اس کی کچھ نہ چل سکی، مطعم بن عدی اس معاہدہ کو پھاڑنے کی غرض سے اس کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ دیمک پورے کاغذ کو چاٹ کر ختم کر چکی ہے صرف ''باسمک اللھُمَّ'' کے الفاظ باقی ہیں۔ (رسول اللہ ﷺ اس بات کی ابوطالب کو اطلاع پہلے سے فرما چکے تھے) ۔

کہ دیمک کھا چکی ہے ظالموں کے عہد نامے کو
شکستہ کر دیا اللہ نے باطل کے خامے کو
ہے عبرت کا سبق اس انتباہِ آسمانی میں
فقط نامِ رحمٰن باقی ہے اس تحریر فانی میں

بہرحال اس معاہدے کو پھاڑ کر پھینک دیا گیا۔'' (نبی رحمت ﷺ)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایسی فضا پیدا فرما دی کہ شعب ابی طالب کے مصائب اور مشکلات میں گرفتار انسان پھر مکہ واپس آنے کے قابل ہوئے، مگر ابھی کچھ اور امتحانات اور آزمائشیں تھیں۔

ابوطالب اور سیدہ خدیجہؓ کی وفات:

قریش کا مقاطعہ جو بعثتِ مبارکہ کے ساتویں سال شروع ہوا تھا، تین سال بعد دس (۱۰) بعثتِ

مبارکہ میں ختم ہوا، چند ماہ بعد رمضان کا مہینا آیا، اس مہینا میں چند روز کے فرق سے، آپ ﷺ کے چچا ابوطالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی۔

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی بڑی گرانقدر نعمت تھیں، وہ ایک چوتھائی صدی آپ ﷺ کی رفاقت میں رہیں اور اس دوران رنج وقلق کا وقت آتا تو آپ ﷺ کے لیے تڑپ اٹھتیں، سنگین اور مشکل ترین حالات میں آپ ﷺ کی مدد کرتیں اور اس تلخ ترین جہاد کی سختیوں میں آپ ﷺ کی خیر خواہی وغمگساری کرتیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس وقت لوگوں نے میرے ساتھ کفر کیا، وہ مجھ پر ایمان لائیں، جس وقت لوگوں نے مجھے جھٹلایا، انہوں نے میری تصدیق کی، جس وقت لوگوں نے مجھے محروم کیا، انہوں نے مجھے اپنے مال میں شریک کیا اور اللہ نے مجھے ان سے اولاد دی ۔

بیاں کرتا کہ یہ شادی بشر کی خوش نصیبی تھی
محمد ﷺ پاک شوہر تھا خدیجہؓ پاک بی بی تھی
بیاں کرتا کہ گزری ازدواجی زندگی کیسی
نظر والوں کو ملتی روح کی تابندگی کیسی
محبت ہی تہذیب و تمدن کی ہیں بنیادیں
بیاں کرتا کہ دیں اللہ نے کیسی پاک اولادیں
بیاں کرتا کہ قاسم، طیب و طاہر یہ تھے بیٹے
کہ بچپن ہی میں جو آرام سے تربت میں جا لیٹے
خدیجہؓ ہی سے حق نے آپ کو سب بیٹیاں بھی دیں
یہ زینبؓ اور رقیہؓ، اُمِّ کلثومؓ اور زہراؓ تھیں

ابو طالب اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات جیسے الم انگیز حادثے صرف چند دنوں کے دوران پیش آئے، جس سے نبی ﷺ کے دل میں غم والم کے احساسات موجزن ہو گئے اور اس کے بعد قوم کی طرف سے بھی مصائب و آلام کا طومار بندھ گیا، کیونکہ ابوطالب کی وفات کے بعد قریش کی

جسارت بڑھ گئی اور وہ کھل کر آپ ﷺ کو اذیت اور تکلیف پہنچانے لگے۔ اس کیفیت نے آپ ﷺ کے غم والم میں مزید اضافہ کر دیا۔

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) مذکورہ آیتِ مبارکہ میں خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو رب کریم نے تسلی اور تشفی دی کہ دعوت حق پیش کرتے وقت مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر صبر واستقامت کا دامن نہ چھوڑیے، کامیابی اور کامرانی ہمیشہ اہل حق کی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ انہیں سرخرو فرماتا ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہوا ہے کہ رسولوں نے حق وصداقت کا اعلان کیا تو انہیں جھٹلایا گیا اور انہوں نے اپنے لوگوں کے ہاتھوں تکالیف برداشت کیں، دکھ اٹھائے مگر حق کا علم سرنگوں نہ ہونے دیا، بالآخر فتح وکامرانی ان کا مقدر بنی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جو مشن لے کر اٹھے اسے اللہ تعالیٰ نے کامیابی سے ہمکنار فرمایا اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے مسلمانوں کے ایک جم غفیر سے خطاب فرمایا۔

۲) یہ آیتِ مبارکہ امتِ مسلمہ کے لیے عظیم پیغام رکھتی ہے کہ وہ متحد ہو کر کفر کے خلاف کمربستہ ہو جائیں تو انہیں بھی رب قدیر کی جانب سے پوری دنیا میں غلبہ حاصل ہوگا، یہ ارشادِ قرآن:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

''نہ کمزوری دکھاؤ اور نہ غم کھاؤ، تمہیں بلند ہو، اگر تم مومن ہو۔''

صبر وثبات کا داعی صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ ﴾ (الاحقاف:٤٦/٣٥)

"پس (اے نبی!) آپ ایسا صبر کیجیے جیسا صبر عالی ہمت رسولوں نے کیا اور ان (منکرین حق) کے لیے (طلبِ عذاب میں) جلدی نہ کیجیے۔"

فَاصۡبِرۡ (ف۔اصۡبِرۡ) پس۔صبر کیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (صَبَرَ، یَصۡبِرُ، صَبۡرًا) صبر کرنا، ہمت سے کام لینا اور نہ گھبرانا، مصائب اور مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا، صبر اور استقامت لازم وملزوم ہیں، کَمَا جیسے، جیسا، صَبَرَ صبر کیا، فعل ماضی واحد مذکر غائب، اُولُوا الۡعَزۡمِ عزم و ہمت والے، عالی ہمت، مِنَ الرُّسُلِ رسولوں نے، وَلَا اور نہ، تَسۡتَعۡجِلۡ آپ جلدی طلب کریں (عذاب) اس لفظ کا مادہ (ع ج ل) ہے (عَجِلَ، یَعۡجَلُ، عَجَلًا عَجَلَةً) جلدی کرنا، عجلت پسند ہونا، یہ لفظ باب استفعال میں (اِسۡتَعۡجَلَ، یَسۡتَعۡجِلُ) سے بھی آتا ہے، عجلت ظاہر کرنا، جلد باز ہونا، لَّهُمۡ ان کے لیے۔

سیدنا طالوت علیہ السلام (بنی اسرائیل) مومنوں کی جماعت کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور اس طرح دعا مانگی:

﴿رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ (البقرہ:٢/٢٥٠)

"اے ہمارے رب! ہمیں صبر دے اور ثابت قدمی سے نواز اور کفار پر ہماری مدد فرما۔"

ان دعائیہ کلمات سے معلوم ہوا کہ صبر کے مفہوم میں استقامت مضمر ہے، اسی طرح نماز اور صبر کا بھی گہرا تعلق ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾

(البقرہ:۲/۱۵۳)

''اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ (اللہ تعالیٰ) سے مدد چاہو، یقیناً اللہ تعالیٰ صابروں کا ساتھ دیتا ہے۔''

اور ''صبر'' میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا مفہوم بھی آتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا﴾ (الدھر:۷۶/۲۴)

''(اے نبی!) آپ اپنے رب کے حکم پر قائم رہیے اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کا کہا نہ مانیے۔''

اور 'صبر' ابتلا و آزمائش دکھوں اور غموں میں رونے پیٹنے سے رک جانے کے معنی بھی دیتا ہے، رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۵۵)

''اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے۔ دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے (ایسے تمام اوقات اور مواقع پر) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجیے۔''

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو پڑھ جایئے، آپ انہیں ہر دکھ اور ہر مشکل میں پیکرِ صبر و رضا پائیں گے، قرآن حکیم نے اسے ''صبر جمیل'' کا نام دیا ہے:

﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا﴾ (المعارج:۷۰/۵)

پس (اے نبی!) صبر کیجیے، (کیسا صبر؟) صبر جمیل (جس میں شکوہ و شکایت کا ذکر ہی کیا مخالفین کے حق میں دعائے خیر ہو)۔

سفر طائف، اہل کفر کی قساوت اور داعیِ

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

''آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کی وفات کے بعد ابولہب خانوادۂ بنو ہاشم کا رئیس بنا تو اس نے آپ ﷺ کو کنبہ بدر کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح آپ ﷺ اپنے خانوادے کی حمایت سے محروم ہو گئے، ایک چچا، یعنی ابوطالب نے جو کام قریش کی دھمکیوں، مخالفتوں اور معاشرتی مقاطعے کے باوجود نہیں کیا تھا، وہ کام دوسرے چچا ابولہب نے برضا و رغبت کر دیا، کنبہ بدری کی اہمیت کا اندازہ اس دور کے انسان کے لیے لگانا ازبس دشوار ہے، عرب کے قبائلی نظام میں ''بے حمایت'' ہو جانے کا مطلب شہری قبائلی، ملکی اور انسانی حقوق سے محروم ہو جانا تھا۔ ایسے شخص کی عزت و آزادی اور جان و مال کا چونکہ قصاص نہ ہوتا تھا، اس لیے جو شخص چاہتا اسے غلام بنا سکتا، اس کی عزت و دولت وغیرہ لوٹ سکتا، حتی کہ اسے قتل بھی کر سکتا تھا اور کوئی قانون، دستور اور رواج اس کی باز پرس نہیں کر سکتا تھا، قریش پہلے ہی آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے دور طائف کو اپنی تحریکِ انقلاب کا مستقر بنانے کا ارادہ کیا۔

طائف مکہ معظمہ سے چالیس پینتالیس میل دور ہے، یہ دامن کوہ میں اپنی زرعی پیداوار کی وجہ سے خوشحال علاقہ تھا، جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے وہاں بڑے بڑے زمیندار اور امراء رہتے تھے، مال و دولت کی فراوانی اور شرک و بت پرستی نے انہیں متکبر و سنگدل بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ (۲۷ شوال ۳ قبل ہجری) طائف گئے، اس وقت عمرو بن عوف کے بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب وہاں کے سردار تھے، آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں دعوتِ اسلام دی، انہوں نے ابلیسی منطق و استہزاء کے ساتھ دعوت کو ٹھکرا دیا اور اپنی حمایت میں لینے سے بھی انکار کر دیا۔ ان سے مایوس ہو کر آپ ﷺ نے عوام اور دوسرے امیروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، عمیری سرداروں نے اوباش لونڈوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا جو انسانیت، صداقت اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرمست

دنیا کے عظیم ترین انسان پر آوازے کستے، ہنستے، دشنام طرازی کرتے اور آپ ﷺ کے پاؤں پر سنگریزے اور روڑے وغیرہ مارتے، آپ ﷺ کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ آپ ﷺ دردِ جراحت سے مجبور ہو کر بیٹھتے تو ظالم زبردستی آپ ﷺ کو کھڑا کرتے اور سنگباری شروع کر دیتے، ظالموں کے دست و زباں کی ضربوں سے جسم اطہر کے ساتھ آپ ﷺ کا قلب مبارک بھی اس قدر مجروح ہوا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔'' (پیغمبر اعظم و آخر ﷺ)

بڑھے انبوہ در انبوہ پتھر لے کے دیوانے لگے مینہ پتھروں کا رحمت عالمؐ پہ برسانے
وہ اَبر لطف جس کے سائے کو گلشن ترستے تھے یہاں طائف میں اس کے جسم پر پتھر برستے تھے
وہ بازو جو غریبوں کو سہارا دیتے رہتے تھے پیہم آنے والے پتھروں کی چوٹ سہتے تھے
وہ سینہ جس کے اندر نورِ حق مستور رہتا تھا وہی اب شق ہوا جاتا تھا اس سے خون بہتا تھا
بشر کی عیب پوشی کے لیے جس کو اتارا تھا بشر کی چیرہ دستی سے وہ دامن پارا پارا تھا

ادھر سیدنا زید بن حارثہؓ ڈھال بن کر چلتے ہوئے پتھروں کو روک رہے تھے، جس سے ان کے سر پر کئی جگہ چوٹ آئی، بدمعاشوں نے یہ سلسلہ برابر جاری رکھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو عتبہ اور شیبہ ابنائے ربیعہ کے ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، یہ باغ طائف سے تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

جب آپ ﷺ نے یہاں پناہ لی تو بھیڑ واپس چلی گئی اور آپ ﷺ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر انگور کی بیل کے سائے میں بیٹھ گئے، قدرے اطمینان ہوا تو دعا فرمائی جو ''دعائے مستضعفین'' کے نام سے مشہور ہے، اس دعا کے ایک ایک فقرے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ طائف میں اس بدسلوکی سے دو چار ہونے کے بعد اور کسی ایک بھی شخص کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپ ﷺ کس قدر دل فگار تھے اور آپ ﷺ کے احساس پر حزن والم، غم و افسوس کا کس قدر غلبہ تھا، اس وقت لبِ مبارک پر دل کی گہرائیوں سے جو دعائیہ کلمات ادا ہوئے اسے پڑھنے والا آج بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا:

﴿اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَ ھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ،

يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ! اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَ اَنْتَ رَبِّیْ، اِلٰی مَنْ تَكِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِیْ اَمْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِیْ، اِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ، وَ لٰكِنْ عَافِيَتُكَ هِیَ اَوْسَعُ لِیْ، اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلَحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنيا وَ الْاٰخِرَةِ مِنْ اَنْ تُنْزِلَ بِیْ غَضَبَكَ اَو تُحِلَّ عَلَیَّ سَخَطَكَ، لَكَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی، وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ﴾

''الٰہی! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی، بے بسی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت آپ کے سامنے فریاد کرتا ہوں، یا ارحم الراحمین! آپ ہی درماندہ عاجزوں کے رب ہیں اور آپ ہی میرے بھی رب ہیں، آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟ کیا کسی بیگانے کے جو میرے ساتھ تندی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے، جس کو آپ نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر مجھ پر آپ کا غضب نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں، لیکن آپ کی عافیت میرے لیے کشادہ ہے، میں آپ کی ذات کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دین و دنیا کے سب معاملات درست ہو جاتے ہیں، (میں اس بات سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں) کہ آپ مجھ پر اپنا غضب نازل کریں، یا آپ کا عتاب مجھ پر وارد ہو، مجھے صرف اور صرف آپ ہی کی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور آپ کے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔ (کہیں بھی کوئی آسرا اور سہارا نہیں ہے) (الرحیق المختوم)

ادھر آپ ﷺ کو ابنائے ربیعہ نے اس حالت زار میں دیکھا تو ان کے جذبۂ قرابت میں حرکت پیدا ہوئی اور انہوں نے اپنے ایک عیسائی غلام کو جس کا نام عداس تھا بلا کر کہا کہ اس انگور سے ایک گچھا لو اور اس شخص کو دے آؤ، جب اس نے انگور آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیے تو آپ ﷺ نے بسم اللہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا اور کھانا شروع کیا۔

عداس نے کہا: ''یہ جملہ تو اس علاقے کے لوگ نہیں بولتے۔'' جناب رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تمہارا دین کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''میں عیسائی ہوں اور نینویٰ کا

باشندہ ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اچھا! تم مردِ صالح یونس بن متیٰ کی بستی کے رہنے والے ہو؟'' اُس نے پوچھا: ''آپ یونس بن متیٰ کو کیسے جانتے ہیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ میرے بھائی تھے، وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں، یہ سن کر عداس رسول اللہ ﷺ پر جھک پڑا اور آپ ﷺ کے سر اور ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا۔

یہ دیکھ کر ربیعہ کے دونوں بیٹوں نے آپس میں کہا لو اب اس شخص نے ہمارے غلام کو بگاڑ دیا، اس کے بعد جب وہ واپس گیا تو دونوں نے اس سے کہا: اجی! یہ کیا معاملہ تھا؟ اس نے کہا میرے آقا! روئے زمین پر اس شخص سے بہتر کوئی اور نہیں، اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

قدرے ٹھہر کر رسول اللہ ﷺ باغ سے نکلے تو مکہ کی راہ پر چل پڑے، غم والم کی شدت سے طبیعت نڈھال اور دل پاش پاش تھا، قرنِ منازل پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل علیہ السلام تشریف لائے، ان کے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ بھی تھا، وہ آپ ﷺ سے گزارش کرنے آیا تھا کہ آپ ﷺ حکم دیں تو وہ ان لوگوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالے۔

اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، ان کا بیان ہے کہ ''انہوں نے ایک روز رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا آپ ﷺ پر کوئی ایسا دن بھی آیا جو 'اُحُد' کے دن سے زیادہ سنگین رہا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''ہاں! تمہاری قوم سے مجھے جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اُن میں سب سے سنگین مصیبت وہ تھی جس سے میں گھاٹی کے دن (وادی طائف میں) دو چار ہوا، جب میں ربیعہ کے بیٹوں کے پاس دعوت و تبلیغ کے لیے گیا مگر انہوں نے میری بات نہ منظور کی تو میں غم والم سے نڈھال اپنے رخ پر چل پڑا اور مجھے قرنِ ثعلب پہنچ کر ہی افاقہ ہوا، وہاں میں نے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بادل کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ فگن ہے، میں نے بغور دیکھا تو اس میں جبریل علیہ السلام تھے۔ انہوں نے مجھے پکار کر کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے آپ ﷺ سے جو بات کہی، اللہ نے اسے سن لیا ہے، اب اس نے آپ ﷺ کے

پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تا کہ آپ ﷺ ان کے بارے میں اسے جو حکم چاہیں دیں، اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے آواز دی اور سلام کرنے کے بعد کہا: اے محمد! ﷺ بات یہی ہے، اب آپ ﷺ جو چاہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا (نہیں) بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ عزوجل ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے گی۔''

یہ فرما کر نبیؐ نے ہاتھ اٹھا کر ایک دعا مانگی　　اللہ کا فضل مانگا خوئے تسلیم و رضا مانگی
دعا مانگی: ''الٰہی قوم کو چشمِ بصیرت دے''　　الٰہی رحم کر ان پر، انہیں نورِ ہدایت دے
جہالت ہی نے رکھا ہے صداقت کے خلاف ان کو　　بچارے بے خبر انجان ہیں کر دے معاف ان کو
فراخی ہمتوں کو، روشنی دے ان کے سینوں کو　　کنارے پر لگا دے ڈوبنے والے سفینوں کو
الٰہی فضل کر کہسارِ طائف کے مکینوں پر　　الٰہی پھول برسا پتھروں والی زمینوں پر

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) اللہ جل جلالہ نے خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو صبر واستقامت کا راستہ دکھایا اور آپ ﷺ نے اسی آقا کی رحمت سے خندہ پیشانی کے ساتھ شدید مصائب اور دکھ برداشت کیے، مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

۲) اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ مصیبتیں ہمیشہ راحتوں کا پیش خیمہ بنتی ہیں ﴿اِنَّ مَعَ العُسْرِ یُسْرًا﴾ اہل طائف کو آپ نے پیغام حق سنایا مگر اس کے جواب میں انہوں نے پتھر برسائے، نبی رحمت ﷺ نے اس کے جواب میں ان کے لیے کلمات خیر ادا کیے۔

غرض یہ بانیانِ شر، یہ فرزندانِ تاریکی　　نبی پر مشق کرتے جا رہے تھے سنگباری کی
مگر اس رنگ میں جب تک زبان دیتی رہی یارا　　دعائے خیر ہی کرتا رہا اللہ کا پیارا

۳) پھر دنیا نے دیکھا کہ اہل طائف کے ساتھ حسن سلوک اور کلماتِ خیر رنگ لائے اور وہ پتھر دل

دعائے خیر سے موم دل بن گئے اور اسلام کی پاکیزہ اور روشن تعلیمات نے نہ صرف ان کی زندگیوں کو بدل ڈالا بلکہ وہ دنیائے انسانیت کے رہبر و رہنما بنے۔

۴) آج اسلام کو ایسے فرزندانِ توحید کی ضرورت ہے جن کی زندگیاں قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھلی ہوں اور وہ آج کی گمراہ اور مادیت میں ڈوبی ہوئی انسانیت کے لیے زندگی کی تاریکیوں میں روشنی بکھیریں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِى الْمِيْزَانِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

”رحمٰن کو دو کلمات بہت پسند ہیں یہ زبان پر تو ہلکے پھلکے ہیں اور ترازو میں (جس میں اعمال تولے جائیں گے) بڑے وزنی ہیں، وہ ”سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ“ ہیں (اللہ تو پاک ہے ہر عیب و نقص سے اپنی حمد و ثنا کے ساتھ) اور اللہ تعالیٰ پاک ہے ہر عیب و نقص سے اپنی عظمت و بزرگی کے ساتھ۔“

جنات کی طرف رسول ﷺ

﴿قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ ؕ وَ لَنۡ نُّشۡرِکَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا﴾

’’(اے محمد! ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے (قرآن) سنا اور پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہا) ’’ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز کسی کو بھی اپنے رب کا شریک نہ بنائیں گے۔‘‘ (الجن:۷۲/۱،۲)

قُلۡ (آپ ﷺ) کہہ دیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (قَالَ، یَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، قول وقرار اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، اُوۡحِیَ (کہ) وحی کی گئی ہے، ماضی مجہول واحد مذکر غائب (اَوۡحٰی، یُوۡحِیۡ) اللہ کا کسی کو پیغام بھیجنا، اور یہ پیغام انبیاء تک جبریل امین کے ذریعہ پہنچتا رہا، اِلَیَّ میری طرف، اَنَّہٗ یہ کہ، اِسۡتَمَعَ غور سے سنا (قرآن) دھیان دینا، فعل ماضی صیغہ واحد مذکر غائب، نَفَرٌ ایک جماعت نے مِّنَ الۡجِنِّ جنوں میں سے، فَقَالُوۡۤا انہوں نے کہا، فعل ماضی، جمع مذکر غائب (قَالَ یَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، اِنَّا بلاشبہ، ہم نے، سَمِعۡنَا سنا، فعل ماضی جمع متکلم (سَمِعَ، یَسۡمَعُ، سَمَاعًا) کسی کی بات توجہ سے سننا، دھیان دینا، قُرۡاٰنًا قرآن (حکم)، عَجَبًا عجیب، یَّہۡدِیۡ وہ راہنمائی کرتا ہے، فعل ماضی واحد مذکر غائب (ھَدٰی، یَھۡدِیۡ، ھُدًی وَ ھِدَایَۃً) رہنمائی کرنا، اِلَی الرُّشۡدِ راہِ حق

کی طرف، فَاٰمَنَّا پس ہم ایمان لائے، ہم نے دل و جان سے تصدیق کی، فعل ماضی جمع متکلم (آمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا، تصدیق کرنا، بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ، اس (قرآن) کے وَلَنْ اور ہرگز نہیں، نُشْرِکَ ہم شریک ٹھہرائیں گے، فعل مضارع جمع متکلم (اَشْرَکَ، یُشْرِکُ) اللہ کی حاکمیت میں کسی کو شریک ٹھہرانا، بِرَبِّنَآ (بِ. رَبِّنَآ) ساتھ، اپنے رب کے، اَحَدًا کسی کو بھی۔

واقعہ طائف کے سلسلے میں رسول اکرم ﷺ کی دعا پیچھے گزر چکی ہے۔ اس دعا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ اطہر، محبتِ الٰہی سے سرشار ہو گیا، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ لکھتے ہیں:

''غم والم کے بادل چھٹ گئے، چنانچہ آپ ﷺ نے (نئے حوصلے اور ولولے کے ساتھ) مکہ کی راہ پر پیش قدمی فرمائی اور وادیٔ نخلہ میں جافروکش ہوئے، یہاں دو جگہیں قیام کے لائق ہیں۔ ایک السیل الکبیر اور دوسری زیمہ، کیونکہ دونوں ہی جگہ پانی اور شادابی موجود ہے، لیکن کسی ماخذ سے یہ پتا نہیں چل سکا کہ آپ ﷺ نے ان میں سے کس جگہ قیام فرمایا تھا۔

وادیٔ نخلہ میں آپ ﷺ کا قیام چند دن رہا، اس دوران اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے پاس جنوں کی ایک جماعت بھیجی جس کا ذکر قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۃ الاحقاف میں، دوسرے سورۃ الجن میں، سورۃ الاحقاف کی آیات یہ ہیں:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (الاحقاف:۴۶/۲۹-۳۱)

''(اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب ہم نے آپ ﷺ کی طرف جنوں کے ایک گروہ کو پھیرا کہ وہ قرآن سنیں تو جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں آپ قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا کہ چپ ہو جاؤ (اور توجہ سے اسے سنو) پھر جب اس کی تلاوت پوری کی

جا چکی تو وہ (نورِ ایمان سے آراستہ ہوکر) اپنی قوم کی طرف عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے بن کر پلٹے، انہوں نے کہا: ''اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے، اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والی ہے، حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اے ہماری قوم! اللہ کے داعی (خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ) کی بات مان لو اور ان پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچائے گا۔''

یہ آیات (سورۃ الجن اور سورۃ الاحقاف کی) جو اس واقعے کے بیان کے سلسلے میں نازل ہوئیں، ان کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو ابتداءً جنوں کی اس جماعت کی آمد کا علم نہ ہوسکا تھا، بلکہ جب ان آیات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تب آپ واقف ہوسکے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کی یہ آمد پہلی بار ہوئی تھی اور احادیثِ مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ اس کے بعد ان کی آمد ورفت ہوتی رہی۔

جنوں کی آمد اور ان کے قبولِ اسلام کا واقعہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے (سفر طائف میں) دوسری مدد تھی (اس سے پہلے سفر طائف میں آپ کا تکالیف اور دکھوں کو برداشت کرنا اور رقت آمیز الفاظ میں اللہ کے حضور دعا کرنا اور آپ کے لیے رب کریم کی طرف سے سکون اور سکینت کا نزول اور پہاڑوں کے فرشتے کا آپ کے پاس پہنچنا تھا) جو اس نے اپنے غیب مکنون کے خزانے سے اپنے اس لشکر کے ذریعے فرمائی تھی جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، پھر اس واقعے کے تعلق سے جو آیات نازل ہوئیں، ان کے بیچ نبی ﷺ کی دعوت کی کامیابی کی بشارتیں بھی ہیں اور اس بات کی وضاحت بھی کہ کائنات کی کوئی بھی طاقت اس دعوت کی کامیابی کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الاحقاف:٤٦/٣٢)

''جو اللہ کے داعی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت قبول نہ کرے وہ زمین میں (اللہ کو) بے بس نہیں کر سکتا اور اللہ کے سوا اس کا کوئی کارساز ہے بھی نہیں اور ایسے لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا﴾ (الجن:۱۲/۷۲)

''ہماری سمجھ میں آ گیا ہے کہ ہم اللہ کو زمین میں بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہی بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں۔'' (الرحیق المختوم)

اس آیت کے ذیل میں سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ ہمارے اسی خیال نے ہمیں نجات کی راہ دکھا دی، ہم چونکہ اللہ سے بے خوف نہ تھے اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم نے اس کی نافرمانی کی تو اس کی گرفت سے کسی طرح بچ نہ سکیں گے، اس لیے جب وہ کلام ہم نے سنا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہ راست بتانے آیا تو ہم یہ جرأت نہ کر سکے کہ حق معلوم ہو جانے کے بعد انہی عقائد پر جمے رہتے جو ہمارے نادان لوگوں نے ہم میں پھیلا رکھے تھے۔'' (مختصر حواشی)

اس نصرت اور ان بشارتوں کے سامنے غم و الم اور حزن و مایوسی کے وہ سارے بادل چھٹ گئے جو طائف سے نکلتے وقت گالیاں اور تالیاں سننے اور پتھر کھانے کی وجہ سے آپ ﷺ پر چھائے تھے، آپ ﷺ نے عزم مصمم فرما لیا کہ اب مکہ پلٹنا ہے اور نئے سرے سے دعوت اسلام اور تبلیغ رسالت کے کام میں چستی اور گرمجوشی کے ساتھ لگ جانا ہے۔

رسول اللہ پھر طائف سے مکے کی طرف آئے
برائے دعوت و تبلیغِ حق پھر سربکف آئے
یہاں بہر تجارت سب قبائل آتے جاتے تھے
رسول پاک انہیں جا کر پیغامِ حق سناتے تھے

بہت سے خوش نصیب اللہ پر ایمان لے آئے
گھروں کی سمت پلٹے، دولتِ عرفان لے آئے
وطن میں جا کے سب نے دینِ بیضا کی منادی کی
کہ لوگو! جاگ اٹھی قسمت ہماری خشک وادی کی

طائف کے سفر سے واپسی پر سیدنا زید بن حارثہؓ نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ آپ مکہ کیسے جائیں گے جبکہ وہاں کے باشندوں یعنی قریش نے آپ ﷺ کو نکال دیا ہے؟ اور جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے زید! تم جو حالت دیکھ رہے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے کشادگی اور نجات کی کوئی راہ ضرور بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً اپنے دین کی مدد کرے گا اور اپنے نبی کو غالب فرمائے گا۔'' (الرحیق المختوم)

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حراء میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے سکتے ہو؟ عرب کا شعار تھا جب کوئی ان سے طالبِ حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا، انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ، رسول اللہ ﷺ مکہ تشریف لائے، مطعم اونٹ پر سوار نبی ﷺ کے ہمراہ تھا، حرم کے پاس آیا تو پکارا کہ میں نے محمد ﷺ کو پناہ دی ہے، رسول اللہ ﷺ حرم میں آئے۔ نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے، مطعم اور اس کے بیٹے آپ ﷺ کو تلواروں کے سایہ میں لائے۔''

(سیرت النبی ج:۱)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ﴿اُوْحِیَ اِلَیَّ﴾ (یعنی میری طرف وحی کی گئی) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود اس واقعہ میں جنوں کا مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ بعد میں وحی کے

ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس واقعہ کی خبر دی، سفر طائف میں جنوں کی ایک جماعت نے نبی ﷺ کو قرآن پڑھتے سنا، جس کی کشش نے ان کے دلوں کو اس طرح موہ لیا کہ وہ اس کے سننے میں ہمہ تن محو ہو گئے اور پھر اس دِل پذیر کلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار لذتِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا، یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا﴾

"ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔"

پھر وہ پلٹے تو اپنی قوم کو اس کی دعوت دینے اٹھ کھڑے ہوئے۔

۲) جنوں کے ان تاثرات کی آپ ﷺ کو اس لیے اطلاع دی گئی کہ اپنی قوم کو آپ ﷺ سنا دیں کہ جس کلام کی فصاحت و بلاغت ایسی پر اثر ہے کہ جنات جیسی مخلوق بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، حالانکہ وہ براہ راست اس کے مخاطب بھی نہیں ہیں، جبکہ تمہارا حال یہ ہے کہ اسے سن کر تم کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہو اور نبی مکرم، محسنِ انسانیت ﷺ کے درپے آزار رہتے ہو۔

۳) ﴿قُرۡاٰنًا عَجَبًا﴾ عجبٌ مصدر ہے، اس وجہ سے عَجِیبٌ کے مقابل اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے، یہ لفظ جنوں نے اس کلام کی دل پذیری، اثر انگیزی اس کی لطافت اور شیرینی اور حکمت آفرینی کے پہلو سے استعمال کیا ہے اور انہوں نے اپنی قوم کو حیرت سے یہ بات کہی کہ وہ ایک ایسا کلام سن کر آئے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے مضامین کے اعتبار سے بے مثل اور بے مثال ہے۔

احادیثِ مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد جنات آپ ﷺ کی خدمت میں آتے رہے اور آپ سے ہدایات لیتے رہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن عربی زبان سے اچھی طرح واقف تھے، ہو سکتا ہے کہ مختلف علاقوں کے جن مختلف زبانیں بولتے ہوں۔

۴) اس میں خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ بشارت بھی ملی کہ آپ کی نبوت نہ صرف نسلِ انسانیت کی طرف ہے بلکہ جنات کی طرف بھی ہے۔

۵) ''جن'' انسان کے بالمقابل پوشیدہ مخلوق ہے، وہ انسان کو دیکھ سکتے ہیں مگر انسان ان کو نہیں دیکھ سکتے،قرآن حکیم میں آتا ہے:

''شیطان اور ان کے ساتھی تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔''

(الاعراف:۲۷/۷)

٦) شیطان (ابلیس) جنوں میں سے تھا اور اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار تھا، پارسائی کی وجہ سے فرشتوں کی صف میں شامل ہو چکا تھا مگر اپنی سرکشی اور نافرمانی کے سبب اللہ کی رحمت سے دور ہو گیا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

''یاد کرو، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ (تعظیمی) کرو تو انہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا۔ وہ جنوں میں سے تھا۔ اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔'' (الکھف:۵۰/۱۸)

پھر اسی (ابلیس) نے اللہ تعالیٰ سے انسانوں کو بہکانے کی مہلت مانگی، جو اسے دے دی گئی، یہ اللہ کی مشیت تھی اور اس میں انسان کا امتحان بھی مقصود تھا کہ کون اپنے رب کا وفادار ہے اور کون شیطان کے راستے پر چلتا ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا تھا:

''جو میرے حقیقی بندے ہیں (احکام کی پوری طرح اطاعت کرنے والے) ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔'' (الحجر:۴۲/۱۵)

اور اسے بھی اس بات کا اقرار کرنا پڑا:

''میں ان سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا بجز تیرے مخلص بندوں کے۔'' (ص:۸۳/۳۸)

اس ابلیس نے جنوں اور انسانوں کو بہکا کر بہت بڑا لاؤ لشکر تیار کر لیا اور لفظِ شیطان کا اطلاق ہر مفسد و سرکش انسان اور جن پر ہونے لگا، بندۂ مومن اپنے رب کی پناہ میں آتا ہے ہر وسوسہ ڈالنے والے شیطان سے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

۷) جنات کی تخلیق آدمؑ سے پہلے ہوئی، اس آیتِ مبارکہ سے پتا چلتا ہے، رب کریم کا فرمان ہے:

''میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری

بندگی کریں۔"

عبارت کی ترتیب سے پتا چلتا ہے کہ انسانوں سے قبل جنوں کی پیدائش تھی اور ان کو بھی یقیناً عبادت کے طور طریقے سکھائے گئے ہوں گے مگر زمین پر خلافت انسان کو عطا کی گئی:

"جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا، میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔" (البقرہ:۲/ ۴۰)

اور آدمؑ کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔

۸) جس طرح انسان مکلّف اور مسئول ہیں اور روزِ جزا وسزا ان کا حساب کتاب ہوگا، اسی طرح جن بھی مکلّف اور مسئول ہیں۔

۹) جس طرح انسانوں میں سے نیک اور بد، مسلم اور کافر ہیں، اسی طرح جنوں میں سے بھی نیک اور بد اور مسلم اور کافر ہیں، قرآن میں ہے:

"اور یہ کہ (جنوں کی جماعت میں سے) کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں۔"

(الجن۷۲:۱۲)

۱۰) انسانوں کی تخلیق خاک سے ہوئی جبکہ جنوں کی آگ سے، جس طرح خاک کی نوعیت ہمارے رہنے سے، اسی طرح آگ کی بھی کوئی شکل وصورت ہوگی:

"(ابلیس تکبر سے بولا) میں اس سے بہتر ہوں، (یعنی آدمؑ سے) اے رب! آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے خاک سے۔"

۱۱) انسانوں اور جنوں میں سے جنہوں نے تعلیماتِ قرآن کو پہچانا اور اس کی تعلیمات کو حرزِ جاں بنایا اور وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہو گئے تو دنیا اور آخرت کی کامیابیاں انہیں کے نصیب میں آئیں۔

دعوتِ عام دینے والے رسول ﷺ

﴿وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ﴾ (الانعام:٦/١٩)

”(اے نبی! فرما دیجیے) کہ میرے پاس یہ قرآن بطورِ وحی بھیجا گیا ہے تا کہ میں اس قرآن کے ذریعہ سے تم کو اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کر دوں۔“

وَ اُوۡحِیَ اور وحی کیا گیا، فعل ماضی مجہول واحد مذکر (اَوۡحٰی، یُوۡحِیۡ) وحی کرنا، اللہ تعالیٰ کا کسی کے پاس پیغام بھیجنا، اس کے احکام جبریل امین کے ذریعہ انبیائے کرام تک پہنچتے رہے اور وہ لوگوں تک من وعن پہنچاتے رہے، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا پیغام دور و نزدیک لوگوں تک پہنچایا، اِلَیَّ میری طرف، هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ یہ قرآن، لِاُنۡذِرَکُمۡ (لِاُنۡذِرَ. کُمۡ) تا کہ میں ڈراؤں (متنبہ کروں)، تمہیں (اَنۡذَرَ، یُنۡذِرُ، اِنۡذَارًا) ڈرانا، متنبہ کرنا ”کم“ ضمیر جمع مذکر مخاطب، لوگوں کی طرف جاتی ہے، بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ اس (کے) یعنی قرآن کے ذریعے سے، وَ مَنۡ اور جس کو، بَلَغَ یہ پہنچے (بَلَغَ، یَبۡلُغُ) پہنچنا، اِبۡلَاغٌ دوسروں تک پہنچانا، اردو میں بھی جانا پہچانا لفظ ہے، جیسا کہ ذرائع ابلاغ وغیرہ۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

”(سفر طائف سے واپسی پر) اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے میں تحریکِ انقلاب کا کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا، جہاں مسلمان زیرِ زمین انقلابی سرگرمیوں

میں مصروف تھے اور انہیں آپ ﷺ کے مشوروں، ہدایات اور قیادت کی احتیاج تھی، مطعم بن عدی کی حمایت میں آپ ﷺ کے مکے میں رہنے کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ فوج کو سپہ سالار کے بغیر اور تحریکِ انقلاب کو قائد کے بغیر اپنی جہت کھو دینے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

انقلاب آفریں و تاریخ ساز شخصیتیں مصیبتوں اور ناکامیوں سے حوصلہ و ہمت نہیں ہارتیں، اس کے برعکس مصائب سے اگر ان میں قوتِ مزاحمت بڑھتی اور ان کے حوصلوں میں توانائی پیدا ہوتی ہے تو ناکامیوں سے ان میں جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے اور ان کی ہمت جوان ہوتی ہے، چنانچہ طائف کے مصائب و ناکامیوں کا ردِعمل یہ ہوا کہ آپ ﷺ میں خوداعتمادی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی اور آپ ﷺ نے ایک نئے ولولے اور جوش کے ساتھ اپنی انقلابی سرگرمیوں کو تیز سے تیز کرنے کا عزم کیا، آپ ﷺ نے مسلمانوں کو بدستور زیرِ زمین تحریک چلانے کی ہدایات دیں اور قبائلِ عرب میں جا کر انہیں دعوتِ اسلام دینے کی ذمہ داری خود اٹھائی ؎

رسول اللہؐ پھر طائف سے مکے کی طرف آئے
برائے دعوت و تبلیغِ حق، پھر سر بکف آئے
یہاں بہر تجارت سب قبائل آتے جاتے تھے
رسول پاک انہیں جا کر پیغام حق سناتے تھے

دشمنِ اسلام ابولہب سائے کی طرح آپ کے پیچھے لگا رہتا تھا، آپ ﷺ جہاں تشریف لے جاتے، وہ بھی وہاں پہنچ جاتا، آپ ﷺ تلاوت فرماتے تو وہ رخنے ڈالتا اور لوگوں کو سننے نہ دیتا، آپ ﷺ کچھ کہنے لگتے تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ شور مچاتا، جو اس کے جی میں آتا کہتا اور کرتا تاکہ کہیں لوگ آپ ﷺ کے حسنِ خطابت اور کلامِ الٰہی کی بلاغت و صداقت سے متاثر نہ ہو جائیں۔

آپ ﷺ کا مشن مثبت اور تعمیری تھا تو ابولہب کا کام منفی و تخریبی تھا۔ آپ ﷺ کا مشن

افرادِ نسل کو ان کے حقیقی اِلٰہ و رب سے ملانا تھا، جبکہ ابولہب کا کام جدا کرنا تھا، اصل یہ ہے کہ نبوت کا وظیفہ 'وصل' ہے، یعنی انسانوں کو اللہ سے ملانا، اس کے علی الرغم شیطنت کی سرگرمیوں کا مقصد 'فصل' یعنی انسان اور اللہ تعالیٰ میں جدائی ڈالنا ہوتا ہے، لہٰذا رحمٰن کے بندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ نبوت کے سچے اور فعال پیروکار ہوتے ہیں اور لوگوں کو ان کے حقیقی خالق و مالک سے ملانے کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں، جبکہ شیطان کے دوست لوگوں کو ان کے رب سے بدظن کرتے اور انہیں اس سے دور لے جانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ یہ انسان اور شیطان میں تمیز کرنے کا ایک عالمگیر معیار ہے، انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسان کا دوست ہوتا ہے اور شیطان کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسان کا دشمن ہوتا ہے، جس طرح دن کے اجالے کے ساتھ رات کا اندھیرا لگا رہتا ہے، اسی طرح انسان کے ساتھ شیطان لگا رہتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان جتنا عظیم ہوتا ہے، اس کا شیطان بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شیطان کی مزاحمت ہی سے انسان کی طبعی صلاحیتوں میں قوت وتوانائی بدرجہ اتم پیدا ہوتی ہے اور اسے عظیم بناتی ہے، چنانچہ ابولہب بھی ایک مقتدر و با اثر شیطان تھا اور شیطنت میں بہت بڑا تھا، وہ آپ ﷺ کی انسان دوست کوششوں کو اپنے زعم میں ناکام بنا بنا کر خوش ہوتا، اتراتا اور اپنے آپ کو کامیاب انسان سمجھتا تھا لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابولہب، جو دشمنِ انسانیت وصداقت تھا، ناکام و نامراد مرا اور آپ ﷺ جو رحمۃ للعالمین تھے اور ہیں، عظیم وکامیاب انسان تھے اور ہیں، اصل یہ ہے عظمتِ انسان کا راز دوسروں کے لیے رحمت بن جانے میں مضمر ہے، لہٰذا انسان کی رحمت کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا، اس کی شخصیت اتنی ہی آفاقی اور عظیم ہوگی، تاریخ ایسے ہی انسانوں کو زندہ جاوید بنایا کرتی ہے۔

بظاہر نامساعد حالات پیش آتے رہے مگر آپ ﷺ اپنا کام کرتے رہے، آپ ﷺ میلوں اور موسمی بازاروں مثلاً سوقِ عکاظ اور سوقِ ذوالمجاز اور مجنہ میں جاتے اور لوگوں کو تحریکِ اسلام میں شمولیت کی دعوت دیتے، حج کے موقع پر آپ ﷺ مکہ کے باہر یا منیٰ میں

زائرین سے رابطہ قائم کرتے اور انہیں قرآن مجید سناتے اور دعوتِ اسلام دیتے اور ساتھ ہی انہیں امن وسلامتی کی آزاد وخوشحال زندگی، قوتِ وصولت اور عظیم الشان سلطنت اور قیادتِ اقوام کا مژدہ سناتے، انہیں قدرت کے قانون مکافاتِ عمل سے ڈراتے اور جنت کی ابدی زندگی کی خوشخبری سناتے تھے وہ سنتے، متاثر بھی ہوتے لیکن شرک و بت پرستی کی دیرینہ روایات کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتے، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عرب بڑے متشدد قسم کے، روایات کے پیروکار اور شخصیت پرست تھے، ان کے قبائلی نظام میں رئیسِ قبیلہ کی بات قولِ فیصل اور اس کا حکم حرفِ آخر ہوتا تھا اور اس سے انحراف کا کوئی فرد تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، بزم ہو یا رزم اطاعتِ امیر ان کی زندگی کا شعار تھا اور اسی میں ان کی تنظیم، اتحاد اور قوت کا راز مضمر تھا اور اس دور کی سیاسی زندگی میں یہ اطاعت شعاری ہی ان کی بقا کی ضامن بھی تھی۔

پیغمبر اعظم و آخر ﷺ قبائل کو تحریکِ اسلام میں شامل کرنے کی خاطر توحید کی دعوت دیتے تھے جو اصل دین ہے، توحید انسان کو جہالت، توہمات، شرک اور غیر اللہ کی غلامی سے نجات دلاتی ہے، اسے اس کے اِلٰہ حقیقی سے ملاتی اور انسانیت کے آزاد و محترم مقام پر متمکن کرتی ہے، عقیدۂ توحید جب انسان کی فکری و عملی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتا ہے تو اس کا قول و فعل اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کے احکام کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ ہی اس کی طلب و آرزو اور پرستش و محبت کا معروض بن جاتا ہے اور انسان عبدیت کے مقامِ احسن و ارفع پر فائز ہو جاتا ہے، جسے اصطلاح میں 'قرب وصال' یا تقربِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں ''لا شریک لہ''
آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ ''لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرْ''

یعنی اے مسلمان! اس دنیا میں تیری ساری بلندیاں اور سرفرازیاں صرف اس وجہ سے ہیں کہ تو اللہ وحدہ لاشریک لہ کا بندہ ہے اور تو اللہ تعالیٰ کے سوا (مخلوق میں سے) کسی معبود کو نہیں پکارتا، تیری تمام مشکلات اور مصائب میں صرف ایک ہی کا در مرجع و ماویٰ ہے، تیرے اسلاف نے بھی زندگی کی تمام کامیابیاں وہیں سے حاصل کیں اور تجھے بھی عزت و عظمت کا سامان وہیں سے ملے گا۔

تقربِ الٰہی سے انسان میں ایمان کی ناقابل تسخیر قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی بدولت وہ بینا اور صاحبِ حسن وسرور بن جاتا ہے اور پھر عمل سے اس میں بے مثل لذت اور لازوال چاشنی پیدا ہوتی ہے ؎

لذتِ ایمان فزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

عمل سے تو لذت ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ایمان ہی مردہ ہے جو عمل میں نہ آئے۔

اسلام کے نزدیک یہی مقصودِ حیات انسانی اور یہی مشیت الٰہی ہے، یہی فطرت انسان کی آرزو اور یہی آپ ﷺ کی دعوت کی غایت حقیقی تھی، چنانچہ قبائل کو آپ ﷺ جو دعوت دیتے تھے اس متن کا ترجمہ اس طرح ہے۔

''اے فلاں قبیلے والو! میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، جو تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ اور اللہ کے سوا جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو اور ان کو اس کا مقابل بنا رکھا ہے، انہیں چھوڑ دو، مجھ پر ایمان لاؤ، میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو، یہاں تک کہ میں ان چیزوں کو صاف صاف بیان کر ڈالوں جن کے ساتھ اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے۔''

لوگ آپ ﷺ کے مواعظِ حسنہ کو سنتے، متاثر بھی ہوتے، لیکن اپنے عقائد و روایات کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے، پھر قبائلی وفاداریاں، نیز سیاسی و معاشی اور معاشرتی مصلحتیں بھی دعوتِ اسلام کو قبول کرنے میں مانع آتی تھیں، پھر بھی اکا دکا شخص تحریکِ اسلام میں

شامل ہوتا رہتا تھا ؎

بہت سے خوش نصیب اللہ پر ایمان لے آئے
گھروں کی سمت پلٹے، دولتِ عرفان لے آئے

تحریک اسلام کا آغاز مکہ معظّمہ میں ہوا، لیکن اس کے ملجا و مستقر بننے کا شرف چونکہ مدینہ منورہ نے حاصل کرنا تھا، اس لیے آپ ﷺ کی توجہ زیادہ سے زیادہ یثرب کی طرف ہونے لگی، قریش کی مخالفت و شقاوت اور ایذا رسانی کے باوجود آپ ﷺ ان سے مایوس تو نہ ہوئے کہ مایوسی آپ ﷺ کے دین میں حرام تھی، البتہ آپ ﷺ کی فکر رسا اور بصیرت اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح کے قبائل کو رام کرنے کے لیے ابھی مزید وقت درکار ہے، لہٰذا یثرب (مدینہ منورہ) کے مشرک قبائل میں تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دینی چاہیں اور مدینہ کو اسلام کا ملجا و مستقر بنانے کے لیے کام کرنا چاہیے، تاریخ نے بعد میں ثابت کر دیا کہ آپ ﷺ کی فکر و نظر کا ہدف ٹھیک اور فیصلہ درست تھا، چنانچہ آپ ﷺ ان لوگوں کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے جو یثرب سے حج و عمرہ کرنے کی غرض سے آتے تھے۔"

(پیغمبر اعظم و آخر ﷺ)

ایمان کی شعائیں مکے سے باہر:

سیدنا سوید بن الصامت رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کو اس سلسلے کی پہلی کامیابی کہہ سکتے ہیں (یہ سن ۳ قبل ہجرت کا واقعہ ہے) وہ اس بات کے مدعی تھے کہ ان کے پاس سیدنا لقمان کا صحیفۂ حکمت ہے جسے 'مجلّہ لقمان' کہتے تھے اور انہیں حکیمانہ اقوال بھی یاد تھے، حکمت کے علاوہ انہیں شاعری و شجاعت میں بھی کمال حاصل تھا، اس بنا پر لوگوں میں 'کامل' کے لقب سے معروف تھے، انہیں اپنی حکمت پر ناز تھا، چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کی حکمت و بلاغت کا شہرہ سنا تو مقابلہ و مناظرہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لے گئے۔ سیدنا سویدؓ نے مجلّہ لقمان پیش کیا، آپ ﷺ نے اسے سراہا اور پھر انہیں قرآنِ حکیم سنایا تو وہ اسقدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت ایمان لے آئے، ذوقِ حکمت نے اگر انہیں کلام الٰہی پہچاننے کے قابل بنایا تو اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ انہیں دولت ایمان کے

ساتھ حیاتِ جاوید بھی عطا کی جائے۔ چنانچہ جب وہ مدینہ منورہ پہنچے تو ایک سچے مسلمان کی طرح تحریکِ اسلام کے لیے کام کرنے لگے لیکن انہیں یہ کام کرنے کی زیادہ مہلت نہ ملی کیونکہ جنگ بعاث میں وہ اپنی جان پر کھیل گئے، لیکن پھر بھی تحریکِ اسلام کو اہل مدینہ سے روشناس کرانے میں ان کی خدمات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

آیت مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) سفر طائف سے واپسی پر جناب رسول اللہ ﷺ کا دعوتِ توحید کا نیا دور شروع ہوا، جسے آپؐ نے عزم و ہمت اور جوش و ولولہ سے سرانجام دیا اور شہر مکہ کے اردگرد قبائل میں بھی دعوت وتبلیغ کا کام شروع کر دیا، ابولہب، جو ابوطالب کی وفات کے بعد شہر کا رئیس بن چکا تھا، ہر طرف آڑے آتا، برا بھلا کہتا، لوگوں کو آپ ﷺ کے خلاف اکساتا مگر آپ ﷺ نے ان تمام مصائب وابتلا کے باوجود دعوتِ حق کو جاری وساری رکھا۔

۲) آفتابِ رسالت کی کرنیں مکہ سے باہر مدینہ منورہ کے در و دیوار کو چھونے لگیں، اللہ تعالیٰ نے اہل مدینہ کے دل اسلام کے لیے کھول دیے اور مدینہ منورہ اسلام کا عظیم الشان مرکز بنا۔

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ الْحَيَاءَ وَالْاِيْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِيْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ (مشکوۃ)

''بے شک حیا اور ایمان ساتھ ساتھ ہیں، جب ایک اٹھ جاتا ہے، تو دوسرا بھی اٹھ جاتا ہے۔''

دعوتِ رسول پر لبیک کہنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ (التوبة:۹/۱۰۰)

''وہ مہاجرین و انصار جنہوں نے سب سے پہلے (جناب نبی ﷺ کی) دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی نیز وہ جو بعد میں راستبازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔''

وَ السّٰبِقُوْنَ اور سبقت کرنے والے (قبول اسلام میں) (سَبَقَ، يَسْبِقُ، سَبْقًا) کسی چیز کے حصول کے لیے دوسروں سے آگے بڑھنا، اَلْاَوَّلُوْنَ سب سے پہلے، اس کا مفرد اَلْاَوَّلُ ہے، مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ، مہاجرین اور انصار میں سے، اَلْمُهٰجِرِيْنَ کا مفرد اَلْمُهَاجِرُ ہے، وہ لوگ جنہوں نے ایمان لانے کے بعد مکہ سے مدینہ ہجرت کی، وَ الْاَنْصَارِ اس کا مفرد نَصِيْرٌ مددگار ہے، وہ لوگ جنہوں نے اپنے مہاجرین بھائیوں کی مدد کی یعنی اہل مدینہ، وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ، اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی اتباع کی، یعنی ایمان لانے میں ان کے نقشِ قدم پر چلے، (اِتَّبَعَ، يَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا)

پیچھے چلنا، پیروی کرنا، اِتَّبَعَ الْقُرْآنَ وَ الْحَدِیْثَ، قرآن وحدیث پر عمل کرنا۔ (القاموس الوحید)
''هُمْ'' ان (کی) ضمیر جمع مذکر غائب، صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف جاتی ہے اور ان کی اتباع کرنے والے تابعین، تبع تابعین، سلف صالحین اور قیامت تک آنے والے ابرار وصالحین ہیں، بِاِحْسَانٍ، احسان کے ساتھ یعنی خلوص اور وفاداری کے ساتھ، رَّضِیَ اللّٰهُ راضی ہوگیا، اللہ تعالیٰ (رَضِیَ، یَرْضَی) راضی ہونا، عَنْهُمْ (عَنْ.هُمْ) سے، اُن، یعنی ان سے، وَ رَضُوْا اور وہ راضی ہوگئے (صحابہؓ کرامؓ، تابعینؒ وغیرہ) عَنْهُ (عَنْ.هُ) سے، اس، یعنی اللہ تعالیٰ سے، ہٗ کی ضمیر اللہ جل جلالہ کی طرف جاتی ہے، وَ اَعَدَّ اور اس (اللہ) نے تیار کر رکھے ہیں، فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَعَدَّ، یُعِدُّ) تیار کرنا، لَهُمْ (لَ.هُمْ) لیے، ان کے 'هُمْ' کی ضمیر جمع مذکر غائب ابرار وصالحین کی طرف جاتی ہے، جَنّٰتٍ ایسے (باغات) اس کا مفرد جَنَّةٌ ہے، تَجْرِیْ (کہ) بہتی ہیں، واحد مؤنث غائب (جَرٰی، یَجْرِیْ، جَرْیًا) بہنا، رواں دواں ہونا، تَحْتَهَا (تَحْتَ.هَا) نیچے، اُن (کے) 'ھا' ضمیر واحد مؤنث غائب جنّٰتٍ (باغات) کی طرف جاتی ہے، اَلْاَنْهٰرُ نہریں اس کا مفرد نہر ہے، خٰلِدِیْنَ وہ ہمیشہ رہیں گے، خَالِدٌ کی جمع خَالِدُوْنَ، اسم فاعل ہمیشہ رہنے والے اور حالت نصبی اور جری میں خَالِدِیْنَ، فِیْهَآ (فِیْ.هَا) میں، اُس، یعنی اس جنت میں، 'ھا' ضمیر واحد مؤنث غائب جنّٰتٍ کی طرف جاتی ہے، اَبَدًا ابد تک ہمیشہ ہمیشہ، ذٰلِکَ یہ ہے، اَلْفَوْزُ کامیابی موصوف، اَلْعَظِیْمُ بہت بڑی صفت، عربی میں صفت موصوف کی اعرابی حالت یکساں ہوتی ہے۔

ذی قعدہ ۱۰ نبوت کو رسول اللہ ﷺ طائف سے مکہ تشریف لائے یہاں مختلف قبائل کو دعوتِ اسلام پیش کی تو اس کے ساتھ ساتھ کئی ذی اثر افراد کو بھی اس دعوت سے روشناس کرایا ان میں سے چند کے نام اس طرح ہیں:

۱-ایاس بن معاذ

یہ یثرب کے باشندے تھے اور نوخیز نوجوان ۱۱ نبوت میں جنگِ بعاث سے کچھ پہلے اَوس قبیلے کا ایک وفد خزرج قبیلے کے خلاف قریش سے حلف وتعاون کی تلاش میں مکہ آیا تھا، ایاس بن معاذ بھی اسی کے ہمراہ تشریف لائے تھے، اس وقت یثرب میں ان دونوں قبیلوں کے

درمیان عداوت کی آگ بھڑک رہی تھی اور اَوْس کی تعداد خزرج سے کم تھی، رسول اللہ ﷺ کو وفد کی آمد کا علم ہوا، تو آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے درمیان بیٹھ کر یوں خطاب فرمایا:

''آپ لوگ جس مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں کیا اس سے بہتر چیز قبول کر سکتے ہیں؟''

ان سب نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ نے مجھے اپنے بندوں کے پاس اس بات کی دعوت دینے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں، اللہ نے مجھ پر کتاب بھی اتاری ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے اسلام کا ذکر کیا اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔

ایاس بن معاذ بولے: اے قوم! واللہ! یہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے آپ لوگ یہاں آئے ہیں، لیکن وفد کے ایک رکن ابوالحیسر انس بن رافع نے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر ایاس کے منہ پر دے ماری اور بولا: یہ بات چھوڑو! میری عمر کی قسم! یہاں ہم اس کی بجائے دوسرے ہی مقصد سے آئے ہیں، ایاس نے خاموشی اختیار کر لی اور رسول اللہ ﷺ بھی اٹھ گئے، وفد قریش کے ساتھ حلف وتعاون کا معاہدہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور یوں ہی ناکام مدینہ واپس ہو گیا، مدینہ پلٹنے کے تھوڑے ہی دن بعد ایاس بن معاذ کا انتقال ہو گیا، وہ اپنی وفات کے وقت تہلیل وتکبیر اور حمد وتسبیح کر رہے تھے، اس لیے لوگوں کو یقین ہے کہ ان کی وفات اسلام پر ہوئی۔'' (الرحیق المختوم)

۲- ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ:

یہ یثرب کے اطراف میں سکونت پذیر تھے، جب سوید بن صامت اور ایاس بن معاذ کے ذریعے یثرب میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر پہنچی تو اس کی اطلاع ابوذر رضی اللہ عنہ کو بھی ملی اور یہی ان کے اسلام لانے کا سبب بنی۔

ان کے اسلام لانے کا واقعہ صحیح بخاری میں تفصیل سے مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان

ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''میں قبیلہ غفار کا ایک آدمی تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مکہ میں ایک آدمی ہے جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے، میں نے اپنے بھائی سے کہا ''تم اس شخص کے پاس جاؤ، اس سے بات کرو اور میرے پاس اس کی خبر لاؤ'' وہ گیا، ملاقات کی اور واپس آیا، میں نے پوچھا کہ کیا خبر لائے ہو؟ بولا: واللہ، میں نے ایک ایسا شخص دیکھا ہے جو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے، میں نے کہا: تم نے تسلی بخش خبر نہیں دی، آخر میں نے زادِ راہ لیا اور مکہ کی طرف چل پڑا، وہاں پہنچ تو گیا لیکن آپ ﷺ کو پہچانتا نہ تھا اور یہ بھی گوارا نہ تھا کہ آپ ﷺ کے متعلق کسی سے پوچھوں، چنانچہ آب زمزم پیتا اور مسجد حرام میں پڑا رہتا، آخر میرے پاس سے علیؓ کا گزر ہوا، کہنے لگے ''اجنبی معلوم ہوتے ہو!'' میں نے کہا: جی ہاں! انہوں نے کہا: اچھا تو گھر چلو، میں ان کے ساتھ چل پڑا، نہ انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا اور نہ میں نے ہی انہیں کچھ بتایا۔

صبح ہوئی تو میں اس ارادے سے پھر مسجد حرام گیا کہ آپ ﷺ کے متعلق دریافت کروں لیکن کوئی شخص نہ تھا جو مجھے آپ ﷺ کے متعلق کچھ بتاتا، آخر میرے پاس سے پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ گزرے، (مجھے دیکھ کر بولے) تمھیں ابھی تک اپنا ٹھکانا معلوم نہ ہو سکا؟ میں نے کہا: ''نہیں'' انہوں نے کہا ''اچھا تو میرے ساتھ چلو، تو میں ساتھ چل پڑا، انہوں نے دریافت کیا کہ تمہارا معاملہ کیا ہے؟ اور تمہارا یہاں آنا کیسے ہوا؟ میں نے عرض کیا ''آپ رازداری سے کام لیں تو بتاؤں'' انہوں نے کہا، ''ٹھیک ہے، میں ایسے ہی کروں گا۔ میں نے کہا، ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں ایک شخص ہے جو اپنے آپ کو اللہ کا نبی بتاتا ہے، میں نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ وہ بات کر کے آئے مگر اس نے واپسی پر کوئی تسلی بخش بات نہ بتائی، اس لیے میں نے سوچا کہ خود ہی ملاقات کرلوں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: بھئی تم صحیح جگہ پہنچے ہو، دیکھو! میرا رخ انہیں کی طرف ہے، جہاں میں داخل ہوں، وہاں تم بھی داخل ہو جانا اور ہاں، اگر میں کسی ایسے شخص کو دیکھوں گا جس سے تمہارے لیے خطرہ ہے تو دیوار کی طرف اس طرح جا رہا ہوں گا گویا اپنا جوتا ٹھیک کر رہا ہوں لیکن تم راستہ چلتے رہنا۔

اس کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے اور میں بھی ساتھ ساتھ چل پڑا۔ یہاں تک کہ وہ ایک جگہ اندر داخل ہوئے اور میں بھی ان کے پیچھے داخل ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ مجھ پر اسلام پیش فرمائیں، اسے سنتے ہی مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

''ابوذر! اس معاملے کو پس پردہ رکھو اور اپنے علاقے میں واپس چلے جاؤ، جب مسلمانوں کو قوت ملے تو آ جانا۔''

میں نے کہا، ''اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں تو ان کے درمیان اپنے اسلام کا برملا اعلان کروں گا۔'' اس کے بعد مسجد حرام آیا، قریش موجود تھے، میں نے باآواز بلند کہا ''قریش کے لوگو!''

﴿اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ﴾

''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

لوگوں نے یہ سنتے ہی کہا: اٹھو! اس بے دین کی خبر لو، لوگ اٹھ پڑے اور مجھے اس قدر مارا کہ مجھے میری جان کا خطرہ لاحق ہوا ؎

حقیقت کا تمہارے سامنے اظہار کرتا ہوں
میں توحید و رسالت کا بہ دل اقرار کرتا ہوں
اٹھے سب طیش کھا کر پل پڑے اس مرد غازی پر
کیا ان بھیڑیوں نے حملہ اس شیرِ حجازی پر

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے مجھے آ بچایا، انہوں نے مجھے غور سے دیکھا تو قریش کی طرف رخ کر کے بولے: تمہاری بربادی ہو، تم لوگ قبیلۂ غفار کے ایک (معزز) شخص کو مارنا چاہتے ہو؟ تم جانتے ہو کہ تمہاری گزرگاہ اور تجارت کا راستہ قبیلۂ غفار ہی سے ہو کر جاتا ہے، اس پر لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا، دوسرے دن صبح ہوئی تو میں پھر وہیں گیا او جو کچھ کل کہا تھا آج پھر

کہا، لوگ پھر پکار اٹھے کہ اس بے دین کی خبر لو! اس پر لوگوں نے میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جو اس سے پہلے کر چکے تھے اور آج بھی سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے مجھے آ بچایا اور قریش سے مخاطب ہو کر وہی بات کہی جو کل کہہ چکے تھے۔

۳- طفیل بن عمرو دوسی:

یہ شریف انسان مضبوط شاعر، سوجھ بوجھ کے مالک اور قبیلۂ دوس کے سردار تھے، ان کے قبیلے کو یمن کے نواح میں امارت حاصل تھی۔ وہ نبوت کے گیارہویں سال مکہ تشریف لائے، اہل مکہ نے شہر سے باہر ان کا استقبال کیا اور نہایت عزت و احترام سے پیش آئے اور ان سے عرض پرداز ہوئے ''اے طفیل! آپ ہمارے شہر تشریف لائے ہیں، ہمارے شہر میں ایک شخص اپنے آپ کو اللہ کا نبی بتاتا ہے، اس نے ہمیں سخت پیچیدگی میں پھنسا رکھا ہے، ہماری جمعیت بکھیر دی ہے اور ہمارا شیرازہ منتشر کر دیا ہے، اس کی بات جادو کا سا اثر رکھتی ہے کہ کسی شخص اور اس کے باپ کے درمیان، بھائی بھائی کے درمیان، میاں بیوی کے درمیان تفرقہ ڈال دیتی ہے، ہمیں ڈر لگتا ہے کہ جس اُفتاد سے ہم دوچار ہیں کہیں وہ آپ پر اور آپ کی قوم پر بھی نہ آن پڑے، لہٰذا آپ اس سے ہرگز گفتگو نہ کریں اور اس کی کوئی بات نہ سنیں۔

سیدنا طفیل رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ یہ لوگ مجھے برابر اس طرح کی باتیں سمجھاتے رہے، یہاں تک کہ میں نے تہیہ کر لیا کہ نہ آپ ﷺ کی کوئی بات سنوں گا اور نہ آپ ﷺ کے ساتھ کوئی بات چیت ہی کروں گا، چنانچہ جب میں صبح کو مسجد حرام گیا تو کان میں روئی ٹھونس رکھی تھی، مبادا آپ ﷺ کی کوئی بات میرے کان میں پڑ جائے، لیکن اللہ کو منظور ہوا کہ وہ آپ ﷺ کی بعض باتیں مجھے سنا ہی دے، چنانچہ میں نے بڑا عمدہ کلام سنا، پھر میں نے اپنے جی میں کہا: ہائے مجھ پر میری ماں کی آہ و فغاں! واللہ! میں تو ایک سوجھ بوجھ رکھنے والا شاعر ہوں، مجھ پر بھلا برا چھپا نہیں رہ سکتا، پھر کیوں نہ میں اس شخص کی بات سنوں؟ اگر اچھی ہوئی تو قبول کر لوں گا، بری ہوئی تو چھوڑ دوں گا، یہ سوچ کر میں رک گیا اور جب

آپ ﷺ گھر پلٹے تو میں پیچھے ہولیا۔ آپ ﷺ اندر داخل ہوئے تو میں بھی داخل ہو گیا اور آپ ﷺ کو اپنی آمد کا واقعہ اور لوگوں کے خوف دلانے کی کیفیت، پھر کان میں روئی ٹھونسنے اور اس کے باوجود آپ ﷺ کی بعض باتیں سن لینے کی تفصیلات بتائیں، پھر عرض کیا کہ آپ ﷺ اپنی بات پیش کیجیے، آپ ﷺ نے مجھ پر اسلام پیش کیا اور قرآن کی تلاوت فرمائی، اللہ تعالیٰ گواہ ہے، میں نے اس سے عمدہ قول اور اس سے زیادہ انصاف کی بات کبھی نہ سنی تھی، چنانچہ میں نے وہیں اسلام قبول کر لیا اور حق کی شہادت دی، اس کے بعد آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میری قوم میں میری بات مانی جاتی ہے، میں اُن کے پاس واپس جاؤں گا اور انہیں اسلام کی دعوت دوں گا، لہٰذا آپ ﷺ اللہ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے کوئی نشانی دے دے، آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔

سیدنا طفیل رضی اللہ عنہ کو جو نشانی عطا ہوئی وہ یہ تھی کہ جب وہ اپنی قوم کے قریب پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے پر چراغ جیسی روشنی پیدا کر دی۔ انہوں نے کہا: یا اللہ! چہرے کی بجائے کسی اور جگہ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اسے مثلہ کہیں گے، چنانچہ یہ روشنی ان کے عَصا (لاٹھی) میں پلٹ گئی، پھر انہوں نے اپنے والد اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی اور وہ دونوں مسلمان ہو گئے مگر قوم نے اسلام قبول کرنے میں تاخیر کی، تاہم سیدنا طفیل رضی اللہ عنہ دعوتِ حق پھیلانے میں مسلسل کوشاں رہے حتی کہ غزوۂ خندق کے بعد جب انہوں نے ہجرت فرمائی تو ان کے ساتھ ان کی قوم کے ستر (۷۰) یا اسی (۸۰) خاندان تھے: ؎

طفیل ابن عمرو دوسی یمن کا شاہزادہ تھا
حضورِ سرورِ دیں اس کا آنا بے ارادہ تھا
قریش مکہ نے بہکا دیا تھا اس کو آتے ہی
کہ انساں عقل کھو دیتا ہے اس کے پاس جاتے ہی
قضا کار ایک دن یہ ہو گیا دو چار حضرتؐ سے
سنا قرآن، پھر معمور تھا نورِ ہدایت سے

مسلمان بن کے خوش قسمت یمن کی سمت لوٹ آیا
پئے تبلیغ حق اہلِ وطن کی سمت لوٹ آیا

سیدنا طفیل رضی اللہ عنہ نے اسلام میں بڑے اہم کارنامے انجام دے کر جنگِ کریمانہ جامِ شہادت نوش فرمایا۔ (الرحیق المختوم)

۴- ضِمَاد اَزدِی

یہ یمن کے باشندے اور قبیلۂ از دشنؤہ کے ایک فرد تھے، جھاڑ پھونک کرنا اور آسیب اتارنا ان کا کام تھا، مکہ آئے تو وہاں کے احمقوں سے سنا کہ محمد ﷺ (نعوذ باللہ) پاگل ہیں، سوچا کیوں نے اس شخص کے پاس چلوں ہوسکتا ہے، اللہ میرے ہی ہاتھوں سے اسے شفا دے دے، چنانچہ آپ ﷺ سے ملاقات کی اور کہا ''اے محمد! (ﷺ) میں آسیب اتارنے کے لیے جھاڑ پھونک کیا کرتا ہوں، کیا آپ (ﷺ) کو بھی اس کی ضرورت ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

((اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ))

''یقیناً ہر تعریف اور ہر شکر اللہ ہی کے لیے ہے، ہم بھی اسی کی تعریف اور اسی کا شکر بجا لاتے ہیں اور صرف اسی کی مدد کے طلبگار ہیں، (حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ ہدایت سے سرفراز فرمائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ بھٹکا دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔''

ضماد نے کہا ذرا اپنے یہ کلمات مجھے پھر سنا دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار انہیں دہرایا، اس کے بعد ضماد نے کہا: میں کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کی بات سن چکا ہوں، مگر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جیسے کلمات کہیں نہیں سنے، یہ تو سمندر کی اتھاہ گہرائی کو

پہنچے ہوئے ہیں، لایئے! اپنا ہاتھ بڑھایئے! آپ ﷺ سے اسلام پر بیعت کروں، اس کے بعدانہوں نے بیعت کرلی۔" (الرحیق المختوم)

یثرب کے چھ سعادت مند افراد

گیارہویں سن نبوت کے موسم حج میں اسلامی دعوت کو چند کارآمد بیج دستیاب ہوئے، جو دیکھتے دیکھتے سروقامت درختوں میں تبدیل ہو گئے اور ان کی خوشگوار اور گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر مسلمانوں نے برسوں سے ہونے والے ظلم وستم کی تپش سے راحت ونجات پائی۔

اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کا جو بیڑا اٹھا رکھا تھا اس کے تئیں نبی ﷺ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ آپ رات کی تاریکی میں قبائل کے پاس تشریف لے جاتے تاکہ مکے کا کوئی مشرک رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

اس حکمت عملی کے مطابق ایک رات آپ ﷺ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ باہر نکلے، بنو ذہل اور بنوشیبان بن ثعلبہ کے ڈیروں سے گزرے تو ان سے اسلام کے بارے میں بات چیت کی، انہوں نے جواب تو بڑا امید افزا دیا لیکن اسلام قبول کرنے کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کیا، اس موقع پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بنو ذہل کے ایک شخص کے درمیان سلسلۂ نسب کے متعلق بڑا دلچسپ سوال و جواب بھی ہوا۔ دونوں ماہرِ انساب تھے۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ منیٰ کی گھاٹی سے گزرے تو کچھ لوگوں کو باہم گفتگو کرتے سنا، آپ ﷺ نے سیدھے ان کا رخ کیا اور ان کے پاس جا پہنچے، یہ یثرب کے چھ جوان تھے اور سب کے سب قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، نام یہ ہیں:

۱- اسعد بن زرارہ (قبیلۂ بنی النجار)

۲- عوف بن حارث بن رفاعہ (ایضاً)

۳- رافع بن مالک بن عجلان (قبیلۂ بنی زریق)

۴- قطبہ بن عامر بن حَدِیدہ (قبیلۂ بنی سلمہ)

۵- عقبہ بن عامر بن نابی (قبیلۂ بنی حرام بن کعب)

کرتے تھے کہ اس زمانے میں ۶۔ حارث بن عبداللہ بن رئاب

پیروی کر کے اس کی معیت میں تمہیں یہ اہل یثرب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنے حلیف یہودِ مدینہ سے سنا

ایک نبی بھیجا جانے والا ہے اور جلد ہی ان کا ظہور ہوگا، ہم اس کی

عادِارم کی طرح ختم کر ڈالیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کے پاس پہنچ کر دریافت کیا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا ''ہم قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''یعنی یہود کے حلیف؟'' بولے: ہاں۔ فرمایا: ''پھر کیوں نہ آپ حضرات بیٹھیں اور کچھ بات چیت کی جائے۔'' وہ لوگ بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کی حقیقت بیان فرمائی۔ انہیں اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا: بھئی دیکھو یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کا حوالہ دے کر یہود تمھیں دھمکیاں دیا کرتے تھے، لہٰذا یہود تم پر سبقت نہ لے جانے پائیں۔ اس کے بعد انہوں نے فوراً آپ ﷺ کی دعوت قبول کر لی اور مسلمان ہو گئے۔

یہ یثرب کے عقلاء الرجال (دانشمند لوگ) تھے، حال ہی میں جو جنگ گزر چکی تھی اور جس کے دھویں اب تک فضا کو تاریک کیے ہوئے تھے اور اس جنگ نے انہیں چور چور کر دیا تھا، اس لیے انہوں نے بجا طور پر یہ توقع قائم کی کہ آپ ﷺ کی دعوت، جنگ کے خاتمے کا ذریعہ ثابت ہوگی، چنانچہ انہوں نے کہا ''ہم اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ کسی اور قوم میں ان کے جیسی عداوت اور دشمنی نہیں پائی جاتی، امید ہے کہ اللہ آپ ﷺ کے ذریعے انہیں یکجا کر دے گا، ہم وہاں جا کر لوگوں کو آپ ﷺ کے مقصد کی طرف بلائیں گے اور یہ دین جو ہم نے قبول کر لیا ہے، ان پر بھی پیش کریں گے، اگر اللہ نے آپ ﷺ پر ان کو یکجا کر دیا تو پھر آپ سے بڑھ کر کوئی اور معزز نہ ہوگا۔

اس کے بعد جب یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے تو اپنے ساتھ اسلام کا پیغام بھی لے گئے، چنانچہ گھر گھر رسول اللہ ﷺ کا چرچا پھیل گیا

اس صورت سے چند افراد آئے ارضِ یثرب سے پسند آیا انہیں اسلام ہی سارے مذاہب سے
وطن میں جا کے سب نے دینِ بیضا کی منادی کی کہ لوگو! جاگ اٹھی قسمت ہماری خشک وادی کی

وہ پیغمبرؐ کہ جس کا منتظر سارا زمانہ تھا
وہ پیغمبر نوشتوں کے مطابق جس کو آنا تھا
اُسی کو دیکھ کر آئے ہیں ہم مکے کی بستی میں
اللہ کا نام لیتا ہے جہان بت پرستی میں
سنو! ہم نے کلام اس کا سنا ہے اپنے کانوں سے
جو صورت ہم نے دیکھی کہہ نہیں سکتے زبانوں سے
اللہ کے فضل سے ہم سب مسلماں ہو کے آئے ہیں
دلوں سے بت پرستی کی نجاست دھو کے آئے ہیں
یہ سن کر غلغلہ سا پڑ گیا اطرافِ یثرب میں
اُخوت از سر نو آ چلی اشرافِ یثرب میں

آیتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) جن لوگوں نے اخلاص سے ایمان قبول کیا، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور اس کی عنایتوں سے بہرہ ور ہوئے، ان کے حصے میں دنیا اور آخرت کی کامیابیاں اور سرفرازیاں آئیں، مہاجرین (اہل مکہ) اور انصار (اہل مدینہ) اس میں سرفہرست ہیں، اس کے بعد وہ تمام ابرار و صالحین آ جاتے ہیں جو ان نفوسِ قدسیہ کے نقش قدم پر چلے۔

۲) غور کیجیے کہ دعوتِ ایمان سے وہی لوگ فیض یاب ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ، دل و دماغ کی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہیں، غور وفکر سے کام لیتے ہیں اور بالآخر وہ راہِ حق کو پا لیتے ہیں، یہ دین اہل بصیرت کے لیے ہے، اندھوں اور بہروں کے لیے نہیں ہے۔

ایک اور حدیث مبارک میں ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَفُضَلُ الُجِهَادِ مَنُ قَالَ كَلِمَةَ الُحَقِّ عِنُدَ سُلُطَانٍ جَائِرٍ (مشکوٰۃ)

''بہترین جہاد اس شخص کا ہے جس نے ظالم حاکم کے سامنے سچی بات کہی۔''

رسول اللہ ﷺ کا سفرِ معراج

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَی الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ﴾

"پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات کے کچھ حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے، اس لیے کہ ہم انہیں یعنی (محمد ﷺ) کو اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔" (بنی اسرائیل:۱/۱۷)

سُبۡحٰنَ پاک ہے، کلمۂ تنزیہہ، سبحان اللہ، اللہ تعالیٰ ہر عیب اور برائی سے پاک ہے، اس کی ذات ہر نقص اور کمزوری سے مبرا ہے، اور اس کی طاقت لامحدود اور بے پناہ ہے، اس نے اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے کچھ حصے میں سیر کرائی اور عزت و سرفرازی سے نوازا، اَلَّذِیۡۤ وہ، جو، اسم موصول، اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لے گیا اپنے بندے کو (أَسرَى اللَّيۡلَ و بِهٖ) رات میں چلنا، بُفلانٍ و فُلانًا، رات کو لے جانا (القاموس الوحید) لَیۡلًا کی تنکیر قلّت پر دلالت کرتی ہے، اَسۡرٰی، رات کے وقت سیر کو کہتے ہیں، پھر لَیۡلًا کا لفظ لا کر اس کی تاکید کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ سیر رات کے کچھ حصے میں ہوئی، مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ مسجد حرام (حرمت اور عزت والی مسجد یعنی بیت اللہ) سے، اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصٰی (بیت المقدس) تک، اَلَّذِیۡ وہ جو، اسم موصول، بٰرَکۡنَا، ہم نے برکت دے رکھی ہے، فعل

ماضی صیغہ جمع مذکر غائب، اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا ہے، جمع کا صیغہ عزت کے لیے آتا ہے۔ (بَارَکَ، یُبَارِکُ) برکت دینا، حَوْلَهٗ (حَوْلَ.هٗ) اردگرد، اس کے، یعنی مسجد اقصیٰ کے اردگرد کا علاقہ جو نہروں اور پھلوں کی کثرت اور انبیاء کا مسکن و مدفن ہونے کے لحاظ سے ممتاز ہے، لِنُرِیَهٗ (لِ.نُرِیَ.هٗ) تاکہ ہم دکھائیں انہیں (یعنی محمد ﷺ) هٗ ضمیر واحد مذکر غائب، آپ ﷺ کی طرف جاتی ہے۔ مِنْ اٰیٰتِنَا اپنی کچھ نشانیاں، اس کا مفرد آیۃٌ ہے، اِنَّهٗ هُوَ بلاشبہ وہی ہے یعنی رب العزت، اَلسَّمِیْعُ خوب سننے والا، جو مخلوق میں سے ہر ایک کی فریاد پکار سنتا ہے، بلکہ دلوں کی دھڑکنوں سے بھی آگاہ ہے، اَلْبَصِیْرُ خوب دیکھنے والا ہے، ہر چھوٹی بڑی چیز اس کی نگاہ میں ہے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ لکھتے ہیں:

''۲۷ رجب ۱۰ نبوت کو معراج ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی سیر کرائی۔ اول مسجد الحرام سے بیت المقدس تک تشریف لے گئے، وہاں امام بن کر جماعتِ انبیاء کو نماز پڑھائی، پھر آسمانوں کی سیر کرائی اور انبیاء سے ان کے مقامات پر ملتے ہوئے سدرۃ المنتہٰی اور بیت المعمور تک پہنچے اور وہاں رب العالمین سے ہم کلام ہونے کا شرف ملا۔'' (رحمة للعالمين)

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ لکھتے ہیں:

''حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ صحیح قول کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو آپ کے جسمِ مبارک سمیت براق (بجلی سے تیز سواری) پر سوار کر کے سیدنا جبریل ؑ کی معیت میں مسجد حرام سے بیت المقدس تک سیر کرائی گئی، پھر آپ ﷺ نے وہاں نزول فرمایا اور انبیائے کرام کی امامت فرماتے ہوئے نماز پڑھائی اور براق کو مسجد کے دروازے کے حلقے سے باندھ دیا تھا۔

اس کے بعد اسی رات آپ ﷺ کو بیت المقدس سے آسمانِ دنیا تک لے جایا گیا، جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھلوایا، آپ ﷺ کے لیے دروازہ کھولا گیا، اور آپ ﷺ نے وہاں انسانوں کے باپ سیدنا آدم علیہ السلام کو دیکھا اور انہیں سلام کیا، انہوں نے آپ ﷺ

کو مرحبا کہا اور سلام کا جواب دیا اور آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے دائیں جانب سعادت مندوں کی روحیں اور بائیں جانب بدبختوں کی روحیں دکھلائیں۔ پھر آپ ﷺ کو دوسرے آسمان پر لے جایا گیا اور دروازہ کھلوایا گیا۔ آپ ﷺ نے وہاں سیدنا یحییٰ بن زکریا علیہما السلام اور سیدنا عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو دیکھا، دونوں سے ملاقات کی اور سلام کیا، دونوں نے سلام کا جواب دیا، مبارک باد دی اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔ پھر تیسرے آسمان پر لے جایا گیا، آپ ﷺ نے وہاں سیدنا یوسف علیہ السلام کو دیکھا اور سلام کیا، انہوں نے جواب دیا مبارک باد دی اور آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا۔

پھر چوتھے آسمان پر لے جایا گیا، وہاں آپ ﷺ نے سیدنا ادریس علیہ السلام کو دیکھا اور انہیں سلام کیا، انہوں نے جواب دیا مرحبا کہا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

پھر پانچویں آسمان پر لے جایا گیا، وہاں آپ ﷺ نے سیدنا ہارون بن عمران علیہ السلام کو دیکھا اور انہیں سلام کیا، انہوں نے جواب دیا، مبارک باد دی اور نبوت کا اقرار کیا۔ پھر آپ ﷺ کو چھٹے آسمان پر لے جایا گیا، وہاں آپ ﷺ کی ملاقات سیدنا موسیٰ بن عمران سے ہوئی آپ ﷺ نے سلام کیا، انہوں نے مرحبا کہا اور نبوت کا اقرار کیا۔ البتہ جب آپ ﷺ وہاں سے آگے بڑھے تو وہ رونے لگے، ان سے کہا گیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: میں اس لیے رو رہا ہوں کہ ایک نوجوان جو میرے بعد مبعوث کیا گیا، اس کی امت کے لوگ میری امت کے لوگوں سے بہت زیادہ تعداد میں جنت میں جائیں گے۔

اس کے بعد آپ ﷺ کو ساتویں آسمان پر لے جایا گیا۔ وہاں آپ ﷺ کی ملاقات سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ آپ ﷺ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا، مبارک باد دی اور آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا۔

پھر آپ ﷺ کو اللہ کے دربار میں پہنچایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر وحی فرمائی اور پچاس وقت کی نمازیں فرض کیں۔

اس کے بعد آپ ﷺ واپس ہوئے تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو انہوں نے

پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کس چیز کا حکم دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پچاس نمازوں کا۔'' انہوں نے کہا: آپ ﷺ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، آپ رب کے حضور واپس جایے اور اپنی امت کے لیے تخفیف کا سوال کیجیے۔ آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کی طرف دیکھا گویا ان سے مشورہ لے رہے ہیں، انہوں نے اشارہ کیا کہ ہاں، اگر آپ چاہیں۔ اس کے بعد سیدنا جبریلؑ آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور لے گئے تو دس نمازیں کم کردی گئیں، واپسی پر پھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزر ہوا تو انہیں خبر دی، انہوں نے کہا: ''آپ ﷺ اپنے رب کے پاس واپس جایے اور مزید تخفیف کا سوال کیجیے۔'' اس طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے درمیان اور اللہ تعالیٰ عزوجل کے حضور آمد و رفت برابر جاری رہی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ عزوجل نے صرف پانچ نمازیں باقی رکھیں۔ اس کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کو واپسی اور طلبِ تخفیف کا مشورہ دیا، مگر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب مجھے اپنے رب سے شرم محسوس ہورہی ہے، میں اس پر راضی ہوں اور سرِ تسلیم خم کرتا ہوں، پھر جب آپ کچھ دور تشریف لے گئے تو ندا آئی کہ میں نے اپنا فریضہ نافذ کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی۔ (یعنی جو بندے خلوص سے بروقت پانچ نمازیں ادا کریں گے انہیں اجر پچاس نمازوں کا ہی دیا جائے گا)

آپ ﷺ پر دودھ اور شراب پیش کیے گئے، آپ نے دودھ اختیار فرمایا، اس پر آپ ﷺ سے کہا گیا کہ آپ ﷺ کو فطرت کی راہ بتائی گئی یا آپ ﷺ نے فطرت کی راہ کو پا لیا۔

آپ ﷺ کو جنت اور جہنم کا مشاہدہ کرایا گیا، آپ ﷺ نے ان لوگوں کو دیکھا جو یتامیٰ کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں۔ ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے اور وہ اپنے منہ میں پتھر کے ٹکڑوں جیسے انگارے ٹھونس رہے تھے جو دوسری جانب ان کے مقعد کے راستے سے نکل رہے تھے۔

آپ ﷺ نے سود خوروں کو دیکھا، ان کے پیٹ اتنے بڑے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتے تھے۔

آل فرعون کو دکھایا گیا، کہ کس طرح انہیں آگ پر پیش کیا جا رہا ہے۔
آپ ﷺ نے زنا کاروں کو بھی دیکھا، ان کے سامنے تازہ اور فربہ گوشت تھا اور اسی کے پہلو بہ پہلو سڑا ہوا چھیچھڑا بھی تھا، یہ لوگ تازہ اور فربہ گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا چھیچھڑا کھا رہے تھے۔
آپ ﷺ نے ان عورتوں کو دیکھا جو اپنے شوہروں پر دوسروں کی اولاد داخل کر دیتی ہیں (یعنی دوسروں سے بے حیائی کی مرتکب ہوتی ہیں لیکن لاعلمی سے پیدا ہونے والا بچہ ان کے شوہروں سے سمجھا جاتا ہے) آپ ﷺ نے انہیں دیکھا کہ ان کے سینوں میں بڑے بڑے کانٹے چبھو کر انہیں آسمان و زمین کے درمیان لٹکا دیا گیا ہے۔
آپ ﷺ نے آتے جاتے ہوئے اہل مکہ کا ایک قافلہ بھی دیکھا اور انہیں ان کا ایک اونٹ بھی بتایا گیا جو بھڑک کر بھاگ گیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کا پانی بھی پیا جو ایک ڈھکے برتن میں رکھا تھا۔ اس وقت قافلہ سو رہا تھا، پھر آپ ﷺ نے اسی طرح برتن ڈھک کر چھوڑ دیا اور یہ بات معراج کی صبح آپ ﷺ کی صداقت کی ایک دلیل ثابت ہوئی۔
علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے صبح کی اور اپنی قوم کو ان بڑی بڑی نشانیوں کی خبر دی جو اللہ عزوجل نے آپ ﷺ کو دکھلائی تھیں تو قوم کی تکذیب اور اذیت و ضرر رسانی میں اور شدت آ گئی۔ انہوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ بیت المقدس کی کیفیت بیان کریں، اس پر اللہ نے آپ ﷺ کے لیے بیت المقدس کو ظاہر فرما دیا اور وہ آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے آ گیا، چنانچہ آپ ﷺ نے قوم کو اس کی نشانیاں بتلانا شروع کیں اور ان سے کسی بات کی تردید نہ بن پڑی۔ آپ ﷺ نے جاتے اور آتے ہوئے ان کے قافلے سے ملنے کا بھی ذکر فرمایا اور بتلایا کہ اس کی آمد کا وقت کیا ہے، آپ ﷺ نے اس اونٹ کی بھی نشان دہی کی جو قافلے کے آگے آگے آ رہا تھا، پھر جو کچھ آپ ﷺ نے بتایا تھا ویسا ہی ثابت ہوا، لیکن ان سب کے باوجود ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوا اور ان ظالموں نے کفر کرتے ہوئے کچھ بھی ماننے سے انکار کر دیا۔
کہا جاتا ہے کہ ابو بکرؓ کو اس موقع پر صدیق کا خطاب دیا گیا کیونکہ آپ نے اس واقعہ کی

اس وقت تصدیق کی جبکہ دوسرے لوگوں نے تکذیب کی تھی۔

معراج کا فائدہ بیان فرماتے ہوئے جو سب سے مختصر اور عظیم بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے:

﴿لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيَاتِنَا﴾ (بنی اسرائیل:۱/۱۷)

تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی کچھ نشانیاں دکھلائے۔

اور انبیائے کرام کے بارے میں یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، ارشاد ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾

(الانعام:٦/٧٥)

''اور اس طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمان و زمین کا نظام سلطنت دکھایا تا کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو۔''

اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

﴿لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى﴾

''(رب کریم کا ارشاد ہے) تا کہ ہم تمہیں اپنی کچھ بڑی نشانیاں دکھائیں۔''

پھر ان نشانیوں کو دکھانے کا جو مقصود تھا اسے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد:

﴿وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾

(تا کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو) کے ذریعے واضح فرما دیا۔

چنانچہ جب انبیائے کرام کے علوم کو اس طرح کے مشاہدات کی سند حاصل ہو جاتی تھی تو انہیں ''عین الیقین'' کا وہ مقام حاصل ہو جاتا تھا جس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' اور یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام اللہ کی راہ میں ایسی ایسی مشکلات جھیل لیتے تھے جنہیں کوئی اور جھیل ہی نہیں سکتا درحقیقت ان کی نگاہوں میں دنیا کی ساری قوتیں مل کر بھی مچھر کے پر کے برابر حیثیت نہیں رکھتی تھیں، اس لیے وہ ان قوتوں کی طرف سے ہونے والی سختیوں اور ایذا رسانیوں کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ (الرحیق المختوم)

آیتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) واقعۂ معراج رسول اللہ ﷺ سفر طائف کے بعد پیش آیا، وادی طائف میں آپ کو مصائب و مشکلات، دکھوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا، آپ کے ساتھ اہل طائف نے انتہائی ناروا سلوک کیا۔ جسدِ اطہر ظالموں کے ستم سے زخموں سے چور چور ہوا مگر لبِ مبارک پر ان کے لیے دعائے خیر کے کلمات جاری و ساری ہوئے۔ معراج نے آپ ﷺ کو عزت و عظمت کی بلندیوں پر پہنچا دیا، رب کریم نے آپ ﷺ کو بے پناہ رحمتوں سے نوازا۔

۲) مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ آپ ﷺ دونوں قبلوں کے نبی اور دونوں سمتوں، مشرق و مغرب کے امام اور اپنے پیش رو تمام انبیائے کرام کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسلِ انسانیت کے رہبر و رہنما ہیں، قبلۂ اول (مسجد اقصیٰ) ہو یا قبلۂ ثانی (مسجد حرام) دونوں واجب الاحترام ہیں اور ان دونوں کی پاسبانی امت مسلمہ پر ضروری اور لازم ہے۔

۳) آپ کی امامت میں جلیل القدر انبیاء کا نماز پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ سید الانبیاء ہیں اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا قربِ قیامت دنیا میں نزول ہوگا تو وہ بھی آپ ﷺ کے امتی بن کر ہی تشریف لائیں گے اور اس دینِ حنیف کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیں گے۔

۴) اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر اور آپ کی امت پر پچاس وقت کی نماز فرض فرمائی اور آپ ﷺ برابر اس میں تخفیف کا سوال کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دن رات میں پانچ وقت تک محدود کر دیا اور یہ پیغامِ رحمت دیا کہ جو شخص ایمان و احتساب کے ساتھ یہ نمازیں ادا کرے گا اس کو اجر پچاس نمازوں ہی کا ملے گا۔ شبِ معراج آپ ﷺ کو 'نماز' ایک ایسا قیمتی تحفہ ملا کہ دن رات میں پانچ بار بندۂ مومن کو اپنے رب سے ہمکلام ہونے کا شرف ملتا ہے:

((اِنَّ الْمُصَلِّیْ یُنَاجِیْ رَبَّہٗ))

''نمازی اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔''

۵) سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں واقعۂ معراج کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ایسے تمدنی قواعد وضوابط اور دفعات ومبادی بھی عطا کیے گئے ہیں جن سے آئندہ اسلامی معاشرے کی تعمیر ہونی تھی اور رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ دائمی اور ابدی کامیابی کا راستہ ٹھہرا ۔

اک اسوۂ رسولؐ ہے وہ راہِ مستقیم
ہوتے ہیں جس کے سامنے سب راستے فنا

جو بھی عمل خلافِ پیغمبرؐ ہے، کفر ہے
ہے طاعتِ رسولؐ میں ایمان کی بقا

راضی کرو رسولؐ کو سنت کے ضبط سے
اس کی رضا میں پاؤ گے اللہ کی رضا

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے تو آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہوئے:

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ

ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف پلٹ آئے ہیں۔

جاں نثارانِ رسول ﷺ

﴿فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِہٖ وَ عَزَّرُوۡہُ وَ نَصَرُوۡہُ وَ اتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗۤ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ (الاعراف:۱۵۷/۷)

''اور وہ لوگ جو اس نبیؐ (آخر الزمان) پر ایمان لائے اور جنہوں نے ان کی حمایت اور نصرت کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اُن کے ساتھ نازل کی گئی (یعنی قرآن حکیم) ایسے لوگ ہی تو پوری طرح فلاح پانے والے ہیں۔''

لغوی معانی: فَالَّذِیۡنَ پس وہ لوگ جو، اسم موصول جمع مذکر، اٰمَنُوۡا ایمان لائے، فعل ماضی جمع مذکر غائب، صدق دل سے اللہ تعالیٰ کو رب واحد مان کر اس کے احکام کی سنتِ نبوی کے مطابق تعمیل کی (اٰمَنَ، یُؤۡمِنُ، اِیۡمَانًا) ایمان لانا، بِہٖ (بِ. ہٖ) ساتھ، ان کے، ہٖ کی ضمیر واحد مذکر، جناب نبی ﷺ کی طرف جاتی ہے، وَ عَزَّرُوۡہُ اور ان کی (دل و جان سے) حمایت کی، ہٗ کی ضمیر جناب نبی ﷺ کی طرف جاتی ہے، وَ نَصَرُوۡہُ اور ان کی مدد کی، ماضی جمع مذکر غائب، ہٗ کی ضمیر واحد مذکر جناب نبی ﷺ کی طرف جاتی ہے، (اشاعت دین میں، حق کو پھیلانے میں) (نَصَرَ، یَنۡصُرُ، نَصۡرًا) مدد کرنا، وَ اتَّبَعُوا اور انہوں نے پیروی کی، فعل ماضی جمع مذکر غائب (اِتَّبَعَ، یَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا) پیروی کرنا، اتباع کرنا، اَلنُّوۡرَ روشنی، اس سے مراد قرآن حکیم، جو گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا ہے، اَلَّذِیۡۤ جو، اُنۡزِلَ نازل کیا گیا، فعل ماضی واحد مذکر مجہول، مَعَہٗۤ (مَعَ. ہٗ) ساتھ، اُن یعنی قرآن حکیم نبی ﷺ کے قلبِ اطہر پر اللہ کی طرف سے جبریل امین لے کر تشریف لائے، اُولٰٓئِکَ یہی لوگ ہیں، اَلۡمُفۡلِحُوۡنَ

فلاح پانے والے، اسم فاعل جمع مذکر، یعنی دائمی اور ابدی کامیابی انہی لوگوں کے لیے ہے۔

اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے کہ نبوت کے گیارہویں سال موسم حج میں یثرب کے چھ آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی قوم میں جا کر آپ ﷺ کی رسالت کی تبلیغ کریں گے۔

بیعتِ عقبۂ اولیٰ

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

ان چھ مخلصین کی بدولت رسول اللہ ﷺ کا ذکر مدینہ کے اوس اور خزرج قبائل تک پہنچ چکا تھا۔ ۱۲ نبویؐ کے موسم حج کے لیے اوس اور خزرج میں بارہ اصحاب مکہ مکرمہ آئے اور اسی گھاٹی (عقبہ) میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی جہاں گزشتہ سال خزرج قبیلہ کے لوگ آپ ﷺ سے ملے تھے اور دعوت حق کو قبول کر لیا تھا۔ ان بارہ میں سے پانچ وہی تھے جو گزشتہ سال آئے تھے، حارث بن عبداللہ بن رئاب کسی وجہ سے نہیں آ سکے تھے، باقی سات اصحاب کے نام یہ ہیں:

۱- معاذ بن الحارث (قبیلۂ بنی نجار، خزرج)

۲- ذکوان بن عبدالقیس (قبیلۂ بنی زریق، خزرج)

۳- عبادہ بن صامت (قبیلۂ بنی عوف، خزرج)

۴- یزید بن ثعلبہ (قبیلۂ بنی بلی حلیف خزرج)

۵- عباس بن عبادہ (قبیلۂ بنی سالم، خزرج)

۶- ابوالہیثم بن التیہان (قبیلۂ بنی عبدالاشہل، اوس)

۷- عویم بن ساعدہ (قبیلۂ بنی عمرو بن عوف، اوس)

ان اصحاب نے مندرجہ ذیل باتوں پر جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی۔

۱- ہم اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہٗ کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں گے۔

۲- چوری اور بے حیائی سے باز رہیں گے۔

۳- اپنی اولاد (لڑکیوں) قتل نہیں کریں گے۔

۴- کسی پر جھوٹا بہتان نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کھائیں گے۔

۵- تمام اچھی باتوں میں نبی ﷺ کے فرمانبردار رہیں گے۔

روایات میں اسے ''بیعت النساء'' بھی کہا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ عورتوں سے انہی امور پر بیعت لیتے تھے اور اُس وقت تک قتال کی اجازت نہیں ہوئی تھی۔''

(رسول رحمتؐ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا غلام رسول مہر)

ڈاکٹر نصیر احمد لکھتے ہیں:

''کفر وشرک کے اندھیروں سے نکل کر جب یثرب کے یہ خوش نصیب لوگ ایمان وحق کی روشنی میں آئے تو ان کی کایا پلٹ گئی، وہ آئے تھے تو خوف وحزن کی آتشِ خاموش میں جل رہے تھے اور جب وہ لوٹے تو ان کے سینے نورِ ایمان سے منور تھے اور امن وسلامتی کی جنت بن چکے تھے۔ وہ مشرک تھے تو ان کی شخصیت پارہ پارہ تھی لیکن مومن ہوئے تو توحید کے جلیل وحُر کے عقیدے کی بدولت ان کی شخصیت میں وحدت وانفرادیت پیدا ہوگئی۔

ایمان سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور انسانی خدمت کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں جو مزرع ہستی کو شاداب کرتے ہیں، محبت سے شخصیت آفاقی ہو جاتی ہے اور یہ مومن کی پہچان ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مومن جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے، وہی دوسروں کے لیے چاہتا ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

چنانچہ ایمان کی بدولت یثرب کے ان نومسلموں میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ ان کی طرح ان کے ہم وطنوں کا دامنِ زندگی بھی دولتِ ایمان اور رحمتِ اسلام سے معمور ہو جائے، لہٰذا

انہوں نے یثرب میں تبلیغ و تعلیم کے لیے مبلغ و معلم بھیجنے کی درخواست کی، جو منظور ہوئی، آپ ﷺ نے سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ کر دیا۔

مصعب بن عمیر، پہلے داعیِ اسلام:

سیدنا اسعد بن زرارہ (جو نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے) عمائدین یثرب میں سے تھے، سیدنا مصعب بن عمیر کی میزبانی کی سعادت انہیں نصیب ہوئی، سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مومنین اولین اور مہاجرین حبشہ میں تھے اور ابھی ابھی حبشہ سے واپس آئے تھے، وہ ایک امیر و کبیر گھر کے چشم و چراغ تھے اور تحریک اسلام میں شامل ہونے سے پہلے شاہزادوں کی طرح ٹھاٹھ سے زندگی گزارتے تھے، انہیں بیش بہا پوشاک پہننے کا شوق تھا، ان کی سواری نکلتی تو آگے پیچھے خدام و غلام ہوتے تھے، تحریک اسلام میں شامل ہوئے تو آپ ﷺ کے فیضانِ تربیت سے سچے انقلابی مسلمان بن گئے، پھر آپ ﷺ کی صحبت میں رہ کر انہوں نے بھی سادہ و جفاکش طرزِ زندگی اختیار کر لی اور پیکر فقر و غنا بن گئے، ایک تو آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا دوسرے دشمنانِ اسلام کی چیرہ دستیاں جھیلنے اور ہجرتِ حبشہ کے صبر آزما تجربات سے گزرنے کے بعد ان میں حلم و بردباری، صبر و استقامت اور مردم شناسی کے اوصاف پیدا ہو گئے تھے، علاوہ بریں ان کی گفتگو حسین و شیریں اور برمحل ہوتی تھی، ان اوصاف کی بدولت وہ اعلیٰ پایہ کے خطیب و مبلغ اور بااخلاق معلم تھے اور اسی بنا پر بصیرتِ نبویؐ نے انہیں مدینے میں تبلیغ و تعلیم جیسے اہم کام کے لیے منتخب کیا تھا اور یہ انتخاب بڑا ہی موزوں ثابت ہوا۔

عہدِ جاہلیت کا یہ شہزادہ، جو مدینے میں تحریکِ اسلامی کا علمبردار تھا۔ دعوتِ اسلام کے لیے گھر سے نکلتا تو پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور کندھوں پر بوسیدہ کمبل ڈالے ہوتا، سیدنا مصعبؓ گلیوں اور بازاروں میں پھرتے، گھر گھر جاتے، ایک ایک شخص سے ملتے اور دعوتِ اسلام دیتے، وہ لوگوں کو قرآن مجید سناتے، وعظ و نصیحت کرتے، انہیں دنیا میں شاندار سیاسی و معاشی مستقبل کی اور آخرت میں جنت کی حیاتِ ابدی کی خوشخبری سناتے ان کے دل میں

ایمان وصدق اور زبان پر کلامِ حق تھا، اس لیے ان کی باتیں اثر میں ڈوبی ہوئی ہوتیں اور دلوں میں اتر جاتیں۔ سیدنا مصعبؓ مسلمانوں کو نماز سکھانے اور پڑھانے نیز قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لیے کبھی اسعد انصاریؓ اور کبھی بنوظفر (کعب بن الحرث) کے گھر میں اکٹھا کرتے، بنوظفر کا گھر ایسے محلے میں تھا جس میں ظفر اور عبدالاشہل کے خاندان اکٹھے رہتے تھے۔

مکہ کی طرح مدینہ میں بھی تحریک اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سرداری نظام تھا، امیر لوگ اور وہاں کے سردار نشۂ غرور میں سرشار رہتے تھے، وہ جو موقف اختیار کر لیتے، وہ درست ہوتا یا غلط اس پر اڑ جاتے اور اس سے ہٹنا اپنی توہین سمجھتے اور توہین پر موت کو ترجیح دیتے۔ ان سرداروں کو رام کرنا اور ان سے ان کا آبائی دین چھڑانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن اس کام کے لیے جن اوصاف اور اخلاقِ حسنہ کی ضرورت تھی وہ ان میں موجود تھے، لہٰذا سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ کو اپنے مشن میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے اسلام کی تحریک و دعوت کے منہاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ساتھ ہی اس صلیبی وصیہونی پراپیگنڈے کی قلعی بھی کھل جاتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔

عبدالاشہل کا قبیلہ مدینے میں صاحب اثر ورسوخ، بااختیار اور طاقتور تھا، سیدنا سعدؓ بن معاذ اور اسیدؓ بن حضیر اس کے سردار تھے، انہیں کفار تحریک اسلام کے خلاف بدظن کرتے رہتے تھے، ایک دن کسی نے اطلاع دی کہ سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ بنوظفر کے گھر میں تبلیغ کے کام میں مصروف ہیں اور وہاں نومسلموں کے علاوہ سیدنا اسعدؓ بھی موجود ہیں سعد بن معاذ طیش میں آ گئے اور انہوں نے اسید بن حضیر سے کہا: ”ان لوگوں کو اپنے ہاں سے نکال دو، جو ہمارے گھروں میں آ گھسے ہیں اور سادہ لوح لوگوں کو بے دین (یعنی مسلمان) بنا رہے ہیں، میں تمہیں اس امر کی زحمت نہ دیتا مگر میرے اور اسعد کے درمیان قرابت داری ہے، وہ میری خالہ کا بیٹا ہے، اس لیے میں اس کے

خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا۔'' یہ سن کر اسید بن حضیر نے نیزہ اٹھایا اور سیدنا مصعب اور سیدنا اسعد بن زرارہ کے پاس پہنچا اور چلایا: تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم لوگ ہمارے یہاں اس غرض سے آئے ہو کہ کمزور عقیدے والوں کو بہکاؤ؟ اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ، سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ نے بڑی نرمی سے کہا: ''کیا آپ بیٹھ کر ہماری بات سنیں گے؟ اگر کوئی بات پسند آئے تو قبول کیجیے اور اگر ناپسند ہو تو چھوڑ دیجیے۔'' اسید بن حضیر نے یہ کہہ کر کہ ''یہ بات تم نے انصاف کی کہی'' نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور بیٹھ گیا، سیدنا مصعبؓ نے اسلام کے بنیادی عقائد اور فضائل بیان کیے اور پھر قرآن مجید سنانے لگے۔

اسید کی زبان سے بے ساختہ نکلتا جاتا تھا ((مَا اَحْسَنَ هٰذَا الْكَلَامُ)) یعنی کتنا اعلیٰ یہ کلام ہے! کلام الٰہی اپنا اثر کر گیا، جمالیاتی لمحہ پیدا ہوا اور اسید کا دل نورِ ایمان سے منور ہو گیا ع

سنا قرآن، پھر معمور تھا نورِ ہدایت سے

اس نے بے تابانہ کہا: ''مجھے اس دین میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟'' سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: غسل کر کے اپنے جسم کو پاک کیجیے اور پھر کلمۂ شہادت پڑھیے، سیدنا اسیدؓ نے فوراً وضو کیا اور کلمۂ شہادت پڑھا اور کہا: ''میرے علاوہ ایک اور شخص بھی ہے جسے تمہیں راہ ہدایت پر لانا ہوگا (ان کا اشارہ سعدؓ بن معاذ کی طرف تھا) اگر وہ ایمان لے آئے تو اس کی ساری قوم اس کی پیروی کرے گی، میں ابھی اسے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔''

سیدنا سعدؓ بن معاذ تحریک اسلام میں:

سیدنا اسیدؓ واپس پہنچے تو اُن کے چہرے کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر سیدنا سعدؓ بن معاذ تاڑ گئے کہ معاملہ کچھ اور ہے پوچھا: مَا فَعَلْتَ؟ ''یعنی تو نے کیا کیا؟'' سیدنا اسید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں نے ان دونوں سے باتیں کیں (یعنی مصعبؓ بن عمیر اور اسعدؓ بن زرارہ سے) وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، وہ کہتے ہیں: ''جو ہمارے نزدیک بہتر ہے، ہم

کرتے ہیں اور کریں گے۔" یہ سن کر سیدنا سعدؓ بن معاذ نے تلوار لی اور اسی وقت سیدنا اسعد بن زرارہ کے پاس پہنچے، انہیں غصہ تھا کہ اسعد نے اسلام کے مبلغوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی، چنانچہ بڑے طیش میں ان سے کہا: واللہ! میرے اور تیرے درمیان قرابت نہ ہوتی تو میں اسی تلوار سے تیرا سر قلم کر دیتا۔ تم لوگ ہمارے ہی علاقوں میں ہماری قوم کو بہکاتے ہو، سیدنا اسعدؓ بن زرارہ تو خاموش رہے، البتہ سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے بڑی ملائمت سے انہیں بیٹھ کر بات سننے پر رضامند کر لیا، وہ بھی کلام الٰہی سے مسحور ہو گئے انہوں نے کلمہ پڑھا اور ان کا سینہ بھی نور ایمان سے منور ہو گیا، وہ جوشِ اسلام سے معمور واپس اپنے قبیلے میں پہنچے اور ان سے کہا "اے بنی عبدالاشہل! بتاؤ! تمہارے ہاں میرا کیا رتبہ ہے؟ انہوں نے کہا: "تو ہمارا سردار ہے اور ہم سب سے زیادہ عقلمند اور عالی نسب ہے،" سیدنا سعد نے کہا: میرے لیے اس وقت تک تمہارے ساتھ بات چیت کرنا حرام ہے۔ جب تک تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لاؤ گے۔ چنانچہ اس دن اس قوم کے مرد اور عورتیں سب ایمان لا کر تحریک اسلام میں شامل ہو گئے، اس سے مدینے کی فضا جو کفر و شرک اور ظلم و گناہ کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی، نور توحید سے جگمگا اٹھی اور تحریک اسلام کو اس قدر زورِ حرکت ملا کہ وہ مدینے سے قبا تک گھر گھر میں سرایت کر گئی۔ شاعر مشرق اس خواب گاہ مصطفیٰ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تجھ میں راحت اس شہنشاہ معظم کو ملی — جس کے دامن میں امان اقوام عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شہنشاہ عالم کے ہوئے — جانشیں قیصر کے، وارث مسند جم کے ہوئے
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو — نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں — صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

بیعت عقبۂ ثانیہ (تقریباً تین ماہ قبل ہجرت)

مدینہ منورہ میں سیدنا مصعب بن عمیر کی انقلابی سرگرمیوں کا پہلا سال غیر معمولی کامیابی سے گزرا، اسلام کے حسین انقلاب کے لیے فضا تیزی سے سازگار ہونے لگی۔

اور دو عورتیں قافلۂ یثرب کے بعثتِ نبوی ﷺ کا تیرھواں سال لے کر آیا۔ ایام حج آئے
پ ﷺ سے بیعت ہونے اور تو مدینے سے بنو اوس اور بنو خزرج کے قبائل کے **73** مرد
تھے، ملاقات کا مقام منیٰ (عقبہ) اوساتھ مکے پہنچے، یہ مسلمان اپنے قبائل کے مشورے سے آ
ریخی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے مسلمان آپ ﷺ کو مدینہ میں آنے کی دعوت دینے آئے
تھے، چنانچہ وقت مقررہ پر اہل مدینہ اور وقت رات قرار پایا، چونکہ یہ بیعت اور معاہدہ تا
اسے مکہ و مدینہ کے کفار سے پوشیدہ رکھنا چاہتے
آپ ﷺ اپنے چچا سیدنا عباسؓ کے ہمراہ ملاقات کی جگہ پہنچ گئے۔

گفتگو شروع ہوئی اور یثرب سے آنے والے نورِ ایمان سے آراستہ ہو کر آپ ﷺ سے بیعت ہوتے گئے، اس وقت سیدنا عباسؓ نے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، ایک ایسی بات کہی جو ان کی سیاسی بصیرت اور تحریک اسلام کی حقیقی انقلابی نوعیت کی مظہر ہے۔ انہوں نے بنو خزرج سے (جو تعداد میں بہت زیادہ تھے) مخاطب ہو کر کہا: تمہیں معلوم ہے کہ قریش مکہ رسول اللہ ﷺ کے جانی دشمن ہیں، اگر تم رسول اللہ ﷺ سے کوئی عہد و پیمان کرنے لگے ہو تو یہ سمجھ کر کرنا کہ یہ بڑا نازک اور مشکل کام ہے، ان سے عہد کرنا سرخ و سیاہ لڑائیوں کو دعوت دینا ہے، وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، ہم ان کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے ہیں، اگر تم بھی مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی جواب دے دو، لہٰذا جو اقدام بھی کرو، سوچ سمجھ کر کرو، ورنہ بہتر ہے کہ کچھ نہ کرو۔

ابوالہیثمؓ نے اس موقع پر آپ ﷺ سے مخاطب ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم یہود کے حلیف ہیں، اس بیعت کے بعد ان سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ﷺ کو قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ﷺ ہمیں چھوڑ کر اپنے وطن لوٹ جائیں۔

آپ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا:

"نہیں، تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔"

ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عباسؓ کے خطاب کے بعد ان طالبانِ حق نے آپ ﷺ سے

کچھ فرمانے کی درخواست کی، آپ ﷺ نے ان کو قرآن مجید سنایا، ایک ایک لفظ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اترتا اور انہیں مسحور و منور کرتا چلا گیا، ان پر رقت طاری ہو گئی، انہوں نے یک زبان ہو کر آپ ﷺ سے مدینے چلنے کی درخواست کی، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

ا) ''کیا تم دین حق کی اشاعت میں میرے ساتھ پورا پورا تعاون کرو گے؟''

ب) ''اور جب میں تمہارے شہر میں اقامت اختیار کرلوں تو کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل وعیال کی طرح کرو گے؟''

''لیکن اس کا معاوضہ ہمیں کیا ملے گا؟'' اہل قافلۂ شوق نے پوچھا۔ ''جنت'' آپ ﷺ نے جواب دیا۔

یہ جواب سب کے لیے وجۂ مسرت تھا، لیکن وفورِ مسرت و محبت میں رشک و خدشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ آپ ﷺ کسی وقت انہیں چھوڑ کر اپنے آبائی شہر مکے میں جا بسیں، چنانچہ انہوں نے عرض کیا، کہیں آپ ﷺ حصولِ قوت و اقتدار کے بعد ہمیں چھوڑ کر تو نہیں چلے جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''نہیں میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہو گا۔''

آپ ﷺ کا یہ ارشاد اہل شوق کے دلوں میں برقِ مسرت کی طرح لہرایا اور وہ فرطِ شوق سے آپ ﷺ سے بیعت کرنے لگے، اس رات سب سے پہلے جسے بیعت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، وہ سیدنا براءؓ بن معرور تھے، بیعت یا عہد و قرار یہ تھا کہ وہ شرک، چوری، بے حیائی، قتلِ اولاد اور افترا کا ارتکاب نہیں کریں گے اور آپ ﷺ ان سے جو معروف یعنی اچھی بات کہیں گے وہ اس سے سرتابی نہیں کریں گے۔

بیعت کا سلسلہ جاری تھا کہ سیدنا سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انصار سے مخاطب ہو کر کہا: بھائیو! یہ بھی خبر ہے کہ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جن و انس سے اعلان جنگ ہے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا: ہاں! ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں ۔

یہاں کے رہنے والے اوس و خزرج کے قبائل تھے
نہایت بامروت، اہل دل، اہل وسائل تھے
یہ باہم بھائی بھائی تھے، مگر آپس میں لڑتے تھے
بڑی مدت سے خانہ جنگیوں میں گھر اُجڑتے تھے
یہودی بھی یہاں تھے اور معزز سمجھے جاتے تھے
یہ ساہوکار دھنّا سیٹھ بن کر سود کھاتے تھے
بتوں کو چھوڑ کر اور حُبِّ مال و جاہ کو تج کے
مسلمان ہو چلے آخر گھرانے اوس و خزرج کے
لیا جانے لگا ختم الرسل کا نام یثرب میں
لگا ہر سمت پھلنے پھولنے اسلام یثرب میں
حسد کرنے لگی قوم یہود اس دین و ملت سے
بنے بیٹھے تھے وہ لوگوں کے آقا ایک مدت سے

آیتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

ا) سیدنا سعدؓ کے یہ الفاظ اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ اسلام کی انقلابی روح کو کسی نے جامع طور پر سمجھا اور اس کے وسیع ترین تناظر میں دیکھا تو وہ قدیم عرب کی سیاسی فراست وبصیرت تھی، اسلام کی تحریک انقلاب واقعتاً مشرکوں، بت پرستوں یہود و نصاریٰ اور استحصالی قوتوں کو ایک چیلنج یا ان کے خلاف اعلان جنگ ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب تک اس میں جمود وتعطل پیدا نہ ہوا، وقت کے فرعون، ہامان اور قارون اس سے لرزہ بر اندام رہتے تھے، آج بھی جبکہ امت مسلمہ اسلام کے عقائدِ جلیلہ ومحرکہ سے اپنا رشتہ برائے نام رکھنے کی وجہ سے کمزور وپس ماندہ ہے اور مسلمانوں میں اپنے اسلام جیسا دشمنوں پر رعب و دبدبہ نہیں رہا، پھر بھی ہنود و یہود مسلمانوں سے خائف اور پریشان ہیں اور وہ سب مل کر ان کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں، وہ اسلامی

ریاستوں کے بعض کمزور ایمان حکمرانوں کو بھی اپنے ساتھ ملاتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف انہیں اکساتے اور بھڑکاتے رہتے ہیں اور انہیں جانی و مالی نقصان پہنچاتے ہیں۔

۲) یہ سوال کہ یہود و نصاریٰ ہوں یا ہنود و لادین اقوام، کیونکہ سب کی سب اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہیں، اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ یہ سب اقوام اسلام کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ اور عملی پہلوؤں کو اپنی اپنی آئیڈیالوجی کے لیے بجا طور سے خطرہ یا چیلنج سمجھتی ہیں، اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کا یہ پراپیگنڈہ غلط اور گمراہ کن ہے کہ اسلام صرف شدہ قوت ہے، لہٰذا اس کے احیا کا کوئی امکان نہیں رہا۔ اصل یہ ہے کہ اسلام اپنی فطرت میں توحید ہے اور توحید ہر حال میں شرک و بت پرستی کی اسی طرح دشمن ہے جس طرح خیر شر کی، نور ظلمت کا اور حسن قبح کا حریف ہے۔ سرداری و جاگیرداری نظام یا نظامِ سرمایہ داری، فرعونی و ہامانی طرز حکومت ہو یا لادینی، ان کی بنیادیں شرک و بت پرستی میں مضمر ہوتی ہیں، لہٰذا یہ سب نظام اور حکومتیں اسلام کی انقلابی روح توحید سے خائف ہیں، اس لیے وہ اس کی مخالف و دشمن ہی رہیں اور ہمیشہ مخالف و دشمن رہیں گی وجہ یہ ہے کہ توحید و شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اجتماعِ ضدین محال ہے، یہاں اس اہم نکتے کی صراحت بھی کر دی جاتی ہے کہ شرک و بت پرستی ہر دور میں نئی نئی شکلیں، روپ اور انداز بدلتے رہتے ہیں، اس دور میں مورتی پوجا کے ساتھ ساتھ ہیرو پرستی اور نظریہ پرستی کا عام رواج ہے اور یہ تمام پجاری اسلام کے دشمن ہیں اور ہونے بھی چاہیں کہ وہ مشرک و بت پرست ہیں اور اسلام توحید ہے۔" (پیغمبر اعظم و آخر ﷺ)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

اَلطُّهُورُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ [ریاض الصالحین]

"پاکیزگی نصف ایمان ہے۔"

آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ﴾ (الانفال:۸/۷٤)

''جو لوگ ایمان لائے (دل و جان سے اللہ تعالیٰ کو رب واحد مان کر اس کے احکام کو سنتِ نبویؐ کے مطابق بجالائے) اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنہوں نے (مہاجرین کو) ٹھکانا دیا اور ہر طرح سے ان کی مدد کی (یعنی انصارِ مدینہ) وہی تو حقیقت میں مومن ہیں، ان کے لیے بخشش اور بہترین رزق ہے۔''

لغوی تشریح: وَالَّذِیْنَ اور وہ لوگ جو، اسم موصول، اٰمَنُوْا فعل ماضی جمع مذکر غائب، ایمان لائے، (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا، تصدیق کرنا، وَ هَاجَرُوْا اور انہوں نے ہجرت کی، فعل ماضی جمع مذکر غائب، اللہ کی رضا میں اپنے وطن کو ترک کیا، مکہ کے مسلمان جنہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ ہجرت کی، (هَاجَرَ، یُهَاجِرُ) ہجرت کرنا، وَ جٰهَدُوْا اور جہاد کیا، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے، اس کے دین کو سر بلند کرنے کے لیے جان و مال سے ہر کوشش بروئے کار لانا، فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اللہ کی راہ میں، وَ الَّذِیْنَ اور وہ لوگ جنہوں نے اسم موصول جمع مذکر اٰوَوْا (مہاجرین کو) ٹھکانا دیا جمع مذکر غائب فعل ماضی (آوٰی، یُؤْوِی، اِیْوَاءً) پناہ دینا، ٹھکانا دینا، جیسا کہ بندہ اپنے رب کے حضور کہتا ہے: ((اَللّٰهُمَّ آوِنِیْ اِلٰی ظِلِّ كَرَمِكَ وَ عَفْوِكَ)) ''اے اللہ! مجھے اپنے سایۂ عفو و کرم میں پناہ

دیجیے۔‘‘ (القاموس الوحید) وَنَصَرُوْٓا اور (ان کی) مدد کی، فعل ماضی جمع مذکر غائب (نَصَرَ، یَنْصُرُ، نَصْرًا) مدد کرنا، اُولٰٓئِکَ ھُمُ یہی ہیں، اسم اشارہ بعید، جمع مذکر، اَلْمُؤْمِنُوْنَ مومن، اس کا مفرد اَلْمُؤْمِنُ ہے، حَقًّا سچے، لَھُمْ (لَ.ھُمْ) لیے، ان کے، یعنی انصار و مہاجرین کے لیے، مَغْفِرَۃٌ، اللہ تعالیٰ کی مغفرت و بخشش، وَّرِزْقٌ اور رزق و روزی ہے کَرِیْمٌ بہترین، باعزت۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

’’انصار کے عہد و پیمان اور بیعتِ عقبہ ثانیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مدینے کو اسلام کی تحریکِ انقلاب کا مستقل مستقر بنانے کا فیصلہ کر لیا اور مسلمانوں کو وہاں ہجرت کر جانے کی عام اجازت دے دی، قریش کی سیاسی بصیرت اس ہجرت کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج سے آشنا تھی، لہٰذا انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ تحریک اسلام کو ایک آزاد اور پر امن ماحول میں نشو و ارتقا کرنے کا موقع مل جائے اور نتیجتاً انقلاب پسند مسلمان قوت حاصل کر کے ان کے حریف بن جائیں، چنانچہ انہوں نے ہجرت کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن عزم و ہمت کے سامنے ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، مسلمان راز دارانہ طریق سے آہستہ آہستہ ہجرت کرتے اور قبا اور یثرب میں جمع ہوتے گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے آپ ﷺ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ہجرت کی اجازت نہیں دی تھی، ان کے علاوہ وہ مسلمان بھی مکے میں رہ گئے تھے جو وسائل کے فقدان کے سبب ہجرت کرنے سے معذور تھے، ان کے شوق ہجرت اور مجبوری و معذوری کا احساس مسلمانوں کو بھی تھا اور رسول اللہ ﷺ کو بھی، حتی کہ خود ان کے اِلٰہ و رب کو بھی تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینے میں تشریف لے گئے اور مسلمانوں نے قوت حاصل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے کمزور و مجبور بھائیوں کو قریش کے پنجۂ استبداد سے رہا کرانے کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا﴾ (النساء:٤/٧٥)

''اور (مسلمانو!) آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال، جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے۔'' (پیغمبر آخر و اعظم ﷺ)

مولانا عبدالمقتدر فاضل فتحپوری لکھتے ہیں:

''جب مدینہ میں شجرِ اسلام کی جڑیں جم گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی (کہ وہ گزشتہ تیرہ برس سے کفارِ مکہ کے ہاتھوں ستم سہہ رہے تھے)۔

یہاں مکّے میں دنیا تنگ تھی ایمانداروں پر
کہ روندے جا رہے تھے پھول کے سے جسم خاروں پر
نبوت نے اجازت دی کہ یثرب چلے جاؤ
وطن والوں کے اس ظلم و تعدی سے اماں پاؤ
بشارت ہے وہاں امن بخشے گا اللہ تم کو
یہاں صبحِ وطن ہے، خندۂ دنداں نما تم کو
صحابہ پر اگرچہ قہر کے بادل برستے تھے
بچارے سانس آزادی سے لینے کو ترستے تھے
نہ تھا آسان منہ اپنے وطن سے موڑ کر جانا
رسول پاک کو مکے میں تنہا چھوڑ کر جانا
مگر فرمانِ محبوبِ کبریا، فرمانِ باری تھا
مسلمانوں کا شیوہ، شیوۂ اطاعت گزاری تھا

اب مکہ میں ممتاز افراد میں جناب رسول اللہ ﷺ کے علاوہ رفیقِ نبوت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، فاتحِ خیبر سیدنا علی رضی اللہ عنہ یا پھر وہ لوگ رہ گئے جو غیر مستطیع اور بے یارومددگار تھے۔

ابوبکرؓ و علیؓ باقی ہیں لیکن دو کی ہستی کیا
بہادر ہی سہی ہم، پر کریں گے پیش دستی کیا
جو چند افراد ہیں کچھ اور وہ کمزور ہیں سارے
کہ اب بھی چھپتے پھرتے ہیں ہمارے خوف کے مارے

ہجرت نبوی (۱ھ/۶۲۲ء)

آفتاب غروب ہوتے ہی کاشانۂ نبوی ﷺ کا محاصرہ کرلیا گیا، اس زمانے میں عرب مکان کے زنانے حصے میں داخلہ معیوب سمجھتے تھے، اس لیے جناب رسول اللہ ﷺ کے باہر آنے کے منتظر رہے، آپ ﷺ کے سخت ترین دشمن بھی آپ ﷺ کی دیانت و امانت کے معترف اور قائل تھے اس وقت بھی آپ ﷺ کے پاس بہت سی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے اپنے چچا زاد بھائی سیدنا علی مرتضیٰ کو بلا کر ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم ہجرت سے مطلع کیا اور اپنے سفر مدینہ کے عزم کا اظہار کیا، مزید فرمایا، ''تم میری سبز حضرمی چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو تمام امانتیں جا کر واپس کر آنا۔'' یہ ذمہ داری سیدنا علیؓ کا شدید امتحان اور کڑی آزمائش تھی، کیونکہ جس بستر پر آج سونا تھا، وہاں سے زندہ سلامت اٹھنا ناممکن نظر آتا تھا، مخالفین (نعوذ باللہ) قتل کے منصوبے پر عمل کے لیے بے تاب تھے، مگر ابن ابی طالب، فاتحِ خیبر، صاحبِ ذوالفقار کے لیے یہ بستر خیابانِ ارم سے کم نہ تھا ؎

یہ چادر اوڑھ لو، سو جاؤ آ کر میرے بستر پر
محافظ ہے وہی رکھو بھروسا شانِ قادر پر
یہ مال و زر انہی لوگوں کا میرے پاس امانت ہے
امانت کا ادا کرنا ہی اسلامی دیانت ہے
اللہ حافظ ہے، دیکھو دل میں اندیشہ نہ کچھ لانا
یہ چیزیں ان کی پہنچا کر سوئے یثرب چلے آنا
علیؓ نے حکم کی تعمیل کی اور اوڑھ لی چادر
باطمینان آ کر سو گئے حضرت کے بستر پر

رفیقِ ہجرت:

جیسے ہی رسول اللہ ﷺ کو ہجرت کی اجازت رب دو جہاں سے ملی، آپ ﷺ نے رفیق نبوت، یار غار سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے جا کر چند دن پہلے ہی ہجرت کے

بارے میں مطلع کر دیا تھا، اس نے بے تابانہ عرض کیا ''کیا مجھے بھی رفاقت کی سعادت حاصل ہو گی؟'' آپ ﷺ نے اثبات میں جواب دیا۔ سیدنا ابوبکرؓ نے ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر دو اونٹنیاں خوب فربہ کر رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک کو رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا، مگر غیرت نبوی ﷺ نے بلا قیمت لینا گوارا نہ فرمایا، ادھر الاَ مُ رُ فَ وفوقَ اا لادب' حسب الحکم قیمت لینی پڑی، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی صدیق اکبرؓ کو''

ہمشیرہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے سامانِ سفر تیار کیا، دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، ''نطاق'' جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی تھیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا، یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو 'ذات النطاقین' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

دعوتِ فکر:

ہجرت کے اس نازک اور پر خطر مرحلے میں جبکہ جاں بازی اور جاں نثاری کا وقت تھا، ایک ہستی (ابوبکرؓ) رفیق سفر ہو کر خونِ پیغمبر کے طلب گاروں کے ظلم وستم کے سامنے سینہ سپر ہونے [illegible]،

ان دونوں گرامی قدر ہستیوں نے جس ثباتِ استقلال، جرأت و جاں بازی، توکل علی اللہ، قوتِ ایمان اور محبت والفت رسول ﷺ کا نمونہ پیش کیا وہ ان دونوں کے نام لیوا پیروکاروں کو دعوتِ فکر دیتا ہے، جو بات بات پر دست و گریبان ہو کر ان مقدس ہستیوں کے خلاف منہجِ عمل پیش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اطاعتِ رسول، فدا کاریِ اسلام، اور مسلمانوں کی خدمت کا یہی جذبہ ہمارے قلوب میں موجزن کر دے تا کہ ایک بار پھر اسلام کے خزاں دیدہ چمن میں ایسی بہار آئے جس پر حوادث کی بادِ سموم بھی بے اثر رہے۔ (سیرتِ طیبہ محمد رسول اللہ ﷺ)

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو، پھر وسعتِ صحرا دے

بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے

احساس عنایت کر، آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

آیتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) ایمان اور ہجرت، ایمان اور جہاد کا آپس میں گہرا ربط ہے، کسی سرزمین میں اگر مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے تو رب کریم کا حکم ہے کہ کسی ایسے علاقے اور کسی ایسے خطۂ زمین میں چلے جاؤ جہاں ایمان اور جان کی حفاظت ہو۔

۲) جہاد کا مقصد دنیا میں فتنہ و فساد ختم کر کے امن و سلامتی کا نظام قائم کرنا ہے تا کہ لوگ سکھ اور اطمینان کا سانس لے سکیں اور انہیں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آ سکیں۔

رسول اللہ ﷺ اپنی امت کو نصیحت فرماتے ہیں:

يٰأَيُّهَا النَّاسُ! تُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ فَإِنِّيْ أَتُوْبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً [رواه البخاری]

”لوگو! اللہ سے توبہ کرو اور بخشش چاہو، بے شک میں دن میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔“

ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ وَ اِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَ یَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ وَ اللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ﴾
(الانفال:۸/۳۰)

’’وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب (مکہ) کے کافر لوگ آپ کے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر لیں یا آپ کو (نعوذ باللہ) قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں اور وہ تو اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور وہ سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا ہے۔‘‘

لغوی تشریح: وَ اور، اِذْ (یاد کیجیے) جب، یَمْکُرُ تدبیر کر رہے تھے (مَکَرَ یَمْکُرُ، مَکْرًا) تدبیر کرنا، خفیہ چال چلنا، مَکَرَ اللّٰہُ الْعَاصِیُ وَ بِہٖ، اللہ کا گنہگار کو گناہ کا بدلہ دینا، یعنی خفیہ چال چلنے والوں کی ہر تدبیر کو ناکام بنا دیتا ہے۔(القاموس الوحید)، بِکَ (بِ.کَ) بابت، آپ ﷺ کی، یعنی آپ ﷺ کے خلاف، اَلَّذِیْنَ وہ لوگ جنہوں نے، اسم موصول۔ کَفَرُوْا کفر کیا، فعل ماضی جمع مذکر غائب (کَفَرَ، یَکفُرُ، کُفرًا وَ کُفرَانًا) کفر کرنا، شریعتِ حقہ کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا رسالت محمدی کا انکار بھی کفر میں شامل ہے۔ لِیُثْبِتُوْکَ (لِ.یُثْبِتُوْ.کَ) تاکہ، وہ آپ ﷺ کو قید کر دیں (اَثْبَتَ، یُثْبِتُ، اِثْبَاتًا) قید کرنا، باندھنا، اَوْ یا، یَقْتُلُوْکَ آپ ﷺ کو قتل کر دیں (نعوذ باللہ) اَوْ یا، یُخْرِجُوْکَ آپ ﷺ کو (وطن سے) نکال دیں، (اَخْرَجَ، یُخْرِجُ، اِخْرَاجًا) نکالنا، وَ یَمْکُرُوْنَ وہ تدبیریں کر رہے تھے، فعل مضارع جمع مذکر غائب، وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ

اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا، یعنی ان کے ہر مکر وفریب کو ناکام بنا رہا تھا، وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

دشمنوں نے کاشانہ نبوت ﷺ کو گھیرے میں لے رکھا ہے کہ آپ ﷺ پر حملہ آور ہوں، رات کافی بیت چکی ہے، رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ آرام کرنے لگے ہیں اور اُن پر آپ ﷺ کی سبز حضرمی چادر ہے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

''آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف لے آئے، مشرکین کی صفیں چیریں اور ایک مٹھی سنگریزوں والی مٹی لے کر ان کے سروں پر ڈالی جس پر اللہ نے اُن کی نگاہیں پکڑ لیں اور وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہ سکے، اس وقت آپ ﷺ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾

(یسین:۳٦/۹)

''ہم نے ان کے آگے رکاوٹ کھڑی کر دی اور ان کے پیچھے رکاوٹ کھڑی کر دی، پس ہم نے انہیں ڈھانک لیا ہے، سو وہ دیکھ نہیں سکتے۔''

اس موقع پر کوئی بھی مشرک نہ بچا جس کے سر پر آپ ﷺ نے مٹی نہ ڈالی ہو، اس کے بعد آپ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور پھر ان کے مکان کی ایک کھڑکی سے نکل کر دونوں صاحبوں نے رات ہی رات یمن کا رخ کیا اور چند میل پر واقع ثور نامی پہاڑ کے ایک غار میں جا پہنچے۔

افق کے غرفۂ مشرق سے جب خورشید نے جھانکا
نظر آیا تماشا، قاتلوں کی چشمِ حیراں کا

گروہِ اشقیا کو سرنگوں ہوتا ہوا پایا
علیؓ کو سایۂ شمشیر سوتا ہوا پایا

سحر کا نور خندہ زن تھا باطل کی لیاقت پر
بہت جز بز تھا اَنبوہِ قریش اپنی حماقت پر

حقیقت کھل گئی جس وقت غافل ہوش میں آئے
بہت بپھرے، بہت ہی اچھلے کودے، جوش میں آئے

بہت کچھ کھینچا تانی کی، علیؓ کو خوب دھمکایا
یہاں سے پھر یہ مجمع خانۂ صدیقؓ پر آیا

ہوا معلوم انہیں بوبکرؓ بھی گھر میں نہیں ہوئے
یہ ایسی بات تھی جس نے حواس و ہوش بھی کھوئے

بہم لڑنے لگے اک دوسرے کی داڑھیاں نوچیں
محمدؐ کو پکڑ لینے کی ترکیبیں کئی سوچیں

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کرشمہ سازیاں کہ اسی نے آپ ﷺ کو تسلی عطا فرمائی تھی:

﴿وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ:٥/٦٧)

''اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو لوگوں سے بچالے گا۔'' (الرحیق المختوم)

مولانا شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں:

''گھر چھوڑتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کعبہ پر پڑی تو فرمایا:

''مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔''

نبیؐ نے خانۂ کعبہ کو دیکھا اور فرمایا
کہ اے پیارے حرم میری تری فرقت کا وقت آیا

تیرے فرزند اب مجھ کو یہاں رہنے نہیں دیتے
تیری پاکیزگی کا وعظ تک کہنے نہیں دیتے

جدائی عارضی ہے پھر بھی دل کو بے قراری ہے
کہ تو اور تیری خدمت مجھ کو دنیا بھر سے پیاری ہے
یہ فرماتا ہوا آگے بڑھا اسلام کا ہادی
سراسر موم ہو کر رہ گئی یہ سنگ دل وادی

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پہلے قرار داد ہو چکی تھی، دونوں اصحاب پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے۔ یہ غار آج بھی موجود ہے، حج اور عمرہ کرنے والوں میں سے بعض اس غار تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مشکل سفر کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔" (سیرت النبی، ج:۱)

غار کا ایمان افروز واقعہ:

غار کے پاس پہنچ کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ تعالیٰ کے لیے ابھی آپ ﷺ اس میں داخل نہ ہوں، پہلے میں داخل ہو کر دیکھ لیتا ہوں، اگر اس میں کوئی چیز ہوئی تو آپ ﷺ کی بجائے مجھے اس سے سابقہ پیش آئے گا، چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اندر گئے اور غار کو صاف کیا، ایک جانب چند سوراخ تھے، جنہیں اپنا تہہ بند پھاڑ کر بند کیا ؎

بالآخر دو مسافر نزد غارِ ثور آ ٹھہرے
مقدر تھا یہیں نورانیوں کا قافلہ ٹھہرے
گئے اندر ابوبکرؓ اس کو صاف کر آئے
عبا کو چاک کر کے روزنوں میں اس کو بھر آئے

لیکن دو سوراخ باقی بچ رہے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رضی اللہ عنہ نے ان دونوں پر اپنے پاؤں رکھ دیے، پھر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ اندر تشریف لائیں۔ آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آغوش میں سر رکھ کر سو گئے، ادھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں کسی چیز نے ڈس لیا مگر اس ڈر سے ہلے بھی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ جاگ نہ جائیں، لیکن درد کی وجہ سے ان کے آنسو رسول اللہ ﷺ کے چہرہ اقدس پر ٹپک گئے اور آپ ﷺ

کی آنکھ کھل گئی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکرؓ تمھیں کیا ہوا؟'' عرض کیا، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان مجھے کسی چیز نے ڈس لیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس پر لعاب دہن لگا دیا اور اللہ کی رحمت سے تکلیف جاتی رہی۔'' (الرحیق المختوم)

سیدنا ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتا لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں، جو کچھ خبر ملتی، شام کو آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا، آپ ﷺ اور سیدنا ابوبکرؓ ان کا دودھ نوش فرما لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی، ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو سیدہ اسماء بنت ابی بکر گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔

کفار کا تعاقب:

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر رسول اللہ ﷺ کی بجائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے، ظالموں نے انہیں پکڑ کر اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور پھر چھوڑ دیا، اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانے تک آ گئے، آہٹ پا کر سیدنا ابوبکر غمزدہ ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو وہ ہم کو دیکھ لیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبہ:۹/۴۰)

''(ابوبکرؓ) گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

سنی ابوبکرؓ نے قدموں کی آہٹ، دل ہوا پرغم
کہا، دشمن قریب آئے ہیں، اے فخر بنی آدم!
کہا، اللہ ساتھی ہے تو کیا اندیشۂ دشمن
رکھ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا پر نظر، اے دوست! لَا تَحْزَنْ

مدینہ کی طرف کوچ:

بہرحال چوتھے دن آپ ﷺ غار سے نکلے، عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا، رہنمائی کے لیے اُجرت پر مقرر کرلیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلتے گئے، دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہوگئی تو سیدنا ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھا دی، رسول اللہ ﷺ نے آرام فرمایا اور سیدنا ابوبکرؓ تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں، پاس ہی ایک شخص بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کے تھن گرد وغبار سے صاف کردے پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہنے سے پہلے برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے (سیدنا ابوبکرؓ کی پاکیزگی اور نفاست پسندی پر غور کیجیے) دودھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا۔ آپ ﷺ نے پی کر فرمایا کہ کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا، آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لیے آپ وہاں سے روانہ ہوئے۔ (سیرت النبیؐ)

کیا آرام اک پتھر کے سائے میں رسالت نے
مہیا کر لیا دودھ اس جگہ بھی جوشِ خدمت نے
ہوئی جس وقت ہلکی دھوپ کی وہ شعلہ سامانی
پیا شِیرِ مُصَفّا آپؐ نے، چلنے کی پھر ٹھانی

سراقہ بن جعشم کا واقعہ:

”سراقہ بن جعشم نے، جو انعام کے لالچ میں آپ ﷺ کی تلاش میں نکلا تھا، نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا، سراقہ اپنی قوت وشجاعت اور مبارزت طلبی کے لیے معروف تھا، سو اونٹوں کے لالچ نے اسے اور بھی جری بنادیا تھا، اس نے فرطِ طرب میں اپنی عوز نامی برق رفتار گھوڑی کو مہمیز لگائی، وہ سرپٹ دوڑی، لیکن دفعتاً ٹھوکر کھائی اور گر پڑی، سراقہ گر کر اٹھا اور پھر سوار

ل پر ایک نا معلوم خوف طاری ہوا، گھوڑی کو پھر دوڑایا لیکن آپﷺ کے پاؤں ریتلی زمین بن گیا، اسے یقین ہو گیا کہ میں اس طرح دھنس گئے کہ سراقہ ششدر رہ گیا۔ اس کے د ہو گیا اور وہ اس قدر ہیبت زدہ اور مرعوب ہوا کہ پیکر عجز و نیاز

کوئی غیبی قوت آپ ﷺ کی حامی و ناصر ہے اور آپ ﷺ عرب پر غلبہ پا لیں گے، چنانچہ آپ ﷺ سے خطِ امان کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔ امتثالِ امر میں عامرؓ بن فہیرہ (جو سیدنا ابوبکرؓ کے غلام تھے) نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ امان لکھ کر دیا، آپ ﷺ کے ارشاد پر سراقہ نے وعدہ کیا کہ وہ اہل مکہ وغیرہ کو آپ ﷺ کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا، یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آپ ﷺ محاصرین کی تلواروں کے سائے سے بچ کر نکلے تھے، ہر طرف سے دشمن آپ ﷺ کے تعاقب میں تھے، ایسی بے سروسامانی، خوف اور پریشانی کی حالت میں بھی آپ ﷺ کے پاس قلم و دوات کا ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ ان چیزوں کو ازبس اہمیت دیتے تھے۔" (پیغمبر آخر و اعظمؐ)

الاستیعاب میں ہے کہ جب سراقہ واپس ہونے لگا تو نبی ﷺ نے فرمایا: "سراقہ اس وقت تیری کیا شان ہو گی، جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ (ایران) کے شاہی کنگن پہنائے جائیں گے۔" رسول اللہ ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی، سراقہؓ غزوہ اُحد کے بعد مسلمان ہوا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب مدائن فتح ہوا اور کسریٰ (شاہ ایران) کا تاج اور مرصع زیورات سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوئے تو امیر المومنین نے سراقہؓ کو بلایا اور اس کے ہاتھوں میں کنگن پہنائے اور زبان سے فرمایا "اللہ اکبر! اللہ کی بڑی ہی شان ہے کہ کسریٰ کے کنگن سراقہ اعرابی کے ہاتھوں میں پہنائے۔"

(رحمۃ للعالمین)

پکارا یا محمد! بخش دیجیے گا خطا میری
میں گمراہی میں تھا، بیشک بدی تھی رہنما میری

میں تائب ہوں، مجھے امن کی تحریر مل جائے
ترے دربارِ رحمت میں مجھے توقیر مل جائے

انوکھی التجا تھی، مسکرایا قوم کا ہادیؐ
پھر اُس کو بے تامل امن کی تحریر لکھوا دی

سراقہ سے مخاطب ہو کے یوں محمدؐ نے فرمایا
اگرچہ تو ابھی اللہ پر ایمان نہیں لایا

نرالے رنگ ہیں لیکن اللہ کی شانِ والا کے
تیرے ہاتھوں میں کنگن دیکھتا ہوں دست کسریٰ کے

تحیر خیز تھے، معجز نما الفاظ، حضرت کے
عیاں فرما دیے تھے آپ نے، اسرار قسمت کے

جہاں کو جلوے اس پشین گوئی کے نظر آئے
کہ یہ کنگن سراقہ نے عمرؓ کے عہد میں پائے

بریدہ بن الحصیب اسلمی کا ساتھیوں سمیت ایمان لانا:

''ہجرت کا سفر جاری تھا کہ ایک اور تعاقب کرنے والے سے مڈبھیڑ ہوگئی، اس کا نام بریدہ بن الحصیب اسلمی تھا، وہ اپنی قوم کا سردار تھا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ انعام کے لالچ میں آپ ﷺ کی تلاش میں نکلا تھا، لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ مال کے بدلے اسے دولتِ دل ملے گی۔ آپ ﷺ کے جلالِ شخصیت اور حسنِ کلام سے وہ اس قدر متاثر ومرعوب ہوا کہ اپنے ستر افراد سمیت اسی وقت ایمان لے آیا اور تحریک اسلام میں شامل ہوگیا، اس عالم ہجرت وغربت میں یہ غیر متوقع کامیابی بڑی خوش آئند، مبارک اور حوصلہ افزا تھی۔'' (پیغمبر اعظم و آخر ﷺ)

ابھی یہ قافلہ دامان منزل تک نہ تھا پہنچا
گرفتاری کی خاطر اور اک انبوہ آ پہنچا

یہ ستر آدمی تھے، دشت ہی گھر بار تھا ان کا
جواں ہمت بریدہ اسلمی سردار تھا ان کا
اسی انعام کا لالچ انہیں بھی کھینچ لایا تھا
یہ فتنہ راستے میں اہل مکہ نے اٹھایا تھا
مگر اسلام کی دولت لکھی تھی ان کی قسمت میں
بریدہ آ گیا، آتے ہی دامانِ نبوت میں

''دورانِ سفر میں ایک حسنِ اتفاق ہوا، سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے جو مسلمان تاجروں کی ایک جماعت کے ساتھ ملک شام سے واپس آ رہے تھے، آپ ﷺ کو دیکھ کر حاضری دی اور آپ ﷺ کے اور صدیق اکبرؓ کے لیے دو سفید ملبوسات پیش کیے۔'' (پیغمبر آخر و اعظم)

قبا میں تشریف آوری:

''ادھر آپ ﷺ یثرب کی آزاد فضا کی طرف ایک نئے ولولۂ شوق سے گامزن تھے، ادھر یثرب کے مسلمان فرطِ اشتیاق سے آپ ﷺ کے لیے چشم براہ تھے، بچے خوشی سے آپ ﷺ کی شان میں گیت گاتے اور پیر و جوان صبح سویرے شہر سے باہر نکلتے اور دوپہر تک آپ ﷺ کی راہ دیکھتے اور پھر یوں مایوس ہو کر واپس ہوتے جیسے عشاق اشتیاقِ دید کی حسرت لیے لوٹتے ہیں، آخر آپ ﷺ کی سفر کی راہیں اور انصار کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔

۸ ربیع الاول ۱ ہجری/۲۳ ستمبر ۶۲۲ء کو شنبہ کے روز آپ ﷺ قبا میں تشریف لائے جو مدینہ منورہ سے تین میل دور ہے، یہاں انصار کے چند گھرانے آباد تھے اور ان کے پاس مہاجرین بھی ٹھہرے ہوئے تھے، دوپہر ڈھل چکی تھی اور اہل شوق صبح سے آپ ﷺ کا انتظار کرتے کرتے حسرت بھرے دلوں کے ساتھ گھروں کو لوٹے ہی تھے کہ اچانک شور ہوا کہ آپ ﷺ کی سواری آ گئی، لوگ دیوانہ وار گھروں سے نکل نکل کر بھاگے، اشتیاقِ دید کا

یہ عالم تھا کہ ایک نظر دیکھنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹوٹے پڑتے تھے، ان کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی، فضا ''اللہ اکبر'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔ (پیغمبر آخر و اعظمؐ)

طلوعِ بدر کے ساماں ہوئے بزمِ کواکب میں
کئی دن سے یہ روشن ہو چکا تھا ارضِ یثرب میں
نکل کر شہر سے خلقت، قبا تک چل کے آئی تھی
تمنا رنگ حسرت بن کے آنکھوں میں سمائی تھی
ہوا کرتی تھیں فرش راہ اٹھ کر بار بار آنکھیں
ہمہ تن انتظار آنکھیں، ہمہ تن انتظار آنکھیں
بھٹکتا تھا تصور منزلوں میں اور راہوں میں
سحر سے شام تک اک شکل رہتی تھی نگاہوں میں
کئی دن تک نہ جب صورت دکھائی شاہ والا نے
بہت مضطر ہوئے شمعِ نبوت کے پروانے
ہوئیں کوتاہ آخر انتظارِ دید کی گھڑیاں
نگاہوں کے لیے آئیں نمازِ عید کی گھڑیاں
اکٹھے ہو گئے ہر سمت سے طالب زیارت کے
شعاعوں کی طرح سے گرد خورشید رسالت کے
نظر آئی جونہی پہلی جھلک روئے منور کی
سلامی گونج اٹھی نعرہ، اللہ اکبر، کی

حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں:

''اس کے ساتھ ہی بنی عمرو بن عوف (ساکنانِ قبا) میں شور بلند ہوا اور تکبیر سنی گئی، مسلمان آپ ﷺ کی آمد کی خوشی میں نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے استقبال کے لیے نکل پڑے پھر آپ ﷺ سے مل کر تحیۂ نبوت پیش کیا اور گرد وپیش پروانوں کی طرح جمع ہو

گئے، اس وقت آپ ﷺ پر سکینت چھائی ہوئی تھی اور یہ وحی نازل ہو رہی تھی۔

﴿فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰـہُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ﴾

(التحریم: ٦٦/٤)

"پس یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کا (حقیقی) کارساز ہے اور جبریل علیہ السلام اور صالح مومنین اور ان کے علاوہ فرشتے بھی مدد کرنے والے ہیں۔" (زادالمعاد بحوالہ، الرحیق المختوم)

سیدنا عمرو بن زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ لوگوں سے ملنے کے بعد آپ ﷺ ان کے ساتھ داہنی جانب مڑے اور قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں تشریف لائے، یہ دوشنبہ (اتوار) کا دن اور ربیع الاول کا مہینا تھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ آنے والوں کے استقبال کے لیے کھڑے تھے اور رسول اللہ ﷺ چپ چاپ تشریف فرما تھے، انصار کے جو لوگ آتے، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا نہ تھا وہ سیدھے سیدنا ابوبکر کو سلام کرتے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ پر دھوپ آگئی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چادر تان کر آپ ﷺ پر سایہ کیا، تب لوگوں نے پہچانا کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔

آپ ﷺ کے استقبال اور دیدار کے لیے سارا مدینہ اُمڈ پڑا، یہ ایک تاریخی دن تھا جس کی نظیر سرزمینِ مدینہ نے کبھی نہ دیکھی تھی۔" (الرحیق المختوم)

قبا میں شرفِ میزبانی سیدنا کلثوم بن الہدم کو حاصل ہوا، جہاں آپ ﷺ نے چودہ دن قیام فرمایا:

پیغمبرؐ نے قبا میں چند دن آرام فرمایا
مروت نے بلطف خاص فیضِ عام پایا
سبھی پہلے مہاجر اس جگہ موجود تھے سارے
اکٹھے ہو گئے تھے چاند کے چاروں طرف تارے

"ادھر سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مکہ میں تین روز ٹھہر کر اور لوگوں کی جو امانتیں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں انہیں ادا کر کے، پیدل ہی مدینہ کا رخ کیا اور قباء میں رسول اللہ ﷺ سے آملے اور انہوں نے بھی کلثوم بن الہدم کے یہاں قیام فرمایا۔"

علیؓ مرتضیٰ بھی تیسرے ہی روز آ پہنچے
چلے مکے سے تنہا، پا پیادہ تا قبا پہنچے
وہ اہل مکہ کو ان کی امانت دے کر آئے تھے
انہیں اسلام کا درس دیانت دے کر آئے تھے

اس دین حق کے سنہری اصولوں پر غور کیجیے کہ ٹھیک خطرات میں بھی لوگوں کی امانتیں انہیں من وعن لوٹائی جاتی ہیں، رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ (النساء:٤/٥٨)

''اللہ تعالیٰ تمھیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ۔''

قبا میں مسجد کی تعمیر:

اس نہایت مختصر عرصے میں آپ ﷺ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ مسجد کی تعمیر کی، اس سے اسلام کی نظر میں مسجد کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ مسجد اسلامی ثقافت کی علامت اور اس کا سرچشمہ ہے (یہ مسلمانوں کی بستی کا پاکیزہ علم، روحانی، علمی مرکز اور معاشرتی نظم وضبط کو مستحکم رکھنے کا مقام ہے)۔

آپ ﷺ نے مسجد کی محض بنیاد ہی نہیں رکھی جو 'بڑے' لوگوں کا شیوہ ہے بلکہ اس کی تعمیر میں خود بھی مزدوروں کی طرح بھاری بھر کم پتھروں کو اٹھاتے اٹھاتے آپ ﷺ کا جسم مبارک خم ہو ہو جاتا، جاں نثاروں سے یہ عالم دیکھا نہ جاتا، وہ آپ ﷺ سے التجا کرتے کہ آپ ﷺ یہ کام نہ کریں، لیکن اخوت ومساوات کی تحریک کے علمبردار سے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ خود اس کی مثال قائم نہ کرتا، آپ ﷺ مسجد کی تکمیل تک برابر مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے، اس طرز عمل سے مسلمانوں میں بالخصوص اور دوسرے لوگوں میں بالعموم اس حقیقت کا عرفان و ایقان پیدا کرنا مقصود تھا کہ اسلام کی نظر میں سب انسان برابر ہیں اور محنت و مشقت سب کا مقدر ہے اور محنت باعث ننگ و عار نہیں، وجہ عزت وافتخار ہے۔''

(پیغمبر اعظم و آخرؐ)

''وہ قطعۂ زمین جس پر مسجد تعمیر کی گئی وہ سیدنا کلثومؓ کی ایک افتادہ زمین تھی جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، یہیں دست مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی ۔

قبا میں سب سے پہلے ایک مسجد کی بنا ڈالی اساسِ دین محکم تھی نبیؐ کی خاطر عالی
صفا کی، صدق کی، تقویٰ کی اور پرہیز گاری کی یہ مسجد اولین بنیاد تھی، طاعت گزاری کی

یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے:

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبہ:۹/۱۰۸)

''وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے آدمی ہیں، جن کو صفائی بہت پسند ہے اور اللہ تعالیٰ پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ شاعر تھے، وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کے لیے گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے ۔

اَفْلَحَ مَنْ يُعَالِجُ الْمَسَاجِدًا
وَ يَقْرَءُ الْقُرْآنَ قَائِمًا وَقَاعِدًا
وَلَا يَبِيْتُ اللَّيْلَ عَنْهُ رَاقِدًا

''وہ بامراد اور کامیاب ہوا جو مسجدیں تعمیر کرتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے اور رب کی عبادت میں رات کو جاگتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے۔'' (سیرت النبی، شبلی نعمانی)

قبا میں چودہ دن قیام کے بعد آپ ﷺ مدینہ منورہ روانہ ہوئے جس کا بیان آئندہ ہوگا۔ ان شاء اللہ!

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) اس آیتِ مبارکہ میں اس سازش کا تذکرہ ہے جو رؤسائے مکہ نے ایک رات دارالندوہ میں تیار کی تھی اور بالآخر یہ طے پایا تھا کہ مختلف قبیلوں کے نوجوانوں کو (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کے قتل پر مامور کیا جائے تاکہ کسی ایک کو قتل کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے بلکہ دیت دے کر جان چھوٹ جائے۔

۲) قریش مکہ نے ہر تدبیر اور ہر کوشش کی کہ ہادیِ اسلام کو زک پہنچایا جائے، مگر ربِ قدیر نے ان کی ہر کوشش اور تدبیر کو رائیگاں فرما دیا اور نبی ﷺ کی ہر طرح سے حفاظت فرمائی اور یقیناً اسی آقا کی حفاظت سب سے بڑھ کر ہے۔

۳) آج مسلمانوں کو یہود و ہنود نت نئی سازشوں سے نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، اگر مسلمان احکامِ الٰہی کو حرزِ جاں بنالیں تو دشمنوں کی ہر سازش ناکام ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

۴) مسلمانو! اٹھو! تمہارے رب کا فرمان ہے:

﴿وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۳/۱۳۹)

''ہمت نہ ہارو اور غم نہ کھاؤ، تم ہی غالب رہو گے اگر تم سچے مومن ہو۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَ تْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ

[رواہ احمد]

''جب تمہیں اپنے اچھے عمل سے مسرت ہو اور برے کام سے رنج وقلق ہو تو تم مومن ہو۔''

اہل مدینہ کا ایثار اور استقبال

﴿وَالَّذِيۡنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالۡاِيۡمَانَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ يُحِبُّوۡنَ مَنۡ هَاجَرَ اِلَيۡهِمۡ وَلَا يَجِدُوۡنَ فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوۡتُوۡا وَيُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ (الحشر:۵۹/۹)

"(اور مالِ فے ان کے لیے بھی ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لاکر دارالہجرہ (یعنی مدینہ منورہ) میں مقیم تھے یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اُس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے (بلکہ انصار کے دل مہاجرین کے لیے کشادہ رہتے ہیں) اور خود اپنے اوپر انہیں (یعنی مہاجرین کو) ترجیح دیتے ہیں گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو (بات دراصل یہ ہے) کہ جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب اور بامراد ہے۔"

لغوی تشریح: وَالَّذِيۡنَ اور ان کے لیے، جنہوں نے، اسم موصول، تَبَوَّؤُا بنالیا تھا، بَوَّءَ، رہنے کی جگہ ٹھیک کرنا، (تبوَّءَ، یَتبوَّءُ) اپنے لیے گھر بنالینا، اَلدَّارَ (مدینہ کو) گھر، وَالۡاِيۡمَانَ اور (قبول کر لیا تھا) ایمان، مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ان (مہاجرین) سے پہلے، یعنی مہاجرین کے مدینہ پہنچنے سے پہلے انصار بھی ایمان سے بہرہ ور ہو چکے تھے، يُحِبُّوۡنَ وہ (انصار) محبت کرتے ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (أَحَبَّ، يُحِبُّ، اِحۡبَابًا) محبوب و پسندیدہ ہونا، مَنۡ اس سے جو، ذوی العقول کے لیے اسم موصول،

هَاجَرَ ہجرت کرے (مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے) هَاجَرَ، يُهَاجِرُ ہجرت کرنا، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ترکِ وطن کرنا، اَلْمُهْجَرُ مقامِ ہجرت، جہاں ہجرت کی جائے یا جہاں سے ہجرت کی جائے (القاموس الوحید)، اِلَيْهِمْ (اِلَى. هِمْ) طرف، ان کے، وَلَا اور، نہیں، يَجِدُوْنَ، وہ پاتے فعل مضارع جمع مذکر غائب (وَجَدَ، يَجِدُ، وَجْدًا) پانا، حاصل کرنا، فِيْ صُدُوْرِهِمْ اپنے سینوں میں، صُدُوْرٌ کا مفرد صَدْرٌ، هِمْ کی ضمیر جمع مذکر، انصار مدینہ کی طرف جاتی ہے، حَاجَةً کوئی حاجت (تنگی نفس) مِمَّآ (مِنْ. مَا) اس سے، جو، اُوْتُوْا دیے جائیں وہ، فعل ماضی مجہول، جمع مذکر غائب (یعنی جو کچھ مہاجرین کو عطا کیا جائے) آتٰی، يُؤْتِيْ، عطا کرنا، دینا، وَيُؤْثِرُوْنَ اور وہ ترجیح دیتے ہیں (انصار مدینہ، مہاجرین مکہ کو) فعل مضارع جمع مذکر غائب (آثَرَ، يُؤْثِرُ) ترجیح دینا، اسی سے اردو میں ایثارِ نفس ہے، عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اپنے نفسوں پر، هم ضمیر جمع مذکر انصار مدینہ کی طرف جاتی ہے، وَلَوْ اگرچہ، كَانَ ہو، بِهِمْ (بِ. هِمْ) ساتھ، اُن کے یعنی انہیں (بذات خود)، خَصَاصَةٌ سخت حاجت، یعنی انصارِ مدینہ تنگی اور ترشی میں بھی مہاجرین مکہ کی ضروریات کو ترجیح دیتے ہیں، وَمَنْ اور جو کوئی، يُوْقَ بچا لیا گیا، فعل مضارع مجہول واحد مذکر غائب (وَقَى، يَقِيْ) بچانا، محفوظ رکھنا، شُحَّ نَفْسِهٖ نفس کی بخیلی/ اپنے سے، یعنی اپنے نفس کے بخل اور حرص سے، فَاُولٰٓئِكَ تو یہی لوگ ہی، اسم اشارہ بعید جمع مذکر، تو ایسے پاکیزہ نفس ہی، هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ فلاح پانے والے ہیں، اَلْمُفْلِحُ کی جمع، اسم فاعل۔

مدینہ منورہ میں تشریف آوری

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"قبا میں قیام کے چودہ دن بعد (جمعۃ المبارک) آپ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے، بنی سالم کے محلّہ میں نماز کا وقت آ گیا، جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا، یہ رسول اللہ ﷺ کی سب سے پہلی نمازِ جمعہ اور سب سے پہلا خطبۂ نماز تھا، لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوشِ مسرت سے پیش قدمی کے لیے دوڑے، آپ ﷺ کے ننہالی رشتہ دار ہتھیار سجا سجا کر آئے، قبا سے مدینہ تک دو رویہ جاں نثاران کی صفیں تھیں۔ راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے۔ ہر قبیلہ سامنے آ کر عرض کرتا

''حضور یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جاں ہے۔'' ؎

ہوا چاروں طرف اَقصائے عالم میں پکار آئی
بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی

جوان و پیر و مرد و زن سراپا چشم بیٹھے تھے
بہار آنے کو تھی، گلشن سراپا چشم بیٹھے تھے

اب استقبال کو دوڑے بنی نجار سج سج کر
بڑھے اَنصار بن کر او پچی ہتھیار سج سج کر

جنوبی سمت اُٹھا ایک نورانی غبار آخر
سوادِ شہر میں داخل ہوا ناقہ سوار آخر

فضا میں بس گئیں توحید کی آزاد تکبیریں
یہ تکبیریں تھیں باطل کے گلو پر تیز شمشیریں

مہاجر پیچھے پیچھے چل رہے تھے سر بکف ہو کر
کھڑے تھے راہ میں انصار ہر سو صف بصف ہو کر

در و دیوار استادہ ہوئے تعظیم کی خاطر
زمیں کیا آسمان بھی جھک گئے تسلیم کی خاطر

مسلماں بیبیاں گھر کی چھتوں پر جمع ہو ہو کر
نظر سے چومتی تھیں عصمت دامانِ پیغمبر

آپ ﷺ مسرت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے، شہر قریب آ گیا تو لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خواتین چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں ؎

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا	چودھویں کا چاند ہم پر طلوع ہوا ہے
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا	ہم پر اللہ کا شکر واجب ہے
مَا دَعٰى لِلّٰهِ دَاعِ	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں
نَحْنُ جِوَارٌ مِنْ بَنِى النَّجَّارِ	ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں
يَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اچھا ہمسایہ ہے

سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی سعادت مندی:

اب جہاں مسجد نبوی ہے اس سے متصل سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا گھر تھا، کوکبۂ نبویؐ یہاں پہنچا، سخت کشمکش تھی کہ آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت سیدنا ابو ایوب انصاریؓ کے حصہ میں آئی۔

سیدنا ابو ایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا، انہوں نے بالائی منزل پیش کی، لیکن آپ ﷺ نے زائرین

کی آسانی کے لیے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ ابوایوبؓ دو وقت آپ ﷺ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپ ﷺ جو چھوڑ دیتے، ابوایوبؓ اور ان کی زوجہ کے حصہ میں آتا۔ کھانے میں جہاں رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا، ابوایوب رضی اللہ عنہ تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے جائے اور رسول اللہ ﷺ کو تکلیف ہو، گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، سیدنا ابوایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے سات مہینے تک یہیں قیام فرمایا، اس اثناء میں جب مسجد نبوی اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپ ﷺ نے نقلِ مکان فرمایا، تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آ کر آپ ﷺ نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ (اور اپنے غلام ابو رافعؓ) کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جا کر صاحبزادیوں اور حرم نبوی ﷺ کو لے آئیں، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں۔

رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادیوں میں سے سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبش میں تھیں، سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو اُن کے شوہر نے آنے نہ دیا، سیدنا زید رضی اللہ عنہ صرف سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور ام المومنین سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کو لے کر آئے، ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آئیں۔

مسجد نبوی اور ازواج مطہرات کے حجروں کی تعمیر:

دولت کدہ کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی جس پر کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپ ﷺ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا: ”میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں“ وہ بولے کہ ”ہم قیمت لیں گے لیکن آپ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے“ چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی، آپ ﷺ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا، ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی لیکن آپ ﷺ نے گوارا نہ کیا، سیدنا ابوایوب انصاریؓ نے قیمت ادا کی، قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، خاتم النبیین محمد رسول

اللہ ﷺ بھی مزدوروں کے لباس میں تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے ۔

اَللّٰھُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرَ الْاٰخِرَۃِ فاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَ الْمُھَاجِرَۃ

''اے اللہ! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے پس انصار و مہاجرین کو بخش دیجیے''

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی، یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگِ خُرما کا چھپر اور کھجور کے ستون تھے، قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا، فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی، ایک دفعہ صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم نماز کے لیے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھالیں رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا گیا۔'' (سیرت النبیؐ)

''مسجد محض ادائے نماز ہی کے لیے نہ تھی بلکہ یہ ایک یونیورسٹی تھی، جس میں مسلمان اسلامی تعلیمات و ہدایات کا درس حاصل کرتے تھے اور ایک محفل تھی جس میں مدتوں جاہلی کشاکش ونفرت اور باہمی لڑائیوں سے دوچار رہنے والے قبائل کے افراد اب میل محبت سے مل جل رہے تھے، نیز یہ ایک مرکز تھا جہاں سے اس ننھی سی ریاست کا سارا نظام چلایا جاتا تھا اور مختلف قسم کی مہمیں بھیجی جاتی تھیں، علاوہ ازیں اس کی حیثیت ایک پارلیمنٹ کی بھی تھی، جس میں مجلسِ شوریٰ اور مجلسِ انتظامیہ کے اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ یہ مسجد ہی ان فقراء مہاجرین کی ایک خاصی بڑی تعداد کا مسکن تھی جن کا وہاں پر کوئی مکان تھا نہ مال اور نہ اہل وعیال۔

آپ ﷺ نے مسجد کے بازو میں چند مکانات بھی تعمیر کیے جن کی دیواریں کچی اینٹ کی تھیں اور چھتیں کھجور کے تنوں کی کڑیاں دے کر کھجور کی شاخ اور پتوں سے بنائی گئی تھیں۔ یہیں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کے حجرے تھے، ان حجروں کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد آپ ﷺ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان سے یہیں منتقل ہو گئے۔

اذان کی ابتدا

اسلام کی تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت و اجتماع ہے، اس وقت کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز با جماعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ وقت کا اندازہ کر کے آتے اور نماز پڑھتے تھے، رسول اللہ ﷺ کو یہ پسند نہ تھا۔ آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیے جائیں جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں لیکن اس میں زحمت تھی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا کر مشورہ کیا، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، کسی نے کہا: نماز کے وقت مسجد میں ایک علم (جھنڈا) کھڑا کر دیا جائے، لوگ دیکھ کر آتے جائیں گے۔ آپ ﷺ نے یہ طریقہ نا پسند فرمایا، عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں اعلانِ عبادت کے جو طریقے ہیں وہ بھی آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیے گئے، لیکن آپ ﷺ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند فرمائی اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اذان دیں، اِس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع ہو جاتی تھی اور دوسری طرف دن میں پانچ بار دعوتِ اسلام کا اعلان ہو جاتا تھا۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز سیدنا عبداللہ بن زیدؓ نے پیش کی تھی جو انہوں نے خواب میں دیکھی تھی، ایک اور روایت میں ہے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اذان کے بارے میں خواب آیا، بخاری میں تصریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں لیکن سیدنا عمرؓ نے اذان کی تجاویز پیش کی اور آپ ﷺ نے اس کے موافق سیدنا بلالؓ کو بلا کر اذان کا حکم دیا۔ (سیرت النبیؐ)

مواخات (مسلمانوں میں بھائی چارگی)

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبویؐ کی تعمیر کا اہتمام فرما کر باہمی اجتماع اور میل ومحبت کے ایک مرکز کو وجود بخشا، اسی طرح آپ ﷺ نے تاریخ انسانی کا ایک اور تابناک کارنامہ انجام دیا، جسے مہاجرین اور انصار کے درمیان ''مواخات اور بھائی چارے'' کے عمل کا نام دیا جاتا ہے۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

''پھر رسول اللہ ﷺ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مکان میں مہاجرین و انصار کے

درمیان بھائی چارہ کرایا، کل نوے آدمی تھے، آدھے مہاجرین اور آدھے انصار، بھائی چارے کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک دوسرے کے غمخوار ہوں گے اور موت کے بعد نسبی قرابت داروں کے بجائے یہی ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، وراثت کا یہ حکم جنگ بدر تک قائم رہا، پھر یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی:

﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ﴾ (الاحزاب:۶/۳۳)

''(یعنی وراثت میں) نسبی قرابت دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔''

اس طرح انصار و مہاجرین میں باہمی توارث کا حکم تو ختم کر دیا گیا لیکن بھائی چارے کا عہد باقی رہا۔ اس بھائی چارے کا مقصود، جیسا کہ محمد غزالی نے لکھا ہے، یہ تھا کہ جاہلی عصبیتیں تحلیل ہو جائیں، حمیت و غیرت جو کچھ ہو، اسلام کے لیے ہو، نسل، رنگ اور وطن کے امتیازات مٹ جائیں، بلندی و پستی کا معیار انسانیت و تقویٰ کے علاوہ کچھ اور نہ ہو ؎

کوئی ترکی، کوئی تازی، کوئی حبشی کوئی رومی
سبھی یکساں تھے، زیرِ سایہ دامانِ معصومی

تھے انصار و مہاجر ایک نمونہ شانِ وحدت کا
کہ اس تسبیح میں تھا رشتہ محکم اخوت کا

تماشوں، رنگ رلیوں کی جگہ پائی عبادت نے
فسادوں اور جھگڑوں کو مٹایا ذوقِ وحدت نے

مسلماں تھے کہ تھے زہد و ورع کی زندہ تصویریں
نمازیں اور تسبیحیں اذانیں اور تکبیریں

تجارت اور زراعت یا دعائیں یا مناجاتیں
مشقت کے لیے دن تھے، عبادت کے لیے راتیں

یہ بستی کاٹتی تھی وقت، نیکی سے بھلائی سے
نہایت آشتی سے امن سے صلح صفائی سے

ہدایت کی سعادت پر ہزاروں شکر کرتے تھے
اللہ پر تھی نظر سب کی، خودی کا دم نہ بھرتے تھے
نبیؐ کا حکم اور قرآن دستور العمل ان کا
صداقت بن گئی آئینہ ظاہر اور باطن کا

اور حق یہ ہے کہ یہ بھائی چارہ ایک نادر حکمت، حکیمانہ سیاست اور مسلمانوں کو درپیش بہت سارے مسائل کا ایک بہترین حل تھا۔ اس طرح مدینہ منورہ امن وسکون کی بستی، تہذیب وتمدن کا شہر، علم وادب کا گہوارہ اور ضابطہ، آئین وقانون کی چھوٹی سی ریاست بن گیا جس کے فیضان سے نسلِ انسانیت بہرہ ور ہوئی۔

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ وہ ابرار وصالحین جو دولت ایمان سے بہرہ ور ہوئے، غور کیجیے کہ انہوں نے کس قدر جانی و مالی قربانیاں دیں، راہ حق میں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، وطن سے بے وطن ہوئے، مگر سفرِ حیات میں استقامت ان کی شان رہی، اس کے بدلے میں انہیں دنیا وآخرت میں رب کریم کی طرف سے فوز وفلاح کی نوید سنائی گئی۔

۲) انصار ومہاجرین کے درمیان رسول اللہ ﷺ نے جو رشتۂ اخوت قائم فرمایا تھا، انہیں اس سے دنیا میں بے پناہ کامیابیاں نصیب ہوئیں، مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس بھائی چارے کو فراموش کر دیا ہے اور نقصان پر نقصان اٹھا رہے ہیں، پھر بھی نصیحت نہیں آتی ہے ؂

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطاکار و خطابین، وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

﴿قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا ۨ الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ﴾ (الاعراف:۱۵۸/۷)

”(اے نبی!، آپ لوگوں سے کہیے) اے افرادِ نسل انسانی! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔“

قُلۡ کہیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (قَالَ، یَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، یٰۤاَیُّهَا اے، حرف ندا، اَلنَّاسُ، لوگو! منادی، اِنِّیۡ (اِنَّ۔ یْ) یقیناً، میں، رَسُوۡلُ اللّٰهِ اللہ کا رسول ہوں، اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا تم سب کی طرف، اَلَّذِیۡ وہ ذات کہ، اسم موصول، لَهٗ اسی کے لیے ہے، مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ بادشاہی، آسمانوں کی اور زمین کی، لَاۤ ہرگز نہیں ہے، اِلٰـهَ کوئی معبود (برحق)، اِلَّا مگر، هُوَ وہی، یُحۡیٖ وہی زندہ کرتا ہے، وَ یُمِیۡتُ وہی مارتا ہے، یعنی موت و حیات صرف اسی رب العالمین کے قبضہ قدرت میں ہے۔

مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:

”وہ آفتاب جو مشرقِ مکہ سے طلوع ہوا تھا، جس کی کرنیں اب تک فاران کی چوٹیوں سے ٹکرا رہی تھیں، مدینہ کے خطِ استوا پر پہنچا تو وہ آفتابِ نیم روز تھا، ویسے بھی دعوت و تبلیغ کے دس سال پورے ہو چکے تھے (کیونکہ نبوت کے ابتدائی تین سال میں دعوت و تبلیغ کا

حکم عام نہیں تھا) اور آنے والے سال بھی دس ہی تھے۔

اسلامی تعلیمات کا دائرہ عمل نوع انسان کے کسی خاص گروہ یا طبقہ تک تو کبھی محدود نہیں ہوا، البتہ ظاہری وسائل و ذرائع کی بنیاد پر ابتدائی دور میں اس کے مخاطب اہل مکہ اور اس کے گردنواح کے لوگ تھے۔ ارشاد گرامی ہے:

﴿وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ (الانعام:٦/٩٢)

"یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی خیر و برکت والی ہے، اپنے سے پہلی (انبیائے کرامؑ پر نازل شدہ کتب) کی تصدیق کرنے والی ہے تاکہ آپ ﷺ مکہ والوں کو اور اُس کے آس پاس والوں کو ڈرائیں۔"

رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مدینہ منورہ ہجرت کے بعد (جبکہ مدینہ چھوٹی سی اسلامی ریاست بن گیا) تو رب کریم کا حکم ہوا کہ اس دعوت کو عام کر دیا جائے کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ پوری نوع انسان کو (وہ عرب ہوں یا عجم، کالے ہوں یا گورے) ان برکتوں کی بشارت سنا دیں جو ایمان و عمل سے حاصل ہوتی ہیں اور انکار حق کے جو برے نتیجے ہوتے ہیں ان سے متنبہ اور آگاہ کر دیں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ (سبا:٣٤/٢٨)

"ہم نے آپ ﷺ کو نسل انسانیت کے لیے خوش خبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔" (سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ)

اللہ تعالیٰ نے جو نظامِ حیات عطا فرمایا ہے، اسے "الدین" کا نام دیا ہے:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (ال عمران:٣/١٩)

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔"

یہ صاف ستھرا نظامِ حیات زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، سیاسی شعبہ ہو یا معاشی سرگرمیاں، ملکی نظم و نسق ہو یا بین الاقوامی معاملات، ان سب کے بارے دین مکمل

رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَ لَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ﴾ (التوبۃ:۹/۳۳)

''اسے رب العالمین نے اپنے رسول (خاتم النبیین) کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے کہ اسے تمام مذاہب پر غالب کردے اگرچہ مشرک برا مانیں۔''

مسلمانوں کو حکم ہوتا ہے کہ اللہ کے اس دین کو تمام شعبہ ہائے حیات میں جاری وساری کریں:

﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ﴾ (الشوریٰ:۴۲/۱۳)

''کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔''

جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچ کر زندگی کے تمام شعبوں پر اس کے نفاذ کی عملی تدابیر اختیار فرمائیں۔ مساجد کی تعمیر سے مسلمانوں کے لیے نہ صرف اجتماعی عبادت وریاضت کا انتظام فرمایا بلکہ ان کی تعلیم وتربیت، روحانی وفکری تعمیر اور ان کے درمیان معاشرتی نظم ونسق کا سلیقہ اور قرینہ بھی عطا فرمایا، مسلمانوں کو مساجد میں باہم مل کر نماز باجماعت ادا کرنے کی فضیلت اور ثواب کی بشارت بھی دی، ان روایات پر غور کیجیے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو صبح یا شام کو مسجد میں نماز باجماعت ادا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جنت میں مہمانی کرے گا۔''

(بخاری، مسلم، بحوالہ ریاض الصالحین)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے گھر سے غسل یا وضو کر کے صاف ستھرا ہو کر مسجد میں فرض نماز کے لیے آئے تو اس کا ایک قدم خطا کو مٹائے گا تو دوسرا قدم ایک درجہ بلند کرے گا۔ (حوالہ ایضا)

بعض صحابۂ کرامؓ نے حصولِ ثواب کے شوق میں مسجد سے دور اپنی رہائش گاہ قائم رکھیں اور وہ سردی وگرمی میں پا پیادہ مسجد میں پہنچتے تھے، اس روایت پر غور کیجیے:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے گرد کچھ گھر خالی ہوئے تو بنوسلمہ نے ارادہ

کیا کہ مسجد کے قریب آ رہیں، آپ ﷺ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ تم مسجد کے قریب رہنے کا ارادہ کرتے ہو؟ عرض کیا، یارسول اللہ! بیشک آپ ﷺ نے صحیح سنا، ہمارا ارادہ تو ایسا ہی تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھر ہی میں رہو، تمہارے قدم گھر سے مسجد تک آنے کے لکھے جائیں گے۔'' انہوں نے کہا: اب ہم کو گھر بدلنا پسند نہیں۔'' (حوالہ ایضاً)

سیدنا بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو اندھیری راتوں میں مسجد میں آتے ہیں ان کو قیامت کے دن پورے نور کی بشارت دو۔'' (ترمذی بحوالہ ریاض الصالحین)

یعنی ایسی روشنی ہے جس کا قرآن حکیم نے اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ نُوۡرُہُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ بِاَیۡمَانِہِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَ اغۡفِرۡ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ﴾ (التحریم:٦٦/٨)

''یہ وہ دن ہوگا (روز قیامت) جس دِن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اور ان لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوا نہ کرے گا، ان کا نُور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما، یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس آیتِ مبارکہ پر سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''اے اہل ایمان! دیکھو اس دن تمہارے لیے اس قدر حوصلہ افزائی ہوگی کہ تم خاتم النبیین کی صف میں کھڑے ہوئے ہوگے اور تمہاری عزت ہوگی اور تمہیں شرمندہ نہ کیا جائے گا اور اس دن تمہارے آگے آگے ایک نور جا رہا ہوگا۔ اس دن وہ اس نور سے پہچانے جائیں گے، یہ دن تو بہت ہی خوفناک، طوفانی اور دل دہلا دینے والا ہوگا جس میں ہر طرف افراتفری کا عالم ہوگا، اہل ایمان کو یہ اعزاز ہوگا کہ جنت میں داخلے کے وقت ان کے آگے اور دائیں جانب ایک نور جا رہا ہوگا، اس نور کے ساتھ وہ جنت میں جائیں گے، جہاں نور علی نور ہوگا۔

ایسے خوفناک لمحات میں ان کے لبوں پر یہ دعا جاری وساری ہو جائے گی:

﴿یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (تحریم:٦٦/٨)

''وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل فرما دے اور ہم سے درگزر فرما، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس وقت جب زبانیں گنگ ہوں گی اور دل بیٹھ رہے ہوں گے اس خوفناک موقف میں ایسی دعا اہل ایمان کو سکھانا اس بات کی علامت ہے کہ یہ منظور ہوگی، یہ تو سکھائی ہی اس لیے گئی کہ منظور ہو، کیونکہ یہ دعا بھی اللہ ان کو بطور احسان سکھا رہا ہے۔

اس سے قبل اہل ایمان کو اس اہم ذمہ داری سے بھی متنبہ کر دیا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ نَارًا﴾ (التحریم:٦٦/٦)

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتشِ جہنم سے بچاؤ۔'' (فی ظلال القرآن)

مساجد میں جانے کے چند مزید فضائل:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تم کو ایسا عمل نہ بتا دوں جس کے سبب اللہ تعالیٰ خطاؤں کو مٹا دیتا ہے اور درجات بلند فرماتا ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا ہاں، ارشاد ہوا ''تکلیف کے وقت پورا پورا وضو، مسجد کی طرف قدموں کی زیادتی اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار (اپنے روزمرہ کام کاج میں مصروف رہتے ہوئے بھی اپنے کانوں کو اذان کی طرف متوجہ رکھنا) پھر زبان اقدس سے ارشاد ہوا: ((فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ، فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ)) ''یہی تو ہے سرحد کی حفاظت، یہی تو ہے سرحد کی حفاظت'' (گویا نمازوں کی حفاظت کرنے والا، ایمان کی سرحد کا محافظ ہوتا ہے)۔

(مسلم، ریاض الصالحین)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم کسی شخص کو مسجد میں آتے جاتے اور اس کی دیکھ بھال کرتے دیکھو، تو اس کے ایمان کی گواہی دو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ)) (ترمذی، ریاض الصالحین)

''اللہ کی مسجدوں کو وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اگر لوگ فجر اور عشا کی جماعت میں شریک ہونے کی فضیلت کو جان لیں تو ((لَاَ تَوْھُمَا وَلَوْ حَبْوًا)) گھسٹ کر آئیں۔ (بخاری، بحوالہ ریاض الصالحین)

مساجد اور ان کی اہمیت پر کچھ گفتگو آگے بڑھے گی، بحثیت مجموعی مسلمان نماز سے غافل ہیں، اس لیے مساجد بھی پوری طرح آباد نہیں ہیں، شہر اور گاؤں کثرت سے آباد ہیں اگر لوگ شوق سے مساجد کا رخ کریں تو یقیناً وہاں جگہ نہ ملے اور ان کی توسیع کی ضرورت پیش آئے، مساجد جو تھوڑی بہت آباد ہیں، غریب غربا کی وجہ سے ہیں ؂

جا کے ہوئے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب
زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضاءُ غربا کے دم سے

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں، آپؐ کی رسالت دائمی و ابدی اور عرب وعجم کے لیے ہے، مشرق اور مغرب کے لیے ہے، جن وانس کی طرف ہے اور آپ ﷺ پر اللہ کے دین کی تکمیل ہوئی اور نسلِ انسانیت کے لیے اس دین میں مکمل رہنمائی ہے، رہبری اور پر سکون اور کامیاب زندگی گزارنے کے روشن اور واضح اصول ہیں، آج پوری دنیا میں جو اضطراب، پریشانی، دکھ اور آلام کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اس کا حل صرف اور صرف قرآن حکیم کی نکھری ہوئی تعلیم اور

اسوۂ رسول ﷺ میں ہے۔

۲) افسوس کہ ملتِ مسلمہ جس کا فریضہ نسل انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی تھا وہ خود گروہ بندیوں کا شکار ہے، کیا اسے اپنے مولا و مالک کا یہ حکم یاد نہیں رہا:

''مسلمانو! اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے رہو، آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

(الانفال:۸/۴٦)

وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّ قَالَ :قُلْتُ :يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قُلْ لِّی فِی الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَّا اَسْاَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ۔ وَفِیْ رِوَایَةٍ : غَیْرَكَ۔ قَالَ: قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ، ثُمَّ اسْتَقِمْ۔

[رواہ مسلم ۔مشکوٰۃ ۔ کتاب الایمان]

''سفیان بن عبداللہ ثقفی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے اسلام کی کوئی ایسی (جامع)بات فرمادیجئے کہ آپ کے بعد یا بعض روایات میں، آپ کے علاوہ کسی اور سے نہ پوچھوں ۔آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ثابت قدم رہو۔''

اسلام کا نظام مساجد

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾

(التوبہ:۹/۱۰۸)

"جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، وہ اس لائق ہے کہ آپؐ اس میں (نماز کے لیے) کھڑے ہوں، اس میں ایسے لوگ (نماز کی ادائیگی کرتے ہیں) جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔"

لَمَسْجِدٌ وہ مسجد، اُسِّسَ (کہ) جس کی بنیاد رکھی گئی (اَسَّ، يَئُسُّ، اَسًّا) بنیاد رکھنا، اَسَّسَ البِنَاءَ، کسی عمارت وغیرہ کی بنیاد رکھنا، اَلْاَسَاسُ، بنیاد، اساس اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ پاکستان کی اساس دین اسلام پر ہے، عَلَى التَّقْوٰى تقوی (پرہیزگاری) پر، مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ پہلے ہی دن سے، اَحَقُّ (وہ مسجد) زیادہ حقدار ہے، اَنْ تَقُوْمَ کہ آپؐ کھڑے ہوں، فِيْهِ (فِیْ. هِ) میں۔ اُس، یعنی نماز کے لیے اُس میں کھڑے ہوں، فِيْهِ اس میں (تو)، رِجَالٌ (ایسے) لوگ ہیں اس کا مفرد رَجُلٌ ہے، يُّحِبُّوْنَ جو پسند کرتے ہیں (أَحَبَّ، يُحِبُّ، حُبًّا) پسند ہونا، اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا (اس بات کو) کہ وہ پاک ہوں، وَ اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، يُحِبُّ پسند فرماتا ہے، اَلْمُطَّهِّرِيْنَ پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو۔

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ﴾

یعنی وہ جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی، یہ مسجد قبا ہے یا مسجد نبوی ہے۔ جنہیں اخلاص

نیت سے تعمیر کیا گیا اور اس لیے بنایا گیا کہ ان میں رب کائنات کی بندگی کا حق ادا کیا جائے، اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ پورا کیا جائے، مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ اللہ کی کتاب کی تلاوت کی جائے اور بندے اپنے مولا و مالک کے ذکر و فکر میں مشغول رہیں اور جن کی طینت میں پاکیزگی اور صفائی کا شعور ہو، یعنی جن کا باطن شرک و کفر، حسد و بغض ایسی برائیوں سے پاک ہو اور جن کا ظاہر بھی ہر قسم کی غلاظت سے صاف ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ ہی ہر علم کی بنیاد ہے، یعنی اعمال کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی رضامندی ضروری ہے۔

مسجد قبا اور مسجد نبوی کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی اور یہ اصول دے دیا گیا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان کوئی مسجد تعمیر کریں اس کی بنیاد ''تقویٰ'' پر ہو، اس کے برعکس جو بھی مسجد تعمیر کی گئی وہ مسجد ضرار کہلائے گی جس کا ذکر مذکورہ آیت سے قبل آیا ہے۔

''اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے ان اغراض کے لیے مسجد بنائی کہ (مسلمانوں کو) ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں۔'' (التوبہ:۹/۱۰۷)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اس آیتِ مبارکہ میں منافقین کی ایک اور نہایت قبیح حرکت کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مسجد بنائی اور نبی ﷺ کو یہ باور کرایا کہ بارش سردی اور اس قسم کے موقعوں پر بیماروں اور کمزوروں کو زیادہ دور جانے میں دقت پیش آتی ہے، ان کی سہولت کے لیے ہم نے یہ مسجد بنائی ہے۔ آپ ﷺ وہاں چل کر نماز پڑھیں تاکہ ہمیں برکت حاصل ہو، آپ ﷺ اس وقت تبوک کے لیے پابرکاب تھے، آپ ﷺ نے واپسی پر نماز پڑھنے کا وعدہ فرمایا، لیکن واپسی پر وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے اصل مقاصد کو بے نقاب کر دیا کہ اس سے وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، کفر پھیلانا، مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا اور اللہ اور رسول ﷺ کے دشمنوں کے لیے کمین گاہ مہیا کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ ﷺ کو متنبہ فرما دیا گیا کہ اس مسجد میں نہ جائیں بلکہ اس مسجد میں جائیں جسے تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر

کیا گیا ہے۔" (تفسیر احسن البیان)

حکم ہے کہ مسلمانوں کو دنیا کے جس خطۂ زمین پر قوت واقتدار حاصل ہو تو فوری طور ان باتوں کا خیال کرنا چاہیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ (الحج:٢٢/٤١)

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں اور تمام امور میں فیصلہ کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے (جو احکام الٰہی کو نافذ کریں گے، وہ بہتر صلہ پائیں گے اور جو نافرمانی کریں گے وہ سزا پائیں گے)"

جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کو اسلامی ریاست بنانے میں بھرپور توجہ فرمائی، ہر شعبۂ حیات میں نکھار اور سدھار پیدا فرمایا۔

مسلمانوں میں معاشرتی نظم وضبط پیدا کرنے کے لیے "صلاۃ" کے نظام کو مضبوط بنایا، اس کے لیے مساجد کی تعمیر فرمائی جن کو بنانے میں آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ شانہ بہ شانہ مل کر کام کیا، قرآن حکیم ایسے ہی پاکباز لوگوں کی شان میں اعلان کرتا ہے:

﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَی الزَّكٰوةَ وَ لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤی اُولٰٓئِكَ اَنْ یَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ﴾

(التوبة:٩/١٨)

"اللہ کی مسجدوں کی رونق وآبادی تو ان کے حصے میں ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نمازوں کے پابند ہوں (پابندی وقت کے ساتھ مساجد میں جاتے ہوں) زکوۃ دیتے ہوں، اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، توقع ہے کہ یہی لوگ یقیناً ہدایت یافتہ ہیں (اور روزِ جزا فلاح وکامرانی سے بہرہ ور ہوں گے)۔"

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

’’جس طرح حدیث میں بھی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا رَأَیْتُمُ الرَّجُلَ یَعْتَادُ الْمَسْجِدَ، فَاشْھَدُوْا لَہٗ بِالْاِیْمَانِ))(ترمذی، احسن البیان)

’’جب تم دیکھو کہ ایک آدمی مسجد میں پابندی سے آتا ہے تو تم اس کے ایمان کی گواہی دو۔‘‘

قرآن کریم میں بھی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے بعد جن اعمال کا ذکر کیا گیا ہے، وہ نماز، زکوٰۃ اور خشیتِ الٰہی ہے، جس سے نماز، زکوٰۃ اور تقویٰ کی اہمیت واضح ہے۔

(حوالہ ایضاً)

تعمیر مسجد کی ضرورت:

مولانا محمد ظفیر الدین لکھتے ہیں:

’’کوئی شبہ نہیں کہ نماز ہر پاک جگہ پڑھنے کی اجازت ہے اور امتِ مرحومہ کے لیے تمام زمین مسجد ہے، شریعتِ محمدی میں وہ تنگی نہیں ہے جو پہلی شریعتوں میں پائی جاتی تھی۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((جُعِلَتِ الْاَرْضُ کُلُّھَا مَسْجِدًا وَ طَھُوْرًا وَ اَیُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِیْ اَدْرَکَتْہُ الصَّلٰوۃُ فَلْیُصَلِّ))

’’تمام زمین مسجد اور پاک بنائی گئی ہے، میری امت کے جس فرد کو جہاں نماز کا وقت آ جائے نماز پڑھ لے۔‘‘

بندوں کے لیے کوئی حیلہ باقی نہیں چھوڑا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت سے غافل رہیں، وقت آئے اور گزر جائے مگر بندہ یہ بہانہ کر کے کہ ’’مسجد نہ تھی‘‘ اپنی پیشانی رب کے آگے نہ رکھے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جہاں وقت آ جائے وہیں وضو کر کے یا شرعی مجبوری میں تیمّم کر کے نماز ادا کرے، مسجد وہاں ہو تو اس میں جا کر نماز ادا کرے اور نہ ہو تو بھی ادا کرے، اس لیے کہ تمام زمین پاک ہے۔

مگر اسلام کا قانون عام مُقْتَضِیْ تھا کہ نظم وضبط اور مسلمانوں کی قوتِ اجتماعی برقرار رکھنے کے لیے کوئی ایسا انتظام کیا جائے جو بکھرے ہوئے لوگوں اور منتشر افراد کی شیرازہ بندی کر

دے اور انتشار و تشتُّت کی راہ پر آہنی پھاٹک لگا دے تاکہ نفرت و عداوت اور پھوٹ کی لعنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے جو کسی قوم کی مٹی پلید کرنے کے لیے کافی ہے۔

چنانچہ شریعتِ مطہرہ نے مساجد میں مسلمانوں کے لیے اس اجتماعی اور دینی نظام کو قائم کیا اور اس کے قائم کرنے کا ہر ایک مسلمان کو حکم دیا اور دن رات کے پانچ وقتوں میں حاضری ضروری قرار دی اور اللہ تعالیٰ کے ان پاکیزہ گھروں کی حیثیت ایسی رکھی کہ کسی کو آنے میں عار نہ ہو اور نہ بندگی کی ادائیگی میں کوئی روک تھام ہی ہو۔

مسجد کی تعمیر اور دیکھ بھال کا اجر:

مسجد ایک ایسی پاکیزہ جگہ ہے جہاں عاجز بندوں کی پیشانیاں اپنے رب کے حضور جھک جاتی ہیں، اس کا بنانا اور اس کی دیکھ بھال کرنا بہت بڑا اجر ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((مَنْ بَنَى لِلّٰهِ تَعَالٰى مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ)) (بخاری)

”جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کوئی مسجد بنائی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔“

جس طرح اہل ایمان کے لیے مساجد کی تعمیر پر جنت میں ان کے لیے بہترین مسکن کی بشارت ہے، اسی طرح ان کو نمازوں سے آباد کرنا اور ان کی دیکھ بھال کرنا بھی اہل ایمان کا خاصہ ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے:

”اللہ کی مساجد کو آباد کرنا، انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں، پس انہی سے توقع ہے کہ گوہر مقصود کو پا لیں گے۔“

اس پر مولانا ظفیر الدین بڑی خوبصورت بات لکھتے ہیں:

”ایمان باللہ“ لا کر بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے (اہل ایمان کو) سچی عقیدت ہو اور اپنے آپ کو صحیح معنی میں احکام الٰہی کے تابع قرار دیں اور ”آخرت پر ایمان“ سے یہ ظاہر فرمایا گیا کہ

ان کو اپنے سارے کاموں کے حساب و کتاب کی ذمہ داری کا پورا احساس بھی ہو اور پھر اس میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب و عقاب کا یقین بھی، یہ دل اور نیت کی اصلاح کی شرط ہے، باقی ظاہری طور پر بھی وہ ایسے ہوں کہ جس سے حب الٰہی نمایاں ہو، بدنی اعتبار سے بھی اور مالی لحاظ سے بھی، جس کو ''اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کاموں میں شہرت و عزت اور ریا و سمعہ کا فریب آ جاتا ہے، اس لیے یہ بھی فرما دیا گیا کہ یہ سب کسی اور کے خوف سے نہ ہو بلکہ رب العزت کی خشیت ہی سے ہو جس کو ﴿وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ کے مختصر جملہ میں بیان فرمایا ہے، ماحصل یہ ہے کہ (خواہشات) کے مقابلہ کے وقت چاہے وہ ذہنی ہو، چاہے خارجی، ان اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کی خشیت غالب رہے۔

مسجد کی دیکھ بھال میں یہ بات بھی شامل ہے کہ نمازیوں کے لیے چٹائیوں کا انتظام، روشنی کے لیے بجلی اور پنکھوں کا اہتمام، وضو کرنے کے لیے جائے وضو اور پانی کا مہیا کرنا، دیہی علاقوں میں کنواں کھدوانا اور پوری صفائی کا خیال رکھنا۔

اس کی اہمیت پر شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی اس طرح فرماتے ہیں:

''جہاں ضرورت ہو حتی المقدور مساجد کے بنانے میں (اہل ایمان) جانی اور مالی مدد کریں، اس کا بڑا ثواب ہے، اسی طرح طہارت کا سامان فراہم کرنے کا ثواب ہے، جیسے غسل خانے بنانا، کنویں کی مرمت کرنا، نل لگانا، اسی طرح فرش مسجد کا سامان جیسے چٹائی اور چراغ روشن کرنا، جب تک لوگ مسجد میں موجود ہوں یہ سب کام عبادت کا ثواب رکھتے ہیں۔''

(تفسیر عزیزی، بحوالہ اسلام کا نظام مساجد)

تعمیر مساجد میں چند امور کا لحاظ:

اس طرف بھی شاہ عبدالعزیز دہلوی اشارہ کر گئے ہیں کہ مسجد یا لوازماتِ مسجد کے مہیا کرنے کا ثواب وہاں ہوگا جہاں ضرورت ہو، بلاشبہ یہ چیز بھی اہم ہے، اس لیے مسجد جب بنانے کا کوئی ارادہ کرے تو اس کو دیکھ لینا ہوگا کہ اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں پھر ضرورت ہے

تو واقعی یا آرام طلبی کے لیے، بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اس کو نہیں دیکھتے ہیں، صرف ثواب کی نیت سے ایسا کر گزرتے ہیں حالانکہ یہ غلط بات ہے، مقصد حصولِ ثواب ہی ہو تو اس کے بہت راستے ہیں، بے ضرورت تعمیر مسجد سے بدرجہا بہتر ہے کہ دین کے دوسرے کام سرانجام دیے جائیں، جو کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔

فرض کر لیا جائے کہ کوئی ایسی مسجد بنائے جس سے دوسری مسجد کو نقصان پہنچنے کا غالب اندیشہ ہو تو کام بجائے خیر کے شر بن جائے گا۔ ایک مسجد میں جو جماعت بآسانی ہو رہی تھی اس میں اس دوسری مسجد کی وجہ سے تفریق پیدا ہو جائے گی اور محلّہ کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ جس کو کوئی دین دار پسند نہیں کرتا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جب فتوحات کی کثرت ہوئی تو آپ نے ہر آبادی میں تعمیر مسجد کا حکم نافذ فرمایا، مگر ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ کسی ایک شہر میں ایسی دو مسجدیں نہ ہوں کہ ایک دوسرے کے لیے ضرر رساں ہوں، تفسیر کشاف میں ہے:

''سیدنا عطاء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعہ شہروں کو فتح کیا تو آپ نے مسلمانوں کو مسجدیں تعمیر کرنے کا حکم دیا مگر اس طرح کہ ایک شہر (وہ شہر یقیناً کوئی بڑے نہیں ہوں گے) میں دو مسجدیں ایسی نہ ہوں کہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچے۔''

(اسلام کا نظام مساجد)

مسلمانوں کا عالمگیر اجتماعی نظام:

انفرادی طور پر نماز پڑھی جا سکتی ہے اور نفل نمازیں پڑھی جاتی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ فرض نمازوں کو اجتماعی شکل دی جائے اور پراگندہ و منتشر افراد کی شیرازہ بندی کا مظاہرہ کیا جائے اور قرآن نے تالیفِ قلوب کا جو احسان جتلایا ہے اس کا عملی طور پر بھی رات دن اعلان ہوتا رہے:

﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۳/۱۰۳)

چنانچہ اسلام نے اس کا ایسا ہی مستحکم نظام قائم کیا ہے، مسجد کے نام سے ایک خاص گھر بنا دیا گیا ہے جس میں کسی خاص شخص کی نہ ملکیت ہوتی ہے نہ اس کا شخصی قبضہ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا

گھر کہلاتا ہے، اس میں سارے مسلمان برابر کے شریک ہیں، اجتماع کے خاص خاص وقت متعین کر دیے گئے ہیں، تاکہ ایک ہی وقت میں دنیا کے سارے اراکینِ اسلام اپنی اپنی قدرتی اسمبلی میں جمع ہو جائیں اور پھر کس طرح؟ کہ سب مل کر ایک امام کے پیچھے ایک ساتھ شانہ سے شانہ ملا کر کھڑے ہو جائیں، اٹھنے، بیٹھنے، کھڑے ہونے اور تمام حرکت و سکون اسی ایک کی پیروی کریں، نہ کوئی امام سے پہلے جھک سکتا ہے اور نہ اس سے پہلے قیام وقعود کر سکتا ہے، اور نہ کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے جو اس کے خلاف ہو، سب کے سب چاہے امیر ہوں چاہے، غریب، بادشاہ ہوں کہ گدا، اسی کی متابعت کرتے ہیں اور یکجائی و اظہارِ بندگی کرتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں ورنہ کم سے کم یہ کہ وہ تو ہمیں ضرور دیکھ رہا ہے۔

جمعۃ المبارک:

پورے ہفتہ کے بعد ایک مخصوص دن پہنچا، تو ایک قدم اور بڑھایا محلّہ محلّہ اور بستی بستی کے مسلمان نہا دھوکر، حسبِ استطاعت خوشبو لگا کر اپنے اپنے گھروں سے نکلے، مسجد کا راستہ ایک عمدہ منظر پیش کر رہا ہے۔ سب ہر طرف سے آ کر اللہ کے ایک ہی گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ آج نسبتاً صاف ستھرے ہیں، چہروں پر وجاہت ہے اور چال میں وقار کی نمایاں جھلک، دیکھتے ہی دیکھتے بغیر کسی اشتہار اور اعلان کے مسجد بھر گئی، محلّہ کے تمام مسلمان یکجا ہو گئے، سنتیں پڑھی گئیں اور لوگ تسبیح و تقدیس اور تلاوت و تدبرِ قرآن میں مشغول ہو گئے۔

سینکڑوں ہزاروں شمعیں مل ملا کر جمع ہو گئیں ان کی ملی جلی روشنی نے پوری مسجد کو بھر دیا، ہر ایک دل کی کلی کھل کر مسکرانے لگی اور ہر ایک کا عکس دوسرے کو منور کرنے لگا، بغض وحسد، عداوت ونفرت اور دوسری برائیوں کی تاریکی سیماب پا ہو چلی۔

امام نکلا، موذن نے اذانِ ثانی دے کر لوگوں کی توجہ امام کی طرف پھیر دی، وہ سامنے کھڑا تلقین کر رہا ہے اور سب ہمہ تن متوجہ سن رہے ہیں، جب اس کی آواز میں تیزی پیدا ہوئی

اور آنکھیں سرخ ہو گئیں تو پھر کتنے دل کانپ اٹھے، کتنے جسموں پر لرزہ پڑ گیا، خشیتِ الٰہی سے دلوں میں رقت طاری ہونے لگی، خطبہ ختم ہوا، نماز ادا کی گئی مگر کس شان سے؟ کہ آج ایک فرد (امام) اللہ اکبر کہتا ہے تو سارے شہر کے مسلمان اللہ اکبر کہتے ہیں، وہ جب رکوع میں جھکا تو سب کے سب بے چون و چرا رکوع کے لیے جھک گئے اور جب وہ سجدہ میں گرا تو سب کے سب سجدے میں گر پڑے۔

دنیوی اور دینی اصلاح کا شاندار پروگرام:

اس شان وشکوہ سے ہفتہ کی جو عبادت ادا کی گئی اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے ماہرین اور دینی و دنیوی دورِ حیات کے تجربہ کار شریک محفل تھے۔ رؤساء، تجار، غرباء، فقراء، علماء، صوفیاء اور وہ لوگ بھی جوق در جوق تھے جن کو علم وفضل سے کوئی مس نہیں۔

ہر ایک نے دوسرے کو عبرت و بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا نقشہ کھنچ گیا، تاجروں اور رئیسوں کو مسلمانوں کی اقتصادی و معاشی حالت کی طرف توجہ ہوئی، علمائے کرام کو علمی اور دینی سدھار کی فکر ہوئی، صوفیا کی نظر تزکیۂ قلوب کی طرف گئی، غریبوں میں محنت کی امنگ پیدا ہوئی، فقیروں کی خودداری میں جوش آیا، اَن پڑھ اور بے علم لوگوں کے دلوں میں اشتیاقِ علوم نے کروٹ لی اور بے عملوں میں عمل کا جذبہ ابھرا۔

آپ نے غور کیا، یہ کون سا دن تھا اور کون سی مسجد؟ جمعہ کا دن تھا اور جامع مسجد، جس کا یہ روح افزا اور حیات بخش منظر آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ (الجمعة:٦٢/٩)

”اے اہل ایمان! جب تمھیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کے لیے پورے ذوق وشوق سے جاؤ اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر اس حقیقت کو جانو۔“

یہ قدرتی ہفتہ وار اجتماع 'نظامِ مساجد' کے سلسلہ میں ہر ماہ چار مرتبہ ہوتا ہے، اس اجتماع سے

قوم وملک کو ہمیشہ روحانی وعلمی، معاشرتی وتمدنی فائدے پہنچتے ہیں۔

عیدین کی نماز اور سالانہ تنظیم:

اس نظم وضبط کے ساتھ سال کے بارہ مہینے گزرتے ہیں، مگر ان میں دو مخصوص دن ذرا اور امتیازی شان رکھتے ہیں اور ان دنوں کا قدرتی اجتماع اور زیادہ مفید اور مہتمم بالشان ہوتا ہے۔ آج فرزندانِ توحید کے قلوب وفورِ مسرت سے لبریز معلوم ہوتے ہیں، ہر چیز میں نمایاں امتیاز پایا جاتا ہے، لباس بھی عمدہ سے عمدہ اور صاف ستھرے ہیں، کھانے پینے میں بھی خاص اہتمام ہے۔ جوان، بچے، بوڑھے، چھوٹے بڑے، خواتین و حضرات سب تکبیرات کہتے ہوئے ایک ہی جانب رواں دواں ہیں۔

﴿اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ﴾

اور شاید ایک ہی گھر کو جا رہے ہیں، تھوڑی دیر میں ایک وسیع میدان کے اندر عظیم الشان اجتماع ہو گیا، جس میں شائستہ شہری بھی ہیں اور سادہ دل دیہاتی بھی، کھلے میدان میں ایک عجیب دلکش منظر ہے، ایک آواز پر لاکھوں بندوں کی پیشانیاں رب واحد کی پرستاری میں خاک آلود ہو رہی ہیں، کبر ونخوت کا جنازہ نکل رہا ہے، مساوات کا پرچار ہو رہا ہے اور یہ سب ایک نظام کے ساتھ ہو رہا ہے۔

صدقۂ فطر:

صدقۂ فطر کے نظام نے غریبوں اور محتاجوں، بیواؤں اور یتیموں کو بھی خوشی کا موقع دے رکھا ہے، امراء اپنے غرباء بھائیوں کی خوشی میں شامل ہیں اور پیغامِ عید کا ایک اعلان ہوا اور وہ ملک کے طول وعرض میں پہنچ گیا، یہ سالانہ قدرتی اجتماع، ہفتہ وار اجتماع سے کہیں زیادہ جاذبِ نظر اور نتیجہ خیز ہوتا ہے، آپ نے سمجھا یہ اجتماع کیسا ہے؟ یہ بھی ایک مسجد ہی کا ابر کرم ہے جو ہر خطۂ ارض پر برستا ہے جس کو ہم عید گاہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عالم اسلام کی یکجائی:

اب اس کی ضرورت رہ گئی تھی کہ کوئی ایسی مسجد بھی ہوتی جو ساری دنیا کے مسلمانوں کو یکجا کر

دیتی اور اس دن نظامِ مساجد سے عالمگیر ہونے کی شان جھلکتی، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نظام سے اس کمی کو پورا کر دیا۔

سال بھر میں ایک مہینا ایسا بھی آتا ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمان مل کر چند ایام رب کائنات کی بندگی میں گزارتے ہیں، یہ ذی الحجہ کا مہینا ہے، حج کے ایام ہیں اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو تازہ کرتے ہیں۔

دنیا کے کونے کونے سے رب کعبہ کے متوالے، اس کی محبت سے سرشار، فریادی بن کر آ رہے ہیں، پروانِ اسلام کے یہ قافلے، مختلف خطہ ہائے ارض سے ہوائی جہازوں، بحری جہازوں، بسوں اور کاروں کے ذریعے آتے ہیں۔ ماضی میں یہ سفر زیادہ تر اونٹوں یا پیدل قافلوں کے ذریعہ ہوتا تھا۔

یہ سب کے سب اس طرح داخلِ حرم ہو رہے ہیں کہ باوجود مختلف شکل وصورت کے سب کی ظاہری ہیئت ایک سی ہے، سب کی زبان پر ایک ہی طرح کی دعائیں اور صدائیں ہیں۔ ذرا ان کی ادائیں تو دیکھیے، بال پراگندہ، جسم خاک آلود، سر کھلے، نہ بدن پر سلا ہوا کپڑا، نہ کپڑوں میں خوشبو، سب کے سب دو اَن سلی سفید چادروں (احرام) میں ملبوس ہیں اور خواتین اپنے روزمرہ سادہ لباس پہنے ہوئے ہیں، سب عیش و راحت سے دور، حرمِ محرّم کا احترام، اس کی ایک ایک چیز عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، نہ گھاس کاٹنے کی مجال، نہ پرند پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت اور نہ جوں مارنے کی ہمت۔

اس عالمی اجتماع میں تمام ممالک کے نمائندے شریک ہیں۔ کالے، گورے، حبشی، مصری، ہندوستانی، پاکستانی، افریقی، یورپی، ایشیائی، غرضکہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں سے مسلمان یہاں نہ آئے ہوں، مختصر یہ کہ عالم اسلام کے کونے کونے سے اسلام کے نمائندے آئے ہیں، سب آپس میں ملے، باہم ملاقاتیں ہوئیں، محبت و الفت بڑھی، تبادلۂ خیالات کا موقع میسر آیا، ہر ایک نے دوسرے ملک والے کو غور وفکر کی نظر سے دیکھا اور سب ایک دوسرے کے غم اور خوشی سے واقف ہوئے، یہ بھی ایک مسجد ہی کا فیض و کرم ہے جس نے

ساری دنیائے اسلام کے نمائندوں کو، ایک تاریخ ایک دن اور ایک شہر میں جمع کر دیا۔
اس مسجد کا نام ''مسجد حرام'' ہے جس کو بیت اللہ بھی کہتے ہیں:
﴿وَ اِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمۡنًا﴾ (البقرہ:۲/۱۲۵)
اِسی مسجد کے متعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ارشاد ربانی ہوا:
﴿وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ﴾
''اور (اے ابراہیم!) لوگوں میں حج کا اعلان کر دو کہ وہ آپ کے پاس آئیں پا پیادہ اور دبلی اونٹنیوں پر جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔'' (اسلام کا نظام مساجد)

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں و بصیرتیں

۱) غور کیجیے کہ مسلمانوں کے مساجد کے نظام میں کس قدر روحانی اور معاشرتی نظم و ضبط ہے، جو انسانوں کو بتدریج جمع کر دیتا ہے اور منتشر افراد کی کس خوبی سے شیرازہ بندی کرتا ہے۔ دنیا کا کوئی پولیٹیکل نظام اس قدرتی 'نظام مساجد' کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔
۲) افسوس کہ مسلمانوں نے مساجد کے اس پاکیزہ نظام سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھایا، ہمارے اسلاف نے اس نظام کو سمجھنے کے ساتھ اس پر عمل بھی کیا اور دنیا بھر سے اپنی شوکت و عظمت کا لوہا منوایا، مگر ہم نے روگردانی کی اور نقصان پر نقصان اٹھا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظام میں نظمِ جماعت، ہمدردی، پاکیزگی، جسم کی صفائی، وقت کی پابندی، آپس کی بہی خواہی، اخلاص و تضرع اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے سارے لوازمات آ جاتے ہیں۔

اہل اسلام کی نماز (ا)

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡهُوۡدًا﴾ (بنی اسرائیل:۷۸/۱۷)

''(اے نبی!) نماز قائم کیجیے، زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کیجیے، یقیناً فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔''

اَقِمِ قائم کیجیے، اَلصَّلٰوۃَ نماز (قَامَ، یَقُوۡمُ، قِیَامًا فَھُوَ قَائِمٌ) کھڑا ہونا، متوازن ہونا، کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا، محکم اور استوار ہونا، ثابت اور دائم رہنا، کسی کام کو ہمیشہ کرتے رہنا (التاج) اَقَامَ الشَّیۡءَ، کسی چیز کو اس کے جملہ حقوق کے ساتھ بروئے کار لانا، سیدھا کرنا، اَقَامَ الصَّلٰوۃَ نماز کو اس کے جملہ ارکان و شرائط یا حقوق اور تقاضوں کے مطابق ادا کرنا، تعدیل ارکان کرنا، نیز خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا، اَقَامَ لِلصَّلٰوۃِ، نماز کے لیے تکبیر کہنا، اسی سے لفظ ''اَلۡاِسۡتِقَامَۃُ'' ہے، دُرستگی، ثابت قدمی، راست روی، دین پر ثابت قدم اور قائم رہنا، ''دِیۡنٌ قَیِّمٌ'' ایسا دین جس میں ہر شے متناسب اور متوازن ہو، ''کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ'' وہ مستقیم و متوازن قوانین جو حق کو باطل سے واضح کر دیں۔(القاموس الوحید) لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ زوالِ آفتاب سے، ''اَلدَّلۡکُ'' سورج کے زوال (ڈھلنے) کا وقت۔(حوالہ ایضاً) اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ رات کے اندھیرے تک (غَسَقَ اللَّیۡلُ، یَغۡسِقُ، غَسۡقًا وَ غُسُوۡقًا) رات کا تاریک ہونا، وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ اور (نماز فجر) میں قرآن پڑھنا، اِنَّ قُرۡاٰنَ

اَلۡفَجۡرِ بے شک (نماز) فجر میں قرآن پڑھنا، کَانَ مَشۡهُوۡدًا ہے یہ وقت (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا۔

حافظ صلاح الدین یوسف اس آیت مبارکہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"دُلُوک کے معنی زوال (آفتاب ڈھلنے) کے اور غسق کے معنی تاریک کے ہیں، آفتاب کے ڈھلنے کے بعد، ظہر اور عصر کی نماز اور رات کی تاریکی تک سے مراد مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں اور "قرآن الفجر" سے مراد فجر کی نماز ہے، قرآن، نماز کے معنی میں ہے اس کو قرآن اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ فجر میں قراءت لمبی ہوتی ہے، اس طرح اس آیت میں پانچوں فرض نمازوں کا اجمالی ذکر آ جاتا ہے، جن کی تفصیلات احادیثِ مبارکہ میں ملتی ہیں اور جوامت کے عملی تواتر سے بھی ثابت ہیں اور بوقت فجر فرشتے حاضر ہوتے ہیں بلکہ دن کے فرشتوں اور رات کے فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے (بحوالہ صحیح بخاری) ایک اور حدیث میں ہے کہ رات والے فرشتے جب اللہ تعالیٰ کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے حالانکہ وہ خود خوب جانتا ہے "تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟" فرشتے کہتے ہیں کہ "جب ہم ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس سے آئے ہیں تو انہیں نماز پڑھتے ہوئے ہی چھوڑ کر آئے ہیں۔" (بخاری، بحوالہ احسن البیان)

اقامتِ صلاۃ

قرآن حکیم میں نماز کی ادائیگی کے لیے اقامت کا لفظ لایا گیا ہے، عربی زبان میں پڑھنے کے لیے "قراءت" کا لفظ آیا ہے، قرآن کا ہر ہر لفظ بے مثل اور بے مثال ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے۔ اقامت اور قراءت میں بڑا فرق ہے، نماز کا پڑھنا اور بات ہے اور نماز کا قائم کرنا اور بات، نماز کو قائم کرنے سے مراد اس کے جملہ حقوق کے ساتھ سنت نبویؐ کے مطابق اسے ادا کرنا ہے، جیسا کہ حدیث رسول ﷺ ہے:

((صَلُّوا كَمَا رَأَيۡتُمُوۡنِيۡ أُصَلِّيۡ))

''نماز ایسے پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔''

قرآن حکیم میں اقامت صلوۃ کی تشریح و توضیح اس طرح آئی ہے۔

- نماز سے پہلے وضو:

ارشاد ربانی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ﴾ (المائدہ:۵/۶)

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو، اپنے سروں کا مسح کرلو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔''

وضو کی سنن و فرائض کی تشریح احادیث مبارکہ میں آئی ہے۔

- جسم و لباس کی طہارت:

جسم و لباس کی طہارت کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور عاجز و گنہگار بندے اپنے محسن و مربی، خالق و مالک، حسین و جمیل، رحمٰن و رحیم، کہ جو ہر عیب اور خطا سے منزہ اور ہر بھول چوک سے پاک ہے، کے دربارِ عالیہ میں حاضر ہیں، اس لیے پاکیزگی اور طہارت لازمی امر ہے۔ اسی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ﴾ (البقرہ:۲/۲۲۲)

''بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک و صاف رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

اور ہر وضو کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا بھی سکھا دی ہے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ))

''اے اللہ! مجھے ان بندوں میں سے بنا دے جو تیرے حضور (اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر) بہت زیادہ توبہ کرتے ہیں اور پاک صاف رہتے ہیں۔''

- نماز کو پابندی سے اوقات پر ادا کرنا:

ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (النساء:۴/۱۰۳)

”یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔“

- **باجماعت ادا کرنا:**

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ﴾ (البقرہ:۲/۴۳)

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“

ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں کا باہم مل کر نماز پڑھنا ہے، جس میں اذان اور جماعت کا اہتمام ہے اور جماعت کرانے کے لیے متقی، عالمِ دین قاری کا مقرر کیا جانا بھی شامل ہے۔

- **مساجد میں جماعت کا انتظام کرنا:**

ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ لَمۡ یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ﴾ (التوبہ:۹/۱۸)

”اللہ کی مسجدوں کے آباد کرنے والے تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نمازوں کے پابند ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔“

مسجدوں کو آباد کرنے سے مراد ان کی تعمیر، صفائی، دیکھ بھال اور سب سے بڑھ کر پانچ وقت کی اذان اور وہ نمازی ہیں جو پابندیِ اوقات کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، ذکر و اذکار میں مصروف رہتے ہیں اور صبح و شام قرآن وسنت کی تعلیم دیتے دلاتے رہتے ہیں اور ان تمام امور میں صرف اور صرف وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب رہتے ہیں۔

- **نمازوں کی حفاظت:**

رب کریم کا حکم ہے:

﴿حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ﴾ (البقرہ:۲/۲۳۸)

”نمازوں کی حفاظت کرو بالخصوص درمیان والی نماز کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے با ادب

کھڑے رہا کرو۔“

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”درمیان والی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے جس کو اس حدیثِ رسول ﷺ نے متعین کر دیا ہے، جس میں آپ ﷺ نے خندق والے دن عصر کی نماز کو ((الصَّلٰوۃُ الْوُسْطٰی)) قرار دیا۔“ (بخاری، کتاب الجهاد، بحواله تفسیر احسن البیان)

- **نماز سے پہلے نیت:**

بندۂ مومن کا ہر ہر عمل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام:٦/١٦٢)

”(اے نبی!) کہیے کہ میری نماز، میری تمام عبادات، میرا جینا اور میرا مرنا سب کا سب خالص اللہ ہی کا ہے جو رب العالمین ہے۔“

- **نماز میں قبلہ کا رخ:**

رب کریم کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اسلام کی نعمت سے نوازا اور دنیا بھر کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا فرما دیا کلمہ طیبہ کا اقرار، اذان، تلاوت قرآن، مساجد کا نظام، قبلہ کا رخ اور تہذیب و ثقافت کی یکسانی نے ان کی صفوں کو مضبوط بنا دیا ہے، آپ دنیا کے کسی حصے میں چلے جائیں آپ کو مسجد کے ماحول میں کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے:

﴿فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ﴾ (البقرہ:٢/١٤٤)

”آپ مسجد حرام (حرمت والی مسجد) کی طرف رخ پھیر دیجیے اور اب جہاں کہیں تم ہو (دنیا کے کسی بھی خطے میں) اُسی (قبلہ یعنی بیت اللہ) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔“

- **کاروبار بھی نمازوں سے غافل نہیں کرتا:**

ارشاد ربانی ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوۡنَ يَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِيۡهِ الۡقُلُوۡبُ وَالۡاَبۡصَارُ﴾ (النور:٢٤/٣٧)

"(وہ ابرار و صالحین) جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی، وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی۔"

- **خشوع اور دوام:**

اقامتِ صلوٰۃ میں خشوع و خضوع، نمازوں کی حفاظت اور ان میں دوام لازمی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِيۡ صَلَاتِهِمۡ خَاشِعُوۡنَ﴾ (المومنون:٢٣/١-٢)

"وہ جو آخرت کو مانتے ہیں وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں (پابندی اور باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں)۔"

- **قرآن اور نماز:**

قرآن حکیم کی تعلیمات پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونا اور نمازوں کو قائم کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں یقینی اجر کا مستحق بنتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ الَّذِيۡنَ يُمَسِّكُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ﴾

(الاعراف:٧/١٧٠)

"اور جو کتاب کے پابند ہیں (قرآن حکیم کی تعلیمات کو حرزِ جاں بناتے ہیں) اور نماز کی پابندی کرتے ہیں، ہم ایسے لوگوں کا جو اپنی اصلاح کریں ثواب ضائع نہ کریں گے۔"

- **خواتین اور نمازوں کی پابندی:**

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ قَرۡنَ فِيۡ بُيُوۡتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاهِلِيَّةِ الۡاُوۡلٰى وَ اَقِمۡنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيۡنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ﴾ (الاحزاب:٣٣/٣٣)

”اور (نبی کی بیویو!) اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو اور پابندی سے نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو، اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت گزاری کرو۔“

اگرچہ یہ حکم اُمہات المومنین کے لیے ہے مگر اس حکم کے تحت قیامت تک تمام مسلمان خواتین آ جاتی ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”یعنی اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور بغیر ضروری حاجت کے گھر سے باہر نہ نکلو، اس میں وضاحت کر دی گئی کہ عورت کا دائرۂ عمل امورِ سیاست و جہانبانی نہیں، معاشی جھمیلے بھی نہیں، بلکہ گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر امورِ خانہ داری سرانجام دینا، نیز اس میں گھر سے باہر نکلنے کے آداب بتلا دیے کہ اگر باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو بناؤ سنگھار کر کے یا ایسے انداز سے، جس سے تمہارا بناؤ سنگھار ظاہر ہو، مت نکلو، جیسے بے نقاب، جس سے تمہارا سر، چہرہ، بازو اور سینہ وغیرہ لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے، بلکہ بغیر خوشبو لگائے، سادہ لباس میں ملبوس اور باپردہ باہر نکلو، تَبَرُّج بے پردگی اور زیب و زینت کے اظہار کو کہتے ہیں، قرآن نے واضح کر دیا کہ یہ تَبَرُّج جاہلیت ہے جو اسلام سے پہلے تھی اور آئندہ بھی جب کبھی اسے اختیار کیا جائے گا، یہ جاہلیت ہی ہو گی، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، چاہے اس کا نام کتنا ہی خوشنما اور دل فریب رکھ لیا جائے۔“ (تفسیر احسن البیان)

- **نمازیں ضائع کرنے والوں کا انجام:**

سفر ہو یا حضر، صحت ہو یا مرض، امن ہو یا جنگ جب تک بندۂ مومن کے ہوش و حواس قائم ہیں، نماز اس پر فرض ہے اور جو مسلمان کہلاتے ہوئے اسے ضائع کر دیتے ہیں، ان کا انجام اچھا نہیں ہے، اس آیتِ مبارکہ پر غور کیجیے:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا﴾ (مریم:۱۹/۵۹)

''پھر (اسلاف) کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نمازوں کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی پیروی کی، عنقریب وہ اپنی سرکشی کا مآل دیکھیں گے۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''انعام یافتہ بندگانِ الٰہی (اسلاف) کا تذکرہ کرنے کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے، جو اُن کے برعکس اللہ کے احکام سے غفلت و اعراض کرنے والے ہیں، نماز کے ضائع کرنے سے مراد یا تو بالکل ہی نماز کا ترک ہے، جو کفر ہے، یا اُن کے اوقات کو ضائع کرنا ہے، یعنی وقت پر نماز نہ پڑھنا، جب جی چاہا، نماز پڑھ لی یا بلا عذر اکٹھی کر کے پڑھنا یا کبھی دو، کبھی چار، کبھی ایک اور کبھی پانچ نمازیں پڑھنا۔ یہ بھی تمام صورتیں نماز کو ضائع کرنے کے مترادف ہیں۔ جس کا مرتکب سخت گناہ گار اور آیت میں بیان کردہ وعید کا سزاوار ہوسکتا ہے''غیّا'' کے معنی ہلاکت اور انجامِ بد کے ہیں۔'' (تفسیر احسن البیان)

ان احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ کون سے اعمال افضل ہیں؟ فرمایا: ''وقت پر نماز پڑھنا'' میں نے عرض کیا: پھر؟ فرمایا: ''ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا'' میں نے عرض کیا: پھر؟ فرمایا: ''اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔'' (بخاری، مسلم، بحوالہ کتاب الصلوۃ، ریاض الصالحین)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آدمی اور کفر کے درمیان ترکِ نماز ہی کا فرق ہے۔'' (مسلم، حوالہ ایضاً)

''رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ پانچ نمازوں کی مثال اس شیریں اور گہری نہر کی سی ہے جو تم میں سے کسی ایک کے دروازے (کے پاس سے گزر رہی ہو) وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو، تمہارا کیا خیال ہے کہ اس کے جسم پر کوئی میل باقی رہے گا؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا ''نہیں'' فرمایا: ''پانچ نمازیں بھی گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں، جیسا کہ پانی میل کو ختم کر دیتا ہے۔'' (بحوالہ منہاج المسلم، ابوبکر جابر الجزائری)

”آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”جس مسلمان کے پاس کسی فرض نماز کا وقت آ پہنچا ہے، وہ اس کے لیے اچھے وضو، خشوع اور رکوع کا اہتمام کرتا ہے تو وہ نماز اس کے پہلے گناہوں کے لیے کفارہ بن جائے گی“ جب تک بڑا گناہ نہ کیا جائے اور یہ قانون ساری زندگی جاری رہتا ہے۔“ (حوالہ ایضاً)

آیت مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) کلمۂ طیبہ کے اقرار کے بعد عبادات میں اقامتِ صلوٰۃ پہلا فرض ہے جو مسلمان پر عائد ہوتا ہے، سفر وحضر ہو یا صحت و بیماری، نماز کسی حال میں بھی معاف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں بھی حکم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کا ایک دستہ جنگ میں مصروف رہے اور کچھ حصہ رب کریم کے حضور اپنی پیشانیوں کو جھکا دے، نماز سے فراغت پانے والے ان کی جگہ لے لیں اور وہ بھی آ کر اپنے رب سے لَو لگا لیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پیدل اور سوار کو بھی اس کی اجازت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”(بدامنی کی حالت ہو) تو خواہ پیدل ہو، خواہ سوار جس طرح ممکن ہو، نماز پڑھو۔“ (البقرہ:۲/۲۳۹)

۲) نماز کفر اور ایمان میں فرق پیدا کرتی ہے، یہ اسلامی معاشرے کی پہچان ہے، کیا مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو سنا ہے:

”(لوگو!) اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر، اس سے ڈرتے رہو اور نماز قائم رکھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ، ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود بھی گروہوں میں بٹ گئے (پھر حال یہ ہوا) کہ ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے (خواہ وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو)۔“ (الروم:۳۰/۳۱-۳۲)

اہل اسلام کی نماز (ب)

﴿قُلۡ لِّعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَ لَا خِلٰلٌ﴾ (ابراھیم: ١٤/ ٣١)

(اے نبی!) میرے جو بندے ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دیجیے کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ پوشیدہ اور ظاہر (غربا و مساکین) پر خرچ کرتے رہیں، اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی اور محبت (بلکہ ہر شخص کے اعمالِ صالحہ ہی کام آئیں گے)

قُلۡ کہہ دیجیے (قَالَ، یَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، نصیحت کرنا سے قُلۡ فعل امر واحد مذکر حاضر ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ وہ اہل ایمان کو اس بات کی نصیحت فرمائیں کہ وہ نماز قائم کریں۔ اَلَّذِیۡنَ جو، اسم موصول، اٰمَنُوۡا ایمان لائے (اٰمَنَ، یُؤۡمِنُ، اِیۡمانًا) ایمان لانا، اللہ تعالیٰ کو رب واحد مان کر اس کے احکام کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق دل و جان اور کامل وفاداری سے ادا کرنا، یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ، نماز قائم کریں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (اَقَامَ، یُقِیۡمُ، اِقَامَۃً) سنت نبویؐ کے مطابق دن رات میں پانچ نمازیں پابندیِ اوقات سے ادا کرنا، وَ یُنۡفِقُوۡا اور وہ خرچ کریں (اَنۡفَقَ، یُنۡفِقُ، اِنۡفَاقًا) خرچ کرنا، اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لیے غربا و مساکین، یتامیٰ و بیوگان کی خدمت کرنا، مِمَّا (مِنۡ. مَا) سے، جو، یعنی اس مال میں سے جو ہم نے اُن کو رزق دیا، فعل ماضی جمع متکلم، اللہ

تعالیٰ رب واحد ہے اور جمع کا صیغہ بطور عزت وعظمت آیا ہے (رَزَقَ، یَرۡزُقُ، رِزۡقًا) رزق دینا، روزی فراہم کرنا، صرف اللہ ہی کائنات میں ہر ہر مخلوق کو روزی عطا کرتا ہے، سِرًّا پوشیدہ، خاموشی سے کسی کی خدمت کر دینا، کہ دایاں ہاتھ سخاوت کرے تو بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلے، رب کریم باریک سے باریک بات کو بھی جانتا ہے اور کسی کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی، وَ عَلَانِیَةً اور کبھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دوسروں کو ترغیب دلانے کے لیے ظاہری طور پر بھی مال دیا جا سکتا ہے۔ مِنۡ قَبۡلِ اس سے پہلے، اَنۡ یَّاۡتِیَ کہ آئے، یَوۡمٌ (وہ) دن، لَّا بَیۡعٌ نہ خرید وفروخت ہوگی، فِیۡهِ (فِیۡ . هِ) میں، اس، یعنی وہ ایسا دن ہوگا کہ کوئی شخص مال و زر کے عوض چھٹکارا نہ پا سکے گا، وَ لَا خِلٰلٌ اور نہ دوستی (ہی کام آئے گی) اَلۡخَلِیۡل گہرا دوست، کوئی گہرا دوست بھی کسی دوست کو نہ چھڑا سکے گا، صرف نیک اعمال ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی سلامتی اور نجات کا ذریعہ بنیں گے۔

اس آیت مبارکہ پر حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”نماز قائم کرنے کا مطلب ہے کہ اسے اپنے وقت اور تعدیلِ ارکان کے ساتھ اور خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کیا جائے، جس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، انفاق کا مطلب ہے کہ زکوٰۃ ادا کی جائے، اقارب کے ساتھ صلہ رحمی کی جائے اور دیگر ضرورت مندوں پر احسان کیا جائے، یہ نہیں کہ صرف اپنی ذات اور اپنی ضروریات پر تو بلا دریغ خوب خرچ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی جگہوں پر خرچ کرنے سے گریز کیا جائے، قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ جہاں نہ خرید وفروخت ممکن ہوگی، نہ کوئی دوستی ہی کسی کے کام آئے گی۔“ (تفسیر احسن البیان)

نماز کی حقیقی شان

مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں:

”نماز کیا ہے؟ نماز اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلقاتِ بندگی کو تازہ کرنے اور اپنے قوائے بہیمیہ (حیوانی قوی) کے خلاف اپنے قوائے ملکوتیہ (فرشتوں کی سی عادات) کو قوی اور مضبوط رکھنے کی کوشش ہے، یعنی دنیا کی چھوٹی ہستیاں جو اپنی شان وشوکت اور جبروت وجلالت

سے دلوں پر ایک طرح مرعوبیت کا نقش بٹھاتی ہیں، اُن سے توبہ و استغفار کر کے صفحۂ قلب سے اس نقشِ باطل کو دھو ڈالنا اور انسانی زندگی کو روحانی و مادی دونوں حیثیتوں سے بہترین نمونۂ سعادت بنانے کے لیے حسنِ توفیق کا طلب گار ہونا، پس نماز بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک معیت اور صحبت ہے، اگر اس تعلق کو صحبت و معیت کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو یہ معیت اول سے لے کر آخر تک قائم رہتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں صرف اللہ ہے اور اللہ کی یاد ہے، بندے اور اللہ کے مابین کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ ''نماز کی ابتدا 'اللہ اکبر' اور انتہا 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ' پر ہوتی ہے، یعنی اول بھی اللہ ہی کا لفظ ہے اور آخر میں بھی، یہ اس لیے ہے کہ نمازی کو معلوم ہو جائے کہ نماز میں اول سے آخر تک وہ اللہ ہی کے ساتھ ہے۔'' (حقیقتِ صلوٰۃ)

نماز اور حضورِ قلب:

''حقیقت یہ ہے کہ نماز میں سب سے بڑی بات اطمینانِ قلب و حضورِ نفس و خشوعِ طبیعت و خضوعِ جوارح ہے کہ انسان اپنے تمام اعضا اور تمام قوی اور جذبات اللہ کی جانب متوجہ کر لے اور جن اغراض کے لیے نماز کی تاکید کی گئی ہے ان کو نہایت مکمل طریق پر بجا لائے۔''

(حوالہ ایضاً)

مغفرت کا وعدہ کس کے لیے؟

حدیث مبارکہ میں ہے:

((خَمْسُ صَلَوَاتٍ اِفْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ تعالیٰ: مَنْ اَحْسَنَ وُضُوْءَ هُنَّ وَ صَلّٰهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ، وَ اَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ كَانَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدًا اَنْ يَّغْفِرَ لَهٗ وَ مَنْ لَّمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدًا اِنْ شَاءَ غَفَرَلَهٗ وَ اِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ)) (رواہ احمد و ابو داوٗد عن عبادہ بن صامت)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''اللہ نے پانچ نمازیں فرض ٹھہرائی ہیں، جس نے اچھی طرح وضو کیا، وقت پر نماز پڑھی اور

کامل طریق پر رکوع وخشوع کے حقوق سے عہدہ برا ہوا تو اللہ کا وعدہ ہے کہ ضرور اس کی مغفرت ہوگی، جس نے ایسا نہ کیا (اس احتیاط اور التزام کو برقرار نہ رکھا) تو کوئی وعدہ نہیں، چاہے تو اللہ اس کو بخش دے اور چاہے عذاب میں ڈالے۔"

یہی وہ نماز ہے، جسے کامل طریق پر ادا نہ ہوتے دیکھ کر ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا:

((قُمْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)) (رواہ البخاری عن ابی ہریرہؓ، حقیقت صلوۃ)

"اٹھو اور پھر نماز پڑھو، اس لیے کہ جو نماز تم نے پڑھی ہے وہ نماز ہی نہ تھی۔"

پھر جب اس شخص نے حسبِ عادت جلد نماز ادا کی تو عرض کرنے لگا:

((وَالَّذِی بَعَثَكَ بِالْحَقِّ فَمَا اُحْسِنُ غَیْرَهٗ فَعَلِّمْنِیْ))

"اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! میں اس سے بہتر نماز ادا نہیں کرسکتا، آپ مجھے سکھلا دیجیے۔"

آپ ﷺ نے اس طرح ارشاد فرمایا:

((اِذَا قُمْتَ اِلَی الصَّلٰوةِ، فَكَبِّرْ، ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَیَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ، ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا، ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَعْتَدِلَ قَائِمًا، ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا، ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِسًا ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ افْعَلْ ذٰلِكَ فِی صَلَاتِكَ كُلِّهَا)) (بخاری، عن ابی ہریرہ)

"اللہ اکبر کہتے ہوئے نماز کے لیے کھڑے ہوتو (ثنا اور سورۂ فاتحہ) کے بعد آسانی سے قرآن کا جو حصہ یاد ہو اسے پڑھو، پھر رکوع کرو اور اطمینان کے ساتھ رکوع کرو، رکوع کے بعد سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ سکون اور اطمینان سے کرو، پھر ایک سجدہ کے بعد اطمینان سے بیٹھ جاؤ، پھر دوبارہ سجدہ سکون اور اطمینان سے کرو، اسی طرح پوری نماز ادا کرو۔"

شیخ ناصر الدین البانی رکوع وسجدہ کرنے کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں:

''نبی ﷺ بحالت رکوع اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر اس طرح رکھتے کہ جسم کے سارے جوڑوں کو اطمینان وسکون مل جاتا، ہاتھ کی انگلیوں کو پھیلا کر رکھتے اور انہیں گھٹنوں پر اس طرح غالب رکھتے گویا کہ انہیں پکڑے ہوئے ہیں۔ بحالت رکوع اپنی دونوں کہنیوں کو اپنے پہلو سے دور رکھتے اور اپنی پشت مبارک کو پوری طرح پھیلاتے اور سر اور پشت مبارک اس طرح برابر رکھتے کہ اس پر پانی ڈالا جاتا تو ٹھہرا رہتا اور گھٹنوں میں کسی طرح کا خم نہ ہوتا، سر مبارک نہ نیچا رکھتے اور نہ اونچا۔

رکوع میں پورے خشوع اور شعور کے ساتھ ''سبحان ربی العظیم'' کم از کم تین بار اور کبھی تین بار سے زیادہ (طاق ہندسوں میں مثلاً پانچ، سات، بار یا زیادہ پڑھتے تھے) کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نماز تہجد میں آپ ﷺ کا رکوع آپ ﷺ کے قیام کے برابر ہوتا۔ رکوع وسجود میں کئی اور دعائیں بھی مسنون ہیں۔

نبی ﷺ کے رکوع اور اس کے بعد کھڑے ہونے پر سجدہ اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار تقریباً یکساں ہوا کرتی تھی۔

یہ آپ ﷺ کی انفرادی نماز کا ذکر ہے۔ اجتماعی نماز متوازن اور معتدل تھی، بلکہ ایسا بھی ہوا کہ جماعت کے دوران کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی تو آپ ﷺ نے نماز کو مختصر فرما دیا۔

رکوع کے بعد قیام:

جب آپ ﷺ رکوع سے سر مبارک اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہوتے کہ ریڑھ کی ساری ہڈیاں اپنی اپنی جگہ پہنچ جاتیں اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کسی شخص کی نماز اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک وہ ((اللہ اکبر)) کہہ کر رکوع نہ کرے اور پھر ((سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہ)) کہہ کر ٹھیک سے کھڑا نہ ہو جائے اور پھر اسی حالت میں ((رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْد)) کہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے کہ ''امام کی نماز کے ہر رکن میں اقتدا کرو، پس جب وہ ((سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہ)) کہے تو تم لوگ ((اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ)) کہو۔

ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری فریاد سنے گا کیونکہ اس نے اپنے نبی ﷺ کی زبان پر ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه)) کہلوایا ہے، ایک دوسری حدیث میں ((اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْد)) کہنے کا سبب بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''جس کی بات فرشتوں کی بات کے موافق ہوگی، اس کے پہلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔''

رکوع کے بعد اور دعائیں بھی مسنون ہیں جنہیں ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔

سجدہ کی کیفیت:

رکوع کے بعد سیدھا کھڑے ہونا اور دعائیں پڑھنے کے بعد نبی ﷺ ''اللہ اکبر'' فرما کر سجدہ ریز ہوتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے دور رکھتے اور آپ ﷺ فرماتے کہ ''چہرے کی مانند دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں، پس جب تم میں سے کوئی اپنا چہرہ زمین پر رکھے تو اپنے دونوں ہاتھ بھی رکھے اور جب چہرہ اٹھائے تو دونوں ہاتھ بھی اٹھائے اور آپ ﷺ سجدے میں اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹیک لگاتے اور انہیں کھلی ہوئی رکھتے اور ساری انگلیوں کو ملا کر انہیں قبلہ رخ رکھتے اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اپنے دونوں کندھوں کے بالمقابل رکھتے اور آپ ﷺ اپنی ناک اور پیشانی زمین پر اچھی طرح رکھتے اور آپ ﷺ ارشاد فرماتے ''جب تم سجدہ کرو تو اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو زمین پر اس طرح دبا کر رکھو کہ ساری ہڈیاں اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر آ جائیں اور آپ ﷺ ارشاد فرماتے کہ جو شخص اپنی ناک اپنی پیشانی ہی کی طرح زمین سے لگا کر نہیں رکھتا اس کی نماز نہیں ہوتی اور آپ ﷺ اپنے دونوں گھٹنوں اور دونوں پیروں کے کناروں کو زمین پر دبا کر رکھتے (اور اپنے دونوں قدم کے اوپر والے حصے) کو انگلیوں سمیت قبلہ رخ کرتے اور اپنے دونوں پیروں کی انگلیاں اندر کی طرف قبلہ رخ موڑ دیتے۔

پس دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے، دونوں قدم اور پیشانی و ناک یہ سات اعضا ہیں جن پر نبی ﷺ سجدہ فرمایا کرتے تھے۔

نبی ﷺ نے اخیر کے دونوں اعضا (یعنی پیشانی اور ناک) کو سجدہ میں ایک عضو قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا اور ایک روایت میں آتا ہے کہ ہم سب کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم سات ہڈیوں پر سجدہ کریں اور نماز کے دوران ہمیں کپڑوں اور بالوں کو سمیٹنے اور سنوارنے سے منع فرمایا (اس سے خضوع میں کمی آتی ہے)۔

آپ ﷺ فرماتے کہ "آدمی کے ساتھ اس کے ساتوں اعضا چہرہ، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں قدم بھی سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

نبی ﷺ اپنی دونوں کہنیوں کو زمین پر بچھاتے نہیں تھے بلکہ انہیں زمین سے اٹھائے رکھتے اور انہیں اپنے پہلوؤں سے اتنا دور رکھتے کہ دونوں بغلوں کی سفیدی آپ کے پیچھے سے نظر آتی اور یہاں تک کہ اگر بکری کا بچہ آپ کے ہاتھوں تلے سے گزرنا چاہتا تو گزر سکتا تھا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، اگر تم نے ایسے سجدہ کیا تو تمہارے سارے اعضا بھی تمہارے ساتھ سجدہ ریز رہیں گے اور رسول اللہ ﷺ رکوع و سجود اچھی طرح کرنے کا حکم دیتے تھے۔

آپ ﷺ سجدہ میں مختلف اذکار اور دعائیں مانگتے اور فرماتے "بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب سے قریب تر ہوتا ہے پس سجدہ میں تم بکثرت دعائیں مانگا کرو (البتہ سجدہ کی حالت میں قرآن پڑھنے سے منع فرماتے) سجدہ کی حالت میں معروف ذکر ﴿سُبْحانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی﴾ ہے، یعنی پاک ہے میرا رب جو سب سے اعلیٰ ہے، کم از کم اسے تین بار کہتے اور کبھی اس سے زیادہ بار (طاق ہندسوں میں یعنی پانچ، سات بار یا زیادہ) بھی پڑھتے، مگر جماعت کے ساتھ نماز میں آپ ﷺ ہمیشہ اعتدال کو پسند فرماتے تھے۔

نبی ﷺ کا رکوع اور سجدہ کا وقفہ تقریباً برابر ہوتا تھا، کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ سجدہ طویل ہو جاتا، ایک صحابی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر یا عصر کی نماز کے لیے حسن یا حسین رضی اللہ عنہما کو گود میں لیے ہمارے پاس تشریف لائے، جب آپ امامت کے لیے آگے بڑھے تو بچے کو اپنے دائیں قدم کے پاس بٹھایا اور پھر "اللہ اکبر" کہہ کر نماز شروع کر دی مگر آپ

نے دورانِ نماز ایک سجدہ لمبا کیا، (ایک صحابی جو روایت کرتے ہیں، کہتے ہیں) میں نے اپنا سر سجدے سے اٹھایا تو دیکھتا ہوں کہ نبی ﷺ سربسجود ہیں اور بچہ آپ کی پشت پر سوار ہے، میں دوبارہ سجدے میں چلا گیا، مگر جب نماز ختم ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ ''اے اللہ کے رسول! ﷺ آپ نے دورانِ نماز ایک سجدہ اتنا لمبا کیا کہ ہمیں گمان ہوا کہ کوئی نئی بات پیدا ہوگئی ہے، یا پھر آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی بلکہ معاملہ یہ تھا کہ میرے بیٹے نے میری سواری کر رکھی تھی، پس میں نے اسے اچھی طرح آسودہ ہو لینے سے پہلے اپنی پشت سے اتارنا پسند نہ کیا۔

سبحان اللہ! مزاجِ مبارک میں کیسا اعتدال اور توازن تھا، اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ دوران جماعت اگر کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو آپ ﷺ نماز کو مختصر فرما دیتے۔ نبی ﷺ فرماتے کہ: ''قیامت کے روز اپنی امت کے ہر فرد کو پہچان لوں گا۔'' صحابہٴ کرامؓ نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! مخلوق کی اس کثرتِ ازدحام (جم غفیر) میں آپ ﷺ انہیں کیسے پہچانیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بتاؤ تم کسی ایسے باڑے میں داخل ہو جس میں خالص سیاہ رنگ کے گھوڑے ہوں، مگر ان میں پنج کلیان گھوڑا بھی ہو تو کیا تم اسے نہیں پہچانو گے؟'' صحابہ نے عرض کیا کہ یقیناً ہم لوگ اسے پہچان لیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں سجدے اور وضو کے سبب اس روز چمکتے ہوں گے۔''

دوسجدوں کے درمیان بیٹھنا

نبی ﷺ ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے سجدے سے اپنا سر مبارک اٹھاتے اور فرماتے کہ کسی شخص کی نماز اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ سکون و اطمینان سے سجدہ نہ کرے، پھر ''اللہ اکبر'' کہہ کر اپنا سر سجدے سے اٹھا کر ٹھیک طور سے بیٹھ نہ جائے، نبی ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان اس اطمینان وسکون سے بیٹھتے کہ جسم مبارک کی ساری ہڈیاں اپنی اپنی جگہ پر آجاتیں اور آپ اس بیٹھک کو اتنا طول دیتے کہ یہ تقریباً آپ ﷺ کے

سجدے کے برابر وقفہ ہوتا اور یہ دعا پڑھتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ، وَارْحَمْنِیْ، وَاھْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ))

''اے اللہ! مجھے بخش دیجیے، مجھ پر رحم فرمایے، مجھے ہدایت سے نوازیے، مجھے صحت و عافیت دیجیے اور مجھے رزق حلال سے بہرہ ور فرمایے۔''

اور کبھی: ((رَبِّ اغْفِرْلِیْ، رَبِّ اغْفِرْلِیْ))

''اے رب! بخشش کا معاملہ فرمایے، اے رب بخشش کا معاملہ فرمایے۔''

ان دونوں دعاؤں کو پڑھ لیں یا جو آسانی سے یاد ہو جائے وہ پڑھ لیں، ان دونوں دعاؤں کا آپ ﷺ سے دونوں سجدوں کے درمیان پڑھنا ثابت ہے۔''

(صفة صلاة النبی صلی الله علیه وسلم شیخ البانی)

حقیقت یہ ہے کہ نماز میں خشوع و خضوع اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اسے سنت نبوی کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا جائے، جب کوئی شخص سعی و جستجو کے ساتھ تلاشِ علم میں لگ جائے تو اسے راہ حق یقیناً معلوم ہو جاتی ہے۔ عاجز نے رکوع و سجود کو سنت نبوی ﷺ کے مطابق ادا کرنے کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں جنہیں عام طور پر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں اور نماز ناقص رہ جاتی ہے، دعا ہے کہ رب کریم عبادت کے اس اہم رکن کو سنت نبوی ﷺ کے مطابق ادا کرنے کی توفیق دے تا کہ ہماری نمازیں اس کے ہاں مقبول ہو جائیں اور وہ ہمیں فوز و فلاح سے ہمکنار فرمائے۔ آمین!

آیت مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) نمازی اپنے مولا و مالک سے نماز میں ہم کلام ہوتا ہے، اسے ایمان و یقین اور فہم و شعور کے ساتھ اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ وہ مالک کے حضور کیا معروضات پیش کر رہا ہے۔

۲) رب العالمین کے حضور پیش ہونے کے آداب کا بھی پوری طرح علم ہونا چاہیے کہ بندگی کا حق کس طرح ادا ہو سکتا ہے، اس طرح عبادت میں حلاوت اور چاشنی پیدا ہوتی ہے اور اس کا رب کے ہاں اجر مرتب ہوتا ہے۔

❁......❁......❁

اِقامت صلوٰۃ (ج)

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡھِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِکَ ذِکۡرٰی لِلذّٰکِرِیۡنَ﴾ (ھود:۱۱/۱۱٤)

''(اے نبی!) دن کے دونوں سروں میں نماز قائم کیجیے اور رات کی ساعتوں میں بھی، حقیقت یہ ہے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کو یاد رکھنے والے ہیں۔''

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اور آپ قائم کیجیے نماز، فعل امر واحد مذکر حاضر، (اَقَامَ، یُقِیۡمُ، اِقَامَۃً) قائم کرنا، تعدیلِ ارکان کے ساتھ سنت نبویؐ کے مطابق نماز قائم کرنا، طَرَفَیِ النَّھَارِ دن کے دونوں طرفوں (حصوں) میں، وَ زُلَفًا اور کچھ گھڑیوں، زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ رات کے کچھ حصوں میں (راغب اصفہانی)، اِنَّ الۡحَسَنٰتِ بلاشبہ نیکیاں، اس کا مفرد حَسَنَۃٌ ہے، یُذۡھِبۡنَ فعل مضارع جمع مؤنث غائب، لے جاتی ہیں (دور کر دیتی ہیں) (اَذۡھَبَ، یُذۡھِبُ) لے جانا، دور کر دینا، اَلسَّیِّاٰتِ برائیاں، اس کا مفرد سَیِّئَۃٌ ہے، ذٰلِکَ یہ (بات) ذِکۡرٰی نصیحت ہے، لِلذّٰکِرِیۡنَ (لِ.ذّٰکِرِیۡنَ) لیے، ذکر کرنے والوں، یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والوں کے لیے، اسم فاعل، اس کا مفرد اَلذَّاکِرُ ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن ناصر السعدی لکھتے ہیں:

'' اللہ تعالیٰ اس آیت مبارکہ میں پانچوں نمازوں کو قائم کرنے کا حکم دیتا ہے ﴿طَرَفَیِ النَّھَارِ﴾ دن کے دونوں اطراف میں نماز قائم کرنے میں نماز فجر، ظہر اور عصر آ جاتی ہیں جبکہ ﴿زُلَفًا مِن اللَّیۡل﴾ رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرنے سے مراد مغرب اور عشا

کی نمازیں آ جاتی ہیں اور اس میں نماز تہجد بھی آتی ہے (جو کہ نفل نماز ہے) جس سے بندہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔'' (تیسیرالکریم الرحمن فِیُ تفسیرِ کلَامِ المَنّانِ)

پانچ نمازوں کے اوقات اہل بصیرت کے لیے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

اس پر مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''نمازوں کے لیے جو اوقات مقرر ہیں یہ عبادت کے لیے موزوں، قبولیت دعا کے لیے سازگار، بندوں کے ذہن کے لیے سکون بخش، عناصر کائنات کے اوقاتِ تسبیح و تہلیل سے مطابق اور شمس و قمر اور شجر و حجر کے اوقات رکوع و سجود سے ہم آہنگ ہیں، فجر، چاشت، ظہر، عصر، مغرب عشاء اور تہجد کے اوقات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی وقت بھی ایسا نہیں ہے جو مذکورہ بالا اعتبار سے ایک خاص اہمیت نہ رکھتا ہو۔

فجر:

فجر کا وقت فراغِ خاطر اور سکونِ قلب کا خاص وقت ہے، آدمی شب میں آرام کرنے کے بعد جب اٹھتا ہے تو اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوتا ہے، عبادت کے لیے ایک نئی حرکت کا آغاز ہوتا ہے، زندگی ایک نئے عزم کی محتاج ہوتی ہے اور یہ نیا عزم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ توفیق اور تازہ ہدایت کا طلبگار رہتا ہے۔

ظہر:

ظہر کا وقت ایک دوسری حقیقت کا اعلان کرتا ہے، آدمی دیدۂ بینا رکھتا ہو تو اس وقت ایک اور حقیقت نظر آتی ہے اور وہ بھی آدمی کو رکوع و سجود کی دعوت دیتی ہے وہ یہ کہ اس وقت سورج، جس کو نادانوں نے معبود کا درجہ دے کر مسجود بنایا، خود اپنے خالق کے آگے اپنی کمر خم کرتا ہے اور خود اپنے عمل سے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ خالق نہیں بلکہ مخلوق ہے اور معبود نہیں بلکہ عابد ہے۔

عصر:

عصر کا وقت ایک نئی حقیقت کی منادی کرتا ہے، وہ یہ کہ ہر عروج کے لیے زوال، ہر جوانی

کے لیے بڑھاپا اور ہر مد کے لیے جزر مقدر ہے، کائنات کی کوئی چیز بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے، صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، اس کے سوا کسی کے لیے بھی بقا نہیں، جس طرح دن چمکا، اس کی دو پہر ہوئی اور اب غروب کے کنارے کھڑا ہے، اسی طرح یہ دنیا بھی پیدا ہوئی، شباب کو پہنچی اور ایک دن خاتمہ کے قریب جا لگے گی۔ عصر کے وقت یہ خاموش تذکیر بندوں کو اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ آخرت کو یاد کریں اور توبہ واستغفار کے لیے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوں۔

مغرب:

مغرب کے وقت زندگی ایک نئے دروازے میں داخل ہوتی ہے۔ یہ دروازہ حیات کے بعد موت اور زندگی کے بعد برزخ کے دروازہ کے مشابہ ہے، رب کائنات دن کی نشانی کے بعد رات کی نشانی اور سورج کی تابانی کے بعد چاند کی چاندنی دکھاتا ہے، دن کے ہنگامے سرد پڑتے ہیں اور ستاروں کی بزم آراستہ ہوتی ہے۔ گرمی، لو اور دن کی شورا شوری کم ہوتی ہیں اور دن بھر کا تھکا ہارا انسان رات کی خنک لوریوں میں ایک نئی کیفیت محسوس کرتا ہے، بے حس اور بلید لوگ ممکن ہے کائنات کے اتنے بڑے الٹ پھیر کو کچھ نہ محسوس کرتے ہوں، تاہم جس کے اندر حس موجود ہوگی وہ اس سے بے خبر کیسے گزر سکتا ہے؟ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ آدمی اتنی بڑی قدرت وحکمت کا مشاہدہ کرے اور جس قدیر وحکیم نے یہ قدرت وحکمت دکھائی ہے، اس سے بالکل بے پروا اور بے نیاز رہ سکے، اگر اس کے دل کے اندر زندگی کی کوئی رمق ہے تو وہ اس موقع پر ضرور متنبہ ہوگا اور اپنے خالق و مالک کے آگے اپنا سر نیاز جھکائے گا جس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اس نے آن کی آن میں پوری دنیا کو شب کی چادر میں چھپا دیا۔

عشاء:

عشاء کا وقت ایک احتساب کا وقت ہے، رات کی تاریکی بڑھ کر حرکت وعمل کے آخری آثار کو بھی ختم کر دیتی ہے، آدمی ہر چیز سے کنارہ کش ہو کر سکون اور آرام کا طالب ہوتا ہے تاکہ آنے والی منزل کے سفر کے لیے تیار ہو سکے، یہ وقت اس بات کے لیے نہایت

موزوں ہوتا ہے کہ آدمی بستر پر جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے رب کے حضور حاضری دے لے، ممکن ہے یہ فرصت، آخری فرصت ہی ہو اور آج کے سونے کے بعد اس کو جاگنا نصیب نہ ہو۔

تہجد

تہجد کا وقت راز و نیاز اور سرگوشی و مناجات کا وقت ہے، پرسکون اور سکون بخش ہونے کے لحاظ سے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، آسمان سے لے کر زمین تک سکون ہی سکون ہوتا ہے، اس وقت سب سو رہے ہوتے ہیں، شاید شیطان بھی سو رہا ہوتا ہے، صرف وہ رب کریم جاگتا ہے جو کبھی نہیں سوتا یا پھر وہ جاگتا ہے جس کا بخت بیدار ہوتا ہے، رات کے آخری پہر اٹھیے اور ستاروں کی چھاؤں میں کھڑے ہو جایے تو فی الواقع محسوس ہوگا کہ آسمان کے دریچے کھلے ہوئے ہیں اور آسمانِ دنیا سے توبہ اور رحمت کی منادی ہو رہی ہے، اُس وقت کی کیفیات ایسی واضح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مقربین کی نماز کے لیے خاص کیا ہے جن کے پہلو اس وقت بستر کی لذت کو چھوڑتے ہیں، ان کی التجائیں اور دعائیں سننے کے لیے وہ خود آسمانِ دنیا پر اترتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی میری رحمت کا طالب کہ میں اس کو اپنی رحمت کے دامن میں چھپالوں؟

یہ اوقات ہیں جو نماز کے لیے مقرر ہیں، غور کیجیے کہ ان میں سے ایک ایک وقت اپنے اندر کتنی معنویت اور کتنی تاثیر رکھتا ہے۔'' (تزکیۂ نفس)

نماز رب اور بندے کے درمیان مناجات کا پاکیزہ اور صاف ستھرا ماحول ہوتا ہے، بندہ جسم و لباس کی طہارت کے ساتھ اپنے آقا و مولا کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔

نماز کی ہیئت:

اس پر مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اب آیے! نماز کی ہیئت وصورت پر ایک نظر ڈالیے، نماز کے لیے جب بندہ کھڑا ہوتا

ہے تو عجز و نیاز مندی کی تصویر بن کر کھڑا ہوتا ہے، ہاتھ باندھے ہوئے، نگاہ نیچی کیے ہوئے، گردن جھکائے ہوئے، پاؤں برابر کیے، دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے بالکل بے تعلق، سنجیدگی اور خاموشی کی تصویر، ادب اور وقار کا مجسمہ کبھی اپنے خالق و مالک کے آگے سر جھکا دیتا ہے، کبھی اپنی ناک اور پیشانی زمین پر رکھ دیتا ہے، کبھی ہاتھ پھیلا کر اس سے دعا اور التجا کرتا ہے، غرض عاجزی اور تذلل کی جتنی شکلیں بندہ اختیار کر سکتا ہے، ادب اور وقار کے ساتھ ان ساری ہی شکلوں کو اختیار کرتا ہے، اس طرح ایک نماز پڑھنے والے کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ صاف گواہی دیتی ہے کہ بندہ اپنے مالک و مولیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر وہ دیکھ نہیں رہا ہے تو یہ یقین تو وہ ضرور رکھتا ہے کہ اس کا مالک و مولیٰ اس کو دیکھ رہا ہے، یہی نماز ہے جس کو احسان کی نماز کہتے ہیں، یہ نماز فقہی نماز سے ایک مختلف مزاج رکھتی ہے، تزکیۂ نفس کے نقطہ نظر سے معتبر نماز یہی ہے، یہ نماز، نماز پڑھنے والے کے باطن کا عکس ہوتی ہے، اس نماز میں نمازی کے دل کا خضوع و خشوع جھلکتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے آگے بندہ کی صرف کمر ہی نہیں جھکتی بلکہ اس کا دل بھی جھک جاتا ہے صرف اس کی پیشانی ہی خاک آلود نہیں ہوتی بلکہ اس کی روح بھی سجدہ ریز ہوتی ہے، اس کے برعکس جو شخص نفاق کی نماز پڑھتا ہے، اس کی کسل مندی اس کی جمائیاں، اس کا بدن کو توڑنا مروڑنا، انگلیوں کو چٹخانا، سر کو کھجلانا، دامن اور گریبان سے کھیلنا، داڑھی کے بالوں سے شغل کرنا اور اس طرح کی دوسری حرکتیں صاف گواہی دیتی ہیں کہ اس کا جسم حاضر ہے لیکن اس کا دل غائب ہے، اس کا بدن مسجد میں ہے لیکن اس کی روح بازار میں گردش کر رہی ہے اور گو دوسروں کی دیکھا دیکھی یا رسم کی پابندی کی خاطر اپنی گردن یہ بھی جھکا دیتا ہے لیکن اس کا دل بدستور اکڑا ہی رہتا ہے۔" (تزکیہ نفس)

نماز میں پڑھے جانے والے کلمات اور دعائیں:

نماز میں بندۂ مومن اپنے رب تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے خالق و مالک سے کیا مانگ رہا ہے اور اسے اس کی بارگاہ سے کیا جواب مل رہا ہے، اس طرح جب وہ

پورے انہماک اور توجہ سے نماز پڑھے گا تو اس کی نماز میں خشوع وخضوع بھی پیدا ہوگا اور وہ نماز اس کے لیے رحمتوں اور برکتوں کا باعث ہوگی۔

اس پر مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اب ذرا ایک اجمالی نظر نماز کی دعاؤں پر ڈالیے نماز کا آغاز ابراہیمی دعا سے ہوتا ہے:

﴿اِنِّیۡ وَجَّھۡتُ وَجۡھِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ، اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ (الانعام:٦/١٦٢)

''میں نے تو اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں، بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو رب العالمین ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم ہوا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا (مسلم) میں ہوں۔''

یعنی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے پورے عزم کے ساتھ شرک سے اپنی براءت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مسلم ہونے کی گواہی دی، یہ صرف ایک کلمہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس یادگار اعلانِ حق کی ایک پوری تاریخ ہے جو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے کیا ہے اور ہر قسم کی دشمنیوں اور دوستیوں، ہر قسم کے فوائد و مصالح اور ہر قسم کے خطرات و مصائب سے بالکل بے پروا ہو کر کیا ہے، اس اعلانِ حق کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑی، اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز سے جس دستبرداری کا اظہار فرمایا تھا، اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ان کو فی الواقع ہر چیز سے دامن جھاڑ کر اٹھنا پڑا اور وہ دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے، ان کو محض استعارہ کی زبان ہی نہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں زندگی اور موت کی بازیاں بھی کھیلنی پڑیں تو وہ ان بازیوں میں بھی سو فی صد کامیاب رہے۔

یہ یادگار کلمہ زبان سے ادا کر کے جب بندہ نماز میں داخل ہوتا ہے تو اس کی عظیم معنویت اور اس کی عظیم تاریخ، اس کی روح کو ابراہیمی اخلاص اور ابراہیمی حنیفیت سے لبریز کر دیتی ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں صرف ایک مصلی (نمازی) ہی نہیں ہوں بلکہ ایک صف شکن مجاہد بھی ہوں، وہ اپنے رب کے آگے اس کے ساتھ اپنی وفاداری کا عہد کرتا ہے لیکن یہ صرف وفاداری کا عہد نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے ہر باطل سے بغاوت کا اعلان بھی ہوتا ہے اور اس راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کا غیر متزلزل عزم بھی۔'' (تزکیۂ نفس)

مولانا اصلاحیؒ نے تکبیر تحریمہ (نماز شروع کرتے ہوئے اللہ اکبر کہنا) کے بعد مندرجہ بالا دعا کا ذکر فرمایا، وہ خود بھی اس دعا کو پڑھا کرتے تھے۔ وہ مفسر قرآن، کئی کتابوں کے مصنف اور شب زندہ دار تھے۔ عاجز کو ان کے درس قرآن میں طویل عرصہ بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے سایۂ رحمت میں ڈھانپ لے، آمین!

لیکن اس دعا کے علاوہ احادیث مبارکہ میں اور بھی دعاؤں کا ذکر آتا ہے، ان میں سے معروف کلمات یہ بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے:

((سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ وَ تَبَارَكَ اسْمُكَ وَ تَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ)) (ابوداود، ترمذی)

''اے اللہ! آپ تو ہر نقص اور عیب سے پاک ہیں اور ساری تعریفیں اور (تمام جسمانی و روحانی) نعمتوں پر شکر صرف اور صرف آپ کے لیے ہے اور آپ کا نام برکت والا اور آپ کا مرتبہ اور عظمت عالی ہے اور آپ کے سوا کوئی معبود (مشکل کشا اور حاجت روا) نہیں ہے۔''

ان کلمات کو ادا کرتے ہوئے بندۂ مومن کا دل اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور عزت و عظمت سے لبریز ہو جانا چاہیے، اور ہر مشکل اور ہر مصیبت میں صرف اور صرف اسی سے مدد کا طلبگار رہنا چاہیے کیونکہ پریشانیاں اور تکالیف صرف وہی دور کر سکتا ہے۔

مولانا اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''بندۂ مومن تکبیر تحریمہ کے بعد رب کائنات کی حمد و ثنا بیان کر کے سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے، یہ دعا وہ دعا ہے جس سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے کوئی اور دعا نہیں ہے۔ یہ دعا خود رب العالمین نے سکھائی ہے، اس میں بندہ جس طریقہ سے اپنے رب سے مانگتا ہے اس سے بہتر طریقے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور جو کچھ مانگتا ہے اس سے بہتر کوئی دوسری چیز مانگنے کی ہو ہی نہیں سکتی، خالق و مالک نے خود ہی بتا دیا ہے کہ اس سے مانگنے کا طریقہ کیا ہے اور اسی نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اصلی مانگنے کی چیز کیا ہے؟ جب سوال کی تمہید بھی ٹھیک ہو، جو چیز مانگی گئی ہے وہ بھی مانگنے کی ہو اور تنہا اسی سے مانگنے کی ہو جس سے مانگی جا رہی ہے اور دینے والا بھی تمام کریموں سے بڑھ کر کریم ہو تو پھر اس کی قبولیت کا کیا شک ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے خبر دی ہے کہ بندہ جب یہ دعا پڑھتا ہے تو رب کریم اس کے ایک ایک لفظ کو کس طرح شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((فَاِنِّی سَمِعۡتُ رَسُولَ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ یَقُولُ: قَالَ اللّٰہُ تعالٰی: قَسَّمۡتُ الصَّلَاۃَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَ عَبۡدِیۡ نِصۡفَیۡنِ وَ لِعَبۡدِیۡ مَا سَأَلَ: فَاِذَا قَالَ الۡعَبۡدُ: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیۡ عَبۡدِی وَاِذَا قَالَ: اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَثۡنٰی عَلَیَّ عَبۡدِی، وَاِذَا قَالَ: مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ قَالَ: مَجَّدَنِیۡ عَبۡدِیۡ فَاِذَا قَالَ: اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ قَالَ: ھٰذَا بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَ عَبۡدِی وَلِعَبۡدِیۡ مَا سَأَلَ: فَاِذَا قَالَ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ، صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ، غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ، قَالَ: ھٰذَا لِعَبۡدِیۡ وَ لِعَبۡدِی مَا سَأَلَ)) (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ)

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے نماز کی دعا کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے، وہ میرا بندہ جو کچھ مانگتا ہے وہ پاتا ہے، جب بندہ اپنی زبان سے کہتا ہے کہ [شکر کا سزاوار وہی اللہ ہے جو

کائنات کا رب ہے] تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا، جب بندہ [رحمان اور رحیم] کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی، جب وہ [جزا وسزا کے دن کا مالک] کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی، جب وہ [ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں] کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے بندے کو وہ دیا جو اس نے مانگا، پھر جب بندہ [ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش، ان لوگوں کے رستے کی جن پر تو نے اپنا فضل فرمایا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ] کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ خاص میرے بندے کا حصہ ہے اور میں نے اس کو بخشا جو اس نے مانگا۔''

آدمی نماز میں جب اس دعا کو پڑھتا ہے اور ساتھ ہی خیال کرتا جاتا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ مالک الملک کس طرح قبول فرماتا ہے جس سے یہ دعا کی جا رہی ہے تو اس کی روح وجد میں آ جاتی ہے، یہ خیال اس دعا کے ایک ایک لفظ کو لعل و گہر سے زیادہ قیمتی بنا دیتا ہے اور بندہ ان کو اونگھتے ہوئے زبان سے نہیں ادا کرتا بلکہ وہ اس جوہری کی طرح آسمان و زمین کے بادشاہ کے سامنے پیش کرتا ہے جس کو اس کے ایک ایک گہر کے بدلے ان کے حقیقی قدردان کے ہاتھ دولت کے خزانے ملنے والے ہوں۔'' (تزکیۂ نفس)

آیت مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں

۱) جو نماز باقاعدگی سے سنت نبوی ﷺ کے مطابق ادا کی جائے وہ اپنے فوائد وثمرات رکھتی ہے جس کا قرآن حکیم نے واضح اشارہ کیا کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہے، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے جب نماز کو اخلاص سے بروقت ادا کرتے ہیں تو ان کے صغیرہ تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، جبکہ کبیرہ گناہ اسی وقت معاف ہوتے ہیں جب سچے دل کے ساتھ ان سے توبہ کی جائے اور آئندہ سیدھی راہ پر چلنے کا عزم کیا جائے۔

۲) دن رات کی نمازوں کے اوقات پر نظر ڈالیے، ان میں کتنا تناسب اور وقفہ نظر آتا ہے، نماز فجر اور نماز ظہر کا وقفہ زیادہ رکھا گیا ہے کیونکہ یہ لوگوں کی معاشی سرگرمیوں کا وقت ہے، دوسری نمازوں میں وقفہ کم رکھا گیا ہے تاکہ وہ غفلت کا شکار نہ ہو جائیں۔ عشا اور فجر کا وقفہ زیادہ رکھا گیا ہے کہ یہ لوگوں کے آرام کا وقت ہے۔

۳) نماز معاشرتی نظم وضبط قائم رکھنے کا بہترین علاج ہے بلکہ یہ نظم وضبط دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ اس بات کا مشاہدہ موسم حج میں کیا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک ہی قسم کے لباس میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۴) افسوس کہ مسلمانوں نے اتنی بڑی نعمت کو بھلا کر خسارے کا سودا کیا ہے، اسی نماز کی بدولت اللہ تعالیٰ نے انہیں میدان جنگ میں فتح ونصرت سے ہمکنار کیا ہے، جبکہ حالتِ امن میں وہ اس دولت گرانمایہ سے غافل ہیں ۔

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رو ہو کے زمین بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے — تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

عَنْ أبی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰه صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:« لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِیْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ

[متفق علیه۔ ریاض الصالحین باب الصبر]

”سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پہلوان وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ دے۔ (حقیقت میں) پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔“

اِقامت صلوٰۃ (د)

﴿اُتۡلُ مَآ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ﴾ (العنکبوت:۲۹/۴۵)

”(اے نبی!) تلاوت کیجیے اس کتاب کی جو آپؐ کی طرف وحی کے ذریعہ بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کیجیے، یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے، بلاشبہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے اور تمہارے ہر عمل سے اللہ اچھی طرح خبردار ہے۔“

اُتۡلُ تلاوت کیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (تَلَا، یَتۡلُوۡ، تُلُوًّا) پڑھنا، پڑھ کر سنانا، تَلَا الۡکِتَابَ وَالسُّنَّۃَ، کتاب وسنت کا اتباع کرنا (القاموس الوحید) مَآ اُوۡحِیَ جو کچھ وحی کی گئی، فعل ماضی مجہول واحد مذکر غائب (اَوۡحٰی، یُوۡحِیۡ) وحی کرنا، اللہ تعالیٰ کا جبرائیل امین کے ذریعہ انبیائے کرام پر اپنے احکام نازل فرمانا، اِلَیۡکَ آپ کی طرف، ک ضمیر واحد مخاطب، جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے، مِنَ الۡکِتٰبِ کتاب میں سے، اَلۡکِتَاب سے مراد اَلۡقُراٰن ہے، وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اور نماز قائم کیجیے، پورے آداب کے ساتھ پانچ نمازوں کو قائم کرنا، اِنَّ الصَّلٰوۃَ بلاشبہ نماز، تَنۡھٰی روکتی ہے، فعل مضارع صیغہ واحد مؤنث غائب، یہ صلوٰۃ کے لیے استعمال ہوا ہے (نَھٰی، یَنۡھٰی) روکنا، منع کرنا، عَنِ الۡفَحۡشَآءِ بے حیائی، بدکاری، وَ الۡمُنۡکَرِ برے کام، قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ

فَضْلًا﴾ (البقرہ:۲/۲۶۸)

''شیطان تمہیں فقر اور تنگدسی سے دھمکاتا ہے اور بے حیائی اور بدکاری کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔''

﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ پر حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یعنی بھلے کام میں مال خرچ کرنا ہو تو شیطان ڈراتا ہے کہ مفلس اور قلاش ہو جاؤ گے، لیکن برے کام پر خرچ کرنا ہو تو ایسے اندیشوں کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا، بلکہ ان برے کاموں کو اس طرح سجا اور سنوار کر پیش کرتا ہے اور ان کے لیے خفیہ آرزوں کو اس طرح جگاتا ہے کہ ان پر انسان بڑی سے بڑی رقم بے دھڑک خرچ کر ڈالتا ہے، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد، مدرسے یا کسی اور کارخیر کے لیے کوئی چندہ لینے پہنچ جائے تو صاحب مال سو، دوسو کے لیے بار بار اپنے حساب کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور مانگنے والے کو بسا اوقات کئی کئی بار دوڑاتا اور پلٹاتا ہے، لیکن یہی شخص سینما، ٹیلی ویژن، شراب، بدکاری اور مقدمے بازی وغیرہ کے جال میں پھنسا ہے تو اپنا مال بے تحاشا خرچ کرتا ہے اور اس سے کسی قسم کی ہچکچاہٹ اور تردد کا ظہور نہیں ہوتا۔'' (احسن البیان)

جبکہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کی بر وقت سنت نبویؐ کے مطابق ادائیگی سے مخلص نمازی ایسی تمام برائیوں اور بے حیائیوں سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے بچ نکلتا ہے اور اس کے انعام و اکرام سے مزید بہرہ ور ہوتا ہے۔ تو اسے یہ خوشخبری ملتی ہے۔

﴿وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾

''اور بلاشبہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔''

﴿وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾

''اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو (وہ تمہارے ہر ہر عمل سے آگاہ ہے)۔''

اقامتِ صلوٰۃ پر گفتگو کو مزید آگے بڑھاتے ہیں، مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''سورۂ فاتحہ کے بعد بندہ قرآن مجید کی کوئی سورت یا اس کا کوئی حصہ پڑھتا ہے، قرآن

مجید کا کوئی حصہ بھی پڑھا جائے، یہ اس کتاب کا اعجاز ہے کہ اس کے ہر حصے میں وہ اصل چیز موجود ہوتی ہے جس کی تعلیم و دعوت کے لیے قرآن اترا ہے، اللہ تعالیٰ کی صحیح تعریف، زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ، آخرت کا بیان اور جزا و سزا کا ذکر اس کے ہر حصے میں ملے گا، اسلوب اور انداز بیان بدلے ہوئے ہوں گے، کہیں ایک بات قانون کی شکل میں ہو گی، کہیں موعظت کی شکل میں، کہیں قصہ کی شکل میں، کہیں تمثیل کے پیرایہ میں، کہیں دھمکی کا انداز ہوگا، کہیں پیار و محبت کا، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھا یا سنا جائے، خواہ تین آیتوں کے بقدر ہی سہی اور آدمی کے سامنے نہایت موثر اور دل نشین انداز میں اس حقیقت کی یاد دہانی نہ ہو جائے جو اس کی زندگی کے رخ کو صحیح رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

اس کے بعد رکوع و سجود کی تسبیحات ہیں، ان تسبیحات میں بندہ اپنے رب کا ہر عیب سے پاک ہونا اور اس کا سب سے بڑا ہونا اور اس کی پاکی اور بڑائی کا عملی اعتراف و اظہار اس طرح کرتا ہے کہ پہلے اُس کے آگے زمین کے قریب تک جھک جاتا ہے اور پھر اپنی پیشانی اور اپنی ناک اس کے سامنے زمین پر رکھ دیتا ہے۔

خاتمۂ نماز پر بیٹھ کر بالعموم تین دعائیں پڑھی جاتی ہیں: التحیات، درود شریف اور استغفار۔ ان تینوں دعاؤں میں بندہ تین سب سے بڑے حقوق ادا کرتا ہے، بندہ پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے۔ اس لیے پہلے التحیات میں وہ اس کے حضور میں سلامی اور نیاز کا تحفہ پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی نبی ﷺ اور اس کے نیک بندوں پر بھی سلام و رحمت بھیجتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا حق نبی ﷺ کا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے ازواج و ذریات پر درود و سلام بھیجتا ہے۔

اس کے بعد ماں باپ، قرابت مندوں اور دوسرے دینی بھائیوں بہنوں کے حقوق ہیں، چنانچہ آخر میں ان سب کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور اس کے بعد سلام پر اپنی نماز

ختم کرتا ہے۔

نماز مؤثر واعظ اور زاجر:

یہ نماز کی وہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں جن کا ملحوظ رہنا نماز کی صحت اور اس کی افادیت کے لیے ضروری ہے، یہ نماز اگر ایک شخص دن رات میں پانچ مرتبہ پڑھتا ہے تو یہ ایک نہایت مؤثر واعظ اور زاجر ہے، اس کو بے حیائی اور برائی سے روکنے کے لیے، چنانچہ اس بنیاد پر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ﴾ (العنکبوت:۲۹/۴۵)

''یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔''

'روکتی ہے' کا مطلب یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں پانچ مرتبہ آدمی کی زندگی کے رخ کو صحیح کرنے کے لیے یاد دہانی کرتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یاد دہانی نہایت موثر یاد دہانی ہے، بشرطیکہ آدمی نماز کو نماز کی طرح پڑھے اور نماز جو تذکیر کرتی ہے آدمی اس کو قبول کرے، اگر وہ نماز کو محض ایک رسم بنا کے رکھ دے۔ اس کے اندر اٹھنا بیٹھنا محض ضابطہ کی خانہ پری رہ جائے اور اس کی دعائیں بے سمجھے بوجھے منتر کی طرح پڑھی جانے لگیں تو پھر نماز ایک بالکل بے معنی اور بے مقصد چیز بن کے رہ جائے گی۔

نماز کی آفات

چند بیماریاں اور ان کا علاج:

اوپر کی تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہے کہ تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے نماز کی کیا اہمیت ہے اور وہ کون سی نماز ہے جو آدمی کو درست رکھتی ہے، لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی اگر ہم یہ نہ بتائیں کہ نماز کی وہ بیماریاں کیا ہیں جو اس کو بالکل بے مقصد اور بے معنی بنا کے رکھ دیتی ہیں اور ان بیماریوں کا علاج کیا ہے؟ اب ہم مناسب ترتیب کے ساتھ نماز کی چند معروف بیماریوں کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی، اپنے علم کی حد تک ان کا علاج بھی بیان کریں گے۔

۱۔ کسل:

نماز کو برباد کرنے والی سب سے عام آفت کسل اور سستی ہے۔ یہ بیماری جب کسی شخص کو لاحق ہوجاتی ہے تو نہ وہ وقت کی پابندی برقرار رکھ سکتا ہے، نہ جماعت کا اہتمام قائم رکھ سکتا ہے اور نہ نماز میں حضورِ قلب کی کیفیت پیدا کرسکتا ہے۔ ایسا شخص اول تو آہستہ آہستہ سرے سے نماز غائب ہی کر دیتا ہے، لیکن پڑھتا ہے تو اس طرح کہ اُس کی نماز ان تمام اوصاف سے خالی ہونے کے سبب سے، جو نماز میں اثر پیدا کرتے ہیں، بالکل بے جان اور بے روح ہوتی ہے، اس کسل کا سبب ظاہر میں کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ کبھی نیند ہوتی ہے، کبھی مشغولیت ہوتی ہے اور کبھی بعض دنیوی دلچسپیاں ہوتی ہیں، لیکن اگر معاملہ کی تہہ میں اتر کر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ اسباب محض ظاہری اسباب ہیں، اس کا حقیقی سبب درحقیقت ان ظواہر میں نہیں بلکہ دل کے اندر ہے۔

ایک کسل تو وہ ہے جو طبیعتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ نیند، تکان اور مشقت طلب مشغولیتیں مستعد سے مستعد آدمی کے اندر بھی کچھ نہ کچھ سستی پیدا کر دیتی ہیں، اس سستی پر ارادہ کی تھوڑی سی تربیت سے انسان آسانی سے قابو پالیتا ہے، لیکن ایک سستی وہ ہوتی ہے جو نفاق کا نتیجہ ہوتی ہے اس کا علاج مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے، قرآن نے سورۂ نساء میں اس کا ذکر کیا ہے:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (النساء:۴/۱۴۲)

”یہ منافق (اپنے لغو خیال میں) اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکا میں ڈال رکھا ہے، جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کاہلی سے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔“

جہاں تک نفاق کا تعلق ہے اس کا ذکر تو آگے اپنی جگہ پر آئے گا لیکن نماز کے سلسلہ میں عام کسل کو دور کرنے کے لیے چند چیزیں مفید ہیں، اُن کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں۔

نماز کی دین میں اہمیت:

پہلی چیز یہ ہے کہ نماز کی دین میں جو اہمیت ہے، آدمی اپنے دل میں اس کو اچھی طرح جمائے، نماز ایمان کا پہلا مظہر ہے، ایمان سے پہلی چیز جو پیدا ہوتی ہے وہ نماز ہے اور پھر نماز ہی سے سارا دین پیدا ہوتا ہے، دین جن ستونوں پر قائم ہے، ان میں ایمان کے بعد سب سے پہلا ستون یہی ہے، اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس ستون کو ڈھا دے تو اس نے درحقیقت پورے دین کو ڈھا دیا، صحابۂ کرامؓ کفر اور ایمان کے درمیان نماز ہی کو حدّ فاصل سمجھتے تھے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں اور عمّال کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ تمہاری سب سے بڑی ذمہ داری نماز کا قیام واہتمام ہے، جو شخص نماز کو ضائع کر دے گا، وہ بقیہ دین کو بدرجہ اولیٰ ضائع کر دے گا، دین کا منبع اور سرچشمہ چونکہ نماز ہی ہے اس وجہ سے دین کی حفاظت میں اس کو سب سے زیادہ دخل ہے، اسی چیز کے اہتمام سے آدمی اپنے پورے دین کی حفاظت کرتا ہے اگر اس میں سست پڑ جائے یا اس کو ضائع کر دے تو پھر وہ دین کی ساری حدیں توڑ کے رہتا ہے اور اپنی باگ شہوات کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، اہل کتاب کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوات میں پڑ گئے۔ اس ذیل میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دین میں ہر چیز کا ایک مقام ہے اور یہ مقام خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے، جو چیز ستونِ دین کی حیثیت رکھتی ہے، وہ بہرحال ستونِ دین ہے جب تک اس کو قائم نہ کیا جائے گا دین کو قائم نہیں کیا جا سکتا، اگر کوئی شخص نماز کو قائم نہ کرے اور بزعم خویش دن رات اسلام کی خدمت میں لگا رہے تو اقامتِ دین کے نقطۂ نظر سے اس کی ساری کوشش لاحاصل رہے گی کیونکہ وہ ایک عمارت بغیر بنیاد کے بنا رہا ہے۔ جس طرح ایک عمارت میں بنیاد کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی اس طرح دین میں نماز کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی، اس حقیقت کو حدیث میں یوں سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے نوافل کو اس وقت تک قبول نہیں فرماتا جب تک وہ فرائض نہ ادا کرے۔

دوسری چیز جو اس کسل کو توڑنے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ''سعی اِلی ذِکر اللہ'' کا عادی بنائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اذان کو اللہ کی پکار سمجھے اور جونہی کانوں میں اذان کی پکار پڑے، سارے کام چھوڑ کر نماز کا اہتمام اور مسجد جانے کی تیاریوں میں لگ جائے، اس اہتمام اور تیاری کا انداز کسل مندانہ نہ ہو، بلکہ ایک مستعد اور چاق و چوبند آدمی کا ہو، جس طرح ایک فرماں بردار غلام آقا کے حکم کے لیے گوش بر آواز رہتا ہے اور اس کی پکار سنتے ہی دوسرے سارے دھندے چھوڑ چھاڑ کر تعمیلِ حکم کے لیے حاضر ہو جاتا ہے، اسی طرح آدمی کو چاہیے کہ اذان کی آواز سنتے ہی نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہو، یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ نماز کے وقت سب سے زیادہ ضروری، سب پر مقدم اور سب سے اہم فرض اللہ تعالیٰ کے نزدیک نماز ہی ہے، اضطرار اور مجبوری کے حالات کے سوا کوئی دوسرا کام، خواہ وہ دین ہی کا کام ہو، اس پر مقدم نہیں ہو سکتا، آدمی اگر کچھ عرصہ اذان کے سنتے ہی دوسرے سارے دھندوں کو چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہونے کی عادت ڈالے تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو اس کی ایک محبوب عادت بنا دے اور نماز کے معاملہ میں اس کی یہ کسل کی بیماری دور ہو جائے۔

نیند سے جو کسل پیدا ہوتا ہے، اس کا بہترین علاج نبی کریم ﷺ نے بیان فرما دیا ہے، نیند اس وقت تک تو بلاشبہ بہت بھاری چیز ہے جب تک آدمی بستر پر پڑا اینڈتا رہے، لیکن جب ایک مرتبہ ہمت کر کے بستر چھوڑ دے، کچھ اللہ کو یاد کرے، پھر وضو کرے اور نماز پڑھ لے تو درجہ بدرجہ وہ سستی کی بدحالی سے نکل کر خوشی و نشاط کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کو سونے کی حسرت نہیں رہ جاتی، بلکہ اگر حسرت ہوتی ہے تو اس بات کی کہ وہ جاگنے کی یہ لذت و راحت اس سے پہلے کیوں نہ حاصل کر سکا، یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ آدمی نماز کے لیے اپنی نیند قربان کر کے کبھی پچھتائے گا نہیں، تھوڑے ہی عرصہ کی مشق کے بعد جاگنے کے بعد کی لذت کی یاد طبیعت پر اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ وہ گہری سے گہری نیند سے بھی آدمی کو اٹھا کھڑا کرتی ہے۔

کلمۂ طیبہ کے صدقِ دل سے اقرار کے بعد سب سے پہلی بات جس کا رب کریم نے حکم دیا ہے وہ قیامِ صلوٰۃ ہے، یعنی دن رات کے اوقات میں پانچ بار سنت نبوی ﷺ کے مطابق با جماعت نماز کا ادا کرنا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ﴾ (طٰہٰ:۲۰/۱۴)

''بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا عبادت کے لائق اور کوئی نہیں، پس تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ (جو اللہ تعالیٰ کی یاد میں زندگی گزارتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی یاد (یعنی اس کی حفاظت اور نگہبانی فرماتا ہے)''

حقیقت یہ ہے کہ جنہوں نے اپنے نفس کو اخلاقِ رذیلہ اور دلوں کو شرک و معصیت اور کفر و حسد جیسی آلودگیوں سے پاک وصاف کرلیا اور اس عارضی زندگی میں اپنے رب کو یاد کرتے رہے اور نماز پڑھتے رہے، وہی حیات جاوداں سے بہرہ ور ہوئے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ○ وَ ذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی﴾ (الاعلیٰ:۸۷/۱۴-۱۵)

''بلاشبہ کامیاب تو وہ ہوا جس نے اپنا تزکیۂ نفس کیا، اپنے رب کا نام یاد رکھا اور نماز پڑھتا رہا۔''

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر درماندہ جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون و اطمینان کی راحت اس کو صرف اُسی ایک قادرِ مطلق کی پکار، دعا اور التجا میں ملتی ہے، وحی الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُہُمۡ بِذِکۡرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ﴾

(الرعد:۱۳/۲۸)

''جو لوگ ایمان لائے، ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں، یاد رکھو! اللہ ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ مصیبت کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثباتِ قدم اور دعا ہی چارۂ

کار بنتے ہیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَاسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ (البقرة:٢/٤٥)

''صبر اور نماز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرو۔'' (سیرت النبی ج:٥)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''صبر اور نماز ہر اللہ والے کے دو بڑے ہتھیار ہیں۔ نماز کے ذریعے ایک مومن کا رابطہ و تعلق اللہ تعالیٰ سے استوار ہوتا ہے، جس سے اسے اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت حاصل ہوتی ہے، صبر کے ذریعے سے کردار کی پختگی اور دین میں استقامت حاصل ہوتی ہے اور نماز اسے جلا (روشنی) بخشتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

((اِذَا حَزَبَهٗ أَمْرٌ فَزِعَ اِلٰی الصَّلٰوةِ))

''نبی ﷺ کو جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آتا، آپ فوراً نماز کا اہتمام کرتے۔''

(احمد، ابوداود، بحواله احسن التفاسیر)

غور کیجیے تو زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ ربِ کائنات کے سامنے سرنگوں ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند پرند سب اس کے آگے سربسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام وقوانین کی بے چون و چرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی ان کی تسبیح ونماز ہے:

﴿وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾

(بنی اسرائیل:١٧/٤٤)

''(ارض وسما کی) ایسی کوئی چیز نہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ اسے یاد نہ کرتی ہو، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ان کی تسبیح سمجھ نہیں سکتے۔''

انسان کی حیثیت تو اس کائنات میں گل سرسبد کی ہے، اسے تو اللہ تعالیٰ نے خلافت کا نظام سونپا ہے اور شکل وصورت، عقل وفکر میں سب سے اعلیٰ اور اشرف بنایا ہے، یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ نہ صرف احکامِ الٰہی کو اس کرۂ ارض میں جاری وساری کرے، بلکہ اس انعامِ عظیم کی بنا پر سراپا اس خالق و مالک کا شکر گزار بن کر رہے۔

گزشتہ درس میں مولانا امین احسن اصلاحی کے قیمتی مضمون نماز کی آفات پر بات چیت ہو رہی تھی، ہم اسے آگے بڑھاتے ہیں، نماز کی آفات کے سلسلہ میں پہلی بات ''کسل'' پر گفتگو ہو چکی یہاں دیگر نکات پر بات کی جاتی ہے۔

۲- وسوسہ:

نماز کی دوسری عام آفت ''وسوسہ'' ہے۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہی آدمی کے ذہن پر وسوسوں اور پراگندہ خیالات کا ہجوم ہوتا ہے، جس طرح برسات کی بھیگی ہوئی راتوں میں کسی لیمپ پر پتنگوں کا ہجوم ہوتا ہے، جو بات کبھی بھی یاد آنے والی نہ ہو، وہ بھی نماز میں یاد آ جائے گی اور پھر اسی ایک بات سے سینکڑوں باتیں پیدا ہو جائیں گی۔ بعض لوگ اس صورت حال سے بہت بددل اور پریشان ہو جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ خاص ان کے اپنے دل کی خرابی ہے کہ اس طرح کے وسوسے سے پیدا ہو رہے ہیں، ورنہ نماز میں یہ بات نہیں ہونی چاہیے، ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے، جہاں تک نماز میں وسوسہ پیدا ہونے کا تعلق ہے اس سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی نماز سے جتنی محبت ہے، شیطان کو اس نماز سے اتنی ہی دشمنی ہے، اس طرح سے آدمی جب نماز شروع کرتا ہے تو ابلیس کے کارندوں اور ایجنٹوں کی وسوسہ اندازی کا حملہ سب سے زیادہ سخت انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو اس کے مقابل میں قوتِ ایمانی کا ثبوت دیتے ہیں، ان لوگوں کے لیے شیطان کو کچھ زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، جو ان وسوسوں ہی کو غذائے روحانی سمجھتے ہیں، اگر شیطان ایک وسوسہ پیدا کرتا ہے تو وہ خود ''واہمہ'' کی خلاقی سے اس میں دس کا اور اضافہ کر لیتے ہیں۔

ان وسوسوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے تین باتیں مفید ہیں۔

ایک عام بات تو یہ ہے کہ آدمی جس وقت یہ حالت محسوس کرے، شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور اس آدمی کی طرح اپنی نماز کی حفاظت اور تکمیل کے لیے مستعد ہو جائے جس کو دشمن کے حملہ کی اطلاع ہو چکی ہو اور اس نے یہ عزم کر لیا ہو کہ وہ دشمن کے علی الرغم

اپنی نماز پوری کر کے رہے گا اور ان وسوسہ اندازیوں کی کوئی پروا نہیں کرے گا۔ آدمی کی یہ مستعدی ہی بسا اوقات شیطان کے سارے طلسم کو باطل کر دیتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نماز کے کلمات صرف اپنے جی ہی میں نہ پڑھے بلکہ اس طرح پڑھے کہ وہ خود ان کو سن سکے اور ان کے معانی پر دھیان کر سکے۔ البتہ احتیاط ضروری ہے کہ اس سے دوسرے پاس کھڑے ہونے والے کی نماز میں خلل واقع نہ ہو۔ یہ چیز وسوسہ کو دور کرنے میں بہت مددگار ہوتی ہے۔ جب آدمی کا ذہن معانی کے پیچھے لگ جاتا ہے تو وسوسوں کی وادیوں میں بھٹکنے سے بہت بڑی حد تک محفوظ ہو جاتا ہے۔

تیسری چیز، جو سب سے زیادہ مفید اور کارگر ہے، یہ ہے کہ آدمی اپنی عام زندگی میں اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ اور بلند رکھنے کی کوشش کرے۔ وہ ہمیشہ ایسی چیزیں سوچے جو اس کے لیے بھی دین و دنیا میں نافع ہوں اور دوسروں کو بھی نفع پہنچانے والی اور ترقی دینے والی ہوں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کے ذہن کی چکی ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ اگر آدمی اس میں صاف ستھرا غلہ ڈالتا رہتا ہے تو وہ اس صاف ستھرے غلہ کو پیستی رہتی ہے اور اس سے نہایت عمدہ آٹا برآمد ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس شیطان کی وسوسہ اندازیاں ہیں۔ وہ موقع پاتے ہی اپنے کنکر پتھر کی مٹھی بھر کر اس میں جھونک دیتا ہے اور یہ چکی اس کو دلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ چیز چکی کے نظام کو بالکل درہم برہم کر دیتی ہے۔ یہ حادثہ اگر بار بار پیش آنے لگے تو چکی اس قدر خراب ہو جاتی ہے کہ اس میں اچھا آٹا تیار کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ عمدہ سے عمدہ گندم بھی اس میں ڈالیے تو بھی آٹا کرکرا ہی نکلے گا۔

جو آدمی اپنے ذہن میں اچھے خیالات کی پرورش کا عادی ہو جاتا ہے نماز میں اس کو وسوسے کم لاحق ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جس طرح کے خیالات سے مانوس ہوتا ہے اسی طرح کی روحانی غذا اس کو نماز میں بھی مل جاتی ہے اور اگر کچھ خیالات پیدا ہوتے ہیں تو وہ ایسے پست نہیں ہوتے کہ نماز کے بلند مقصد سے بالکل بے جوڑ ہو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحب حضور و شہود کی نماز میں بھی کبھی کبھی خارجی حالات خلل انداز ہو ہی جاتے

تھے۔ کبھی کبھی عین حالت نماز میں ان کا ذہن ایران و شام میں لڑنے والی فوجوں کی ترتیب میں مشغول ہو جاتا تھا۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی تو ایک قسم کا کھو جانا ہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بھی ایک قسم کا کھو جانا ہی ہے لیکن بڑا فرق ہے اس کھو جانے میں جو کسی غیر کی گلی میں ہو اور اس کھو جانے میں جو اسی کے کوچے میں ہو جس کے در کی تلاش ہے۔

اس وسوسہ ہی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں کو نہ اپنی طہارت پر اعتماد ہوتا ہے، نہ وضو پر اور نہ نماز پر۔ وضو کے لیے بیٹھیں گے تو ہاتھ دھونے ہی پر لوٹے کے لوٹے پانی کے بہا دیں گے لیکن انھیں اطمینان نہیں ہو گا کہ ہاتھ دھویا گیا۔ نماز کے لیے کھڑے ہوں گے تو بار بار نیت باندھیں گے اور توڑیں گے لیکن ان کی نیت ہے کہ کسی طرح بندھنے ہی میں نہیں آتی۔

یہ ایک سخت قسم کی ذہنی بیماری ہے۔ جس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اس کو بیماری سمجھے اور اپنی طبیعت کی اصلاح کی فکر کرے۔ بعض لوگوں کو یہ بیماری شک کے راستہ سے لاحق ہوتی ہے، ان کو اپنا ہر کام مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اسلامی شریعت کا یہ اصول اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ دین کے معاملات میں گمان غالب کافی ہے۔ اگر ایک کام کے متعلق ہمارا گمان یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہو گیا تو ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس سے زیادہ اس کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض لوگوں کو یہ بیماری احتیاط اور تقویٰ میں غلو کے سبب سے لاحق ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اسلامی شریعت کے مزاج سے واقف کرنا چاہیے کہ یہ شریعت سہل ہے اور اللہ اور رسول کو یہ بات پسند ہے کہ بندہ تشدد پسندی سے بچے اور اپنے لیے معتدل راہ کا انتخاب کرے۔ جو شخص اپنی تشدد پسندی کی وجہ سے دین سے دھینگا مشتی شروع کر دیتا ہے، بالآخر وہ شکست کھا جاتا ہے۔

مدّعا سے بے خبری:

تیسری آفت مدعا سے بے خبری ہے۔ اس زمانہ میں عوام کا بہت بڑا طبقہ ایسے لوگوں پر

مشتمل ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے سرے سے جانتے ہی نہیں کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں۔ اس میں کس بات کا اقرار اور کس بات کا انکار کرتے ہیں۔ وہ نماز کے الفاظ کو منتروں کی طرح پڑھتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ خواہ ہم ان کے معنی مطلب سمجھیں یا نہ سمجھیں یہ منتر کارگر ہو کے رہیں گے۔ ان کے نزدیک سارا جادو بس ان الفاظ میں ہے۔ اگر الفاظ الٹے سیدھے زبان سے ادا ہو گئے تو تیر نشانہ پر لگ گیا۔

دوسرے بہت سارے لوگ ہیں جو ان الفاظ کے معنی سے تو بے خبر نہیں ہیں لیکن یا تو غفلت کے سبب سے دھیان نہیں کرتے یا دھیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہ جس طرح قرآن کی تلاوت محض بطور تبرک کرتے ہیں اسی طرح نماز میں اس کی دعائیں بطور تبرک پڑھ لیتے ہیں۔

یہ صورت حال خواہ جہالت کے سبب سے ہو یا غفلت اور غلط فہمی کے سبب سے نماز کو بالکل بے اثر اور بے مقصد بنا کر رکھ دیتی ہے۔ کم از کم تزکیۂ نفس کے نصب العین کو تو اس نماز سے مشکل ہی سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں، وہ کم از کم ان سورتوں اور دعاؤں کے معنی مطلب تو ضرور سیکھ لیں جو عموماً نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ کام تھوڑی سی محنت اور بہت معمولی اہتمام سے ہر شخص کر سکتا ہے۔ جو لوگ اتنا بھی نہیں کر سکتے، نہ وہ نماز کی اہمیت سے واقف ہیں نہ دین کی اہمیت سے۔

رہے وہ لوگ جو عربی زبان سے واقف ہیں یا کم از کم نماز کی دعاؤں کی حد تک واقف ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز میں جو کچھ سنیں یا پڑھیں اس کے لفظ لفظ کے معنی پر دھیان کریں۔ آدمی کا ذہن اگر کسی چیز پر جمنے اور غور کرنے کا عادی نہ ہو تو شروع شروع میں وہ اس میں مشقت اور اجنبیت محسوس کرتا ہے لیکن یہ محض عادت کی خرابی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذہن کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے بنایا ہے، ہرزہ گردی کے لیے نہیں بنایا ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ اس راہ پر لگایا جائے تو تھوڑی سی محنت سے لگ جاتا ہے اور جب

لگ جاتا ہے تو پھر اس سے الگ ہو کر وہ زندگی میں کوئی لذت ہی محسوس نہیں کرتا۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ جب ایک ہی طرح کی دعائیں اور سورتیں ہر نماز میں پڑھی جاتی ہیں اور وہ معلوم ہیں تو پھر ان پر ہر روز اور ہر وقت غور کرنے کی کیا ضرورت ہے، ایک مرتبہ جب اس کو سمجھ لیا تو یہ کافی ہے؟ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں، وہ نماز کی اور نماز کی دعاؤں کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ نماز معلومات کے اضافہ کے لیے نہیں پڑھی جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد کی تجدید، اس سے رہنمائی اور استعانت کی طلب اور توبہ و استغفار کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ یہ مقصد آخر بے سمجھے بوجھے الفاظ دہرا دینے سے کس طرح حاصل ہو سکتا ہے، جبکہ آدمی کا ذہن اور دماغ حاضر نہ ہو؟ پھر یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے کہ نماز میں ایک ہی طرح کی چیزوں کا بار بار اعادہ ہے۔ نماز میں نئے نئے انکشافات بھی ہیں اور ان انکشافات کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے لیکن یہ انکشافات تہجد کی نماز میں ہوتے ہیں بشرطیکہ آدمی تہجد، اس کی شرائط کے ساتھ ادا کرے اور اس کو قرآن مجید یاد ہو۔

چوری:

نماز میں ایک حادثہ چوری کا بھی پیش آیا کرتا ہے۔ یہ چوری شیطان نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات نماز پڑھنے والا خود کرتا ہے اور کہیں باہر جا کر نہیں کرتا بلکہ خود اپنی نماز کے اندر کرتا ہے۔ آپ متعجب ہوں گے کہ وہ کس طرح؟ وہ اس طرح کہ بعض لوگ وضو اور نماز میں اتنی جلد بازی کرتے ہیں کہ وہ ان کے کسی رکن کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے۔ ہاتھ دھوئیں گے تو کہنیاں چھوڑ جائیں گے۔ پاؤں دھوئیں گے تو ایڑیاں خشک رہ جائیں گی۔ نماز میں کھڑے ہوں گے تو اس طرح کہ ابھی برابر کھڑے بھی نہیں ہوئے کہ رکوع کے لیے جھک پڑے۔ رکوع میں گئے تو سر ابھی کمر کے برابر ہوا بھی نہیں کہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رکوع سے اٹھ کر ابھی کمر سیدھی بھی نہ ہونے پائی کہ دوسرے سجدے کے لیے جھک گئے۔ قعدہ میں بیٹھیں گے تو معلوم ہوگا کہ جلتے توے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ غرض وہ اپنی نماز کے ہر حصہ میں سے کچھ نہ کچھ دبا لیں گے۔

اس بیماری کے عموماً دو سبب ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ بعض لوگ فطری طور پر جلد باز ہوتے ہیں۔ وہ ہر کام کو جلدی جلدی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور تربیت سے محروم ہونے کے باعث یہی طریقہ وہ نماز میں بھی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ بتانا چاہیے کہ نماز کے ہر کام میں وقار اور متانت شرط ہے۔ اس کے بغیر نماز بالکل بے برکت ہو جاتی ہے۔ عام طور پر بچپنے میں جو غلط عادت پڑ جایا کرتی ہے وہ آخر دم تک قائم رہتی ہے، اس وجہ سے بچوں کی ابتدائی تربیت ہی میں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ نہ تو وہ زندگی کے عام حالات میں جلد باز ہوں اور نہ نماز میں۔ خصوصاً نماز میں جلد بازی کی خرابیاں اچھی طرح ان کے ذہن نشین کی جائیں۔

اس کا دوسرا سبب دل کی خرابی ہے۔ بعض لوگ مارے بندھے مسجد میں آتے ہیں۔ ان کے لیے مسجد ایک قید خانہ ہوتی ہے۔ وہ آتے ہی یہ چاہتے ہیں کہ کب اس جیل سے چھوٹیں اور اپنے ذوق کی دلچسپیوں میں منہمک ہوں۔ اس بد ذوقی کی وجہ سے نماز ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا علاج مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے۔ جب تک ان کے ذہن تبدیل نہ ہوں، جب تک یہ دین کی اہمیت اور دین کے اندر نماز کے مرتبہ اور مقام کے قائل نہ ہونا، اس وقت تک محض تعدیل ارکان کی تاکید سے ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ نماز پیدا ہوتی ہے ایمان سے۔ اگر کوئی شخص ایمان کی لذت ہی سے آشنا نہ ہو تو وہ اس نماز کے لیے بھلا کیا اہتمام کرے گا جو اس نے محض اوپر سے چپکا لی ہو یا اس کے اوپر چپکا دی گئی ہو؟

<u>ریا:</u>

نماز کی سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ خطرناک آفت ریا ہے۔ عام اس وجہ سے کہ اس کی اتنی مخفی قسمیں ہیں کہ محتاط سے محتاط آدمی بھی بعض اوقات اس کی بعض قسموں کے حملہ سے اپنی نماز کو بچا نہیں سکتا اور خطرناک اس وجہ سے کہ نماز کے لیے اخلاص شرط ہے اور ریا اخلاص کے منافی ہے۔ ان دو باتوں کے سبب سے جو شخص اپنی نماز کو ریا سے

پاک رکھنا چاہے اس کو مسلسل ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

علاج:

میرے نزدیک اس بیماری کے علاج کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ آدمی ریا کی مختلف شکلوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء العلوم اور اس طرح کی بعض دوسری کتابوں کا مطالعہ ریا کی اقسام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے نہایت مفید ہے۔ ایک چیز سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد ہی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آدمی اس کو پکڑ سکے اور اگر چاہے تو اس کی اصلاح کر سکے۔ یہ واقفیت عام لوگوں کے لیے جس قدر ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری علمائے دین اور اہل تقویٰ کے لیے ہے کیونکہ ریا دنیا داری کے بھیس میں کم آتی ہے، یہ دین داری کے جامہ میں زیادہ آتی ہے اور ایسی ایسی پرفریب شکلوں میں آتی ہے کہ بڑے بڑے عالمانِ دین اور بڑے بڑے مشائخِ وقت اس کے چکمے میں آ جاتے ہیں اور اس کے پیچھے بسا اوقات اپنے زہد و ریاضت کی زندگی بھر کی پونجی گنوا بیٹھتے ہیں۔

دوسری چیز جو اس کے لیے مفید ہے وہ تہجد کی نماز ہے۔ یہ نماز شب کی تنہائی میں پڑھی جاتی ہے اور نفس کے لیے نہایت سخت ہے اور اس کو مخفی رکھنے کی بھی تاکید ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ محض دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں وہ اس کی ہمت نہیں کر سکتے۔ اس کی ہمت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یا تو بے ریا ہوں یا ریا کے فتنوں سے واقف ہوں اور اس سے اپنے آپ کو بچانے ہی کے لیے تہجد کے گوشۂ خلوت میں آ کے چھپے ہوں۔ یہ نماز ریا کا سب سے زیادہ مفید علاج ہے، بشرطیکہ آدمی اس کی رازداری کو قائم رکھ سکے۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں بھی ریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو خود مختلف پردوں میں اپنی شب بیداری اور تہجد خوانی کا اشتہار دیتے ہیں یا ان کے شاگرد اور مرید حضرات یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ نماز اس مقصد کے لیے نہ صرف یہ کہ کچھ مفید نہیں رہ جاتی بلکہ کچھ مزید ریا پرور بن جاتی ہے۔

نماز کے فتنوں میں سے یہ چند بڑے بڑے فتنے بیان ہوئے ہیں۔ اگر آدمی ان سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے تو دوسرے فتنوں پر قابو پانے کی صلاحیت بھی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی نماز فی الواقع اس کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کی طمانیت اور روح کا سرور بن جاتی ہے۔

آیت مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں:

۱) نماز بندوں اور رب کے درمیان پاکیزہ رابطہ ہے، وہ نماز کی ہر رکعت میں اپنے مولا و مالک کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں، اس کی ربوبیت و رحمت کا اقرار کرتے ہیں، راہ ہدایت پر استقامت طلب کرتے ہیں، نیک اور سعادت مند لوگوں کے راستے پر چلنے کا عزم کرتے ہیں اور اس بات کی توفیق بھی اپنے رب ہی سے مانگتے ہیں، وہ لوگ جو راہ حق سے بھٹک گئے اور جن پر مسلسل نافرمانیوں کی وجہ سے اللہ کا غضب نازل ہوا، ایسے تمام لوگوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور اس مالک سے فریاد کرتے ہیں کہ وہ ان کے طریق کار سے انہیں محفوظ رکھے، اب غور کیجیے کہ عجز و خاکساری سے یہ دعا اور التجا بندے اس خالق و مالک سے کرتے جو ہر بات پر قادر ہے، وہ انہیں اپنی رحمت سے نیکیوں پر استقامت عطا فرماتا ہے۔ وہ انہیں زندگی کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

۲) ضروری ہے کہ بندے پانچ وقت پورے آداب کے ساتھ نماز قائم کریں۔ جس میں پہلی بات اخلاص ہے کہ خالصتہً اللہ کی رضا کے لیے اس کے آگے جبین نیاز کو جھکایا جائے، دوسری بات جسم ولباس کی طہارت ہے، تیسری بات توجہ ہے اور اس طرح کہ جو کچھ پڑھا جائے وہ آپ کے علم میں ہو کہ اپنے مالک کے حضور کیا کہہ رہے ہیں، چوتھی بات اوقات کی پابندی ہے، جونہی مالک کی طرف سے بلاوا آئے اور حیّ علی الصلوۃ کی آواز کان میں پڑے فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کر 'لبیک' کہتے ہوئے اس علیم وقدیر کے در پر حاضر ہو جائیں اور باجماعت نماز ادا کریں۔ پانچویں بات تعدیلِ ارکان ہے، یعنی رکوع وسجود، قیام وقعود کو اطمینان اور سکون سے

ادا کیا جائے۔ چھٹی بات سنت نبویؐ کے مطابق نماز کو ادا کیا جائے، ساتویں بات دوام ہے، یعنی پابندی سے پانچوں نمازیں ادا کی جائیں، یہ نہ ہو کہ فجر کی نماز ادا کر لی اور بقیہ نمازوں سے فارغ ہو گئے، یا کبھی اپنی مرضی سے کوئی سی نماز پڑھ لی کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ جب تک ہر نماز پابندیِ وقت سے ادا نہ ہو، دل بے قرار اور بے چین رہے، آٹھویں بات رزقِ حلال کا حصول اور لوگوں کے حقوق کی پاسبانی ہے، رزق حاصل کرنے کے ذرائع بھی صاف ستھرے ہوں اور جو رزق آپ کھا رہے ہیں وہ بھی طیب اور حلال ہو، اسی طرح والدین کے حقوق، پڑوسیوں سے مروت، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت، یتیموں کی سرپرستی اور بیواؤں سے ہمدردی وغیرہ کا پورا پورا خیال رکھا جائے، اس سے دلوں میں نرمی اور گداز پیدا ہوتا ہے اور نمازوں میں نرم دلی، یعنی خشوع وخضوع کی ضرورت ہوتی ہے۔

عَنْ اَوْسِ بْنِ شُرَحْبِيْلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ: ((مَنْ مَّشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِّيُقَوِّيَهُ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهُ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَام

[مشکوۃ۔باب الظلم]

''سیدنا اوس بن شرجیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے کہ جو شخص ظالم کو ظالم جاننے کے باوجود اس کا ساتھ دے وہ اسلام سے نکل جاتا ہے''

اذن اور آداب مجلس رسول اللہ ﷺ

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاِذَا كَانُوۡا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمۡرٍ جَامِعٍ لَّمۡ يَذۡهَبُوۡا حَتّٰى يَسۡتَاۡذِنُوۡهُ﴾ (النور:٢٤/٦٢)

''مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو ان سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔''

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ مومن تو صرف، اَلَّذِيۡنَ وہ لوگ ہیں جو، اٰمَنُوۡا ایمان لائے (دل و جان سے یقین کیا) فعل ماضی جمع مذکر غائب، بِاللّٰهِ (بِ.اللّٰهِ) اللہ پر، وَ رَسُوۡلِهٖ (رَسُوۡلِ.هٖ) اور اس کے رسول پر، ہ کی ضمیرِ واحد مذکر رب کریم کی طرف جاتی ہے، وَاِذَا اور جب، كَانُوۡا وہ ہوتے ہیں، مَعَهٗ (مَعَ.هٗ) ساتھ، اُن کے (رسول اللہ ﷺ کے ساتھ)، عَلٰٓى اَمۡرٍ کسی ایسے معاملہ پر، جَامِعٍ جو جمع کرنے والا ہے (مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہے)، لَمۡ يَذۡهَبُوۡا تو نہیں جاتے، لَمۡ کی وجہ سے 'ن' جمع کا گر گیا، حَتّٰى يَسۡتَاۡذِنُوۡهُ یہاں تک کہ وہ اس (رسولؐ) سے اجازت مانگ لیں، ہٗ کی ضمیر واحد مذکر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے (اِسۡتَأۡذَنَ، يَسۡتَأۡذِنُ) اجازت چاہنا۔

رسول اللہ ﷺ کی مجلس کے آداب:

''مدینہ منورہ میں آ کر رسول اللہ ﷺ کو عام مجمعوں اور عام صحبتوں میں لوگوں سے ملنے

جلنے اور تعلیم و ہدایت پیش کرنے کا موقع ملا تو ان حالات میں مسلمانوں کو آپ ﷺ سے ملنے جلنے، بات چیت کرنے اور آپ ﷺ کی مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کے مخصوص طریقے بتائے گئے، مثلاً رسول اللہ ﷺ جب کسی مجمع میں عام خطبہ دیتے تھے یا کسی اہم اسلامی کام کے لیے مسلمانوں کو جمع کرتے تھے تو منافقین اس قسم کے مجمعوں سے خفیہ طور پر اٹھ کر چلے جاتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے منع کیا اور ان کو یہ حکم دیا کہ بغیر اجازت کے آپ ﷺ کی مجلس سے نہ اٹھیں۔" (تاریخ اخلاق اسلامی)

اس کے بعد اہل ایمان کا وصف اس طرح بیان ہوا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ فَاِذَا اسۡتَاۡذَنُوۡکَ لِبَعۡضِ شَاۡنِہِمۡ فَاۡذَنۡ لِّمَنۡ شِئۡتَ مِنۡہُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَہُمُ اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴾

(النور:٢٤/٦٢)

"(اے رسول ﷺ!) جو لوگ آپؐ سے اجازت مانگتے ہیں، وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں، تو جب وہ اپنے کسی کام کے لیے آپ سے اِذن مانگیں تو ان میں سے جسے چاہیں اجازت دیں (اور جسے چاہیں نہ دیں) اور ان کے لیے اللہ سے بخشش طلب کیجیے، اللہ تعالیٰ یقیناً بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

مجلس سے اٹھنے کے آداب:

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

"یعنی ایسے امور جن کا تعلق سب مسلمانوں سے مشترک ہو، جیسے جہاد یا مجلسِ مشاورت یا کوئی مشترکہ مفادات کے لیے اجتماع ہو، خواہ ایسی میٹنگ جنگ یا حالات جنگ سے تعلق رکھتی ہو یا حالت امن سے، مومنوں کا یہ کام نہیں کہ آپ سے اجازت لیے بغیر وہاں سے چل دیں، ہاں اگر انہیں کسی ضروری کام کی بنا پر اس مجلس و اجتماع کے اختتام سے پہلے واپس آنا ضروری ہو تو وہ اس مجلس سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں، اجازت لیے بغیر وہاں سے چلے نہیں آتے۔ اگر وہ اپنی کوئی ضرورت آپ سے بیان کریں

تو انہیں اجازت دینا آپ ﷺ کی صوابدید پر منحصر ہے اور اگر آپ یہ سمجھیں کہ اُس کا ذاتی کام اس اجتماعی مفاد کے مقابلہ میں کچھ اہمیت نہیں رکھتا تو بے شک آپ اجازت نہ دیں اور اگر آپ انہیں اجازت دے دیں تو ان کے لیے دعائے مغفرت بھی کیجیے، کیونکہ اپنی ذاتی غرض کی خاطر اجتماعی معاملات اور آپ ﷺ کی صحبت سے محروم رہنا حقیقتاً دنیا کو دین پر ترجیح دینے کے مترادف ہے، لہٰذا اگر کسی مخلص مومن کو اس کی التجا کی بنا پر آپ اجازت دے بھی دیں تو اس کے حق میں آپ کے استغفار کی برکت سے اس کی تقصیر کا تدارک ہو سکے گا۔

ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی واقعی ضرورت کے بغیر ایسی اجتماعی مفاد کی مجلس سے اجازت طلب کرنا قطعاً ناجائز ہے، علاوہ ازیں یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات یا آپ کی زندگی تک ہی محدود نہیں، بلکہ آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین یا کسی بھی اسلامی حکومت کے ایسے مشترکہ مفاد کی مجلس سے بلا اجازت چلے آنا آداب مجلس کے بھی خلاف ہے اور شرعاً ناجائز بھی ہے، مجلس کو چھوڑ کر جانے کا جواز صرف اسی صورت میں ہے کہ فی الحقیقت کوئی ضرورت لاحق ہو جس کی بنا پر امیرِ مجلس سے رخصت ہونے کی اجازت حاصل کی جائے اور اگر...... امیرِ مجلس اس کو اجازت دینے یا اس کے ذاتی کام کے مقابلہ میں اس کے شریکِ مجلس رہنے کو زیادہ اہم سمجھتا ہو اور وہ اجازت نہ دے تو کسی مومن کو اس سے کچھ شکایت نہیں ہونا چاہیے۔" (تیسیر القرآن)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو بلانے اور ان کی پکار پر جواب دینے کا ادب اس طرح بیان ہوا:

﴿لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَيۡنَكُمۡ كَدُعَآءِ بَعۡضِكُمۡ بَعۡضًا قَدۡ يَعۡلَمُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ يَتَسَلَّلُوۡنَ مِنۡكُمۡ لِوَاذًا فَلۡيَحۡذَرِ الَّذِيۡنَ يُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِهٖۤ اَنۡ تُصِيۡبَهُمۡ فِتۡنَةٌ اَوۡ يُصِيۡبَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ﴾ (النور:۶۳/۲۴)

"ایسا نہ سمجھ لو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے چپکے سے کھسک جاتے ہیں، لہٰذا جو لوگ رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں اپنی

انہیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں یا انہیں کوئی درد ناک عذاب پہنچ جائے۔''

رسول اللہ ﷺ کا ادب واحترام:

﴿لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا﴾ اس جملہ کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں درست ہیں، ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے نہ بلایا کرو، جیسے تم ایک دوسرے کو بے تکلفی سے بلاتے رہتے ہو، بلکہ انہیں بلانا ہو تو ان کا پورا ادب و احترام ملحوظ رکھا کرو، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر رسول ﷺ تمہیں بلائیں تو ایسا نہ سمجھو جیسے کوئی عام آدمی بلا رہا ہے کہ جی چاہے تو جواب دے دو یا نہ دو، اگر جی چاہے تو ان کے پاس حاضر ہو جاؤ اور چاہے تو نہ آؤ، بلکہ ان کے بلانے پر تم پر واجب ہو جاتا ہے کہ تم ان کے پاس حاضر ہو جاؤ اور ان کی بات سنو، پھر اسے بجالاؤ اور یہ مطلب قرآن کریم کی ایک دوسری آیت:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ﴾ (الانفال ۸:۲۴)

''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے کہنے کو دل و جان سے بجالاؤ، جبکہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں۔''

سے ماخوذ ہے اور درج ذیل حدیث مبارک سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

سیدنا سعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ ﷺ میرے سامنے سے گزرے اور مجھے بلایا، میں نماز پڑھ کر حاضر ہوا تو مجھے فرمایا:

''تم میرے بلانے پر کیوں نہ آئے؟ کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا؟

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ﴾ (بخاری، کتاب التفسیر)

اس حدیث سے علماء نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ اگر کوئی شخص فریضۂ نماز بھی ادا کر رہا ہو، تو رسول اللہ ﷺ کے بلانے پر اسے نماز تک چھوڑ کر فوراً حاضر ہونا چاہیے اور آیت کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کو یوں نہ سمجھو جیسے کسی عام آدمی کی دعا ہے، بلکہ تمہارے حق میں رسول اللہ ﷺ کی دعا تمہاری دنیا اور تمہاری آخرت سنوارنے کا موجب بن سکتی ہے، اس طرح ان کی بد دعا

تمہیں تباہ و برباد بھی کر سکتی ہے، لہٰذا ان کی اطاعت کر کے انہیں خوش رکھنے اور ان کی دعا لینے کی کوشش کیا کرو۔

﴿قَدْ یَعْلَمُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا﴾

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

” تَسَلَّلَ کے معنیٰ چل دینے اور چپکے سے کھسک جانے کے ہیں، لِواذا کے معنی ایک دوسرے کی آڑ اور پناہ لینے کے ہیں۔

یہ منافقین کو تنبیہ ہے کہ اللہ ان لوگوں سے برابر آگاہ رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے بلائے ہوئے اجتماعات سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جایا کرتے رہے ہیں کہ پرسش ہو تو عذر کر سکیں کہ آپ ﷺ کے حکم کی خبر نہیں ہوئی۔ اس اسلوبِ بیان میں جو غصہ اور عتاب مضمر ہے، وہ زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

﴿فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ﴾ مُخالفة یہاں گریز اور فرار کے مفہوم کی مخالفت کی نوعیت درحقیقت گریز و فرار ہی کی تھی، وہ اپنی بزدلی کے سبب سے سامنے تو ”اٰمَنَّا و صَدَّقْنَا“ ہی کہتے تھے لیکن درپردہ گریز و فرار کی کوشش کرتے، فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے، وہ اس بات کو نہ بھولیں کہ اس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی کسی بہت بڑی آزمائش میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں اور کسی دردناک عذاب میں بھی گرفتار ہو سکتے ہیں۔“ (تدبر قرآن)

مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

”عرب کے لوگ چونکہ زیادہ مہذب و شائستہ نہ تھے، اس لیے بعض موقعوں پر رسول اللہ ﷺ کے سامنے باہم سخت کلام یا شور وغل کرنے لگتے تھے اور بعض موقعوں پر آپ کو بھی عام لوگوں کی طرح مخاطب کرتے تھے، وفد بنو تمیم کی آمد کے وقت اس قسم کی بے ادبیاں سرزد ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ، اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ

عَلِيْمٌ ○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (الحجرات:۴۹/۱-۵)

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے سامنے کسی بات میں بھی کسی طرح سبقت نہ کرو، اللہ تعالیٰ کی راہِ تقویٰ اختیار کرو، وہ سب کچھ سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے، اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ اُن سے اونچی آواز میں بات کرو جس طرح تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سوءِ ادبی کے سبب بے خبری میں تمہارے اعمال ہی برباد ہو جائیں، بے شک جو لوگ رسول اللہ کے حضور احتراماً اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کے لیے پرکھ لیا ہے، اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اجرِ عظیم ہے، جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں اکثر سوچتے نہیں، اگر یہ لوگ یہاں تک صبر کرتے کہ آپ خود ان کے پاس آ جاتے تو یہی ان کے لیے بہتر ہوتا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔“

﴿لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے اس ادب و تعظیم اور احترام و تکریم کا بیان ہے جو ہر مسلمان سے مطلوب ہے، پہلا ادب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں جب تم آپس میں گفتگو کرو تو تمہاری آواز نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ ہو۔ دوسرا ادب، جب خود نبی ﷺ سے کلام کرو تو نہایت وقار اور سکون سے کرو، اس طرح اونچی اونچی آواز سے نہ کرو، جس طرح تم آپس میں بے تکلفی سے ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہو، اگر ادب و احترام کے ان تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھو گے تو بے ادبی کا احتمال ہے جس سے بے شعوری میں تمہارے عمل برباد ہو سکتے ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَھُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ﴾ اس میں ان لوگوں کی تعریف ہے جو رسول اللہ ﷺ کی عظمت وجلالت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی آوازیں پست رکھتے تھے۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ﴾ یہ آیت قبیلۂ بنوتمیم کے بعض اعرابیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے ایک روز دوپہر کے وقت، کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قیلولے کا وقت تھا، حجرے سے باہر کھڑے ہوکر عامیانہ انداز سے یا محمد ﷺ، یا محمد ﷺ کی آوازیں لگائیں تاکہ آپ ﷺ باہر تشریف لے آئیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کی اکثریت بے عقل ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی ﷺ کی جلالت شان اور آپ ﷺ کے ادب واحترام کے تقاضوں کا خیال نہ رکھنا، بے عقلی ہے۔" (احسن البیان)

مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

"اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سامنے اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ ان کی بات سننے میں نہیں آتی تھی، سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ پر اس آیت کا اور بھی سخت اثر ہوا اور وہ بالکل خانہ نشین ہوگئے اور لوگوں سے کہا کہ "تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ گفتگو کرتا تھا، پس میں دوزخی ہوگیا آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا: "نہیں وہ جنتی ہے۔" (تاریخ اخلاقِ اسلامی)

یہ تو جلوت کے آدابِ معاشرت تھے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کی خلوت، یعنی اندرونی اور خانگی زندگی کے متعلق بھی بعض معاشرتی آداب کی ضرورت تھی اور اس کی تقریب یہ پیدا ہوئی کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے دعوت ولیمہ دی اور بہت سے صحابہ اس دعوت میں شریک ہوئے اور کھانے کے بعد باہم بات چیت کرنے لگے، اس میں دیر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اٹھنے کا ارادہ کیا، لیکن یہ لوگ اس اشارے کو نہ سمجھے اور بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے، مجبوراً آپ کو اٹھنا پڑا اور آپ کے اٹھنے کے بعد اور تمام لوگ تو اٹھ کھڑے ہوئے لیکن تین آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَکُمۡ اِلٰی طَعَامٍ غَیۡرَ

نٰظِرِيْنَ اِنٰهُ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا○ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴿ (الاحزاب:۳۳/۵۳-۵۴)

”مسلمانو! نبیؐ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چل آیا کرو، نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو، ہاں اگر تمھیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ، مگر جب کھانا کھا لو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو، تمہاری یہ باتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے، اور اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا، نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمہارے لیے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔ تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے، تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔“

ان آیات کی شانِ نزول اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی خانگی زندگی کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن اس سے اور بھی معاشرتی اصلاح مقصود تھی۔

۱) ایک تو یہ کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت نہیں جانا چاہیے، جیسا کہ زمانۂ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں اہل عرب کا طریقہ تھا۔

۲) دعوتوں میں حریصانہ طور پر کھانے کی تیاری کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

۳) کسی کے ہاں اتنی دیر تک نہیں ٹھہرنا چاہیے کہ اس کو ناگوار ہو۔

۴) مسلمان خواتین کے لیے پردے کے احکام کا علم ہوا اور اس کی اہمیت کا پتا چلا، یہ پردے کی حکمت اور علت ہے کہ اس سے مرد اور عورت دونوں کے دل خلجان اور فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔

ان آداب رسالت کے ساتھ جن کی پابندی ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ ﷺ کو چند معاشرتی آداب سکھائے، تا کہ اس احترام میں جبارانہ اور شاہانہ شان وشوکت کی آمیزش نہ ہونے پائے، بلکہ اس کی بنیاد خالص مذہبی اور اخلاقی جذبات پر قائم ہو، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کریں اور آپؐ کو اپنے اوپر اور تمام مخلوقات پر فضیلت دیں تو اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو بھی لطف وعنایت کی ہدایت کی کہ آپ باپ سے بھی زیادہ مسلمانوں پر مہربان ہیں، جیسا کہ فرمایا کہ آپ ﷺ مسلمانوں سے بہ تواضع پیش آئیں ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ اور حکم ہوا کہ آپ ﷺ ان لوگوں کے ساتھ صبر کریں، جو اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اور مچھلی والے (یعنی سیدنا یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جائیں ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ﴾ اور فرمایا ﴿وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ اور اس کے علاوہ اس قسم کی اور بھی آیات ہیں تا کہ آپ ﷺ کی خدمت ان ظالموں کی طرح نہ ہو، جو آزاد لوگوں کو جبر اور سختی کے ساتھ غلام بناتے ہیں اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت خالِصَۃً لِوَجہِ اللہ ہو۔'' (تفسیر کبیر، بحوالہ تاریخ اخلاقِ اسلامی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام

خاتم النبین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے اہل ایمان پر ضروری ٹھہرا کہ آپؐ پر درود وسلام بھیجا کریں اور اسے نماز کا حصہ بھی بنا دیا گیا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾ (الاحزاب:۳۳/۵۶)

''اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود بھیجو۔''

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”اللہ کی طرف سے اپنے نبی ﷺ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ پر مہربان ہے، آپ کی تعریف فرماتا ہے، آپ کے کام میں برکت دیتا ہے۔ آپ کا نام بلند کرتا ہے اور آپؐ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرماتا ہے۔ ملائکہ کی طرف سے آپ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ سے غایت درجے کی محبت رکھتے ہیں اور آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو زیادہ سے زیادہ بلند مرتبے عطا فرمائے، اہل ایمان کی طرف سے آپ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں کہ وہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔“ (ترجمہ قرآن اور مختصر حواشی)

درود ابراہیمی:

((اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ))

”اے اللہ! آپ اپنی رحمتیں نازل فرمایے محمد (ﷺ) پر اور آل محمد (ﷺ) پر، جیسا کہ آپ نے رحمتیں نازل فرمائیں ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیم پر، بلاشبہ آپ حمید اور مجید ہیں۔

اے اللہ! آپ برکتیں نازل فرمایے محمد (ﷺ) پر اور آل محمد (ﷺ) پر جیسا کہ آپ نے برکتیں نازل فرمائیں ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر، بلاشبہ آپ حمید اور مجید ہیں۔“

آیت مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں

۱) ایمان محض زبانی اقرار کا نام نہیں ہے بلکہ صدقِ دل سے ماننے کے ساتھ ساتھ احکامِ الٰہی کی سنتِ رسول ﷺ کے مطابق پیروی بھی ضروری ہے۔

۲) ایمان میں سمع وطاعت، تسلیم ورضا بھی ضروری ہے۔

قرآن حکیم، رسول اللہ ﷺ کا دائمی معجزہ

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾
(الشوری:۵۲/۴۲)

''اور اسی طرح (اے نبی!) ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (یعنی قرآن حکیم) کو اتارا، آپ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے؟ مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا (کہ لوگ اس سے راہ یاب ہوں) اس کے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہ آپ راہِ راست کی رہنمائی کر رہے ہیں۔''

وَ كَذٰلِكَ اور اس طرح، اَوْحَيْنَآ ہم نے وحی کی (یعنی رب کریم نے) اَوْحٰى، يُوْحِىْ، دل میں بات ڈالنا، اللہ تعالیٰ کا جبرائیل امین کے ذریعہ انبیائے کرامؑ کو وحی بھیجنا، اِلَيْكَ (اِلٰى. كَ) طرف آپ ﷺ (کی) کَ ضمیر واحد مخاطب، جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے، رُوْحًا ایک روح (یعنی قرآن حکیم) مِّنْ اَمْرِنَا اپنے حکم سے (یعنی رب کریم کے حکم سے قرآن آپؐ پر نازل ہوا)، مَا كُنْتَ تَدْرِىْ آپ نہیں جانتے تھے (دَرٰى، يَدْرِىْ، دِرَايَةً) جاننا، واقفیت حاصل کرنا ''اَلدِّرَايَةُ'' علم، واقفیت، عقل وفہم، زیرکی، عِلْمُ الدِّرَايَـةِ فقہ اور اصولِ فقہ کا علم، حدیث کے معانی ومطالب کا علم (القاموس الوحید) مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ کیا ہے کتاب (القرآن) اور نہ ایمان۔ یعنی قرآن اور

ایمان کا آپؐ کو علم نہیں تھا مگر اللہ نے اپنی رحمت سے آپؐ کو یہ علم بخشا، وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ اور لیکن ہم نے بنا دیا اس کو (قرآن حکیم کو)، نُوْرًا نورِ ہدایت، نَّهْدِیْ بِهٖ ہم ہدایت کرتے ہیں اس کے ذریعے سے (یعنی قرآن حکیم کے ذریعے سے) مَنْ نَّشَآءُ، جس کو ہم چاہتے ہیں، مِنْ عِبَادِنَا، اپنے بندوں میں سے، وَاِنَّكَ اور بلاشبہ آپؐ، لَتَهْدِیْٓ ضرور راہ نمائی کرتے ہیں، اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ سیدھے راستے کی طرف۔

معروف عرب سیرت نگار اکرم ضیا العمری لکھتے ہیں:

''قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس کے الفاظ اور معانی و مطالب اس نے خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو سکھائے اور سمجھائے، آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو سکھایا اور سمجھایا، اس طرح رب کریم کی رحمت سے اس کی حفاظت و صیانت کا انتظام و اہتمام ہوا اور یہ نورِ ہدایت ہے جس کے ذریعے وہ اپنے بندوں کو ہدایت سے بہرہ ور فرماتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وحی کیے جانے سے پہلے آپ کتاب و ایمان سے واقف نہ تھے، جیسا کہ قرآن حکیم نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔

اور اسی طرح (اے نبی!) ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (یعنی قرآن حکیم) کو اتارا، آپ ﷺ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے؟ مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا (کہ لوگ اس سے راہ یاب ہوں) اس کے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور بلا شبہ آپ ﷺ راہ راست کی رہنمائی کرتے ہیں۔'' (الشوریٰ:۴۲/۵۲)

<u>سیدھا راستہ ایک ہی ہے:</u>

''سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے سوال کیا گیا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اس راہ پر ڈال دیا ہے، اس کا ایک سرا جنت میں ہے جبکہ اس کے دائیں اور بائیں کئی راستے ہیں اور جس نے رسول اللہ ﷺ کی راہ چھوڑ کر ادھر ادھر کی راہوں کو اختیار کر لیا، وہ بھٹک گیا اور وہ جہنم میں چلا گیا، پھر ابن مسعودؓ نے اس آیت

مبارکہ کو پڑھا:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾ (الانعام:۶/۱۵۳)

''اور بلاشبہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے (یعنی دین اسلام کا راستہ) لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں گے۔''

مسند احمد اور نسائی کی روایت ہمیں واضح کرتی ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صراطِ مستقیم کی یہ تعریف رسول اللہ ﷺ سے سیکھی، ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خط کھینچا اور فرمایا:

''یہ اللہ کی راہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ وہ راہیں ہیں جن میں سے ہر راہ پر ایک شیطان بیٹھا ہے، جو اپنی طرف بلا رہا ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾

تلاوت فرمائی۔

ابن مسعود کی بات کے معنیٰ یہ ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو اُن کے ہاتھوں سے پکڑ کر اس راہ پر لگایا جو جنت کی طرف لے جانے والی ہے اور انہیں روشن منزل اور واضح راستے پر چھوڑا، مگر یہ راہ آخر تک استقامت کی طلبگار ہے اور اس کو چھوڑ کر کسی اور راہ پر چلنا خواہشاتِ نفس کا شکار ہونا اور اِفراط و تفریط کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ اہل حرص و ہوا، شیاطین و خواہشاتِ نفس تو انسان کو راہ حق سے دور جا پھینکتے ہیں اور وہ اسے دھوکے اور فریب کے ساتھ متفرق اور شاذ طریقوں پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں جنت سے دور کر دیتے ہیں، حالانکہ سنت کی راہ جنت کی طرف جانے والی مختصر ترین راہ ہے۔

وحی کی حقیقت:

وحی کے لغوی معنیٰ اشارہ اور خفیہ آگاہی کے ہیں، جبکہ شرعی لحاظ سے وہ شریعت کی آگاہی

ہے، فرشتے کے ذریعے سے انبیاء کے لیے اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے ساتھ مخصوص ہے یا واسطے کے بغیر دل میں معنی کا القا اور الہام ہے اور پردے کے پیچھے سے رویت کے بغیر کلام، جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور رسول اللہ ﷺ جبرئیل امین کو دیکھا کرتے، ان کی حقیقی صورت میں اور ایسا نادر ہی ہوتا یا بشر کی صورت میں ظہور کے ساتھ، وہ آپ ﷺ سے کلام کرتے، آپ ﷺ اسے سمجھ لیتے اور یاد کر لیتے، یہ وحی آپ ﷺ پر آسان تر تھی، بعض اوقات آپ ﷺ جبرئیل امین کو نہ دیکھتے مگر ان کے آنے پر ایک گرج اور شدید گھنٹی کی آواز سنتے، آپ کا جسدِ اطہر بوجھل ہونے اور جبینِ مبارک سے پسینہ جاری ہونے سے آپ ﷺ کے پاس صحابہ سمجھ لیتے کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے اور بعض اوقات آپ اپنے چہرۂ اقدس کے پاس شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح آواز سنتے تو یہ بھی وحی کے آنے کی علامت ہوتی، جب جبرئیل امین اپنے رب کا پیغام پہنچا چکتے تو نبی ﷺ اپنی معمول کی حالت پر آ جاتے، نبی ﷺ کا حفظِ قرآن کا شوق ایک طرف اور آپ پر وحی کی شدت دوسری طرف، چنانچہ آپ ﷺ کی جبرائیل امین سے قراءت کے حصول میں لگن اور تڑپ اور جلدی سے حفظ کرنے کا شوق و ولولہ ہوتا، مبادا اس کا کوئی حصہ حفظ ہونے سے رہ جائے، اس پر رب کریم کا شفقت بھرا جملہ آپ ﷺ کے گوشِ مبارک میں پڑتا ہے:

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ (القیامة:۷۵/۱۶-۱۹)

”(اے نبی!) اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے، اس کو یاد کرا دینا اور آپ کی (زبان مبارک سے) پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں، اس وقت آپ اس کی قراءت کو غور سے سنتے رہیے، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول بخاری و مسلم میں روایت ہے:

”نبی کریم ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی اور جو خواب آپ ﷺ دیکھتے وہ روزِ

روشن کی طرح سامنے آجاتا۔"

نیز سیدہ عائشہؓ کی حدیث وضاحت کرتی ہے کہ نبی کے خواب وحی ہوا کرتے ہیں اور پہلی وحی رسول اللہ ﷺ کو مانوس کرنے کے لیے تھی کیونکہ وہ روح بشری پر سب سے خفیف واقع ہوئی، نیز اس لیے بھی کہ آپؐ بیداری کی حالت میں شدید قسم کی وحی کو وصول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، وحی محمدی سابقہ انبیاء کی وحی ہی کی مانند تھی، اس میں کوئی فرق نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّآ اَوۡحَیۡنَآ اِلَیۡکَ کَمَآ اَوۡحَیۡنَآ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ﴾ (النساء:٤/١٦٣)

"اے (نبی!) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔"

غارحرا کی گوشہ نشینی:

رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ نے غار حرا میں گوشہ نشینی کو پسندیدہ بنا دیا تھا، جہاں آپ حنیفیت کی اتباع میں عبادت کرتے جو ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا، آپ ﷺ غار حرا میں ایک مہینا رہتے، پھر آپ اپنے اہل کی طرف لوٹتے اور اسباب اختیار فرماتے ہوئے طعام کا زاد لیتے، رسول اللہ ﷺ کی غار میں آمد و رفت ہوتی رہی تا آنکہ ماہِ رمضان میں بحالتِ اعتکاف وحی آئی اور فرشتہ نے آپ ﷺ سے کہا:

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ﴾ (العلق:٩٦/١)

"پڑھیے! اپنے رب کے نام سے جس نے (کائنات اور اس کی ہر چیز کو) پیدا کیا۔"

آپ ﷺ نے کہا: "مجھ سے پڑھا نہیں جاتا" رسول اللہ ﷺ اُمّی تھے اور پڑھنا نہیں جانتے تھے، ناخواندگی آپ ﷺ کے اعجاز کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سابقہ کتابوں سے اخذ کرنے کے شبہ سے دور رکھا، (اور اپنے فضل و کرم سے اپنی جناب سے آپ کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ وطہارت کا انتظام فرمایا، آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((اَدَّبَنِیۡ رَبِّیۡ فَاَحۡسَنَ تَاۡدِیۡبِیۡ))

''میرے رب نے مجھے ادب سے آراستہ فرمایا اور بہترین آداب سے نوازا۔''

پھر قرآن حکیم کے ذریعہ پڑھنا سکھایا، (سبحان اللہ!) چنانچہ فرشتے نے پڑھنے کا دوبارہ مطالبہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کو پکڑ کر زور سے دبایا اور وضاحت کی کہ آپ زبانی پڑھیں جو پہلے آپ ﷺ کے حفظ میں نہیں ہے بلکہ آپ اس آن اللہ کے امر سے سیکھیں گے، وہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات تھیں اور یہ پہلی وحی تھی جو قرآن سے علی الاطلاق نازل ہوئی۔

غار حرا سے گھر کی طرف:

نبی کریم ﷺ ان پانچ آیات کو لے کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گھر تشریف لائے اور اپنی زوجۂ مطہرہ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کو معاملہ کی خبر دی، آپ ﷺ نے بی بی صاحبہ سے کہا کہ آپ کو چادر اوڑھا دیں، کچھ وقفہ کے بعد آپ کا خوف جاتا رہا، آپ ﷺ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کو غار حرا کا تمام واقعہ سنایا، آپ ﷺ کو جو وحی کی گئی اس کا آپ ﷺ کو پہلے کبھی خیال تک نہ گزرا تھا، بلکہ یہ سب اچانک ہوا جس کی آپ ﷺ کو اس سے پہلے کچھ خبر نہ تھی، جب آپ ﷺ نے سیدہ خدیجہؓ سے اپنے خوف کا اظہار کیا تو سیدہؓ نے حلفاً کہا:

''اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ذلت، رسوائی سے محفوظ رکھے گا، آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، درماندوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، تہی دستوں کا بندوبست کرتے ہیں، مہمان کی میزبانی کرتے ہیں اور حقدار کی حق رسی فرماتے ہیں۔''

ورقہ بن نوفل کی گواہی:

پھر ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، وہ نصرانی تھے اور عربی و عبرانی زبانوں کے عالم اور تورات و انجیل سے واقف تھے۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے، تجربات نیز کتابوں پر نظر نے انہیں صیقل بنا دیا تھا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے واقعہ کی کیفیت سنی تو وہ معاملہ کی حقیقت کو سمجھ گئے اور خوش ہوئے کہ وہ اس طرح کی وحی ہے جسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام وصول کیا کرتے تھے۔ ورقہ نے اس تمنا کا اظہار

کیا: ''کاش! ان کا شباب لوٹ آئے اور وہ قوم کے مقابلے میں نبی ﷺ کی نصرت کریں جب وہ آپ ﷺ کو مکہ سے نکالے۔'' پھر ورقہ نے اپنے بڑھاپے کے باعث اسے ناممکن سمجھا اور یہ خواہش کی، کاش! وہ دن انہیں نصیب ہو جائے۔

نبی ﷺ کو ورقہ کا یہ کلام بڑا عجیب سا لگا، کیونکہ آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ سے محبت کرتی تھی اور آپ ﷺ کو صادق و امین کے نام سے پکارتی تھی: ''آپ ﷺ کو اپنے شہر سے کیونکر نکال دے گی؟ آپ ﷺ نے یہ بات تعجب سے پوچھی: کیا میری قوم کے لوگ مجھے اس شہر سے نکال دیں گے؟ تو ورقہ نے کھل کر بتایا ''یہ دنیا کی ریت ہے، کوئی ایسا نبی نہیں ہوا جس نے اپنی قوم کو جاہلیت چھوڑنے اور عبادت و اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت دی ہو اور قوم نے اسے ستایا نہ ہو،'' ورقہ بن نوفل کا کچھ عرصہ کے بعد انتقال ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ پر پہلی وحی ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ کے بعد وقفہ ہو گیا، اس پر آپ ﷺ سخت مضطرب اور پریشان رہتے تھے، یہاں تک کہ رب کریم سے آپ ﷺ پر وحی ان الفاظ کے ساتھ آئی:

﴿یٰۤاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ○ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ ○ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ﴾ (المدثر:٧٤/١-٥)

''اے چادر اوڑھنے والے! اٹھیے اور خبردار کیجیے اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کیجیے اور اپنے کپڑے پاک وصاف رکھیے اور گندگی (شرک و بت پرستی) سے دور رہیے۔''

اسی طرح رسالتِ محمدی ﷺ کی ابتدا ہوئی اور محمد ﷺ کی نبوت سے اللہ تعالیٰ عزوجل کی معرفت سے لوگ آشنا ہوئے اور جو کتاب آپ پر نازل ہوئی وہ کتاب حق ہے جس کے آگے اور پیچھے باطل بھٹک بھی نہیں سکتا:

﴿وَاِنَّهٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌ ○ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ﴾ (حٰمۤ السجدہ:٤١/٤١-٤٢)

''اور جو کتاب آپؐ پر نازل ہوئی یہ بڑی باوقعت کتاب ہے، جس کے پاس باطل پھٹک بھی

نہیں سکتا، نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ نازل کردہ ہے حکمتوں والے خوبیوں والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔“

قرآن کی حفاظت، اللہ تعالیٰ کی ضمانت

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کی ضمانت لے رکھی ہے کہ جو کچھ اس میں درج ہے، اس میں کوئی اضافہ نہ کیا جائے گا اور نہ اس کے احکام وفرائض، اصول وضوابط میں کوئی کمی کی جائے گی، جب تک قرآن رسالتِ اسلامیہ کا دستور ہے اور جب تک وہ ہر زمان و مکان میں نسلِ انسانیت کے لیے ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ ہے، اس کی حفاظت کا ذمہ رب کریم نے لیا ہے اور یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ قرآن حکیم کی حفاظت سے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت میں بھی دوام ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ (الحجر:۱۵/۹)

”یہ ذکر (یعنی قرآن کو) ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔“

قرآن حکیم کی حفاظت کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کے معنی ومطالب سیرتِ طیبہ کی روشنی میں لوگوں تک برابر پہنچتے رہیں (چنانچہ دنیا کے ہر ملک اور ہر شہر میں ہر بستی اور ہر گاؤں میں غرضکہ ہر خطۂ زمین میں مدارس اور مکاتب میں اسے حفظ و ضبط کرنے کا اہتمام ہے، اس کے ساتھ ساتھ علما وفضلاء کی ایک جماعت ہر زبان اور ہر بولی میں اس کو سمجھنے سمجھانے اور اس کے تفسیری نکات بیان کرنے اور لکھنے میں شب و روز مصروف ہے۔)

رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے حافظِ قرآن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر جبرائیل امین نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قرآن نازل کیا اور آپ ﷺ نے اس کو حفظ کیا، جبرائیل ہر سال رمضان میں قرآن کا دورہ آپ ﷺ کے ساتھ کرتے اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری رمضان میں جبرائیل امین نے دو بار دورہ کیا۔

کاتبینِ وحی:

رسول اللہ ﷺ نازل شدہ آیات کو بعض صحابہؓ (جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے) کو املا کروا دیا کرتے تھے، ایسے کاتبینِ وحی کی تعداد ۲۹ تک پہنچ گئی تھی، جن میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، زبیرؓ بن العوام، سعیدؓ بن عاص، عمروؓ بن عاص، ابیؓ بن کعب، معاویہؓ بن ابی سفیان اور زیدؓ بن ثابت قابل ذکر ہیں۔ سیدنا زید بن ثابت اس عظیم مہم میں سب سے زیادہ منسلک رہنے والے تھے، کتابت زیادہ تر چمڑے کے ٹکڑوں پر ہوتی، چوڑی ہڈیوں، کھجور کے چھلکوں اور پتھروں کے صاف ٹکڑوں پر لکھا جاتا تھا، کاتبینِ وحی جتنا لکھ لیتے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیتے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اَنصار میں چار اصحاب کے نام نمایاں ہیں جنہوں نے قرآن حکیم جمع کیا۔ ابی بن کعبؓ، معاذؓ بن جبل، زیدؓ بن ثابت اور ابوزیدؓ، یہ ان کے پاس متفرق رقعوں میں تھا اور کامل متن پر مشتمل تھا، اس کے علاوہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد تھی جنہوں نے اس مبارک کتاب کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمات:

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ترغیب پر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مکمل قرآن جمع کر کے لکھنے کی ذمہ داری سونپی، ابوبکرؓ نے زیدؓ سے کہا:

''تم دانشمند جواں مرد ہو اور تمہاری زندگی صاف ستھری ہے۔ تم رسول اللہ ﷺ سے وحی لکھا کرتے تھے، لہٰذا قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری قبول کرو۔''

چنانچہ سیدنا زید بن ثابتؓ نے اس اہم نیک کام کی ذمہ داری قبول کر لی اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں لکھے ہوئے قرآن کو بڑی احتیاط کے ساتھ جمع کیا۔ وہ اس میں دو کاتبانِ وحی کو گواہ بناتے تھے۔ اس طرح قرآن کریم پہلی بار خلافتِ صدیقی میں مکمل طور پر جمع کیا گیا، پھر یہ مصحف جناب ابوبکر صدیقؓ سے عمرؓ بن خطاب کی طرف منتقل ہوا، جنہوں نے شہادت کے وقت اسے ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کر دیا۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمات:

جب سیدنا عمرؓ بن خطاب کی شہادت کے بعد سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے اس مصحف، جو سیدہ حفصہؓ کے پاس تھا، پر اعتماد کرتے ہوئے آخری مرتبہ جمع کرنے اور اسے پھیلانے کی ذمہ داری لی اور سیدنا زید بن ثابتؓ، جنہوں نے اس سے پہلے خلافتِ صدیقی میں اس خدمت کا شرف حاصل کیا تھا، کے ساتھ عبداللہؓ بن جبیر، سعیدؓ بن عاص اور عبدالرحمٰنؓ بن حارث بن ہشام پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی، آخری تین اصحابِ قریش میں سے تھے، جبکہ زیدؓ بن ثابت انصاری تھے اور سیدنا عثمانؓ نے اس سلسلے میں ہدایت کی:

''اسے قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ وہ ان کی زبان میں اترا ہے۔''

اس کمیٹی نے اپنا یہ فریضہ کامیابی کے ساتھ مکمل کرلیا اور چھ مصحف تیار کیے گئے، ان میں سے مکہ مکرمہ، شام، کوفہ اور بصرہ میں ایک ایک مصحف بھجوایا گیا، جبکہ پانچواں مصحف مدینہ منورہ میں رکھا گیا، جبکہ چھٹا مصحف سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس رکھ لیا، چنانچہ آنے والے وقتوں میں دیگر مصاحف ان ہی سے نقل کیے گئے، یہ رسم الخط سیدنا عثمان بن عفان کی نسبت سے (عثمانی رسم الخط) کہلایا۔

علمائے کرام کی خدمات:

''مسلمان علماء طویل صدیوں کے دوران قرآن کریم کے بارے میں عظیم خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں، انہوں نے رسم عثمانی والے مصحف میں نقطوں اور شکلوں کا اضافہ کیا جو ان سے خالی تھا، یہ سعادت ابوالاسودؒ الدولی کو ملی کہ انہوں نے حروف پر نقطے لگائے تاکہ وہ آسانی سے پہچانے جائیں اور نصرؒ بن ایلثی اور یحییٰؒ بن یعمر العدوانی نے حروف پر حرکات (زیر، زبر، پیش، جزم) کا اعزاز حاصل کیا تاکہ حروف کی ادائیگی صحیح طور پر ہو اور ان میں لحن نہ پیدا ہو، آخر میں خلیلؒ بن احمد الفراہیدی تھے جنہوں نے مصحف کو موجودہ صورت دی۔

مصحف کی خدمت میں علماء کی مساعی نقطے لگانے اور حروف کو شکل دینے تک ہی محدود نہ تھی، انہوں نے وقف وابتدا کے مقامات سمجھائے اور قرآن کریم کی خدمات کے لیے تفسیر،

طرح ''علوم قرآنیہ'' کا ایک اہم مکتبہ وجود میں آ گیا، بعد میں علوم القرآن، تجوید، معرفتِ قراءاعراب القرآن جیسی متن

ء اس خدمت میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ بڑی مہارت اور عمدگی کے خدمات بھی انجام دیں، ان

ساتھ حفظ قرآن، تجوید وقراءت، مشرق ومغرب میں علما وفضلاء کی تفاسیر آ کے نسلوں... علما

مساعیِ جمیلہ قرآن کریم کے اعجاز کا مظہر ہے۔'' (سیرت رحمت عالم ﷺ مطبوعہ نشریات لاهور)

آیت مبارکہ میں حکمتیں وبصیرتیں

۱) قرآن حکیم کی خدمات کی یہ ساری کوششیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت وصیانت کے لیے مفید بنائیں یہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ کی جیتی جاگتی تفسیر ہے، جبکہ دیگر جملہ آسمانی کتابیں جو انبیائے کرام پر نازل کی گئیں ان کی زبان تک محفوظ نہیں ہے۔

۲) قرآن حکیم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ رب کریم نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو بھی محفوظ کرنے کا سروسامان فرما دیا، جہاں قرآن حکیم کے سمجھنے سمجھانے کے لیے علما وفضلاء کی ایک جماعت ہر دور اور ہر زمانے میں موجود رہی ہے اور تفاسیر پر کام ہوتا رہا ہے وہاں سیرتِ طیبہ پر کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری وساری رہے گا، ان شاء اللہ! یہ اس لیے کہ قیامت تک لوگوں کے لیے زندگی گزارنے کا نمونہ ''حیاتِ طیبہ'' سامنے رہے۔ الحمدللہ!

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر صبح کو دو فرشتے اترتے ہیں ایک کہتا ہے:

اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا

''اے اللہ! خرچ کرنے والوں کو نعم البدل عطا فرما۔''

نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم

﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (الاعراف:۱۵۷/۷)

”(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی اُمی (ﷺ) کی پیروی اختیار کریں، جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے، وہ انہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔“

لغوی تشریح: اَلَّذِیْنَ وہ لوگ، جو، اسم موصول جمع مذکر کے لیے، اس کا مفرد الذی ہے، یَتَّبِعُوْنَ فعل مضارع جمع مذکر غائب، اتباع کرتے ہیں (اِتَّبَعَ، یَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا) اتباع کرنا، پیروی کرنا، اَلرَّسُوْلَ رسول (ﷺ) کی، اَلنَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (جو) نبی اُمّی ہیں۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”یہاں نبی ﷺ کے لیے ”اُمّی“ کا لفظ یہودی اصطلاح کے لحاظ سے استعمال ہوا، بنی اسرائیل اپنے سوا سب قوموں کو اُمّی کہتے تھے اور ان کا قومی فخر وغرور کسی اُمّی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار، اس پر بھی تیار نہ تھا کہ اُمیّوں کے لیے اپنے برابر انسانی حقوق ہی تسلیم کرلیں، چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ امیّوں کے مال مار کھانے میں ہم پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، آل عمران کی اس آیت پر غور کیجیے:

﴿قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ (آل عمران ۳:۷۵)

''اُمیّوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ انہی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اسی اُمیؐ کے ساتھ تمہاری قسمت وابستہ ہے، اُس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصہ پاؤ گے ورنہ وہی غضب تمہارے لیے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آ رہے ہو۔''

(مختصر حواشی)

امیؐ کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے کسی مکتب یا مدرسہ میں تعلیم حاصل نہ کی بلکہ براہ راست آپ کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وطہارت کا رب کریم کی طرف سے انتظام ہوا، چنانچہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَأَحْسَنَ تَأْدِیْبِیْ))

''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہترین آداب سے آراستہ فرمایا۔''

اَلْمَعْرُوف، بھلائی، احسان، حسن سلوک، عطیہ، نیکی (ہر وہ کام جس کی خوبی عقلاً وشرعاً ثابت ہو)۔ (القاموس الوحید)

اَلْمُنْکَر. عقلِ سلیم کے نزدیک ہر بری اور ناگوار بات، نیز ہر وہ بری بات جو شریعت کی رو سے ناپسندیدہ یا حرام ہو۔ (حوالہ ایضاً)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

مفسر قرآن، مسجد نبوی ﷺ کے استاد ابو بکر جابر الجزائری لکھتے ہیں:

''ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ اچھے کاموں کو پھیلانا اور برے کاموں کو مٹانا اس وقت ضروری ہو جاتا ہے جب نیکی معدوم ہو رہی ہو اور برائی پھیل رہی ہو، خاص طور پر اُن لوگوں کے لیے یہ بات ضروری ہو جاتی ہے جو یہ فریضہ سرانجام دینے کی طاقت رکھتے ہوں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنی کتاب عزیز میں ایمان کے ساتھ ذکر فرمایا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۳/ ۱۱۰)

''(اے مسلمانو!) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' (منهاج المسلم)

خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے دل و جان کے ساتھ اس فریضہ کو سرانجام دیا، آپ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا، اس لیے اس فرض کو آپ ﷺ کی امت تا قیامت سرانجام دیتی رہے گی۔

کتاب وسنت سے دلائل

(۱) اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران:۳/ ۱۰۴)

''اورتم میں ایک ایسی جماعت (ضرور) رہے جو اچھائی کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

(۲) اللہ جل جلالہ نے اپنے نیک بندوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ أَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (الحج:۲۲/ ۴۱)

''یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، اچھی بات کا حکم کریں گے اور برائی سے منع کریں گے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ﴾ (التوبہ:۹/ ۷۱)

”اور مومن مرد اور مومن عورتیں (دینی لحاظ سے) ایک دوسرے کے (معاون اور) دوست ہیں، اچھائی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔“

اللہ کے ولی سیدنا لقمان علیہ السلام نے اپنے فرزند کو جو وصیتیں فرمائیں، ان کے بارے میں اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے:

﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (لقمان:۳۱/۱۷)

”اے بیٹے! نماز قائم کر، اچھائی کا حکم دے اور برائی سے روک اور تجھے جو تکلیف پہنچے، اس پر صبر کر، یقیناً یہ پختہ باتوں میں سے ہے۔“

بنی اسرائیل پر نفرین بھیجتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (المائدہ:۵/۷۸-۷۹)

”داوٗد اور عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر بنی اسرائیل کے کافروں پر لعنت کی گئی ہے، اس لیے کہ یہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھتے تھے، جن برے کاموں میں مشغول تھے ان سے ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے۔ واقعی یہ لوگ برا کر رہے تھے۔“

اور بنی اسرائیل کے ان لوگوں کا تذکرہ فرمایا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے کر نجات پا گئے اور جنہوں نے یہ فریضہ ادا نہ کیا، وہ تباہ ہوئے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ (الاعراف:۷/۱۶۵)

”اور ہم نے ان کو نجات دی، جو برائی سے روکتے تھے اور ان کو برے عذاب میں پکڑ لیا،

جنہوں نے ظلم کیا، اس لیے کہ وہ نافرمان تھے۔''

۳) رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں نتائج کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَ ذٰلِكَ أَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (صحیح مسلم)

جو تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو اپنے ہاتھ سے روکے۔ اگر طاقت نہیں ہے تو زبان سے (منع کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو دل سے (برا جانے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔

نیز فرمایا:

((لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ لَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، أَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ أَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ، ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يَسْتَجِيْبُ لَكُمْ)) (روا الترمذی و حسنه)

''تم ضرور اچھائی کا حکم کرو گے اور برائی سے روکو گے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے، پھر تم اس کو پکارو گے (لیکن) وہ تمہاری دعا قبول نہیں کرے گا۔''

(۴) رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں نتائج کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا:

((مَا مِنْ قَوْمٍ عَمِلُوْا بِالْمَعَاصِیْ، وَفِيْهِمْ مَنْ یَّقْدِرُ أَنْ یُّنْكِرَ عَلَيْهِمْ، فَلَمْ يَفْعَلُوْا، اِلَّا يُوْشِكُ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖ))

(روا الترمذی، و قال: حسن صحیح)

''جو قوم گناہوں میں مبتلا ہو جائے اور ان میں اسے روکنے کی قدرت والے بھی موجود ہوں اور وہ نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ جل شانہ ان سب کو اپنی طرف سے عذاب میں مبتلا کر دیں۔''

ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت مبارکہ کی تفسیر پوچھی:

﴿لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ﴾ (المائدہ:۵/۱۰۵)

''جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((یَا ثَعْلَبَۃُ! مُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ، فَاِذَا رَأَیْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَ ھَوًی مُتَّبَعًا وَ دُنْیَا مُؤْثَرَۃً وَاِعْجَابَ کُلِّ ذِیْ رَأْیٍ بِرَأْیِہٖ فَعَلَیْکَ بِنَفْسِکَ وَدَعْ عَنْکَ الْعَوَامَ، اِنَّ مِنْ وَّرَائِکُمْ فِتَنًا کَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ، لِلْمُتَمَسِّکِ فِیْھَا بِمِثْلِ الَّذِیْ أَنْتُمْ عَلَیْہِ أَجْرُ خَمْسِیْنَ مِنْکُمْ، قِیْلَ: بَلْ مِنْھُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، قَالَ: لَا بَلْ مِنْکُمْ، لِاَنَّکُمْ تَجِدُوْنَ عَلَی الْخَیْرِ أَعْوَانًا وَلَا یَجِدُوْنَ عَلَیْہِ أَعْوَانًا)) (سنن ابی داود، سنن ابن ماجۃ و سنن ترمذی و حسنہ)

”اے ثعلبہ! اچھائی کا حکم کرو اور برائی سے روکو۔ جب دیکھو کہ کنجوسی کی روش جاری ہو چکی ہے اور خواہشات کی پیروی ہو رہی ہے اور ہر صاحب رائے اپنی رائے پر اترا رہا ہے تو تم اپنے آپ کو بچاؤ اور عوام سے دور ہو جاؤ۔ تمہارے پیچھے تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے ہوں گے، تمہارے عقیدہ و عمل کو اپنانے والوں کے لیے تم میں سے پچاس آدمیوں کی طرح ثواب ملے گا۔“ وہ پوچھ رہے تھے، اے اللہ کے رسول! کیا پچاس انہی میں سے؟ آپؐ نے فرمایا ”نہیں بلکہ تم میں سے کیونکہ (آج) نیکی کرنے میں معاون دستیاب ہیں، جو ان کو دستیاب نہیں ہوں گے۔“

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ أُمَّتِہٖ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ مِنْ أُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَأَصْحَابٌ یَّأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَ یَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِہٖ، ثُمَّ اِنَّھُمْ تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ، یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ، وَ یَفْعَلُوْنَ مَالَا یُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ، وَ مَنْ جَاھَدَھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ، وَ مَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ، لَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ)) (صحیح مسلم)

”ہر نبی کے بعد جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے مبعوث فرمایا، کچھ حواری اور مخلص ساتھی بھی ہوئے، جو اس کے طریقے پر چلے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے رہے۔ پھر ان

کے بعد ایسے لوگ آئے جو گفتار و کردار میں صفر اور ایسے کام کرتے تھے جن کا انہیں حکم نہیں ہوتا تھا (آئندہ بھی یہی صورت حال ہوگی) جو ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے اور جو ان سے زبان سے جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہے اور جو دل سے ان کے خلاف جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہے (یہ بھی نہیں کرسکتا تو) اس کے بعد رائی کے دانہ کے بقدر بھی ایمان نہیں ہے۔''

آپ ﷺ سے افضل جہاد کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا:

((کَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ)) (مسند احمد، سنن نسائی و سنن ابن ماجۃ و ھو صحیح)

''ظالم بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا افضل جہاد ہے۔''

عقلی دلائل:

(۱) تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ اگر بیماری کا علاج نہ کیا جائے تو وہ جسم میں پھیل جاتی ہے اور پھر اس کا علاج مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح برائی کو اگر ابتدا ہی میں ختم نہ کیا جائے اور اسے معاشرے میں پھیلنے دیا جائے اور چھوٹے بڑے اس کے عادی ہو جائیں تو پھر اسے مٹانا اور اس کا ازالہ کرنا مشکل ہے اور بالآخر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے، یہ قانونِ ایزدی ہے جس میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا﴾ (الفتح:۴۸/۲۳)

''(یہ) اللہ کا قانون ہے جو (پہلی قوموں میں) گزر چکا ہے اور تو قانون الٰہی میں ہرگز تبدیلی نہ پائے گا۔''

(۲) یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اگر کسی مکان کی صفائی نہ کی جائے اور اس سے کوڑا کرکٹ دور نہ پھینکا جائے تو کچھ عرصہ بعد وہ جگہ رہائش کے قابل نہیں رہتی، اس کی ہوا متعفن اور زہر آلود ہو جاتی ہے اور اس میں وبائی جراثیم کی خوب پرورش ہوتی ہے، کیونکہ میل کچیل اور غلاظتوں کی کثرت و بہتات کا یہی لازمی نتیجہ ہے۔

اسی طرح اگر اسلامی معاشرے میں برائی کو پنپنے دیا جائے اور اچھائی کا پرچار معدوم ہو

جائے تو کچھ مدت بعد لوگ گندے اور شریر النفس بن جائیں گے۔ اچھائی و برائی کا امتیاز مٹ جائے گا اور پھر اس زمین پر انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہوگا، چنانچہ مختلف اسباب و ذرائع سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں تباہ و برباد کر دیں گے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ﴾ (البروج:۸۵/۱۲)

''تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔''

اور فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ عَزِیۡزٌ ذُوانۡتِقَامٍ﴾ (آل عمران:۳/۴)

''اور اللہ غالب ہے، انتقام لینے والا۔''

(۳) یہ بات بھی تجربہ سے ثابت ہے کہ انسانی نفوس جب قبیح اور خراب چیزوں کے عادی ہو جائیں تو وہ انہیں اچھی لگتی ہیں۔ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دیا جائے تو لوگ اچھے کام چھوڑ دیتے ہیں اور برے کام کرنے لگ جاتے ہیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ برائی عام ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی عادات اور بتقاضائے بشری وہ برائی محسوس نہیں ہوتی، بلکہ الٹا اسے اچھائی اور عمدہ بات سمجھ لیا جاتا ہے اور یہی بصیرت کا ختم ہونا اور یہی فکری مسخ ہے۔ (العیاذ باللہ)

اسی بنا پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مسلمانوں پر لازم قرار دیا ہے کہ یہ انسانی معاشرے کی پاکیزگی اور درستی کا باعث ہے اور اقوام وملل کے عزوشرف کا محافظ بھی۔

آدابِ امر و نہی:

(۱) داعی یہ جانتا ہو کہ جس بات کا وہ حکم دے رہا ہے، وہ شریعت میں معروف اور نیکی ہے۔ اسی طرح وہ برائی کی حقیقت بھی سمجھتا ہو، جس سے منع کرتا ہے اور جسے مٹانے کی کوشش کر رہا ہے، نیز وہ کام واقعتاً شریعت میں گناہ ہو اور اسے حرام قرار دیا گیا ہو۔

(۲) اصلاح کرنے والا خود اس پر عامل ہو اور جس بات سے منع کر رہا ہے، اس کے قریب نہ

جائے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف: ۶۱/۲،۳)

’’اے ایمان لانے والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے؟ اللہ کے نزدیک یہ بڑی ناراضگی کا باعث ہے کہ تم وہ کہو جو نہ کرو۔‘‘

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾

(البقرہ: ۲/۴۴)

’’کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو؟ کیا تم سمجھتے نہیں۔‘‘

(۳) ایک مبلغ کو اچھے اخلاق کا مالک ہونا چاہیے، جو نرمی کے ساتھ حکم کرے اور منع کرے، اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شدت وتکلیف پہنچے تو دل میں محسوس نہ کرے اور نہ غصے کا اظہار کرے، بلکہ اس بارے میں درگزر، عفو اور اعراض سے کام لے۔ ارشاد عالی ہے:

﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (لقمان: ۳۱/۱۷)

’’اور اچھائی کا حکم دے، برائی سے منع کر اور تجھے جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر، یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔‘‘

(۴) برے کام جاننے کے لیے لوگوں کی جاسوسی نہ کرے۔ یہ بات غیر مناسب ہے کہ منکرات کی دریافت کے لیے لوگوں کے گھروں میں جھانکتے پھریں، یا کسی کا کپڑا اٹھا کر دیکھیں کہ اندر کیا ہے اور برتن کا ڈھکنا اٹھاتے پھریں کہ برتن میں کیا ہے، بلکہ شارع علیہ السلام نے تو لوگوں کے عیوب چھپانے کا بھی حکم فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ (الحجرات: ۴۹/۱۲)

''اور تم خفیہ انداز سے ٹوہ نہ لگاؤ۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَجَسَّسُوْا)) (صحیح بخاری)

''جاسوسی نہ کرو۔''

نیز فرمایا:

((مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَہُ اللّٰہُ فِیْ الدُّنْیَا وَالآخِرَۃِ)) (صحیح مسلم)

''جو شخص ایک مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔''

(۵) مبلغ جسے وعظ و تبلیغ کرنا چاہتا ہے، اسے نیکی اور برائی کی پہلے پہچان کرائے، اس لیے اولاً برائی اور نیکی کی ضروری وضاحت کرنی چاہیے۔

(۶) اچھائی کے حکم اور برائی سے منع کرنے کے بعد بھی اگر وہ نیکی پر عمل نہیں کرتا اور برائی والا برائی نہیں چھوڑتا تو شریعت کے مطابق ترغیب و ترہیب سے کام لے۔ اگر پھر بھی وہ تعمیل سے گریزاں ہے تو ڈانٹ اور سختی اپنائی جائے، اگر اس طرح بھی کام نہیں چلتا تو حکومت یا برادرانِ اسلام کا تعاون حاصل کیا جائے۔

(۷) اگر اپنے ہاتھ اور زبان سے برائی کو ختم نہ کر سکے کہ اس صورت میں اسے اپنی جان و مال اور عزت کے ضائع ہونے کا ڈر ہے اور وہ مصائب پر صبر کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر دل ہی سے اس کو برا جانے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہِ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہِ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہِ، وَ ذٰلِکَ أَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (صحیح مسلم)

''جو تم میں سے برا کام دیکھے، اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہیں تو زبان سے، ورنہ دل سے ضرور برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں و بصیرتیں:

۱) اسلام معاشرتی زندگی میں سدھار اور نکھار کا ہر وقت خیال رکھتا ہے، اسے کبھی اس کے حال پر

نہیں چھوڑتا۔ اگر بگاڑ پر توجہ نہ دی جائے تو معاشرتی نظام تلپٹ ہو جائے اور جنگل کا قانون چل نکلے، زور آور زیر دستوں کو دبانے لگیں، طاقتور کمزوروں کے حقوق سلب کرنے لگیں، امیر لوگ غریبوں کا استحصال کرنے سے نہ رکیں اور برائیاں آکاس بیل کی طرح ہر طرف پھیل جائیں، جاہلیت کے معاشروں میں یہی بات نظر آتی ہے۔

۲) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ حکومت اور افراد دونوں کے لیے ضروری ہے، حکومت کے پاس طاقت کے وسائل ہوتے ہیں، وہ قوت کے ساتھ برائیوں کو مٹا سکتی ہے، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ((فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ)) کہ برائی کو مٹانے کے لیے پہلی بات قوت اور طاقت سے مٹانے کی آئی ہے جو عوام الناس کے بس کا روگ نہیں ہے، اسی طرح نیکی کو پھیلانے میں حکومت پوری قوت صرف کرسکتی ہے۔

۳) عالم لوگوں کو حکم ہے کہ زبان اور قلم سے اسے روکیں اور اس کی ابتدا اپنے گھروں سے ہونی چاہیے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے اردگرد کے ماحول کو لیا جائے۔ اس طرح نیکیوں کو پھیلانے میں وعظ ونصیحت، دعوت وارشاد، حکمت وبصیرت اور ترغیب وترہیب کو پیش نظر رکھا جائے۔

۴) مملکتِ پاکستان آج سے کوئی ساٹھ برس قبل وجود میں آئی، اغیار کی غلامی سے اللہ تعالیٰ نے نجات دی کہ ہم اس خطہ ٔزمین میں رب العالمین کا قانون جاری وساری کریں گے۔ آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے یقیناً بے وفائی کی ہے اور جس عہد سے اس ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی، اس سے منحرف ہوئے ہیں۔ اب تک جتنی حکومتیں بنیں اور ٹوٹیں سب کی سب خواہشاتِ نفس کا شکار رہی ہیں۔ آج تک لوگ اسلامی نظامِ عدل کے لیے ترس رہے ہیں، حقوق کی پاسبانی سے محروم ہیں، پاکیزہ اور مضبوط نظامِ تعلیم کا فقدان ہے اور اسلامی فلاحی معاشرہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ملک بغیر کسی نظام کے چل رہا ہے، کیا ہم اس خراب وخستہ حالت پر توجہ دیں گے؟ ایسا نہ ہو کہ ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دشمن ہمیں پھر غلامی کے پنجۂ استبداد میں جکڑ لے۔

دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار

﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ○ وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ ○ وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ ○ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ﴾

(النحل:۱۶/۱۲۵-۱۲۸)

''(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجیے۔ یقیناً آپ کا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے اور اگر بدلہ لو بھی تو بالکل اتنا ہی جتنا صدمہ تمہیں پہنچایا گیا ہو اور اگر صبر کرلو تو بے شک صابروں کے لیے یہی بہتر ہے۔ (اے نبی!) صبر سے کام کیے جاؤ اور آپ کا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کیجیے اور نہ ان کے مکروفریب سے دل تنگ ہو، یقین مانیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کیے رہتے ہیں اور جو لوگ حسنِ سلوک کرتے رہتے ہیں۔''

لغوی تشریح: اُدۡعُ (اے نبی!) بلایے (لوگوں کو) فعل امر واحد مذکر حاضر (دَعَا، یَدۡعُو، دَعۡوًا وَ دَعۡوَۃً وَ دُعَاءً) مانگنا، طلب کرنا، دَعَا اِلَی الدِّیۡنِ، دین اسلام کی دعوت دینا، دین کی طرف بلانا۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ، بلایے (لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف، بِالْحِکْمَةِ حکمت کے ساتھ، حکمت کے معنی علم و عقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں، حکمت میں یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ مخاطب کی نفسیات اور فہم کے مطابق گفتگو کرنا، دعوت کو پورے شعور اور علم سے پھیلانا، لطافت اور نرمی کو پیش نظر رکھنا۔ (دیکھیے تفسیر......تیسیر الکریم الرحمٰن، فی تفسیر کلام المنان، عبدالرحمٰن ناصر السعدی)

﴿وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ اور اچھی نصیحت (کے ساتھ) اَلْمَوعِظَة نصیحت، اَلْحَسَنَة اچھی یعنی کہیں مخاطب کو ترغیب دی جائے اور کہیں ترہیب سے کام لیا جائے، وَجَادِلْهُمْ، اور بحث کیجیے ان سے، بِالَّتِیْ، اس طریقے کے ساتھ کہ، هِیَ اَحْسَنُ، جو بہت اچھا ہو، جدال بالاحسن کا مطلب ہے کہ اگر دورانِ دعوت و تبلیغ مخالف سے بحث کی ضرورت پڑے تو درشتی اور تلخی سے بچتے ہوئے نرم و مشفقانہ لب و لہجہ اختیار کرنا چاہیے۔ اِنَّ بلاشبہ، جملے میں زور پیدا کرتا ہے، رَبَّکَ (رَبَّ. کَ) رب، آپ کا، هُوَ اَعْلَمُ وہ خوب جانتا ہے، بِمَنْ اُس شخص کو جو، ضَلَّ گمراہ ہوا، عَنْ سَبِیْلِهٖ اس کی راہ سے، ہ کی ضمیر رب کریم کی طرف جاتی ہے، وَ هُوَ، اور وہ سبحانہ وتعالیٰ، اَعْلَمُ خوب جانتا ہے، بِالْمُهْتَدِیْنَ ہدایت پانے والوں کو، وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ اگر تم بدلہ لو، ماضی جمع مذکر حاضر (عَاقَبَ، یُعَاقِبُ، مُعَاقَبَةً) بدلہ لینا، فَعَاقِبُوْا تو بدلہ لو، فعل امر جمع مذکر حاضر، بِمِثْلِ، برابر اس (تکلیف) کے، مَا عُوْقِبْتُمْ جو تم ایذا دیے گئے ہو، بِهٖ، ساتھ اس کے، یعنی دعوت و تبلیغ میں مخالفین کی طرف سے اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو قدرت حاصل ہونے پر برابر کا بدلہ لے سکتے ہو، لیکن بدلہ لینے کی بجائے اگر تم صبر سے کام لو اور زیادتی کرنے والوں کو معاف کر دو گے تو اس کے نتائج تمہارے لیے بہتر ہوں گے، تمہارے حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔

﴿وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ﴾ اور اگر صبر کر لو تو بے شک صابروں کے لیے یہی بہتر ہے۔ اسلام نے بالکل صحیح طور پر فطرتِ بشری کے مطابق اجازت تو انتقام لینے کی بھی دی ہے لیکن مقامِ بلند صبر و تحمل اور عفو و درگزر ہی کا ہے۔ (تفسیر ماجدی)، وَ اصْبِرْ اور آپ صبر کیجیے، وَ مَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰهِ اور نہیں ہے آپ کا صبر کرنا مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے، اس راہ میں وہی آپ ﷺ کا مددگار اور وہی آپ کو استقامت دینے والا ہے۔ (تیسیرالکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان)

﴿وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡهِمۡ﴾ اور نہ آپ غم کریں ان پر، اگر آپ ﷺ کی دعوت پر ان کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملے تو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے (اس لیے کہ آپ نے فریضہ دعوت وتبلیغ حسن وخوبی سے ان تک پہنچا دیا ہے)

﴿وَ لَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ﴾ اور نہ ان کے مکر وفریب سے دل تنگ ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مکر وفریب، سازشوں اور چالوں کے مقابلے میں محسنین اور متقین کے ساتھ ہے، اسی حقیقت کو آخری آیتِ مبارکہ نے واضح کر دیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ساتھ ہے ان لوگوں کے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور (ساتھ ہے) ان لوگوں کے جو لوگوں کے ساتھ احسان کرتے رہتے ہیں۔ سید قطب شہید لکھتے ہیں:

”یہ ہیں دعوتِ اسلامی کی بنیادیں اور یہ ہیں تحریکِ اسلامی کے کام کے اصول وقواعد اور یہ طریقۂ کار خود نبی کریم ﷺ کے لیے وضع کیا گیا ہے، نیز آپ ﷺ کے بعد آنے والے تمام داعیانِ حق کے لیے یہی دستور العمل ہے اور یہی منہاجِ دعوت ہے۔

<u>دعوت الی اللہ:</u>

سب سے پہلے یہ ہے کہ یہ دعوت اِلی اللہ ہے، اللہ کے راستے اور اللہ کے نظام کی طرف دعوت، کسی شخصیت یا کسی قوم کی طرف نہیں ہے، اس میں داعی کا کردار صرف یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے، اس لیے دعوت دینا اس کا کوئی احسان نہیں ہے کہ وہ جتلاتا پھرے بلکہ یہ فریضہ بے لوث اور بے غرض ہے، لہٰذا اس کا اجر بھی اللہ پر ہے۔

<u>اصولِ حکمت:</u>

دعوتِ دین حکمت اور حسنِ تدبیر کے ساتھ جاری رہنی چاہیے، مخاطب کے ظروف واحوال کو اس میں مدنظر رکھنا اور یہ متعین کرنا چاہیے کہ مخاطب کو ایک وقت میں کون کون سی باتیں بتانا ضروری ہیں، یہ نہ ہو کہ لوگوں کو اس قدر احکام ونواہی مختصر وقت میں سنا دیے جائیں کہ وہ ذہنی طور پر ان کو سننے کے لیے تیار نہ ہوں، اس طرح وہ اسے ناقابل برداشت بوجھ سمجھ

لیں، طریقۂ دعوت معقول اور لوگوں کے مناسب حال ہو، داعی جوش وخروش میں آ کر سختی نہ کرے بلکہ اس کے مزاج میں اعتدال اور میانہ روی ہو۔

نرم لب ولہجہ:

حق بات کو نرم لب ولہجہ دلکش بنا دیتا ہے۔ بات اس انداز سے ہو کہ دل و دماغ میں بیٹھ جائے، صرف کو سنے اور شرمندہ کرنے کے انداز ہی کو نہ اپنائیں، داعی لوگوں کی ان غلطیوں کو نہ کھولے جو جہالت اور نادانی کی وجہ سے کسی سے سرزد ہو جائیں، بعض اوقات ایسی غلطیاں نیک نیتی سے ہو جاتی ہیں اور وعظ میں نرمی اور لطافت بعض اوقات اخلاق باختہ لوگوں کو حق کی طرف مائل کر دیتی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؏

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

اور زجر وتوبیخ، لعنت و ملامت کا اثر بعض اوقات الٹا ہوتا ہے۔

مجادلہ یا بحث:

مخالفین کے ساتھ اگر مجادلہ کا موقع پیش آئے تو وہ بھی احسن طریق سے ہو، یہ مناسب نہ ہوگا کہ مخالف پر علمی برتری کی بنا پر داعی حملہ آور ہو جائے اور اس کو ذلیل کرے یا اس کی قباحتیں بیان کرے، دعوت میں مباحثے کا انداز یہ ہو کہ مخاطب کو یقین ہو جائے کہ دعوت دینے والا محض غلبہ اور کلام میں برتری کا حصول نہیں چاہتا بلکہ وہ ایک حقیقت ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔

ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ عناد اور سرکشی کا مادہ ہوتا ہے اور ہر شخص کی عزتِ نفس ہوتی ہے، وہ آخر دم تک اپنی رائے کی مدافعت چاہتا ہے تا کہ ہزیمت اور شکست سے بچے، اگر داعی اچھے انداز میں مباحثہ اور مکالمہ کرے تو اس سے کسی شخص کے ذاتی احساس کو ٹھیس نہ پہنچے گی اور مخاطب یہ سمجھے گا کہ اس کی عزتِ نفس، اس کی شخصیت اور اس کی عزت و آبرو محفوظ ہے اور داعی صرف دعوت پہنچانا چاہتا ہے۔ محض اللہ کے لیے اسے ایک اچھی راہ کی طرف بلا رہا ہے، اس کام کے لیے اس کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہے، نہ وہ اپنی فتح اور مخاطب کی شکست چاہتا ہے۔

شستہ اور شائستہ اندازِ دعوت:

ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾

''یقیناً آپ کا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔''

داعی الی اللہ کو یہ نصِ قرآنی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ دراصل اللہ ہی علیم ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے اور کون ہدایت پانے والا ہے، لہٰذا بحث و مباحثہ کے اندر بہت زیادہ جوش اور جدال کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ شستہ اور شائستہ انداز میں دعوت کو پیش کیا جائے اور اس کے بعد اس کے نتائج اللہ پر چھوڑ دیے جائیں۔

مخالفین کی دست درازی کا مناسب جواب:

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلامی پیش کرنے پر مخالفین دست درازی پر اتر آتے ہیں، چونکہ دست درازی ایک محسوس اور مادی فعل ہے، اس لیے سچائی کی عزت اور سچائی کے مقام کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ باطل کو دست درازی کا مناسب جواب دیا جائے، مگر اس میں بھی حدود و قیود کا پوری طرح خیال رکھا جائے گا، عدل و انصاف کا قیام اسلام کی خصوصیت ہے، اہل اسلام کو اپنے دفاع کا پورا حق ہے، مگر اس میں اعتدال کی راہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور دوسروں پر ظلم و زیادتی کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ اس لیے حکم ہوتا ہے:

﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾

''اگر تم بدلہ لو بھی تو بالکل اسی قدر جتنا صدمہ تمہیں پہنچایا گیا ہو۔''

یہ طریق کار دعوتِ اسلامی کے مزاج میں داخل ہے اور اس کے عزت و وقار کا باعث ہے اور کوئی ایسی دعوت جس کا وقار ہی نہ ہو، لوگ اسے ہرگز قبول نہیں کرتے اور نہ لوگوں کو یقین آتا ہے کہ یہ دعوت دین ہے، پھر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ دعوتِ

اسلامی کو یوں بے وقار اور لاچار چھوڑ دے، اس لیے دفاع عزت و وقار کو بحال کرتا ہے مگر حدود و قیود کے دائرہ میں رہتے ہوئے۔

داعی الی اللہ کا منصب:

داعی الی اللہ کا منصب یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر سچائی کا امین ہے، اس نے لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا ہے اور نسلِ انسانیت کو راہ راست کی طرف بلانا ہے، اگر وہ دست درازی کرنے والوں کی مناسب روک تھام نہ کر سکے تو بھلا قیامِ امن کی اس سے کیونکر توقع ہوسکتی ہے؟ اس سلسلے میں مناسب جواب اور سرزنش کا اصول، 'اصولِ قصاص' ہوگا۔

یہ درست ہے کہ قرآن حکیم عفو و درگزر کی تعلیم دیتا ہے لیکن عفو و درگزر اس وقت ہوتا ہے جب انسان انتقام اور بدلہ لینے پر قدرت رکھتا ہو اور ایسے حالات میں عفو و درگزر کا بہت ہی خوشگوار اثر ہوتا ہے اور دعوت کو بہت فائدہ بھی ہوتا ہے (جیسا کہ انتقام کی قدرت رکھتے ہوئے فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عام معافی کا اعلان فرمایا، جس کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے)

اس کے برعکس اگر دعوت الی اللہ کی توہین ہوتی ہو اور اس کے وقار پر حرف آتا ہو تو اس صورت میں قصاص کا اصول ہی بہتر ہوتا ہے۔

صبر کی تلقین اور جزا:

چونکہ صبر اور درگزر کرنے سے داعی اپنے جذبات اور جذبۂ انتقام پر کنٹرول کرنا سیکھتا ہے، اس لیے قرآن حکیم نے اس فعل اور اس کے اجر کو اللہ تعالیٰ اور آخرت سے وابستہ کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ ○ وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾

''اور اگر صبر کر لو تو بیشک صابروں کے لیے یہی بہتر ہے۔ اور (اے نبی!) صبر سے (دعوت وتبلیغ) کا کام کیے جاؤ اور آپ ؐ کا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔''

یہ اللہ ہی ہے جو صبر اور ضبطِ نفس کی توفیق عطا فرماتا ہے اور یہ جذبۂ للّٰہیت ہی ہے جو انسان

کو ذاتی انتقام اور قصاص و بدلہ لینے کے مقابلہ میں صبر پر آمادہ کرتا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

داعی الی اللہ کے لیے خوشخبری:

ان آیات کے آخر میں داعی الی اللہ کے لیے بے پناہ خوشخبری دی گئی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾

''یقین مانیے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کیے رہتے ہیں اور جو لوگ حسن سلوک کرتے رہتے ہیں۔''

''قرآن حکیم میں تقویٰ اور احسان کا بڑا درجہ ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ اللہ تعالیٰ کی معیت متقین کے ساتھ اس معنی میں ہوتی ہے کہ وہ انہیں گناہوں سے بچاتا رہتا ہے اور طاعتوں کی توفیق دیتا رہتا ہے اور اپنی رحمت و فضل سے انہیں اپنی حفاظت میں رکھتا ہے، اہل تقویٰ وہ لوگ ہیں جو احکام الٰہی کی پوری پوری تعمیل کرتے رہتے ہیں، اس میں تعمیلِ احکام کی جانب اشارہ ہو گیا۔ ﴿اَلَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾ وہ لوگ جو خلق کے ساتھ بہترین سلوک سے پیش آتے رہتے ہیں، اس میں اللہ کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کی جانب اشارہ ہو گیا۔'' (تفسیر ماجدی)

آیات مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ سے دعوت کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، رب کائنات کی طرف لوگوں کو بلانا بہت قیمتی بات ہے اور جو لوگ یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے۔

۲) دعوت دینے والے کے لیے علم کی گہرائی کے ساتھ ساتھ حکمت و بصیرت اور صبر و تحمل ایسی صفات کی بھی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں اسوۂ انبیائے کرام اور خاص طور پر سیرتِ طیبہ ﷺ کا مطالعہ سود مند ثابت ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تبلیغ دین (۱)

﴿یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ﴾ ”اے رسول!(ﷺ) جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے (لوگوں تک) پہنچا دیجیے۔“ (المائدہ:۵/۶۷)

یٰٓاَیُّھَا اے، حرف ندا، اَلرَّسُوْلُ رسول ﷺ، بَلِّغْ پہنچا دیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر (بَلَّغَ، یُبَلِّغُ، تَبْلِیْغًا) پہنچانا، اللہ کا پیغام پہنچانا، تبلیغ، دعوتِ حق، مَآ جو کچھ، اُنْزِلَ نازل کیا گیا آپ ﷺ کی طرف آپ ﷺ کے رب کی طرف سے، ماضی مجہول (اَنْزَلَ، یُنْزِلُ) نازل کرنا، اِلَیْکَ (اِلٰی. کَ) طرف۔ آپ کی، یعنی جو وحی آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے، مِنْ رَّبِّکَ (رَبِّ. کَ) آپ ﷺ کے رب کی طرف سے۔

جسم و روح کا رشتہ:

جناب پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

”انسان بنیادی طور پر دو ایسی ضروریات کا محتاج ہے جن سے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا، ایک طرف اُسے اُن اشیاء اور وسائل کی ضرورت درپیش ہے جو اس کی مادی احتیاجات کو پورا کریں، جن کے ذریعہ وہ اپنے جسم اور روح کے رشتے کو قائم و استوار کرے اور بقائے حیات کے مادی تقاضوں کو پورا کرے، دوسری طرف وہ اس ہدایت اور رہنمائی کا محتاج ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی اخلاقی اجتماعی اور تمدنی زندگی کی تشکیل، صحت

مند بنیادوں پر کر سکے اور اس طرح انسانیت کے حقیقی مقاصد کی بوجہ اَحسن تکمیل کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا تقاضا:

اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ عامہ کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کی ان دونوں ضرورتوں (مادی و روحانی) کو پورا کرے، پہلی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس نے زمین و آسمان میں وسائلِ معیشت کا ایک ختم نہ ہونے والا خزانہ ودیعت کر دیا ہے اور انسان ان وسائل کے ذریعہ اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے۔ پوری کائنات انسان کے لیے اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے اور اپنے سینے سے وہ وسائل اُگل رہی ہے جو انسانیت کی بے شمار اور ہر آن بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو بحسن وخوبی پورا کر رہی ہے ؎

دَما دم رواں ہے یمِ زندگی
ہر ایک شے سے پیدا رمِ زندگی

پاکیزہ اور روحانی زندگی کا سروسامان:

انسان کی دوسری بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور اپنے نبی مبعوث فرمائے تاکہ وہ انسان کو زندگی کی حقیقت سے روشناس کرائیں، انہیں زندگی کے معنی اور اس کے مقاصد سے آشنا کریں، انہیں جینے کے طریقے سکھائیں اور اُن اصولِ تمدن کی تعلیم دیں جو زندگی کو اس کے اصل مقاصد سے ہمکنار کر دیں اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر ایک صحت مند نظام قائم کریں جس میں زمین اپنی نعمتیں اُگل دے اور آسمان اپنی برکتیں نازل کرنے لگے۔

انبیاءعلیہم السلام کی بعثت کا مقصد:

انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ اور بندے کے تعلق کو توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کی بنیادوں پر استوار کرائیں اور دعوتِ دین اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعے تاریخ کی رَو کو موڑ دیں اور الہامی ہدایت کی روشنی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کریں۔

سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ

بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:۵۷/۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) کو اُتارا تا کہ انسانوں میں انصاف قائم کریں۔

سورۃ الصّف میں ﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصف:۶۱/۹)

''وہی (رب العالمین) تو ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اس کو تمام نظامہائے زندگی پر غالب کر دے۔''

یہ ہے انبیاء علیہم السلام کا مشن اور یہی وجہ ہے کہ نبی کی جو حیثیت اس کی تمام حیثیتوں سے نمایاں اور ممتاز ہے وہ داعی اِلَی الحق کی حیثیت ہے۔ اسلام کا اصل مقصد انسانی زندگی کو ایک خاص نہج پر چلانا ہے۔ اِسلام کوئی پوجا پاٹ کا جامد نظام نہیں، بلکہ ایک زندہ متحرک تحریکِ فکر وعمل ہے، جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ہدایتِ الٰہی کا پابند بناتی ہے، اسلام ایک دعوت ہے جو انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلاتی اور اُن کی زندگیوں کو نورِ الٰہی سے منور کرتی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین، ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی تمام وسعتوں پر حاکمیت الٰہی قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ انبیاء وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو اس دعوت کے داعی اور اس تحریک کے قائدین ہیں اور جن کی رہنمائی میں یہ اصلاحی جدوجہد برپا ہوئی اور جس سلسلۃُ الذہب کی آخری کڑی جناب محمد رسول اللہ ﷺ تھے، قرآن حکیم آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد اس بات کو قرار دیتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (الجمعہ:۶۲/۲)

''وہی اللہ ہے جس نے اُمیّوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا، جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾

''اے رسولؐ! جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے (لوگوں تک) پہنچا دیجیے۔''

اور ارشاد ہوا:

﴿فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ وَاسۡتَقِمۡ کَمَآ اُمِرۡتَ﴾ (الشوریٰ:۴۲/۱۵)

''(اے محمدؐ!) پس اُسی دین کی طرف دعوت دیجیے اور جس طرح آپ کو حکم دیا گیا، اسی پر مضبوطی سے قائم ہو جایے۔''

اِن آیاتِ ربانی سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کی بنیادی حیثیت داعی الی اللہ کی ہے، آپ ﷺ کا اصل مشن یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات لوگوں تک پہنچا دیں کہ وہ دین کو اپنی پوری زندگی پر غالب کر دیں، پھر جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہیں انہیں ایک تحریک اور ایک امت میں منظّم کریں، ان کے اخلاق کا تزکیہ کریں، ان میں کردار کے جوہر پیدا کریں اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعہ اپنی قیادت و رہنمائی میں وہ تہذیب وتمدن قائم کریں جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، اسلام فکر ونظر اور علم وعمل میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے، وہ انسان کو غیر اللہ کی ہر غلامی سے نجات دلا کر اس کی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا چاہتا ہے، اس کا پیغام یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سماجی ہو یا سیاسی، معاشرتی ہو یا معاشی، قومی ہو یا بین الاقوامی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرو، ہر اطاعت پر اللہ ہی کی اطاعت ہو اور ہر قانون پر اللہ ہی کا قانون مقدم ہو۔

حاکمیتِ الٰہی

نبی اکرم ﷺ کی دعوت حاکمیتِ الٰہی کی دعوت تھی اور آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے دعوتِ اسلامی کے کام کو باقی تمام کاموں پر مقدم رکھا اور ہر دور اور ہر حالت میں اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف رہے، آپ ﷺ اول بھی داعی تھے اور آخر بھی داعی...... اور صرف داعی اِلی اللہ۔

آیے! آپ ﷺ کی دعوتی زندگی کے چند اہم پہلوؤں کا مطالعہ کریں تا کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو آپ ﷺ کے اُسوہ حسنہ کی روشنی میں ادا کرنے کی کوشش کر سکیں، اس لیے کہ داعی الی الحق کی جو ذمہ

داری آپ کے مبارک شانوں پر تھی، اب وہ پوری امتِ مسلمہ کے کندھوں پر ہے:

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (الحج:۲۲/۷۸)

''تا کہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔''

یعنی جس طرح نبی اکرم ﷺ نے حق کی شہادت اور گواہی دی، اب اس طرح پوری امت کو تمام انسانیت کے ساتھ اُس حق کی شہادت دینی ہے۔

سب سے پہلے مومن:

۱- آپ ﷺ کی دعوتی زندگی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جو تعلیم آپ ﷺ نے دنیا کو دی اس پر سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ ﷺ خود تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (البقرہ:۲/۲۸۵)

''رسول اس پر ایمان لائے جو رب کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا اور تمام مومن بھی آپ ﷺ کی اس ہدایت پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔''

﴿اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔''

﴿اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ''میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔''

جو دعوت آپ ﷺ نے دی آپ کی پوری زندگی اس کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ بقولِ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی زندگی سراپا قرآن تھی۔ دنیا میں بے شمار مصلح اور فلسفی آئے جو گفتار کے غازی تو ضرور تھے مگر کردار کے غازی نہ تھے۔ جو تعلیم انہوں نے دی وہ خود اس پر عامل نہ تھے، مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت ہے کہ آپ نے اپنی دعوت کے ہر پہلو پر خود عمل کر کے دکھا دیا اور انسانیت کے لیے بہترین نمونہ پیش فرمایا تا کہ لوگ صرف آپ ﷺ کے ارشادات ہی سے ہدایت حاصل نہ کریں بلکہ آپ کے افعال و اعمال کی بھی پیروی کریں اور زندگی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا باقی نہ رہے جس پر آپ ﷺ کے سیرت و کردار کی گہری چھاپ موجود نہ ہو۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

کلی انقلاب:

دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ آپ نے جزوی اِصلاح کے مقابلے میں کلی انقلاب کی جدوجہد کی۔ آپ کا مقصد چند جزئیات میں تبدیلی پیدا کرنا نہ تھا بلکہ پوری زندگی کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق استوار کرنا تھا۔ آپ نے لوگوں کے خیالات اور نظریات کی اصلاح کی اور انہیں ایک ایمان اور جوشِ زندگی بخشا۔ آپ ﷺ نے ان کے اخلاق و کردار کو سنوارا اور ایک نیا انسان پیدا کیا۔ آپ نے تمدن و معاشرت کی اصلاح فرمائی اور ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر کی۔ آپ ﷺ نے طاغوت کو زندگی کے ہر میدان میں شکستِ فاش دی اور پھر وہاں حاکمیتِ الٰہی کے تخت بچھائے۔ یہ ایک ہمہ گیر انقلاب تھا اور انسانی تاریخ کا وہ واحد انقلاب ہے، جس نے انسانیت کی پوری زندگی کی اصلاح وتعمیر کی۔

طوفانوں کا مقابلہ:

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ کو دین کی فتح و کامرانی اور اس کی سربلندی پر ہمیشہ گہرا اور غیر متزلزل یقین رہا۔ عین اُن پُر آشوب حالات میں جب مسلمانوں کی کشتی مخالفتوں کے طوفانوں میں گھِری ہوئی تھی اور دور دور ساحل کا کہیں نام ونشان نہ ملتا تھا اور روشنی کی کوئی رمق موجود نہ تھی۔ اُس وقت بھی قطعاً مایوس نہ ہوئے۔ مکی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ مسلمان قریش کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ہر مسلمان کی جان خطرہ میں تھی۔ صبح ہوتی تھی شام کا بھروسا نہ تھا اور شام ہوتی تھی تو صبح کا یقین نہ تھا۔ بظاہر اسلام کا کوئی مستقبل نظر نہ آ رہا تھا اور جو دن گزرتا تھا غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں ایک مظلوم مسلمان سیدنا خباب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ بیت اللہ کے سامنے بیٹھے تھے۔ سیدنا خبابؓ نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! اب تو پانی سر سے گزرا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ ہمارے لیے دعا کیجیے۔'' آنحضرت ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بس خبابؓ! گھبرا گئے۔ پہلی امتوں میں تو یہ ہوا کہ مومن کو گڑھا کھود کر گاڑ دیا گیا اور سر پر آرا چلایا گیا یہاں تک کہ اس کے بدن کے دو ٹکڑے ہو کر گر گئے اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا مگر اس کے استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ اللہ کی قسم اللہ! وہ اپنے دین کو مکمل کرے گا یہاں تک کہ (اس دین کی عمومیت اور غلبہ) کا یہ حال ہو گا کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک سینکڑوں میل کی مسافت طے کرتا چلا جائے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا کھٹکا نہ ہو گا۔ سوائے اس کے کہ اس کو بھیڑیے

سے خطرہ ہو کہ وہ اس کی بکریوں پر حملہ کرے، لیکن تم جلدی بہت کرتے ہو۔"

یہ واقعہ کئی حیثیت سے بڑا اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو اپنی دعوت پر کتنا اعتماد ہے کہ بڑی سے بڑی مشکل اور آزمائش کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی عمومیت اور غلبہ کا مقصد اپنی تمام ضمانتوں کے ساتھ اس کے سامنے اس وقت بھی تھا جب غلبہ وحکمرانی بظاہر ناممکن نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی استقامت کے اس مقام پر ہوتا ہے جہاں سے کوئی چیز اس کے ارادہ کو متزلزل نہیں کرسکتی۔

لگن اور تڑپ:

تیسری چیز ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ آپ نے بعثت سے لے کر اپنے آخری سانس تک دین کی دعوت کو پھیلانے کی کوشش اس اِنہماک اور تندہی سے کی کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ کا ہر لمحہ اسی فکر میں بسر ہوتا تھا کہ کسی طرح اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک پہنچائیں اور ان کو جہنم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچائیں۔ یہ فکر آپ کو اس درجہ دامن گیر رہتی تھی کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ دن بھر کی تبلیغی جدوجہد اور دشمنوں کی اذیت رسانی سے چور ہو کر رات کو تھکے ہارے گھر واپس آئے۔ بدن بخار سے تپ رہا تھا اور آپ چند منٹ کے لیے لیٹ گئے۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ مکہ سے چند میل پر ایک پہاڑی کے نیچے ایک قافلہ آ کر رکا ہے۔ یہ سنتے ہی آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے تا کہ ان تک اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ بہت تھکے ہوئے ہیں قافلہ والوں سے کل صبح مل لیں۔ آپ نے فرمایا: کیا معلوم صبح تک مجھے موت آ جائے یا وہ قافلہ راتوں رات کہیں اور چلا جائے اور اس صورت میں میرا فرض نامکمل رہ جائے۔ دیکھیے دعوتِ اسلامی کے کام کو حضور ﷺ کتنی اہمیت دیتے ہیں اور فرض کی بجا آوری کو کیا مقام آپ نے دیا۔ فرض شناسی کی یہ مثال ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے۔

حکمت و دانشمندی:

پھر آپ کی دعوتی زندگی کا یہ بھی ایک نمایاں پہلو ہے کہ آپ نے ہر مرحلے اور ہر دور کے حالات کے مطابق دعوتِ دین کی راہیں نکالیں اور ہر زمانہ میں نہایت حکمت و دانشمندی کے ساتھ کلمۂ حق کا

اظہار کیا اور بالآخر دین حق کو قائم کیا۔ بعثت کے فوراً بعد خاموشی کے ساتھ آپ نے اپنی دعوت کا آغاز کر دیا اور قریبی حلقوں میں دین کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ بعثت کے تیسرے سال جب دعوت عام کی اجازت ملی تو آپ نے تمام قریش کو فاران پر جمع کیا اور اسلام کی دعوت ان تک پہنچائی۔ پھر معززینِ قبیلہ کو خصوصی دعوت دی اور کھانے پر بلا کر ان کو اللہ کے کلام سے آگاہ کیا۔ آپ ایک ایک قبیلہ، ایک ایک خاندان، ایک ایک گروہ اور ایک ایک فرد تک پہنچے اور ان کو اسلام سے روشناس کرایا، نجی گفتگو میں مکالمات و مذاکرات، تقریر و وعظ الغرض ہر ممکن طریق سے اسلامی تعلیمات ان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی اور جب تک دعوت کی راہیں کھلی رہیں۔ آپ برابر حق کی طرف برملا بلاتے رہے اور جب کھلے بندوں تبلیغ کا امکان نہ رہا تو خاموشی سے نجی ملاقاتوں کے ذریعے اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے۔ جب آپ ﷺ کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا تو آپ خاموشی کے ساتھ جن جن مقامات پر جا سکتے تھے۔ اس زمانہ میں بھی ان مقامات پر دعوت پہنچانے سے آپ نہ رکے۔ پھر جب مکہ میں دعوت کے مزید پھیلانے کا امکان نہ رہا تو آپ ﷺ نے مکہ سے باہر جا کر دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیا۔ میلوں اور جلسوں کے موقع پر باہر کے قبائل سے ملے۔ طائف کا سفر کیا اور دوسرے بیرونی قبائل کو اپنی دعوت کی طرف بلایا، حتیٰ کہ بیرونی قبائل میں اس کوشش ہی کے نتیجہ میں اسلامی دعوت کو نیا مرکز مل گیا اور اہل مکہ کی سختی اور ان کا تشدد ذریعہ بنے، دینِ حق کے نئے مرکز مدینۂ رسول کے قیام اور اس کے ذریعہ بالآخر دعوتِ اسلامی کے غلبہ کا!

پھر مدینہ میں جب قوت و اقتدار اسلام کو حاصل ہو گیا تو آپ ﷺ نے ریاست کی تمام طاقتیں دعوتِ اسلامی کے فروغ کے لیے وقف کر دیں۔ ایک طرف مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کی اور دوسری طرف اس ریاست کے ذریعہ تمام عرب اور بالآخر پوری دُنیا کو اسلام کی دعوت دی۔

استقامت:

پھر آپ کی زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلامی کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر کونے اور جہت سے اس کی مخالفت کی جائے اور مخالفت کی نت نئی صورتیں نکالی جائیں۔ آپ ﷺ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپ ﷺ کو سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا۔ آپ

کے متعلق افواہیں پھیلائی گئیں۔ آپ ﷺ پر پتھر پھینکے گئے۔ آپ ﷺ کو زدوکوب کیا گیا، آپ ﷺ کے گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا گیا۔ عین عالمِ سجدہ میں آپ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی تک رکھ دی گئی۔ آپ ﷺ کے ساتھیوں کو آگ پر لٹایا گیا، ریت پر گھسیٹا گیا، پتھر کی سلوں کے نیچے دبایا گیا، اتنا مارا گیا کہ وہ شہید ہو گئے، لیکن ہر حال میں آپ ثابت قدم رہے، آپ ﷺ نے دعوتِ اسلامی کا کام جاری رکھا اور راہ کی کوئی مشکل اور مصیبتوں کا کوئی طوفان آپ ﷺ کی پیش قدمی کو نہ روک سکا۔ اسی طرح کوئی لالچ اور کوئی ترغیب خواہ وہ دولت کی ہو یا سرداری کی یا بادشاہت کی، آپ ﷺ کو اپنے مشن سے ہٹا نہ سکی اور ہر حالت میں آپ ﷺ نے کہا تو یہی کہا:

"اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ کر کہیں کہ مہر و ماہ کے عوض میں تبلیغ دین کا کام ترک کر دوں تو مجھے منظور نہیں، اگر اس راہ میں مجھے ہلاکت نظر آئے تب بھی میں پیچھے نہ لوٹوں گا، حتیٰ کہ یہ مشن کامیاب ہو یا میں اس میں کام آ جاؤں۔"

یہ تھا داعی کا عزم! اور سچ ہے کہ داعی اگر اپنے مشن میں سچا اور اپنی دھن کا پکا ہو تو انہی مشکلات سے کامیابی کی راہیں پھوٹیں گی اور دین حق فاتح و کامران ہو گا جس طرح کلی کی موت ہی کے بعد پھول خندہ زن ہو سکتا ہے اور جس طرح آگ کے جلے بغیر روشنی اور حرارت ممکن نہیں اسی طرح آزمائش اور ابتلاء کے بغیر دعوتِ حق کی کامیابی کا امکان نہیں، فتح مکہ کی منزل، شعبِ ابی طالب کی گرفتاری، طائف کی ہزیمت اور بدر و اُحد کی خوں پاشی کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور یہی فطرت کا قانون ہے۔

((وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا))

"اور تم اللہ کے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔"

آیتِ مبارکہ میں حکمتیں و بصیرتیں

ا) اسلام کا چمن دعوت و تبلیغ ہی سے سرسبز و شاداب ہوا۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ سب سے

پہلے داعی الی اللہ تھے اور اس فریضہ کو انتہائی لگن اور تڑپ محبت اور محنت سے ادا فرمایا، اس راہ میں ہر تکلیف اور مشقت کو اٹھایا، پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ذمہ داری کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا، اس کے بعد اسلاف یہ فریضہ انجام دیتے رہے اور اسلام کی آواز چار دانگ عالم تک پہنچی۔

۲) دعوت وتبلیغ کے فریضہ کی ادائیگی امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے، بلکہ اس کا ہر ہر فرد پیغام حق کو پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ افسوس کہ اس فرض کی ادائیگی میں ہم سب غفلت کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ اولیٰ میں اسلام جس برق رفتاری سے پھلا پھولا اس کے بعد مسلمانوں کی غفلت کی وجہ سے وہ بات نہ پیدا ہوسکی۔

سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو وصیت کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

اِذَا قُمۡتَ فِی صَلَاتِكَ فَصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ

(مسند احمد)

”جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اسے الوداعی نماز سمجھ کر ادا کیا کرو۔“

رسول اللہ ﷺ اور تبلیغ دین (ب)

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (یوسف:۱۲/۱۰۸)

”(اے نبی!) آپ اِن سے صاف کہہ دیجیے کہ ”میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔“

لغوی تشریح: قُلْ کہہ دیجیے (اے نبی!) فعل امر واحد مذکر حاضر (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ یہی میرا راستہ ہے، اَدْعُوْٓا میں بلاتا ہوں (میں تمہیں دعوت دیتا ہوں) فعل مضارع واحد متکلم (دَعَا، یَدْعُوْا، دَعْوًا وَ دَعْوَةً) دعوت دینا، جیسا کہ دَعَا اِلَی الْاِسلام، اسلام کی طرف دعوت دینا، دَعَا اِلَی الصَّلٰوةِ نماز کی ترغیب دینا۔(القاموس الوحید) اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ میں بلاتا ہوں (تمہیں) اللہ کی طرف (کہ اُس خالق و مالک کے مطیع اور فرمانبردار بندے بن جاؤ) عَلٰی بَصِیْرَةٍ بصیرت پر ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی روشنی عطا فرمائی ہے، اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ میں اور وہ لوگ (صحابہ رضی اللہ عنہم) جنہوں نے میری پیروی کی ہے، وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ اور پاک ہے اللہ (شریکوں اور عیوب سے)، وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ اور نہیں ہوں میں مشرکوں میں سے۔

داعی الی اللہ کی صفات:

۱- اَلْعِلْم:

داعی الی اللہ کے لیے قرآن وسنت کا علم اساسی اور بنیادی بات ہے، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ

رسول اللہ ﷺ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین نے دعوت کا کام کسی طرح سر انجام دیا؟ گویا کہ سیرتِ رسول ﷺ اور سیرتِ اصحاب الرسول ﷺ پر گہری نظر ہونی چاہیے۔

غور کیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی میں پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ (العلق:۹۶/۱-۵)

”پڑھیے (اے نبی!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھیے! آپ کا رب تو بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ علم سکھایا جسے وہ نہیں جانتا ہے۔

علم نام ہی اس بات کا ہے کہ انسان نا معلوم سے معلوم کی طرف بڑھے، جو باتیں وہ نہیں جانتا، اُسے سیکھے اور سمجھے ظاہر ہے کہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں احکام الٰہی کو جاننا ضروری ہے۔ داعی جانے گا تو آگے بیان کرے گا، اور ان احکام کو سیرتِ طیبہ کی روشنی میں معلوم کیا جائے گا، اہل علم کی فضیلت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر: ۳۹/۹)

”(اے نبیؐ!) ان سے پوچھیے کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں۔“

قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں عالم وہ شخص ہے جو علم کے مطابق عمل بھی کرتا ہے، ایک اور مقام پر اس طرح فرمایا:

﴿یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ (المجادلہ:۵۸/۱۱)

”تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا۔“

ان احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((مَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَلْتَمِسُ فِیْهِ عِلْمًا، سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِیْقًا اِلَی الْجَنَّةِ))

(رواہ مسلم، کتاب العلم، ریاض الصالحین)

جو شخص علم کی تلاش میں کوئی راستہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا۔

اور مبلّغ کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اس طرح دعا فرمائی:

((نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ)) (رواه ترمذی، حواله ایضاً)

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جو میری بات دوسروں تک مِن وعَن پہنچا دے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص کو بات پہنچائی جا رہی ہے وہ راوی سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔"

۲- اَلْعَمَلُ:

احکام الٰہی کو سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں جاننا علم دین ہے اور ان احکام کو زندگی میں جاری و ساری کرنا عمل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ علم اور عمل لازم و ملزوم ہیں، گویا کہ ان کا چولی دامن کا تعلق ہے، عربی زبان کا ایک محاورہ ہے:

اَلْعِلْمُ بِدُوْنِ الْعَمَلِ وَبَالٌ وَالْعَمَلُ بِدُوْنِ الْعِلْمِ ضَلَالٌ

"یعنی علم بغیر عمل کے وبالِ جان ہے اور عمل بغیر علم کے گمراہی ہے۔"

قرآن حکیم میں ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کی بار بار تاکید آئی ہے اور اُسی پر انعام و اکرام کی نوید ہے۔ ان آیات پر غور کیجیے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (هود:۱۱/۲۳)

"جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور (زندگی بھر) اپنے رب ہی کے ہو کر رہے تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔"

رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ

لَنَجۡزِیَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴾ (النحل:۱۶/۹۷)

''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن، اُسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو اُن کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔''

ان احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے:

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

((أَحَبُّ الدِّیْنِ اِلَیْهِ مَا دَاوَمَ صَاحِبُهٗ عَلَیْهِ)) (ریاض الصالحین، باب فی المحافظه علی الاعمال)

''اللہ تعالیٰ کو وہی عبادت اور عمل محبوب ہے جس پر عمل کرنے والا ہمیشہ قائم رہے۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((کُلُّ أُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ أَبٰی، قِیْلَ: وَ مَنْ یَأْبٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: 'مَنْ أَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ أَبٰی))

(رواہ البخاری، باب فی الاَمر بالمحافظةِ علی السُنّةِ و اٰدابها، حواله ریاض الصالحین)

''(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا) میری امت کے سب لوگ جنت میں جائیں گے مگر وہ جنت سے محروم رہیں گے جنہوں نے انکار کیا۔'' لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! انکار کون کرے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا، جس نے نافرمانی کی اُس نے انکار کیا۔''

داعی الی اللہ کے لیے جہاں یہ بات ضروری اور لازمی ہے کہ وہ قرآن وسنت کے علم سے پوری طرح واقف ہو تو ساتھ ساتھ اُس کی زندگی اُن تعلیمات کا عملی نمونہ بھی ہو۔ ایسا نہ ہو جس کا قرآن نے اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ﴾ (الصف:۶۱/۲)

''اے ایمان والو! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟''

داعی الی اللہ کی کوئی بات موثر نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اپنی زندگی اس سانچے میں ڈھلی نہ

ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رب کائنات اور اس کے احکام پر سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (البقرہ:۲/۲۸۵)

رسول اللہ ﷺ اُس ہدایت پر ایمان لائے ہیں جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ رسول اللہ ﷺ کو ماننے والے ہیں، انہوں نے بھی اس ہدایت کو تسلیم کر لیا ہے۔

پھر آپ ﷺ کی حیات طیبہ اس قرآن کی جیتی جاگتی تصویر تھی، جب اُمُّ المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ سے آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے اس طرح جواب دیا:

((كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ))

''آپ کے اخلاق تو قرآن کی عملی تفسیر تھے۔''

۳- اَلْاِخْلَاصُ:

(خَلَصَ، يَخْلُصُ، خُلُوْصًا وَ خِلَاصاً) خالص ہونا، کھرا ہونا، صاف ستھرا ہونا، خَلَصَ لِلّٰهِ دِيْنَهٗ خلوص نیت سے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، دین میں ریاکاری سے بچنا، سچے دل سے اور نام و نمود کے بغیر دین پر عمل کرنا (القاموس الوحید) قول و عمل میں اخلاص کو ملحوظ رکھنا ہی ایمان کی بنیاد ہے، اس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، قرآن و حدیث میں اخلاص سے اعمال سرانجام دینے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ (البینۃ:۹۸/۵)

''(اہل کتاب کو اس سے پہلے) اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں، اُسی کے لیے دین کو خالص رکھیں، ابراہیمؑ حنیف کے دین پر اور نماز کو قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں، یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''حنیف کے معنی میں ''مائل ہونا'' کسی ایک طرف یکسو ہونا، حنفاء جمع ہے، یعنی شرک

سے توحید کی طرف اور تمام ادیان سے منقطع ہو کر صرف دین اسلام کی طرف مائل اور یکسو ہوتے ہوئے، جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔'' (اَحسنُ البیان)

ایک اور مقام پر رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا:

﴿قُلْ اِنِّیٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (الزمر:۳۹/۱۱-۱۲)

''(اے نبی!) ان سے کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں۔''

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں: قُلْ اِنِّیٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ '' اَیْ: اَمَرَنِی اللّٰهُ أَنْ اَعْبُدَه عِبَادَةً خَالِصَةً مِنَ الشِّرْكِ وَالرِّيَاءِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ

یعنی مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس کے دین کے لیے خلوص سے کروں ایسی عبادت جو شرک، ریا اور ہر اس قسم کے گناہوں سے پاک ہو۔

وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ای: مِن هٰذِهِ الْاُمَّـةِ، وَ كَذٰلِكَ كَانَ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّـهٗ اَوَّلُ مَنْ خَالَفَ دِيْنَ آبائهٖ وَ دَعَا اِلَى التَّوْحِيْدِ

(فتح القدیر)

یعنی اس امت مسلمہ میں سب سے پہلے آپ ﷺ نے اپنے آبا واجداد کے دین کی مخالفت کی اور لوگوں کو توحید کی طرف بلایا۔

ان احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے:

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب فرض نماز سے سلام پھیرتے (تو دیگر اذکار کے ساتھ) اسے بھی پڑھتے تھے:

((لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ، لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ))

(ابو داود رقم الحديث ۱۵۰۶)

''اللہ کے سوا قطعی کوئی معبود نہیں ہے، وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، پوری کائنات کا مالک ہے اور وہی حمد وثنا کا سزاوار ہے اور ہر چیز پر کلی اختیار صرف اُسی کا ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا قطعی کوئی معبود نہیں ہے، ہم اسی کے لیے خالص عبادت کرنے والے ہیں اگرچہ کافر اس بات کو برا مانیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((اِذَا صَلَّیْتُمْ عَلَی الْمَیِّتِ فَأَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ)) (ابوداؤد، رقم الحدیث ۳۱۹۹)

یعنی جب تم وفات پانے والے (کسی مسلمان بھائی) کی نماز جنازہ ادا کرو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا مانگو (یعنی خشوع وخضوع اور گریہ وزاری سے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے لیے بخشش کے طلبگار رہو)

داعی الی اللہ میں صفتِ اخلاص کا پایا جانا ضروری ہے کہ دعوت دین کے سلسلے میں اس کی ہر سعی وجستجو، دوڑ دھوپ، محنت ومشقت، تکلیف و برداشت محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو اور اس سے ریاکاری اور شرک کا شائبہ تک نہ ہو اور اگر کبھی شیطان اور اس کے ساتھی اسے ورغلانے کی کوشش کریں تو وہ فوراً اپنے خالق و مالک کی پناہ کا طلبگار بنے، یہ دعا رب کریم نے سکھا دی ہے:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ﴾ (المومنون:۲۳/۹۷-۹۸)

''اور دعا کریں کہ اے میرے رب! میں شیاطین کے وسوسوں سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور اے رب! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس آ جائیں۔''

تمام عبادات واطاعت کی روح اخلاص ہے، ہر بندۂ مومن اور ہر داعی الی اللہ کی وہی صدا ہوتی ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ (الانعام:۶/۱۶۲،۱۶۳)

''(اے نبیؐ!) کہیے! میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور مرنا، سب کچھ

اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔''

اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی اعمال قبول ہوتے ہیں جو اخلاص سے ادا کیے جائیں اور سنت نبویؐ کے مطابق ہوں، اچھے سے اچھا عمل خواہشاتِ نفس سے برباد ہو جاتا ہے۔ مثلاً جہاد فی سبیل اللہ کی بڑی فضیلت آئی ہے اور یہ اُسی وقت مقبول ہوتا ہے جب اسے اللہ کی رضا کے لیے کلمۃ الحق کی سربلندی کے لیے کیا جائے۔ اس حدیث پر غور کیجیے:

((سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرَّجُلِ يُقَاتِلُ شُجَاعَةً وَ يُقَاتِلُ حَمِيَّةً وَ يُقَاتِلُ رِيَاءً اَيُّ ذٰلِكَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'')) (رياض الصالحين، باب احضار النيّة)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے آدمی کے متعلق پوچھا گیا، جو بہادری اور طاقت کے اظہار کے لیے جہاد کرتا ہے یا وہ (قومی) عصبیت وحمیت کے لیے جنگ کرتا ہے یا پھر وہ شہرت اور ناموری کے لیے یہ فریضہ سرانجام دیتا ہے، ان میں اللہ کے راستے میں کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے راستے میں صرف اس شخص کی جنگ ہے جو محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے۔''

اسی طرح داعی الی اللہ کی ہر کوشش جو تبلیغ پر صرف ہوتی ہے اس سے دنیاوی منفعت، شہرت، سطوت اور قدر و منزلت کا حصول نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی مقصود ہوتی ہے، ہر نبی نے دعوت دیتے ہوئے لوگوں سے کہا:

﴿وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الشعراء:٢٦/١٤٥)

''میں (اس دعوت دین میں) تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔''

دراصل خلوص سے داعی الی اللہ کی منزل متعین ہوتی ہے اور اس کا مقصود پاکیزہ بن جاتا ہے، وہ

صرف حق بات کی دعوت دیتا ہے اور اس سے کوئی ایسا عمل سرزد نہیں ہوتا جو اللہ کی رضا کے خلاف ہو، اس کی تمام توانائیاں اور کوششیں لوگوں کی اصلاح وفلاح پر صرف ہوتی ہیں اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں ثبت ہو جاتا ہے، جس طرح کوئی باغبان کسی چمن کی محنت اور لگن سے آبیاری کرتا ہے، اور وہ سرسبز وشاداب ہو جاتا ہے، اسی طرح داعی الی اللہ کا خلوص کے ساتھ دعوت دین کو پھیلانا رنگ لاتا ہے اور وہ معاشرہ سنورتا اور نکھرتا ہے، پھر غور کیجیے کہ خلوص اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس پوری کائنات کو عرش سے فرش تک رب کائنات نے بنایا اور سجایا ہے، اس لیے ہر قسم کی حمد وثنا، رضا مندی اور خوشنودی بھی اسی کے لیے ہونی چاہیے۔

٤- اَلْحِلْمُ:

یہ وہ صفت ہے جو داعی الی اللہ کی تربیتی ذمہ داریوں اور اصلاح وتعمیر کی مسؤولیت میں کامیابی کا ضامن بنتی ہے۔

(حَلُمَ يَحْلُمُ، حِلْمًا) برد بار ہونا، یعنی ناگواری اور غصہ کے اظہار پر قدرت کے باوجود نرمی سے کام لینا، متحمل مزاج ہونا، سلیم الطبع ہونا، دور اندیش ہونا، دانشمند ہونا۔ (القاموس الوحید)

اردو زبان میں حِلم نرم دلی اور انکساری کے مفہوم میں آتا ہے جو عجز اور خاکساری کی صفت ہے اور یہ بھی خوبی کی بات ہے، مگر عربی زبان میں حِلم قوت اور توانائی کا مظہر ہوتا ہے جس سے انسان کو اپنے اَعصاب پر پورا کنٹرول ہوتا ہے اور بھرپور طیش کے وقت اس کا اظہار ہوتا ہے۔

جیسا کہ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اَلْحِلْمُ ضَبْطُ النَّفسِ والطَّبْعِ عِنْدَ هِيَجَانِ الْغَضَبِ (مفردات القرآن)

''یعنی حلم تو نفس اور طبیعت پر ایسا ضبط رکھنا ہے کہ غیظ وغضب کے مواقع پر وہ بھڑک نہ اٹھے''۔

گویا کہ صفت حِلم کا اظہار طیش اور غصے کے وقت ہوتا ہے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے:

﴿إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ﴾ (هود:١١/٧٥)

جاگتی تصویر تھے۔ ”یقیناً ابراہیمؑ بڑے بردبار، خاع کرنے والے تھے۔“

سیدنا ابراہیمؑ کی سیرت کو پڑھ جایے، وہ ان صفات کی جیتی

خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا حلیم الطبع ہونا اپنی مثال آپ تھا، آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے متعدد واقعات میں آپ ﷺ کے حلم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اسلام اور ایمان سے بہرہ ور فرمایا۔

جب آپ ﷺ طائف میں دعوت وتبلیغ کے لیے تشریف لے گئے تو اہل طائف نے آپ سے انتہائی ناروا سلوک کیا، آپ ﷺ پر پتھر برسائے گئے اور جسد اطہر زخموں سے نڈھال ہو گیا، مگر آپ ﷺ کے مبارک لبوں پر ان کے لیے ہدایت اور سلامتی کے کلمات جاری وساری تھے، یہی لوگ بالآخر مشرف باسلام ہوئے۔

دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح مکہ کا دن تھا۔ قریشِ مکہ جن کے ہاتھوں آپ ﷺ نے اور آپ کے صحابہؓ نے طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کیں تھیں ان سب کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا:

((لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ))

”آج تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔“

آپ ﷺ کے حلم وعفو سے متاثر ہو کر لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

قرآن وحدیث کی پاکیزہ تعلیمات حلم سے آراستہ کرتی ہیں، ان آیات پر غور کیجیے:

﴿وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(آل عمرآن:۳/۱۳٤)

”جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں، ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں (ان لوگوں کا شمار محسنین میں ہوتا ہے)“

پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (الاعراف:۷/۱۹۹)

’’(اے نبیؐ!) نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔‘‘

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

’’یعنی جب آپﷺ نیکی کا حکم دینے میں اتمامِ حجت کر چکیں اور پھر بھی وہ نہ مانیں تو ان سے اعراض فرمالیں اور ان کے جھگڑوں اور حماقتوں کا جواب نہ دیں۔‘‘ (احسن البیان)

ارشاد ہوا:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (الشوریٰ:٤٢/٤٣)

’’اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے، یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے (ایک کام) ہے۔‘‘

اور فرمایا:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾

(حٰم السجدہ:٤١/٣٤)

’’(اے نبی!) آپ بدی کو اس نیکی سے دفع کیجیے جو بہترین ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔‘‘

سیرت طیبہ کا یہ باب انتہائی روشن ہے کہ سینکڑوں لوگ آپ ﷺ کے نیک رویہ اور حسن اخلاق سے دائرہ اسلام میں آئے، اس سلسلہ میں چند احادیث مبارکہ پر بھی گہری نظر ڈالیے۔

آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

آپ ﷺ نے اشج (عبد القیس قبیلے کے شخص) کو فرمایا:

((اِنَّ فِیْكَ خَصْلَتَیْنِ یُحِبُّهُمَا اللّٰهُ: ’’اَلْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ))

’’تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جنہیں اللہ پسند کرتا ہے ایک حلم دوسرے سکون اور سنجیدگی۔‘‘ (ریاض الصالحین، باب الرفق)

اُمّ المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْاَمْرِ كُلِّهٖ))

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم ہے اور تمام امور میں نرمی کو پسند فرماتا ہے۔'' (حوالہ ایضاً)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهٗ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهٗ)) (حوالہ ایضاً)

''کہ جس چیز میں نرمی ہوتی ہے وہ اس کو زینت دے دیتی ہے اور جس چیز سے نکل جاتی ہے وہ اسے بدنما کر دیتی ہے۔''

سیدنا انس رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

((يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا)) (حوالہ ایضاً)

''(اشاعت دین میں) آسانیاں پیدا کیا کرو اور سختیاں نہ کرو، بشارتیں دیا کرو اور نفرتیں نہ دلاؤ۔''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ))

(متفق علیہ، ریاض الصالحین، باب الصبر)

''پہلوان وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے، بلکہ حقیقی (پہلوان) تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔''

۵- اَلْاِسْتِقَامَةُ:

اس لفظ کا مادہ (ق و م) ہے [قَامَ، يَقُوْمُ، قَوْمًا، وَ قِيَامًا وَ قَوْمَةً] کھڑا ہونا، سیدھا ہونا، چلتے ہوئے رک جانا، قَامَ الْاَمْرُ، اعتدال پر آنا، متوازن ہونا، سدھرنا، درست ہونا، (اَقَامَ، يُقِيْمُ) نماز کو اس کے جملہ ارکان و شرائط کے ساتھ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ادا کرنا اور اس کا پوری طرح نفاذ کرنا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ (البقرہ:۲/۳)

''(اہل ایمان) نماز کو (پابندیِ اوقات سے) قائم کرتے ہیں۔''

﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ﴾ (الشوریٰ:۴۲/۱۳)

''یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔''

مسلمان کی زندگی کا یہ مشن ہے کہ اس زمین سے فتنہ وفساد مٹا کر اللہ کے دین کا پوری طرح نفاذ کرے، اس طرح کہ زندگی کا ہر شعبہ دینِ اسلام کے تحت آ جائے اور یہاں خصوصی تاکید کی جا رہی ہے کہ دیکھو! اس میں پھوٹ نہ ڈالو، اس تفریق سے تم کبھی غالب نہ آ سکو گے، آج اسی تفریق کی وجہ سے مسلمانوں کا جو حشر ہوا ہے، وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، پاکستان میں آج تک جو نفاذِ اسلام نہ ہو سکا، اس کی بنیادی وجہ بھی تفریق اور پھوٹ ہے۔قرآن حکیم نے اس بارے میں کتنی زبردست تاکید کی ہے، اس آیت پر غور کیجیے:

﴿وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَ تَذۡہَبَ رِیۡحُکُمۡ﴾ (الانفال:۸/۴۶)

''(مسلمانو!) اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے رہو، آپس میں اختلاف نہ کرو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

چونکہ ہر مسلمان تھوڑا بہت دعوتِ دین کا فریضہ ادا کرتا ہے، اس لیے اسے اپنے کسی بھی مسلمان بھائی سے جھگڑنے اور تفریق پیدا کرنے سے بچنا چاہیے اور خاص طور پر وہ داعیانِ حق جو دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کر رہے ہیں، انہیں یہ فریضہ ایک دوسرے کے دست و بازو بن کر ادا کرنا چاہیے اور اس پر خلوص اور مضبوطی سے جمے رہنا چاہیے۔اسی بات کو قرآن حکیم نے ''استقامت'' کا نام دیا ہے، اور کامیابی کی خوشخبری دی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ○ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴾

(الاحقاف:۴۶/۱۳-۱۴)

''یقیناً جن لوگوں نے (دل و جان سے) کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے، اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اپنے ان اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے

رہے ہیں۔“

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے:

﴿فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ ھُمْ﴾ (الشوری:٤٢/ ١٥)

”(اے نبیؐ!) آپ لوگوں کو اس دین کی طرف بلاتے رہیں اور جو کچھ آپ سے کہا گیا ہے اس پر مضبوطی سے جم جائیں اور (کفار و مشرکین) کی خواہشوں پر نہ چلیں۔“

رسول اللہ ﷺ نے جس استقامت اور ہمت، دلیری اور پامردی سے دعوتِ حق کو پھیلایا ہے، وہ سیرت طیبہ کا ایک روشن باب ہے اور ہر داعی الی اللہ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا یہ پہلو ہر وقت سامنے رہنا چاہیے۔

ان احادیث پر بھی غور کر لیجیے:

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب سفر پر روانہ ہونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں وصیت فرمائی:

((أُعْبُدِ اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكْ بِهٖ شَيْأً، قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! زِدْنِيْ، قَالَ: ”إِذَا أَسَأْتَ فَأَحْسِنْ، قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! زِدْ قَالَ: اِسْتَقِمْ وَلْتُحْسِنْ خُلُقَكَ))

(الحاکم، رقم الحدیث:٤/ ٢٤٤)

”اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، معاذؓ نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! کچھ اور بتایئے: فرمایا: ”جب تم سے کوئی خطا ہو جائے تو نیکی کر ڈالو“ معاذ رضی اللہ عنہ نے مزید کی خواہش کی تو فرمایا: ”دین پر ثابت قدم رہو اور حسنِ اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرو۔“

سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قُلْ لِيْ فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا، لَا أَسْأَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ، قَالَ: قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ فَاسْتَقِمْ)) (مسلم، رقم الحدیث:٣٨)

”اے اللہ کے رسول! مجھے اسلام کی کوئی ایسی جامع بات بتا دیجیے کہ آپ کے بعد پھر کسی

سے پوچھنے کی حاجت نہ رہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہو میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اُس پر ثابت قدم رہو۔''

''ایمان باللہ'' کی حقیقت یہ ہے کہ بندۂ مومن احکامِ الٰہی کا ہر حکم سنتِ نبویؐ کے مطابق ماننے کے لیے سرِتسلیم خم کر دے اور یہی دنیا و آخرت میں کامیابی کا راز ہے۔

٦- اَلتَّوَاضُعُ:

تواضع کے معنیٰ عاجزی اور خاکساری کے ہیں، لیکن ایسا نہیں کہ انسان اپنے رتبہ سے گر جائے بلکہ وہ اپنے مقام اور مرتبہ کو قائم رکھتے ہوئے دوسروں کے ساتھ نرمی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے اور لطف و محبت کا برتاؤ کرے گویا کہ تواضع عاجزی اور خاکساری کا نام ہے، نہ کہ ذِلت اور پستی کا، اوّل الذکر اگر فضیلت ہے تو ثانی الذکر کمزوری۔

چنانچہ علامہ زبیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''تواضع اور ذلت میں یہ فرق ہے کہ تواضع اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت، اُس کے جلال و جبروت اور محبت و عظمت کے علم اور اپنے نفس کے عیوب و نقائص کے علم سے پیدا ہوتی ہے جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جناب میں انکسارِ قلب اور مخلوق کے حق میں نرمی اور نیازمندی کے برتاؤ اور سلوک کا نام ہے، البتہ جو پستی اور اہانت، حظِّ نفس کی خاطر، خودداری اور عزتِ نفس کو مٹا کر اختیار کی جاتی ہے، اس کا نام 'ذلت' ہے، اس لیے پہلی صفت 'فضیلت' ہے اور دوسری 'رذالت' ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((طُوْبٰی لِمَنْ تَوَاضَعَ فِیْ غَیْرِ مَسْکَنَةٍ))

''اس شخص کے لیے بشارت ہے جو نفس کو ذلیل کیے بغیر تواضع کا حامل ہے۔''

(احیاء العلوم، بحوالہ اخلاق اور فلسفہ اخلاق، مولانا محمد حفیظ الرحمن سیوہاروی)

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''تواضع اور خاکساری کو قرآن حکیم میں ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَ﴾ یعنی ''بازو جھکا دینا'' تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے، جَنَاحُ پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین

پر اترتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں (پروں) کو جھکا دیتا ہے، اس سے یہ استعارہ لیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔''

(سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد ششم)

رب کریم کا رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ (الحجر:۱۵/۸۸)

''(اے نبی!ﷺ) تمام مومنوں کے لیے اپنے بازو جھکا دیجیے (ان کے ساتھ عاجزی اور خاکساری کے ساتھ پیش آیے)''

یہ تو رسول اللہ ﷺ کو حکم تھا۔ عام انسان کو فرمایا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ تواضع اور عاجزی سے پیش آئیں:

﴿وَ اخۡفِضۡ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَۃِ﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/۲٤)

''اور ماں باپ کے لیے عاجزی کے بازو محبت سے جھکا دو۔''

تواضع و خاکساری کی ضد فخر و غرور ہے، جسے معاشرتی زندگی میں اسلام کسی طرح بھی پسند نہیں کرتا، لوگوں سے بے رخی اختیار کرنا، گفتگو اور رفتار میں اترانا اور معاملات میں تکبر اور غرور کا اظہار کرنا شرفِ انسانی کے خلاف باتیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَا تُصَعِّرۡ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ ○ وَاقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِکَ وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِکَ اِنَّ اَنۡکَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ﴾ (لقمان:۳۱/۱۸-۱۹)

''اور لوگوں سے بے رُخی (غرور اور گھمنڈ) سے نہ ملو (بلکہ خندہ پیشانی سے بات کرو) اور زمین پر اِتراتے ہوئے نہ چلو، بے شک اللہ تعالیٰ اِترانے والے، متکبر کو پسند نہیں فرماتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو اور بات کرتے وقت آہستہ اور نرمی سے بولو، سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے (انسانی شرف کے خلاف ہے کہ وہ حیوانی

سطح پر اُتر آئے)''

انسان کو اس کون و مکان میں دوسری مخلوق پر جو شرف حاصل ہوا ہے، وہ علم و ہنر، عاجزی و خاکساری کی وجہ سے ہے اور انسانیت کے گلِ سرسبد جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ تواضع و خاکساری کا بہترین نمونہ ہے، اِس عظیم شخصیت کی تواضع اور خاکساری کے چند واقعات پیشِ خدمت ہیں۔

رسول اللہ ﷺ گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑے میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا۔

ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ اہل عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھو۔ غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے، مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ ﷺ کو پہچان نہ سکتا، کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا، لیکن نبوت کا رعب اس قدر طاری ہوا کہ کانپنے لگا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں بادشاہ نہیں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپ ﷺ اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے، میں بندہ ہوں اور بندوں کی طرح کھاتا اور بیٹھتا ہوں، ایک دفعہ ایک کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی اور لوگ زیادہ آ گئے، آپ ﷺ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے، ایک بدو بھی مجلس میں شریک تھا، اُس نے کہا: محمد! ﷺ یہ کیا طرزِ نشست ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ نے مجھے خاکسار بندہ بنایا ہے، جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے۔''

مخرمہؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ انہوں نے اپنے بیٹے مسور سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں، آؤ ہم بھی چلیں۔ آئے تو آپ گھر کے اندر تشریف لے جا چکے تھے، کہا: آواز دو، انہوں نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو آواز دوں؟ مخرمہؓ نے کہا: بیٹے! محمد ﷺ جبار نہیں ہیں، اُن کے جرأت دلانے سے مسور نے آواز دی، آپ ﷺ فوراً نکل آئے اور ان کو دیبا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زریں تھیں۔

انسان کے غرور و ترفع کا اصلی موقع وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے چپ و راست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے جو اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ فاتحانہ ایک جرّار و پر جوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے تواضع و خاکساری کا منظر اُس وقت اور نمایاں ہو جاتا ہے، فتح مکہ کے موقع پر جب آپ ﷺ شہر میں داخل ہوئے تو تواضعاً سر مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آ کر مل گیا۔'' (سیرت النبی ﷺ، جلد دوم)

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس سے، آپ کے کلام سے، آپ کے رویہ اور معاملات سے تواضع اور عجز کا پہلو نمایاں تھا جسے دیکھ کر بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں چلے آئے، ہر داعی الی اللہ کے لیے سیرتِ نبوی کا یہ پہلو دعوت میں زادِ راہ ہے، اس کے بغیر اُس کی دعوت کبھی موثر اور کارگر نہیں ہو سکتی ہے۔

۷۔ عفو و درگزر:

غفو کے معنی معاف کرنا، درگزر کرنا، (عَفَا، يَعْفُوْا، عَفْوًا وَ عُفُوًّا) عَفَا کے بعد عَنْ آ جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ (آل عمران:۳/۱۵۵)

اَلْعَفُوُّ، بہت معاف کرنے والا، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔

دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں لوگوں کو معاف کرنا، اُن سے درگزر کرنا بہت بڑا وصف ہے کہ جس کی

قرآن وحدیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گزرتی ہے وہ عفو، درگزر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت کی ہے، لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور عظمت وجلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابل تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ ''تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ وہ چڑ میں تمہارے اللہ کو برا کہہ بیٹھیں۔

﴿وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ﴾

(الانعام:٦/١٠٨)

''(اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔''

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے، پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم وستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو اور اُن کو معاف کر دو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے۔

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ○ وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ (الاعراف:٧/ ١٩٩-٢٠٠)

''(اے نبی!ﷺ) نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کیجیے، معروف کی تلقین کیے جایے اور جاہلوں سے نہ الجھیے، اگر شیطان آپ کو اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگیے، وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا۔''

سکون کی حالت میں عفو و درگزر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ

ہونے پائے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف میں فرمایا:

﴿وَإِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ﴾ (شوری:۴۲/۳۷)

''اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کرتے ہیں۔''

نیکو کاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا اللہ تعالیٰ کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے:

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(اٰل عمران:۳/۱۳۴)

''جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔''

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے، فرمایا:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (شوریٰ ۴۲:۴۳)

''البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو بلاشبہ وہ ہمت کے کام ہیں۔''

اس برداشت اور عفو کو وحی محمدی نے اپنے الفاظ میں 'عزم' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاء اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (احقاف:۴۶/۳۵)

''پس (اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم) صبر کیجیے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے۔''

نیکی کو پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے، فرمایا:

﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (لقمان:۳۱/۱۷)

''نیکی کا حکم دو، بدی سے منع کرو اور جو مصیبت بھی پڑے، اس پر صبر کرو کہ یہ بڑے

حوصلے کے کاموں میں سے ہیں۔"

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں اور اُن کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے، فرمایا:

﴿وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ (آل عمران:۳/۱۸۶)

"اور اگر صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔"

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبوبی کا سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔" (سیرت النبی ﷺ، جلد ششم)

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا عفو و درگزر کا باب اس قدر روشن اور درخشندہ ہے کہ رہتی دنیا تک اس کی روشنی ماند نہ پڑے گی۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

دشمنوں کے حق میں بددعا کرنا انسان کی فطری عادت ہے لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں وہ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور جو ان کے تشنۂ خون ہوتے ہیں وہ ان کو پیار کرتے ہیں۔ ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر اور خود رسول اللہ ﷺ پر جو پیہم مظالم ہو رہے تھے، اس داستان کے دہرانے کے لیے بھی سنگ دلی درکار ہے، اِسی زمانہ میں خباب ؓ بن ارت ایک صحابی نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! دشمنوں کے حق میں بددعا فرمایے۔ یہ سن کر چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا۔ ایک دفعہ چند صاحبوں نے مل کر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا میں دنیا کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

جنگ احد میں دشمنوں نے آپ ﷺ پر پتھر پھینکے، تیر برسائے، تلواریں چلائیں، دندان مبارک کو شہید کر دیا، جبیں اقدس کو خون آلود کیا لیکن ان حملوں کا وار آپ ﷺ نے جس ڈھال پر روکا وہ صرف یہ دعا تھی:

((اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ))

''اے اللہ! ان کو معاف فرما کہ یہ نادان ہیں۔''

وہ طائف جس نے دعوتِ اسلام کا جواب استہزا اور تمسخر سے دیا تھا، وہ طائف جس نے داعیِ اسلام کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا، وہ طائف جس نے پائے مبارک کو لہولہان کیا تھا، اُن کی نسبت فرشتۂ غیب پوچھتا ہے کہ حکم ہو تو اُن پر پہاڑ الٹ دیا جائے، جواب ملتا ہے کہ شاید ان کی نسل سے کوئی اللہ تعالیٰ کو ماننے والا پیدا ہو، (دس بارہ برس کے بعد یہی طائف اسلام کی دعوت کا جواب تیر و تفنگ (منجنیق) سے دیتا ہے۔ جاں نثاروں کی لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں، صحابہؓ عرض کرتے ہیں کہ یارسول اللہ! ان کے حق میں بد دعا کیجیے۔ آپ ﷺ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے حق میں بد دعا فرمائیں گے، لیکن زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

''رب کریم! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا۔''

وہ تیر جو میدان جنگ میں نشانہ پر نہیں لگے تھے، وہ مدینہ کے صحن مسجد میں زبان مبارک سے نکل کر ٹھیک اپنے ہدف پر پہنچے، یعنی وہ لوگ مدینہ آ کر خاص مسجد نبوی میں بیٹھ کر جہاں وہ مہمان ٹھہرائے گئے تھے، مسلمان ہوئے۔

دوس کا قبیلہ یمن میں رہتا تھا، طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ اس قبیلہ کے رئیس تھے، وہ قدیم الاسلام تھے، مدت تک وہ اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن وہ کفر پر اڑا رہا، ناچار وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قبیلے کی حالت عرض کر کے گزارش کی کہ ان کے حق میں بد دعا فرمایے، لوگوں نے سنا تو کہا کہ اب دوس کی بربادی میں کوئی شک نہیں رہا، لیکن رحمتِ عالم نے جن الفاظ میں دعا فرمائی وہ یہ تھے:

((اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا وَّأْتِ بِھِمْ))

''اے اللہ! دوس کو ہدایت فرما اور ان کو اسی (ہدایت) کے ساتھ لا۔'' ؎

سلام اے صاحب خلقِ عظیم! انسان کو سکھلا دیے
یہی اعمال پاکیزہ، یہی اشغالِ روحانی
تری صورت، تری سیرت، ترا نقشا، ترا جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی
ترے آنے سے رونق آ گئی گلزار ہستی میں
شریک حال قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربّانی

۸۔ حق گوئی:

داعی الی اللہ کے لیے ضروری ہے کلمۃ الحق لوگوں تک من وعن پہنچائے اور اس میں نہ تو دل کی خواہشات اور نہ کوئی بیرونی طاقت اور خوف آڑے آئے۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ:۵/۶۷)

”اے رسول! ﷺ جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے (وہ لوگوں تک من وعن) پہنچا دیجیے، اگر آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت (کا حق) ادا نہیں کیا اور آپ کو اللہ تعالیٰ لوگوں سے بچا لے گا۔“

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”اس حکم کا مفاد یہ ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، بلاکم وکاست اور بلاخوف لومۃ لائم آپ لوگوں تک پہنچا دیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”جو شخص یہ گمان کرے کہ نبی ﷺ نے کچھ چھپا لیا، اُس نے یقیناً جھوٹ کہا۔ (صحیح بخاری، بحوالہ احسن البیان) اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک لاکھ چالیس ہزار کے جمِ غفیر میں فرمایا: ”تم میرے بارے میں کیا کہو گے؟“ انہوں نے کہا:

((نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ، وَ أَدَّیْتَ وَ نَصَحْتَ))

''ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور ادا کر دیا اور خیر خواہی فرما دی۔''
آپ ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
((اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ)) ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ)) (تین تین مرتبہ)

(صحیح مسلم، بحوالہ احسن البیان)

''یعنی اے اللہ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا، تو گواہ رہ۔''
سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:
''یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح میدان جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں، بعینہ جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے اسی کا نام ''حق گوئی'' ہے۔
حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابل ستائش سمجھا جاتا ہے، جب مادی قوت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو، اور اسلام نے اسی قابل ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے:
﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ○ اِنَّا كَفَیْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِیْنَ ○ الَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ (الحجر:۱۵/۹۴-۹۵)
''پس (اے نبیؐ!) جس چیز کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے، اسے کھول کر سنا دیجیے اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کیجیے، آپ کی طرف سے ہم اُن مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی اِلٰہ قرار دیتے ہیں۔''
یعنی اب مخفی طور پر دعوت توحید کا زمانہ گزر گیا اور علانیہ یہ دعوت دینے کا وقت آ گیا، اس لیے کھلم کھلا اللہ کے اس حکم کو بیان کیجیے اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر اور استہزا کی مطلق پروا نہ کیجیے بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروا نہ کیجیے، سب کے مقابلہ

میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔‘‘

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے، وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا معیاری و اخلاقی وصف قرار دیا گیا۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ (المائدہ:۵/۵٤)

’’اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔‘‘

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن طعن کی پروا نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے،لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے بیان کرنے میں اسے انسانوں کا خوف مانع نہ ہو، ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے، صحابہؓ کرامؓ نے کہا، یا رسول اللہ! ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے۔ ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف، ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیے تھا۔

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے، اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ ﷺ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:

((اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ))

''بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنا ہے۔''

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی المنکر کے جو مدارج قرار دیے گئے اُن میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے، چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان! تم نے سنت کی مخالفت کی، آج منبر نکالا، حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا، حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس پر سیدنا ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے (حق گوئی سے) اپنا فرض ادا کر دیا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''تم میں سے جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے، ورنہ زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (برا سمجھے) لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔''

سیدنا ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا:

''ہوشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے، جو تم کو معلوم ہے۔''

یہ سن کر سیدنا ابوسعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس کہ ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے۔'' (سیرت النبی، جلد ششم)

ویسے تو ہر مسلمان داعی الی اللہ ہے اور اس پر لازم ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق حق بات دوسروں تک پہنچائے، مگر علماء کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ حق بات کو من وعن لوگوں کو بتائیں۔

۹- اَلْعِفَّۃُ:

اس کا مادہ (ع ف ف) ہے۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں ''نفس میں ایسی حالت اور کیفیت کا پیدا ہونا جس کے ذریعے وہ غلبۂ شہوت اور خواہشاتِ نفس سے محفوظ رہے۔ [مفردات القرآن]

(عَفَّ، یَعِفُّ، عِفَّةً وَ عَفَافًا) ناپسندیدہ قول وفعل سے بچنا۔ (القاموس الوحید)

دراصل اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو انسان کے لیے حلال اور طیب ٹھہرایا، ان سے فائدہ اٹھانا

اور جن چیزوں کو حرام اور ناجائز ٹھہرایا ہے، ان سے رک جانا، عفت اور پرہیز گاری کی راہ اختیار کرنا ہے، مثلاً نکاح حصولِ عفت کا جائز راستہ ہے، جبکہ زنا حرام ہے اور عفت کی خلاف ورزی ہے، حق حلال کی تھوڑی سی روزی پر قناعت کر جانا عفت کی راہ ہے، جبکہ ناجائز ذرائع آمدنی خواہ وہ ڈھیروں مال ہو، حرام ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (النور:۲۴/۳۳)

''اور ان لوگوں کو پاک دامن رہنا چاہیے جو اپنا نکاح کرنے کا مقدور نہیں رکھتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے مالدار بنا دے۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''حدیث میں پاک دامنی کے لیے جب تک شادی کی استطاعت حاصل نہ ہو جائے، نفلی روزے رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ فرمایا: ''اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شادی کی طاقت رکھتا ہے، اُسے وقت پر شادی کر لینی چاہیے، اس لیے کہ اس سے آنکھوں اور شرم گاہ کی حفاظت ہو جاتی ہے اور جو شادی کی طاقت نہیں رکھتا، اسے چاہیے کہ وہ (کثرت سے نفلی) روزے رکھے، روزے اس کی خواہشات نفس کو قابو میں رکھیں گے۔'' (البخاری، کتاب الصوم، بحواله أحسن البیان)

کھانے پینے کے معاملے میں کتنی صاف ستھری ہدایات دی گئی ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ﴾ (المائده:۵/۸۷-۸۸)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو، اور حد سے آگے مت نکلو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان سے حلال مرغوب چیزیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔''

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی کے مسئلے کا تعلق خاص مسئلۂ حاکمیت اور اُلوھیّت کے ساتھ ہے، قانون سازی کا حق اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے ساتھ مخصوص اس لیے ہے کہ اللہ ہی انسانوں کا خالق اور مالک ہے اور وہی انسانوں کو رزق فراہم کرتا ہے، اس لیے یہ حق صرف اللہ کا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لیے، اپنے پیدا کردہ رزق سے بعض چیزوں کو حلال کر دے اور بعض کو حرام کر دے، یہ ایک ایسی دلیل ہے جسے انسانوں کی عقل بڑی آسانی سے مان لیتی ہے۔ انسانوں کے نزدیک بھی کسی چیز کا مالک ہی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی مملوکہ چیز میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور جو شخص بھی کسی کے حقِ ملکیت پر دست درازی کرتا ہے تو اُسے ظلم و زیادتی کا مرتکب تصور کیا جاتا ہے، جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حقوق پر دست درازی کریں گے، اس لیے کہ اللہ پر ایمان اور پھر اللہ سے بغاوت دونوں ایک دل میں کس طرح جمع ہو سکتے ہیں؟

یہ ہے وہ مسئلہ جسے یہ دو آیات ایسے واضح اسلوب میں پیش کرتی ہیں کہ کوئی عقل مند شخص اس بارے میں کوئی مباحثہ اور مجادلہ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ دست درازی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، یہ مسئلہ ایک عام قاعدے اور اصول کو طے کرتا ہے کہ تمام لوگ اللہ کے بندے اور غلام ہیں اور اس مسئلے کے مطابق اپنا طرزِ عمل ڈھالنا تقاضائے ایمان ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ دو آیات اور ان سے اگلی آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئیں، یہ واقعہ نبی ﷺ کے دور میں پیش آیا، لیکن آیت عام ہے اور اسبابِ نزول کے ساتھ مخصوص نہیں، ہاں یہ اور بات ہے کہ اسبابِ نزول کے ذریعے فہم قرآن میں اچھی مدد ملتی ہے۔

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحَرِّمُوۡا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا﴾

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تین

افراد ازواج مطہرات کی خدمت میں آئے، انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کے بارے میں پوچھا، جب انہیں آپ ﷺ کی عبادت کے بارے میں معلومات دی گئیں تو گویا انہوں نے اپنی عبادت کو کم سمجھا، انہوں نے کہا ہم آپ ﷺ کے رتبے تک کب پہنچ سکتے ہیں؟ اللہ نے آپ ﷺ کے سابق اور آئندہ گناہوں کو معاف کر دیا ہے، ایک نے کہا: میں تو تمام رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا: میں تو ہمیشہ کے لیے روزے رکھوں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا، تیسرے نے کہا: میں تو نکاح نہ کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ اُن کے پاس آئے اور اُن سے پوچھا کہ تم لوگ ہو جنہوں نے یہ یہ باتیں کیں، واللہ! میں تم سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ پرہیز گار ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کرتا ہوں، لہٰذا جو میری سنت سے منہ موڑے گا وہ مجھ سے نہ ہوگا۔'' (فی ظلال القرآن)

گویا سورۃ النور کی آیت ۳۳ کے مطابق وَلْيَسْتَعْفِفْ کا مفہوم سنت نبوی کے مطابق لیا جائے گا، اس کے بغیر عفت اور پرہیز گاری بے معنی ہو جائے گی اور داعی الی اللہ کے لیے عفت کا لباس لازمی اور ضروری ہے۔

عفت بمعنی خودداری کے بھی ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (البقرہ:۲/۲۷۳)

''خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسبِ معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، اُن کی خود داری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔''

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

﴿اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ یعنی دین ہی کے کسی کام میں گھر گئے ہیں اور اب

آزادی سے کسبِ معاش نہیں کر سکتے۔

﴿لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ﴾ (یعنی آزادی سے طلبِ معاش کے لیے) یعنی اُن کا وقت خدمتِ دین میں ایسا گھرا رہتا ہے کہ کسب معاش کے لیے انہیں مہلت نہیں ملتی۔ ﴿یَحۡسَبُھُمُ الۡجَاھِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ یعنی ان کی غیرت وخودداری گوارا نہیں کرتی کہ وہ لوگوں سے سوال کریں، ناواقفوں کو اس سے گمان یہ گزرتا ہے کہ یہ لوگ خوشحال ہیں، محتاج و مستحقِ امداد نہیں، مگر ان کی رضائے الٰہی کے لیے مدد کرنا اجر عظیم ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ﴾ صدقات و خیرات کا (اصل) حق انہی حاجت مندوں کا ہے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں۔''

(تفسیر ماجدی)

ان احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اَرۡبَعٌ اِذَا کُنَّ فِیۡکَ، فَلَا عَلَیۡکَ مَا فَاتَکَ مِنَ الدُّنۡیَا، حِفۡظُ أَمَانَةٍ، وَصِدۡقُ حَدِیۡثٍ، وَ حُسۡنُ خَلِیۡقَةٍ وَ عِفَّةٌ فِیۡ طُعۡمَةٍ)) (مشکوٰۃ، رقم الحدیث:۵۲۲۲)

''اگر تم میں چار خصلتیں پیدا ہو جائیں تو دنیا کی کسی چیز (خواہ وہ قیمتی سے قیمتی بھی ہو) کے چھٹنے کا غم نہیں، امانت کی حفاظت، حق بات کہنا، حسنِ اخلاق سے آراستہ ہونا اور حلال روزی کا حصول (جس میں حرام کا شائبہ تک نہ ہو)''

آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَیۡسَ الۡمِسۡکِیۡنُ الَّذِیۡ تَرُدُّهُ التَّمۡرَةُ وَالتَّمۡرَتَانِ وَلَا اللُّقۡمَةُ وَلَا اللُّقۡمَتَانِ، اِنَّمَا الۡمِسۡکِیۡنُ الَّذِیۡ یَتَعَفَّفُ اِقۡرَءُوۡا اِنۡ شِئۡتُمۡ یَعۡنِیۡ قَوۡلَهُ تَعَالٰی ''لَا یَسۡأَلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا)) (مسلم، رقم الحدیث:۱۰۳۹)

''مسکین وہ شخص نہیں ہے (جو در بدر پھرے) جسے کہیں سے کوئی ایک کھجور یا پھر دو کھجوریں مل جائیں، یا پھر کہیں سے کھانے کا ایک لقمہ یا پھر دو لقمے مل جائیں، حقیقت

میں مسکین تو وہ ہے جو سوال کرنے سے بچے (اور اِدھر اُدھر مانگتا نہ پھرے) اگر چاہو تو اللہ تعالیٰ کا فرمان پڑھ لو، ''وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔''

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((اِنَّ نَاسًا مِنَ الْاَنْصَارِ سَأَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ سَأَلُوهُ فَأَعْطَاهُمْ، حَتّٰى اِذَا نَفِدَ مَا عِنْدَهُ، قَالَ: ''مَا يَكُنْ عِنْدِىْ مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ أَدَّخِرَهُ عَنْكُمْ، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ، وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ مِنْ عَطَاءٍ خَيْرٌ وَ اَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ)) (مسلم، رقم الحديث:۱۰۵۳)

''انصار میں سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مال کا مطالبہ کیا، آپ ﷺ نے انہیں دے دیا، پھر انہوں نے مزید کی خواہش ظاہر کی، آپ ﷺ نے انہیں پھر عطا فرمایا، یہاں تک کہ جو کچھ آپ ﷺ کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا، تو آپ نے فرمایا: ''میرے پاس جو کچھ مال ہوتا ہے، وہ میں اپنے پاس ذخیرہ نہیں کرتا ہوں (بلکہ تمہیں دے ڈالتا ہوں) یاد رکھو! جو شخص مال لینے سے بچتا ہے، اللہ اسے بچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے اور جو لوگوں سے مستغنی ہو جاتا ہے، اللہ اُسے دولتِ استغنا سے نوازتا ہے اور جو صبر سے کام لیتا ہے، اللہ اُسے زادِ صبر سے بہرہ ور فرماتا ہے اور صبر سے بہتر کوئی دولت نہیں جو کسی کے نصیب میں آتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور اس طرح دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ أَسْأَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعَفَافَ وَ الْغِنٰى)) (مسلم، رقم الحديث:۲۷۲۱)

''اے اللہ! میں آپ سے ہدایت، تقویٰ، عفت اور تونگری کی بھیک مانگتا ہوں۔''

حقیقت میں نبوت کے خصائص میں یہ بات بھی ہے کہ بے لوث اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دعوت و تبلیغ کے فرائض سرانجام دیتے جائیں اور ہر نبی کی لوگوں کو دعوت یہ پکار رہی ہے:

﴿اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ

اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الشعراء:۲۶/۱۲۵-۱۲۷)

''میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔''

اور زبان سے حق بات تو اُسی وقت جاری ہوسکتی ہے جب لوگوں کے مال و دولت سے بے نیاز ہو کر کام کیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے انبیاءعلیہم السلام کو دولت استغنا سے نوازا اور انہوں نے دعوتِ حق کا فریضہ برملا ادا کیا اور اپنی معاش کو حلال ذرائع سے اپنے دست و بازو سے حاصل کیا اور انہوں نے لوگوں سے لیا نہیں بلکہ انہیں دیا۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو رب کریم کا حکم ہوتا ہے:

﴿وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ○ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ○ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ﴾ (الضحیٰ:۹۳/۸-۱۱)

''اور آپ کو نادار پایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مالدار کر دیا، لہٰذا آپ یتیم پر سختی نہ کیجیے اور نہ ہی سائل کو جھڑکیے اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتے رہیے (شکر ادا کرتے رہیے)۔''

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یتامیٰ کی سرپرستی اور غربا و مساکین کی خدمت، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں سے ہمدردی حیاتِ طیبہ کا روشن باب ہے اور خود فقر و فاقہ، زہد و قناعت سے زندگی بسر کر دی، حدیث میں آتا ہے:

((کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَبِیْتُ اللَّیَالِیَ الْمُتَتَابِعَةَ طَاوِیًا هُوَ وَاَهْلُهٗ لَا یَجِدُوْنَ عِشَاءً)) (جامع ترمذی، بحوالہ سیرت النبی، جلد دوم)

آپ اور آپ کے اہل وعیال متصل کئی کئی رات بھوکے رہ جاتے تھے۔ کھانا میسر نہیں ہوتا تھا، پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، اُمّ المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موقع پر جب یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن زبیر نے پوچھا کہ آخر گزارا کس چیز پر تھا؟

بولیں کہ پانی اور کھجور، البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تو پی لیتے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سر زمین میں سیم و زر کا سیلاب آ چکا ہے۔'' (سیرت النبی)

مگر آپ ﷺ نے یہ تمام دولت، غربا و مساکین میں تقسیم کر ڈالی اور خود فقر و درویشی کی زندگی کو ترجیح دی......ع

سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی اکثریت کی زندگی میں یہی سادگی، یہی درویشی یہی زہد اور یہی قناعت کی جھلک نظر آتی ہے، اس کے باوجود اُن کا حال یہ تھا:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ (الدھر:۷۶/۸-۹)

''(اور وہ صحابہؓ) اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان کے دل کی صدا یہ ہوتی ہے) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔''

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود بھوکے رہ کر بھی غربا و مساکین کی خدمت کر ڈالتے، قرآن اس بات کی گواہی دیتا ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:۵۹/۹)

''اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔''

ان کی عفت اور خودداری کا حال یہ تھا ؎

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

اسلاف کی ان صفات کی وجہ سے اسلام پھلا پھولا اور دنیا نے امن اور سکھ کا سانس لیا، آج پھر ضرورت ہے کہ ہر داعی الی اللہ اپنے اندر انہی صفات کو پیدا کرے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں

اخلاقِ حسنہ سے آراستہ فرمائے۔ آمین!

۱۰- اَلْقَنَاعَةُ:

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اس لفظ کا مادہ (ق ن ع) ہے (قَنَعَ، يَقْنَعُ، قَنَاعَةً وَ قَنعَانًا اِذَا رَضِیَ) یعنی ضروریاتِ زندگی میں تھوڑی سی چیز پر راضی ہو جانے کے ہیں اور جب یہ فعل قَنَعَ، يَقْنَعُ، قُنُوعًا سے آئے تو اس کے معنی سوال کرنے کے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ (الحج:۲۲/۳۶)

''(اور قربانی کا گوشت) قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔''

گویا کہ یہاں قَانِعَ سے مراد وہ سائل ہے جو با اصرار سوال نہ کرے اور جو کچھ مل جائے اُسی پر راضی ہو جائے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

لَمَالُ الْمَرْءِ يُصْلِحُهُ فَيُغْنِیْ
مَفَاقِرَهُ اَعَفُّ مِنَ الْقُنُوعِ

وہ مال جو انسان کی حالت درست رکھے اور اِحتیاج سے بچائے وہ سوال کرنے سے بہرحال بہتر ہے۔ (مفردات امام راغب)

''گویا کہ 'قناعت' اپنی ضروریات کے دائرہ کو محدود رکھنا اور جس قدر با آسانی اور جائز طور سے مل سکے اس پر اکتفا کرنا ہے اور قانع وہ شخص ہے جو دوسروں کے محلات کی بجائے اپنی کٹیا ہی کو دل و جان سے پسند کرتا ہو اور دوسروں کی مرغن غذاؤں کی بجائے اپنی نان جویں پر ہی خوش باش رہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے۔

قناعت کی ضد حرص ہے، قانع انسان تو حق حلال کی روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش رہتا ہے مگر حریص انسان کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔

قانع انسان کی آنکھ سیر ہوتی ہے، اس لیے اسے کسی شے کی طرف بھوکی نگاہوں سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، گویا کہ قناعت اور سیر چشمی لازم ملزوم ہیں اور ان دونوں اوصاف کا تعلق دولت کی کمی اور زیادتی سے نہیں ہوتا بلکہ دل کے حریص یا بے نیاز ہونے سے ہوتا ہے، دل کا بے نیاز ہونا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ایک سے بے نیاز ہو، بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے پاس اس کی ضروریات سے بہت زیادہ فالتو مال موجود ہوتا ہے، مگر حرص برابر اسے بے چین کیے رکھتی ہے، یہ شخص (حقیقت میں) محتاج ہوتا ہے، یہ شخص دولتمند ہونے کے باوجود احتساب کا شکار ہے، لہٰذا یہ محتاج ہے، اس کے برعکس بعض سیر چشم ایسے ہوتے ہیں کہ بمشکل ضروریات ہی پوری کر سکتے ہیں تاہم ان کے دل میں مال و دولت کی حرص نہیں ہوتی، لہٰذا وہ محتاج نہیں (بلکہ قانع ہے)۔" (دیکھیے اسوۂ حسنہ، جلد دوم، بنت الاسلام)

اس حقیقت کو جناب رسول اللہ ﷺ نے یوں واضح فرمایا:

((لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ))

(متفق علیه ریاض الصالحین، باب القناعَة)

"مال داری مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل مال داری تو دل کی مال داری ہے۔"

یہی بات سعدی شیرازی نے اس طرح کہی ہے ؎

تونگری بدل است نہ کہ بمال
بزرگی بعقل است نہ کہ بسال

یعنی امیری تو حقیقت میں دل سے ہوتی ہے نہ کہ مال سے اور بزرگی عقل وفراست سے ہوتی ہے نہ کہ درازیِ عمر سے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض تنگدستی کے باوجود فراخ دست تھے۔

قرآن حکیم ان کے ایثار نفس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:۵۹/۹)

''اور یہ (نفوسِ قدسیہ) اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔''

اس آیت مبارکہ کا شانِ نزول اس طرح ہے۔

''سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! مجھے بھوک نے ستایا ہے آپ ﷺ نے اہل خانہ کے ہاں پتا کروایا تو کھانے کی چیز نہ پائی، پھر آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا:

''کوئی ہے جو اس شخص کی میزبانی کرے؟ اللہ اُس پر رحم فرمائے۔''

ایک انصاری (ابوطلحہ رضی اللہ عنہ) نے کہا:

یارسول اللہ! میں اس کی میزبانی کروں گا، یہ صحابی اسے اپنے گھر لے آئے اور اپنی اہلیہ (اُم سلیم) سے کہا: یہ رسول اللہ کا (بھیجا ہوا) مہمان ہے، لہٰذا جو چیز موجود ہے اسے کھلاؤ، وہ کہنے لگیں ''اللہ کی قسم! میرے پاس تو بمشکل بچوں کا کھانا ہے'' ابوطلحہؓ نے کہا: اچھا یوں کرو کہ بچے جب کھانا مانگنے لگیں تو انہیں بہلا کر سلا دو اور جب ہم دونوں (میں اور مہمان) کھانا کھانے لگیں (عرب دستور کے مطابق مہمان کو الگ نہیں چھوڑا جاتا) تو چراغ کو (درست کرنے کے بہانے سے) گُل کر دینا، اس طرح ہم دونوں بھی آج رات کچھ نہیں کھائیں گے (اور مہمان سیر ہو کر کھالے گا) چنانچہ اُمِ سلیم رضی اللہ عنہا نے ایسا ہی کیا، صبح جب ابوطلحہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''فلاں مرد (ابوطلحہ رضی اللہ عنہ) اور فلاں عورت (ام سلیم رضی اللہ عنہا) پر اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوا اور مجھ پر مندرجہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری، بحوالہ ایسرا لتفسیر، عبدالرحمن کیلانی)

یہ ہے قناعت پسندی، فراخدلی، سیرچشمی اور احسان و مروت کی لازوال مثال جو سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے تاریخ اسلام میں رقم کی۔

قناعت پسندی اتنی بڑی دولت ہے کہ اس سے دل اطمینان و سکینت سے معمور ہو جاتے ہیں اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ دل فرحاں و شاداں رہتے ہیں۔ مندرجہ ذیل واقعہ پر غور کیجیے۔

''سیدنا عون بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں دولتمندوں کی صحبت میں رہا تو اپنے

سے زیادہ کسی کو غم زدہ نہ پایا، اپنی سواری سے اچھی سواری اور اپنے کپڑوں سے اچھے کپڑے دیکھتا (اور غم کھاتا، پھر جب) غریبوں کے ساتھ رہا، تو (اس رنج و غم سے) آرام پا گیا (کیونکہ نہ کسی کو اپنے سے بہتر حالت میں دیکھتا تھا اور نہ اپنی محرومی پر غم کھاتا تھا)۔'' (ترمذی، بحواله أسوهٔ حسنه، بنت الاسلام)

حقیقت میں قناعت پسندی کی خوبی پیدا کرنے لیے انسان کو چاہیے کہ اپنے سے کم تر پر نظر رکھے، اس حدیث مبارکہ پر بھی غور کیجیے:

((أُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَّا تَزْ دَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ)) (مسلم، رقم الحديث:۲۹۶۳)

''اس شخص کی طرف نگاہ کرو جو (مال و دولت یا جاہ و جلال اور حسن و جمال وغیرہ میں) تم سے کم ہے اور اُس کی طرف نہ دیکھو، جو تم سے بڑھ کر ہے، اس طرح تم اللہ کی نعمتوں کو (جو اس نے تمہیں اپنے فضل سے دے رکھی ہیں) حقیر نہ سمجھو گے۔''

''حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مال طلب کیا، آپ ﷺ نے مجھے عطا فرمایا، پھر دو تین بار طلب کیا تو آپ ﷺ نے مجھے عطا فرمایا، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، حکیم! (غور سے سنو)

((اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ، حُلْوَةٌ، فَمَنْ أَخَذَهُ بِسَخَاوَةِ نَفْسٍ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْهِ، وَمَنْ أَخَذَهُ بِاِشْرَافِ نَفْسٍ لَمْ يُبَارَكْ لَهُ فِيْهِ، كَالَّذِيْ يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ، اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰی))

''یہ مال تو سرسبز اور میٹھا ہے، جو اسے بے پروائی کے ساتھ لے گا، اُس میں برکت ہو گی، اور جو اسے نفس کی طمع کے ساتھ لے گا تو برکت سے محروم رہے گا اور یہ مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا اور اونچا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے (یعنی صدقہ و خیرات کرنے والا ہاتھ، صدقہ و خیرات لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے)، (رسول اللہ ﷺ کی اس جامع نصیحت کو سن کر) حکیمؓ بن حزام کہتے ہیں کہ میں نے رسول

اللہ ﷺ سے عرض کیا، یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، میں زندگی بھر آپ کے بعد کسی سے کوئی شے لے کر اُس کے مال میں کمی نہ کروں گا:"

((لَا أَرْزَأُ أَحَدًا بَعْدَكَ شَيْئًا حَتّٰى أُفَارِقَ الدُّنْيَا))

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں سیدنا حکیم بن حزام کو بلاتے تھے اور کچھ دینا چاہتے تھے تو وہ انکار کر دیتے تھے، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں انہیں بلایا اور مال دینا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا، سیدنا عمرؓ نے کہا: اے مسلمانو! میں تمہیں حکیم بن حزام کے معاملے میں گواہ کرتا ہوں کہ میں انہیں وہ حق دیتا ہوں جو مال غنیمت ان کے لیے رکھا ہے اور یہ انکار کرتے ہیں اور سیدنا حکیم بن حزام نے نبی ﷺ کے بعد وفات پانے تک کسی سے کچھ نہیں لیا۔" (مسلم، رقم الحدیث ۱۰۳۵)

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

((مَنْ سَأَلَ النَّاسَ تَكَثُّرًا فَإِنَّمَا يَسْئَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ يَسْتَكْثِرْ))

(رواه مسلم، رياض الصالحين، رقم الحديث:۵۳۷)

"جو لوگوں سے جمع کرنے کے لیے مانگتا ہے، وہ آگ کی چنگاری مانگتا ہے، اُس کو اختیار ہے کہ زیادہ چنگاریاں جمع کرے یا کم۔"

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((مَنْ تَكَفَّلَ لِيْ أَنْ لَا يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئًا وَ أَتَكَفَّلُ بِالْجَنَّةِ؟ فَقُلْتُ: أَنَا فَكَانَ لَا يَسْأَلُ أَحَدًا شَيْئًا)) (رواه ابوداود، رياض الصالحين، رقم الحديث:۵۴۰)

"جو شخص اس بات کا عہد کرے کہ میں لوگوں سے کسی قسم کا سوال نہ کروں گا تو میں اس کے لیے جنت کا ذمہ دار ہوں (اس پر ثوبانؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں) رسول اللہ ﷺ سے عرض کرنے لگے، (کہ میں لوگوں سے کسی قسم کا سوال نہ کروں گا) کہتے ہیں پھر میں نے کبھی بھی کسی سے کچھ نہ مانگا (بلکہ قناعت پسندی کی راہ کو اختیار کیا)"

یہی قناعت ہر داعی الی اللہ کا زادِ سفر ہے اور انبیاء علیہم السلام وہ سعادت مند لوگ ہیں جن کی پاکیزہ زندگیاں قناعت کا نمونہ تھیں، انہوں نے اپنے دست و بازو سے کمایا اور دعوتِ حق کے چراغ روشن کیے اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک کوئی انسان لوگوں کے مال و دولت سے بے نیاز ہو کر دعوتِ حق کا فریضہ سرانجام نہ دے، وہ برملا، اعلائے کلمۃ الحق کا اظہار نہیں کرسکتا، خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

﴿یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ، وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ: ٥/٦٧)

''اے رسولؐ! جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے (لوگوں تک) پہنچا دیجیے، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپؐ نے اللہ کی رسالت کا حق ادا نہ کیا اور (آپ بلا خوف و خطرہ یہ فریضہ سرانجام دیجیے) آپ کو اللہ تعالیٰ لوگوں سے بچالے گا۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اس حکم کا مفاد یہ ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے بلا کم و کاست اور بلا خوف لومۃ لائم (کسی کی ملامت کی پروا کیے بغیر) آپ لوگوں تک پہنچا دیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''جو شخص یہ گمان کرے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چھپا لیا، اُس نے یقیناً جھوٹ کہا۔''

(احسن البیان، صحیح بخاری، رقم الحدیث:٤٨٥٥)

آپ ﷺ نے اپنی جوانی میں اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ تجارتی سفر اختیار کیے اور ''تاجر امین'' کے لقب سے جانے پہچانے جاتے تھے، بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سامان تجارت لے کر مکہ سے باہر تشریف لے گئے اور آپ ﷺ کی امانتداری کی وجہ اس تجارت میں بڑا نفع ہوا، آپ ﷺ کی شرافت اور امانتداری دیکھ کر بی بی صاحبہ نے نکاح کا پیغام بھیجا، جسے آپ ﷺ نے بھی بی بی صاحبہ کی پارسائی کی وجہ سے قبول کرلیا، نکاح کے بعد بی بی صاحبہ نے اپنی ساری دولت آپ کے حوالے کر

دی، آپ ﷺ نے اسے اپنے پاس نہ رکھا بلکہ وہ سب کی سب غربا و مساکین میں لٹا دی اور خود فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دی، ہجرت مدینہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متعدد فتوحات سے نوازا اور ڈھیروں مال غنیمت جمع ہوا، مگر وہ سب کا سب لوگوں میں تقسیم کر ڈالا اور خود صبر وقناعت سے گزارا کیا اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی یہی شانِ استغنا آپ ﷺ کو بلندیوں پر فائز کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا مقرب ترین بندہ بنا دیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں میں یہ دعا بھی تھی:

((اَللّٰھُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ، وَ بَارِكْ لِیْ فِیْهِ)) (الحاکم فی المستدرك، رقم الحدیث:۲/۴۴۵)

''اے اللہ! جس قدر رزق سے آپ نے نوازا ہے اُس میں قناعت اور برکت عطا فرما۔''

آپ ﷺ یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ آلَ مُحَمَّدٍ قُوْتًا)) (البخاری، رقم الحدیث: ٦٤٦٠)

''اے اللہ! محمد (ﷺ) کی آل و اولاد کو اتنی روزی عطا فرما (کہ آپ کے سوا کسی اور کا دستِ نگر نہ ہونا پڑے)، یہاں پر آل سے مراد نہ صرف آپ ﷺ کی اولاد ہے بلکہ آپ کی امت کا ہر فرد ہے۔''

کاشانۂ نبوت ﷺ کا حال بھی سنتے جایئے:

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ

((وَمَا شَبِعَ مِنْ خُبْزٍ وَ زَیْتٍ فِیْ یَوْمٍ وَّاحِدٍ مَرَّتَیْنِ)) (مسلم، رقم الحدیث:۲۹۷٤)

کہ آپؐ نے ایک ہی دن روٹی اور گھی سے صبح و شام پیٹ نہ بھرا۔

سیدنا عروہؒ، سیدہ عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں۔

((مَا اَکَلَ آلُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم أُکْلَتَیْنِ فِیْ یَوْمٍ اِلَّا اِحْدَا هُمَا تَمْرٌ)) (البخاری مع الفتح: ۱۱/ ٦٤٥٥)

''محمد ﷺ کی ایک دن کی خوراک میں دونوں وقت کھانا جمع نہ ہوا، بلکہ اس میں سے ایک

وقت کھجوروں پر گزر بسر رہی۔“

ام المومنین سیدہ عائشہؓ ہی بیان کرتی ہیں:

((مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ مِنْ شَعِيرٍ، يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، حَتَّى قُبِضَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))

”رسول اللہ ﷺ کے اہل خانہ نے مسلسل دو دن جو کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا، یہاں تک آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔“

سبحان اللہ! یہ سادگی اور پاکیزگی اور پھر دعوت حق کو جس خوبی اور محنت سے پھیلایا، وہ آپ ﷺ ہی کا حصہ ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔

سچ تو یہ ہے کہ اطمینان وسکون کاروں اور کوٹھیوں میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے اور یہ بات قناعت پسندی اور پرہیزگاری سے پیدا ہوتی ہے، یہاں اس بات پر بھی غور کر لیجیے کہ قناعت پسندی کا یہ مفہوم بھی نہیں ہے کہ ہم محنت و مشقت سے دست بردار ہو جائیں اور ہمارے اندر زندگی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ختم ہو جائے، مثلاً ہم معاشی اور تعلیمی میدان میں جتنے بھی آگے بڑھیں ہمارے اندر حرص وغرور کی بجائے نرمی، شفقت اور احسان و مروت کے جذبات پروان چڑھنے چاہئیں۔ ہماری دولت قارون کی نہیں عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی دولت بن جائے جو ہمیشہ غربا و مساکین کے لیے وقف رہتی تھی، ہمارا علم انسانیت کی تباہی و بربادی کے لیے نہیں بلکہ اس کی فلاح و بہبود، نیکی اور بھلائی کے فروغ کے لیے وقف ہو جائے، اسی میں سکون اور سرور ملتا ہے، بقول شخصے

قناعت ہے وہ بے بہا کیمیا
چھوا اس نے جس کو بھی سونا ہوا

پاکستان کو ابھی تک ہم فلاحی اسلامی ریاست کیوں نہیں بنا سکے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قناعت کی جگہ حرص نے راہ پالی ہے، کیا سیاست دان اور کیا عوام حرص کے مرض میں مبتلا ہیں، ہم راتوں رات کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھتے ہیں اور لوگوں کو بنکوں کی ایسی سکیمیں بتائی جاتی ہیں کہ دنوں میں کروڑ پتی بن جائیں اور حکمران منصب سنبھالتے ہی اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ روپے پیسے کو کیونکر

اکٹھا کیا جائے، عوام کی خدمت و بہبود کا بھلا کس کو خیال ہے؟ ہر شخص دولت کے چکر میں پھنس کر رہ گیا ہے، حق حلال کی روزی اور قناعت پسندی کی پاکیزہ راہ نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے، کیا ہم اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کی طرف پلٹنے کی کوشش کریں گے؟ یہ بات یاد رکھیے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد:۱۱/۱۳)

اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔''

۱۱- اَلصَّبْرُ:

راحت و آرام میں اللہ تعالیٰ کے حضور سپاس گزاری اور احسان مندی کا اظہار کرنا ''شکر'' ہے، جبکہ مصائب و آلام میں نفس میں اضطراری اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا اور راہ حق پر ثابت قدم رہنا ''صبر'' ہے اور یہ زندگی گزارنے کا وہ ارفع و اعلیٰ اصول ہیں جو اسلام نے ہمیں عطا کئے ہیں اور داعی الی اللہ کے لیے بہترین زادِ سفر ہیں۔ مجد الدین محمد بن یعقوب (المتوفی ۸۱۷ھ) لکھتے ہیں:

﴿فَالصَّبْرُ: حَبْسُ النَّفْسِ عَنِ الْجَزْعِ وَالسَّخَطِ، وَحَبْسُ اللِّسَانِ عَنِ الشِّكْوٰى، وَ حَبْسُ الْجَوَارِحِ عَنِ التَّشْوِيْشِ، قَالَ الْإِمَامُ اَحْمَدُ رِحِمَهُ اللّٰهُ: ذَكَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى الصَّبْرَ فِى الْقُرْآنِ نَحْوًا مِنْ تِسعِيْنَ مَوْضِعاً، وَهُوَ وَاجِبٌ بِاِجْمَاعِ الْأُمَّةِ وَ هُوَ نِصفُ الْإِيْمَانِ، فَإِنَّ الْإِيْمَانَ نِصْفَانِ، نِصْفُ صَبْرٌ، وَ نِصفُ شُكْرٌ﴾ (بصائر ذوی التمیز فی لطائف الکتاب العزیز)

''صبر کیا ہے؟ جزع فزع کے مواقع پر ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرنا، زبان پر شکوہ و شکایت کا پیدا نہ ہونا اور اعضا و جوارح سے کسی سراسیمگی اور بے چینی کا اظہار نہ ہونا، صبر کہلاتا ہے۔ امام احمد ابن حنبلؒ کا قول ہے: امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ صبر زندگی کا جُزوِ لَا ینفک ہے اور وہ نصف ایمان ہے، اس لیے کہ ایمان (کی حقیقت اور چاشنی) دو نصف حصوں سے عبارت ہے۔ اس میں ایک (نصف اول) صبر ہے، جبکہ (نصف آخر) شکر ہے۔''

قرآن حکیم میں صبر کا بیان مختلف پیرائے میں آیا ہے جس میں چند پیش خدمت ہیں۔ پہلی بات:

۱- نماز سے صبر کا حصول:

ارشاد ربانی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ﴾ (البقرہ:۲/۱۵۳)

''اے ایمان والو! نماز اور صبر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مدد چاہو۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''انسان کی دو ہی حالتیں ہوتی ہیں، آرام و راحت (یہ نعمت ہے) یا تکلیف و پریشانی...... نعمت میں شکرِ الٰہی کی تلقین اور تکلیف میں صبر اور اللہ سے استعانت کی تاکید ہے، حدیث میں ہے:

''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اسے خوشی پہنچتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور دونوں ہی حالتیں اس کے لیے خیر ہیں۔''

پس اللہ کی نعمتوں پر شکر کرنا چاہیے اور مصائب پر صبر کا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور اس بات پر استقامت نماز کے ذریعے ہوگی۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۝ وَاِذَا مَسَّهُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ۝ اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ﴾

(المعارج:۷۰/۱۹-۲۳)

''انسان تھڑ دِلا پیدا کیا گیا ہے، جب اُس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اُسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ نماز کی پابندی سے نہ صرف صبر و استقامت کا راستہ مضبوط اور ہموار ہوتا ہے بلکہ بخل و حرص اور ایسی کئی روحانی بیماریوں کا شافی علاج بھی ہے۔

۲- صبر اور حوصلہ:

ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ﴾ (الاحقاف:۴۶/۳۵)

''پس (اے نبیؐ!) آپ ایسا صبر کریں جیسا صبر عالی ہمت رسولوں نے کیا اور اُن کے لیے (عذاب طلب کرنے میں) جلدی نہ کیجیے۔''

رب کریم کی طرف سے نبی ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اصحابِ عزیمت رسولوں کی طرح صبر و ہمت سے کام لیں اور کفار مکہ کے لیے بد دعا میں جلدی نہ کیجیے، چنانچہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ جو ایمان لائے مکی دور میں جس استقامت، استقلال اور صبر و عزم کا مظاہرہ کیا، وہ تاریخ اسلام میں شجاعت و ہمت اور ایثار و قربانیوں کا لازوال باب ہے۔ آپ غور کیجیے کہ اہل ایمان کو ہر طرح سے ستایا گیا، مارا پیٹا گیا، گرم ریت پر لٹایا گیا اور گلے میں رسی ڈال کر گھسیٹا گیا، اس ظلم و ستم کی انتہا میں کبھی شعب ابی طالب میں کھلے آسمان کے نیچے ٹھہرنے پر وہ مجبور ہوئے اور کبھی انہیں حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی، اُن میں بعض نے تکالیف اٹھا اٹھا کر راہ میں جام شہادت بھی نوش کیا، مگر صبر کا دامن نہ چھوڑا، اسی پر انہیں ابدی کامیابی کا مژدۂ جانفزا سنایا گیا اور شجرِ اسلام پھلا پھولا۔ ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ﴾

۳- صبر کرنے والوں کی تعریف:

﴿اَلصّٰبِرِيۡنَ وَ الصّٰدِقِيۡنَ وَ الۡقٰنِتِيۡنَ وَالۡمُنۡفِقِيۡنَ وَالۡمُسۡتَغۡفِرِيۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ﴾

(آل عمران:۳/۱۷)

''(اہل ایمان کی صفات میں سے یہ بھی ہیں) صبر کرنے والے ہیں، راستباز ہیں، فرمانبردار ہیں، فیاض ہیں (سخاوت کرنے والے) اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگنے والے ہیں۔''

یہ وہ صفات ہیں جن کو اختیار کرنے والے اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے بن جاتے ہیں۔ صبر کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کو صبر کے ساتھ اختیار کرتے ہیں اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہتے ہیں اور اپنے اقوال و افعال میں ''صادق'' سچے ہیں، اور رب کی رضا کی خاطر ہمیشہ اطاعت اور فرمانبرداری کی راہ اختیار کرتے ہیں، جبکہ ہر وقت اُن میں خشوع و خضوع

کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اُسی مولا و مالک کی رضا کے لیے فقرا و مساکین پر خرچ بھی کرتے رہتے ہیں اور رب کے حضور بوقت سَحَر اپنی جبینِ نیاز اُس کی چوکھٹ پر جھکا دیتے ہیں اور نماز کے بعد پھر استغفار کرتے ہیں۔'' (تیسیرالکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان، عبدالرحمن ناصر السعدی)

۴- حق و باطل کی جنگ کے وقت:

ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ﴾ (البقرہ:۲/۱۷۷)

''(اور صبر کرنے والے) تنگی اور مصیبت کے وقت اور حق و باطل کی جنگ میں۔''

یعنی جنگ کے وقت راہِ فرار اختیار نہیں کرتے بلکہ دشمنوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ڈٹ جاتے ہیں ؎

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میدان سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی، تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

۵- صبر کرنا انتقام لینے سے بہتر ہے:

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ○ وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَ لَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ﴾ (النحل:۱۶/۱۲۶،۱۲۷)

''(مسلمانو!) اگر تم لوگ (اپنے مخالفین سے) بدلہ لو تو بس اُسی قدر لو، جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو، لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً (یہ بات) صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر

کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔" ہے۔ (اے نبیؐ) صبر سے (دعوتھارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں: سے ہے، ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ

"انتقام لینے کا وقت بھی نازک ہوتا ہے، مظلوم کا نفس جوشِ انتقام میں عموماً حد سے بڑھ جاتا ہے اور اب خود ظالم ہو جاتا ہے، قرآن مجید نے اس اشتعال کے وقت جذبات پر قابو رکھنے کی بار بار تاکید کی ہے اور انتقام کو حدود کے اندر رکھنے کا خاص اہتمام فرمایا ہے

" وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ" خطاب اب محض رسول اللہ ﷺ سے نہیں، عام امت سے ہے، نہ

" وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ" میں ترکیبِ کلام سے پتا چل رہا ہے کہ بہتر اور افضل تو انتقام نہ لینا ہی

ہے لیکن اگر اس پر قدرت نہ ہو اور مجرم کو سزا دینے ہی پر تُل جاؤ، تو اتنی احتیاط تو بہرحال ضروری ہے کہ سزا بس جرم ہی کے متناسب ہو، اس سے زائد ہرگز نہ ہونے پائے، جیسے مریض سے طبیب کہتا ہے کہ بدپرہیزی اگر کرنا ہی ہے تو فلاں مقدار سے زائد نہ کرنا۔

اسلام نے بالکل صحیح طور پر (دشمنوں سے) فطرتِ بشری کے مطابق اجازت تو انتقام لے لینے کی دی ہے، لیکن مقام بلند صبر و تحمل اور عفو و درگزر ہی کا ہے۔" (تفسیر ماجدی)

اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے عفو و درگزر کرنے والے ہی محسنین کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہی لوگ محبوب ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿ (ال عمران:۳/۱۳۴)

﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ

"جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔"

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ عفو و درگزر کا بہترین نمونہ تھی، آپ ﷺ نے لوگوں کی سختی کا جواب ہمیشہ نرمی اور شفقت سے دیا، جن لوگوں نے آپ ﷺ کو سخت سُست کلمات کہے، آپ نے ان کے حق میں کلماتِ خیر کہے، وادی طائف کا تبلیغی سفر آپ کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا، اہل

طائف نے آپ ﷺ کی دعوت حق پر آپ ﷺ پر کنکر برسائے کہ جسد اطہر سے جگہ جگہ خون جاری ہو

گیا، فرشتہ غیب سے حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ حکم ہو تو ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے، جواب ملتا ہے کہ شاید ان کی نسل سے کوئی اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے والا پیدا ہو، پتھر کھا کر بھی ان پر پھول برسائے ۔

یہ فرما کر نبیؐ نے ہاتھ اٹھا کر اک دعا مانگی
اللہ کا فضل مانگا، خوئے تسلیم و رضا مانگی
دعا مانگی الٰہی قوم کو چشمِ بصیرت دے
الٰہی رحم کر اُن پر انہیں نورِ ہدایت دے
جہالت ہی نے رکھا ہے صداقت کے خلاف اُن کو
بچارے بے خبر انجان ہیں کر دے معاف ان کو
فراخی ہمتوں کو، روشنی دے ان کے سینوں کو
کنارے پر لگا دے ڈوبنے والے سفینوں کو
الٰہی فضل کر کہسارِ طائف کے مکینوں پر
الٰہی پھول برسا پتھروں والی زمینوں پر

پھر تاریخ نے دیکھا کہ یہی اہل طائف جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ ﷺ کی دعوت کو دل و جان سے قبول کیا، پھر خلوص کے ساتھ اس کی محنت میں لگ گئے اور آج یہی طائف سعودی عرب کے اہم شہروں میں شمار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی صبر کرنے والے اور معاف کرنے والے شخص کی ہمت کو عزیمت کا نام دیا ہے، ارشاد ہوا:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (الشوریٰ:۴۲/۴۳)

جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

۶- دعوت پھیلانے میں صابرین کا مقام:

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ

وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ﴾ (حٰمٓ السجدہ: ٤١/٣٤-٣٥)

"اور (اے نبیؐ!) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، آپ بدی کو اُس نیکی سے دفع کیجیے، جو بہترین ہو، آپ دیکھیں گے کہ آپؐ کے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے، یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔"

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

یہ ایک بہت ہی اہم اخلاقی ہدایت ہے کہ برائی کو اچھائی کے ساتھ ٹالو، یعنی برائی کا بدلہ احسان کے ساتھ، زیادتی کا بدلہ عفو کے ساتھ، غضب کا صبر کے ساتھ، بے ہودگیوں کا جواب چشم پوشی کے ساتھ اور مکروہات (ناپسندیدہ باتوں) کا جواب برداشت اور حلم کے ساتھ دیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا دشمن، دوست بن جائے گا، دور دور رہنے والا قریب ہو جائے گا اور خون کا پیاسا، تمہارا گرویدہ اور جاں نثار ہو جائے گا۔

﴿وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا﴾ یعنی برائی کو بھلائی کے ساتھ ٹالنے کی خوبی اگرچہ نہایت مفید اور بڑی ثمر آور ہے، لیکن اس پر عمل وہی کر سکیں گے جو صابر ہوں گے، غصے کو پی جانے والے اور ناپسندیدہ باتوں کو برداشت کرنے والے ہیں۔

﴿وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ﴾ (بڑا نصیبہ) سے مراد جنت ہے، یعنی مذکورہ خوبیاں اس کو حاصل ہوتی ہیں جو بڑے نصیبے والا ہوتا ہے، یعنی جنتی جس کے لیے جنت میں جانا لکھ دیا گیا ہو۔ (احسن البیان)

اس نیلگوں آسمان کے نیچے سب سے بڑھ کر بانصیب جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کی حیات طیبہ مذکورہ آیت مبارکہ کی جیتی جاگتی تصویر تھی، حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آئی ہے؟ ارشاد ہوا کہ پیغمبروں پر، پھر اِس طرح درجہ بدرجہ لوگوں پر (یعنی ابرار و صالحین پر) واقعات بھی اسی روایت کی

تصدیق کرتے ہیں۔ آپ ﷺ سرورِ اَنبیا تھے، اِس بنا پر دنیا کے شدائد اور مصائب کا بار اس مقدس گروہ میں سب سے زیادہ آپ ﷺ کے دوشِ مبارک پر تھا، اسی لیے قرآن حکیم میں بار بار آپ ﷺ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

آپ ﷺ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کہ والد نے انتقال کیا، عہدِ طفولیت میں تھے کہ سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا، اس کے دو برس بعد دادا نے، جن کی نگاہِ لطف زخمِ یتیمی کا مرہم تھا، وفات پائی، وفات کے بعد ابو طالب نے، جو قریش کے ظلم وستم کے سپر تھے، مفارقت کی، محرمِ اسرار امُّ المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ، جو اس ہجومِ مصائب میں آپ کی تنہا مونس وغمخوار تھیں، موت نے ان کو بھی اس زمانہ میں آپ ﷺ سے علیحدہ کر دیا، والدین اور بیوی کے بعد انسانوں کو سب سے زیادہ اولاد سے محبت ہوتی ہے جس کی مفارقت کا زخم تمام عمر مندمل نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ کی اولادِ ذکور حسب اختلاف روایت کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ آٹھ تھی، لڑکیوں کی تعداد چار تھی، لیکن ایک (سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے سوا سب نے کم سنی یا جوانی میں آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے جان دی، اِن واقعات پر اگرچہ کبھی کبھی آپ ﷺ کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں لیکن زبان و دل پر ہمیشہ صبر وسکینت کی مہر لگی رہی اور کبھی کوئی کلمہ زبانِ مبارک سے ایسا نہیں نکلا جس سے بے صبری کا کوئی پہلو ظاہر ہوتا ہو۔''

(سیرت النبیؐ، جلد۲)

۷- صبر اور کامیابی کا جامع اور مختصر ترین راستہ:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (العصر:۱۰۳)

''(زمانے کی قسم!) انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''زمانے سے مراد، شب و روز کی یہ گردش اور ان کا ادل بدل کر آنا ہے رات آتی ہے تو

اندھیرا چھا جاتا ہے اور دن طلوع ہوتا ہے تو ہر چیز روشن ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کبھی رات لمبی، دن چھوٹا اور کبھی دن لمبا اور رات چھوٹی ہو جاتی ہے، یہی مرورِ ایام زمانہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور کاریگری پر دلالت کرتا ہے، اسی لیے رب نے اس کی قسم کھائی ہے (یعنی اس کو گواہ بنایا ہے، قسم بمعنیٰ شہادت کے ہیں)۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی مخلوق میں سے جس کی چاہے قسم کھا سکتا ہے (یعنی اس کو گواہ بنا سکتا ہے) لیکن انسانوں کے لیے اللہ کی قسم کے علاوہ کسی چیز کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔

﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ﴾ یہ جواب قسم ہے، انسان کا خسارہ اور ہلاکت واضح ہے کہ جب تک وہ زندہ رہتا ہے، اس کے شب و روز سخت محنت کرتے ہوئے گزرتے ہیں، پھر جب موت سے ہمکنار ہوتا ہے تو موت کے بعد بھی آرام و راحت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ وہ جہنم کا ایندھن بنتا ہے۔

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ہاں اس خسارے سے وہ لوگ محفوظ ہیں جو ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں، کیونکہ ان کی زندگی چاہے جیسی بھی گزری ہو، موت کے بعد وہ بہر حال ابدی نعمتوں اور جنت کی پر آسائش زندگی سے بہرہ ور ہوں گے۔

﴿وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ﴾ یعنی مصائب و آلام پر صبر، احکام و فرائضِ شریعت پر عمل کرنے میں صبر، معاصی سے اجتناب پر صبر، لذت و خواہشات کی قربانی پر صبر۔ (یہ مسلمانوں کے درمیان باہم حق بات اور صبر کی تلقین ہے) جو ان کا زادِ سفر ہے۔

(احسن البیان)

۸- اجر و ثواب:

ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر: ۳۹/ ۱۰)

''بلاشبہ صبر کرنے والوں کو تو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''

سبحان اللہ! یہ کتنا بڑا اجر ہوگا، یہ وہ رب کریم ہی جانتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم میں صابرین کی صفت پیدا فرمادے، پھر ہمارا شمار انہی لوگوں کے ساتھ فرمادے۔ آمین!

صبر کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی ان احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے، آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اَلطُّھُورُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلآنِ، اَوْ تَمْلأُ مَا بَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَالصَّلاۃُ نُورٌ، وَالصَّدَقَۃُ بُرْھَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِیَاءٌ، وَالْقُرْاٰنُ حُجَّۃٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ کُلُّ النَّاسِ یَغْدُو، فَبَائِعٌ نَفْسَہُ فَمُعْتِقُھَا اَوْ مُوْبِقُھَا)) (رواہ مسلم، ریاض الصالحین، باب الصبر)

”طہارت نصف ایمان ہے اور الحمد للہ ترازو کو بھر دیتا ہے۔ (وہ ترازو جس میں روزِ قیامت اعمال تلیں گے) اور سبحان اللہ اور الحمد للہ (کا ورد) ترازو کے دونوں پلڑے بھر دیتا ہے۔ یا زمین و آسمان (کے خلا کو) نیکیوں سے بھر دیتا ہے، سبحان اللہ! اتنے وزنی کلمات ہیں) اور نماز نور ہے (جنت کا راستہ دکھانے کے لیے روشنی ہے) اور صدقہ دلیل ہے (آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کا سروسامان ہے) صبر روشنی ہے (بندۂ مومن کا اور خاص طور پر داعی الی اللہ کا زادِ سفر ہے) اور قرآن حجت ہے تمہارے حق یا تمہارے خلاف (جو مسلمان اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں گے ان کے حق میں گواہی دے گا اور جو روگردانی کریں گے ان کے خلاف روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور گواہی دے گا) ہر شخص ہر روز اپنے نفس کا سودا کرتا ہے، یا تو اس کو آزاد کر لیتا ہے (آتشِ جہنم سے اچھے اعمال کے ساتھ) یا اس کو ہلاک کر دیتا ہے (برے اعمال کے ساتھ آتشِ جہنم کا سامان مہیا کرتا ہے)۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَا یُصِیْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا ھَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا أَذًی وَ لَا غَمٍّ حَتّٰی الشَّوْکَۃِ یُشَاکُھَا اِلَّا کَفَّرَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ خَطَایَاہُ)) (متفق علیہ، ریاض الصالحین، باب الصبر)

''کسی مسلمان کو جو مصیبت پہنچتی ہے خواہ وہ کسی قسم کی ہو، بیماری ہو، رنج ہو، غم ہو، دکھ اور پریشانی ہو، حتیٰ کہ اسے کانٹا بھی چبھے، اللہ تعالیٰ اس کے صلہ میں اس کی خطائیں معاف کر دیتا ہے۔''

۱۲- اَلصِّدْقُ:

''وہ بات جس میں اخلاص ہو اور امانتداری بھی، حقیقت ہو اور حقانیت بھی، صلابت ہو اور مضبوطی بھی، سیدھی، سچی بات، صاف ستھرا معاملہ۔'' (القاموس الوحید)

امام راغب اصفہانی کہتے ہیں:

((اَلصِّدْقُ مُطَابَقَةُ الْقَوْلِ الضَّمِيْرِ وَالْمُخْبَرِ عَنْهُ مَعاً وَ مَتَى انْخَرَمَ شَرْطٌ مِنْ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ صِدْقًا)) (مفردات القرآن)

''یعنی دل اور زبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفسِ واقعہ کے مطابق ہونا، اگر دونوں میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی گئی تو کامل صدق نہیں رہتا۔''

اس بات کو مثال سے یوں سمجھیے کہ ایک شخص نے صدق دل سے کلمۂ طیبہ کا اقرار کیا ہے، یعنی زبان سے ((لَا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ)) پڑھا اور دل نے اُس کی تصدیق کی، اب اُس کے لئے اس کلمہ کے مطابق اعمال صالحہ ضروری ہو گئے۔ اگر وہ شخص احکام الٰہی کو سنت نبویؐ کے مطابق زندگی بھر ادا کرتا رہے گا تو اُس نے 'صدق' پر عمل کیا اور ایسا شخص صدیق کہلائے گا۔

امام راغب لکھتے ہیں:

((وَالصِّدِّيْقُ مَنْ كَثُرَ مِنْهُ الصِّدقُ وَقِيْلَ لِمَنْ صَدَقَ بِقَوْلِهٖ وَ اعْتِقَادِهٖ وَحَقَّقَ صِدْقَهٗ بِفِعْلِهٖ)) (مفردات القرآن)

''الصدیق'' بہت سچ بولنے والا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے صدیق وہ شخص ہے جو قول و اعتقاد میں سچا ہو اور پھر اپنی سچائی کی تصدیق اپنے عمل سے بھی ثابت کرتا ہو۔''

جس طرح کہ سیدنا ابوبکرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ ایمان پر فوری لبیک کہا اور اسوۂ رسول ﷺ پر اپنی زندگی ڈھال لی تو رسول اللہ ﷺ نے ''الصّدیق'' کا لقب عطا فرمایا۔

اور یہی داعی الی اللہ کا سب سے بڑا وصف ہے کہ اُس کی اپنی زندگی صدق سے عبارت ہوتی ہے، اُس کے قول وعمل میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، جس بات کی وہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے اُس پر وہ خود بھی عمل پیرا ہوتا ہے، اُس کی بات میں اثر اور وزن ہوتا ہے اس بات کو مثال سے یوں سمجھیے کہ ایک شخص لوگوں کو نماز کی دعوت دیتا ہے مگر خود نماز نہیں پڑھتا تو ایسے شخص کی دعوت کیونکر مؤثر ہوسکتی ہے؟ یہ تو وہی بات ہوئی جس پر قرآن نے متنبہ کیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف: ۶۱/۲)

''اے ایمان والو! وہ بات (لوگوں سے) کیوں کہتے ہو جسے تم خود نہیں کرتے ہو۔''

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''انسان کے ہر قول اور علم کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اُس کے لیے اُس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہوسکتا ہے اور جو سچا ہے، اُس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے۔'' (سیرت النبی، جلد ششم)

رب تعالیٰ کی صفت:

''صدق'' اس کائنات کے خالق و مالک کی صفات میں سے ایک بڑی صفت ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے؟ قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں اس کا فرمان ہے:

﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا﴾ (النساء: ۴/۸۷)

''اللہ تعالیٰ سے زیادہ اور سچی بات والا اور کون ہوگا۔''

اہل ایمان کے لیے آخرت میں بہشت اور حیاتِ جاوداں کا بیان ہوا تو فرمایا:

﴿وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا﴾ (النساء: ۴/۱۲۲)

''یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات کا سچا ہوگا۔''

انسانوں کے لیے جو ضابطۂ حیات اُس نے عطا فرمایا، وہ بھی حق اور سچ پر مبنی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾ (الانعام:٦/١٤٦)

''اور ہم ہیں سچے۔''

خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ خالق کائنات کے 'صدق' کا اعلان کریں اور دین حنیف کی پیروی کریں:

﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾

(آل عمران:٣/٩٥)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ سچا ہے، تم سب ابراہیمؑ حنیف کی ملت کی پیروی کرو (جنہوں نے یکسوئی کے ساتھ اللہ کی بندگی کی) اور وہ مشرک نہ تھے۔''

ربّ کائنات نے زمین و آسمان اور اُس میں جو کچھ ہے حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور اس میں انسانوں کی حیثیت کُلِ سرسبُد کی ہے۔ اُن کی ہدایت کے لیے نہ صرف انہیں فہم و بصیرت سے نوازا بلکہ اَنبیائے کرام کو بھیجا جن نفوسِ قدسیہ کی زندگیاں ہدایت الٰہی کے سانچے میں ڈھلی ہوتی تھیں تاکہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ بنیں، جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ نسل انسانیت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہے، پھر جس کسی نے سچائی کے ساتھ حق بات کو تسلیم کیا اور اُسے اپنے قول و عمل سے آشکارا کیا تو وہی پرہیز گار ہیں اور دائمی کامیابی انہی کے لیے ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الزمر:٣٩/٣٣)

''اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس سچ کو مانا، وہی پرہیز گار ہیں (آخرت کے عذاب سے بچنے والے ہیں)۔''

ظاہر ہے کہ انبیائے کرام دعوت 'صدق' کے ساتھ تشریف لائے اور سیدنا آدم سے سیدنا محمد ﷺ تک اسی پیغام صدق کو لوگوں تک پہنچاتے رہے تو جنہوں نے اس پیغام کو قول و عمل سے قبول کیا، وہی متقین کی صف میں شامل ہوں گے اور انہیں آتش جہنم سے بچا لیا جائے گا۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ وہ سچے لوگوں کے ساتھ ہو جائیں، پھر اُن کی رفاقت اَنبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہو گی۔ حکم ہوتا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبہ:۹/۱۱۹)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔''

اس بات کا صلہ تمہیں اس طرح ملے گا:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء:۴/۶۹)

''جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔''

''صِدق'' میں ظاہری اور باطنی دونوں اعمال شامل ہیں، یعنی ایمان اور اسلام دونوں پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونا، اس آیت مبارکہ پر غور کیجیے۔ طوالت کی وجہ سے ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

''نیکی یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف (پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور اب مسجد حرام کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہو) بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ (یعنی دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں) یہ اعمال ظاہر ہیں اور آخر میں فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۷۷)

''یہی ہیں سچے لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔''

ایمان کی اساس اور بنیاد ''صدق'' ہے جبکہ نفاق کی کِذب (جھوٹ) ہے اور یہ دونوں باتیں کبھی اکٹھی نہیں ہوسکتی ہیں، ایسے ہی جیسا کہ اندھیرا اور روشنی کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے اور روز جزا کو تو

کسی انسان کی کامیابی کی خوشخبری ''صدق'' ہی کی وجہ سے ہوگی۔ ارشاد ہوا:

﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

(المائدہ:۵/۱۱۹)

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا، یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے، اُن کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے یہی بڑی کامیابی ہے۔''

اور صادقین (سچے) تو وہ لوگ ہیں جو دل کے کھرے، زبان و بیان کے سچے، دل و جان سے سچائی کی تصدیق کرنے والے، نیک اعمال سے اُس کی شہادت دینے والے، جو شرم و حیا کے رَسیا، عفت و پاکبازی کی تصویر، عفو و درگزر کے پاسبان، حلم اور برد باری کے نگران، تواضع و خاکساری کا نمونہ، خوش کلامی اور حق گوئی جن کی طینت، اعتدال اور میانہ روی جن کی عادت، شجاعت اور بہادری جن کا کمال، خود داری اور عزت نفس جن کا جمال اور ہمہ وقت شہادتِ حق کا فریضہ ادا کرنا جن کا سرمایۂ حیات ہے ؎

دَمِ تقریر تھی مُسلم کی صداقت بیباک
عدل اُس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مُسلم تھا حیا سے نمناک
تھا شجاعت میں وہ اِک ہستی فوق الادراک

اور جن کی زبان پر یہ کلمات جاری و ساری رہتے ہیں، رب کریم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے:

﴿وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ (بنی اسرائل:۱۷/۸۰)

''(اور اے نبی!) دعا کرتے رہیے کہ رب کریم! مجھے جہاں بھی آپ لے جائیں 'صدق'

(سچائی) کے ساتھ لے جائیں اور جہاں سے بھی واپس لائیں 'صدق' (سچائی) سے لائیں اور اپنی جناب سے قوّتِ فتح و نصرت سے قوی کریں۔''

یہی دعا ہر داعی اِلی اللہ کا قیمتی سرمایہ ہے کہ اُسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنے مولا و مالک کی سرپرستی اور مدد حاصل رہے اور توشۂ صدق و امانت اس کا زادِ راہ بنا رہے۔

قرآن حکیم میں لِسانِ صدق (سچی زبان)، قدم صدق (راست قدم)، مَقْعَد صِدق (سچی نشست)، مخرج صِدق (سچائی سے نکلنا) اور مَدْخل صِدق (سچائی سے داخل ہونا) ان پانچ باتوں کی تعریف آئی ہے۔ ان کا حصول رب کریم کی رحمت و عنایت سے ہوتا ہے اور اِن پر فوز و فلاح کا مژدۂ جانفزا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (یونس: ۱۰/۲)

''اور خوشخبری سنایے (ان لوگوں کو جنہوں نے راست روی کو اپنا شعار بنایا) اُن کے رب کے پاس اُن کو پورا پورا اَجر ملے گا۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام دعا فرماتے ہیں:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ﴾ (الشعراء: ۲۶/۸۳-۸۴)

''اے میرے رب! مجھے حکمت (دینی بصیرت) سے نواز اور مجھے نیک لوگوں میں ملا دے اور میرا ذکر (لسانِ حق اور ذکرِ حق سے) آئندہ آنے والوں میں جاری فرما۔''

چنانچہ اس دعا کی تکمیل جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر ہوئی اور آپ ﷺ نے اُسی دین حنیف کو پروان چڑھایا جو سیدنا ابراہیمؑ لے کر آئے تھے۔

پھر رسول اللہ ﷺ کی دعا ﴿رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ﴾ اوپر گزر چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان تمام داعیانِ حق کو عزت و سرفرازی سے نوازا اور دین کے سلسلہ میں ان کی سعی و جہد کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ لوگوں کے لیے روشنی کا سامان ہے اور یہی ہر داعی الی اللہ کا زادِ سفر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا﴾ (مریم:۱۹/ ۵۰)

''(ان ابرار و صالحین کو) اپنی رحمت سے نوازا اور اُن کو سچی ناموری عطا کی۔''

اور خاتم النبیین کی حیات طیبہ ''صدق و امانت'' کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ نبوت ملنے سے پہلے بھی آپ ﷺ لوگوں میں ''صادق و امین'' کے لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ پھر اللہ کے دین کو آپ ﷺ نے جس صدق و امانت کے ساتھ پہنچایا وہ آپ کی رفعت شان کا باعث ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾

(چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے، رفعتِ شان وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے) دنیا کے کونے کونے سے جب موذّن اذان کے کلمات ادا کرتا ہے، تو رب کائنات کی توحید کے اقرار کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا بھی اعلان ہوتا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ لوگو! اللہ کا دین تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ پہنچا، اگر تم اللہ سے لو لگانا چاہتے ہو تو محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے بغیر یہ بات ممکن نہیں ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران:۳/ ۳۱)

''(اے نبی!) لوگوں سے کہہ دیجیے، اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

آخر میں ''صدق'' کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ کی اِن احادیث کو بھی پڑھ لیجیے۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

((اِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِىْ اِلَى الْبِرِّ وَ اِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ، وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا، وَ اِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِىْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَ اِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ، وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ

اللّٰہِ کَذَّابًا)) (متفق علیہ، ریاض الصالحین، باب الصدق)

''یعنی سچ نیکی کی طرف ہدایت کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف رہبری کرتی ہے، آدمی سچ بولتا ہے (اور اُسے اپنی عادت بنا لیتا ہے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے پاس سچوں میں لکھ لیتا ہے اور جھوٹ گناہوں پر آمادہ کرتا ہے اور گناہ دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں، آدمی جھوٹ بولتا ہے (اور روزمرہ زندگی میں اس کو اپنا معمول بنا لیتا ہے) تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جھوٹوں اور باغیوں میں لکھا جاتا ہے۔'' (العیاذ باللہ)

((مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ تَعَالٰی شَهَادَةً بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلٰی فِرَاشِهٖ)) (مسلم، حوالہ ایضاً)

''جو شخص اللہ تعالیٰ سے شہادت کا سچائی کے ساتھ سوال کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کو شہیدوں کے مرتبہ کو پہنچائے گا اگرچہ وہ اپنے بستر پر فوت ہوا ہو۔''

یا اللہ! ہمیں صدقِ نیّت سے حق کا بول بالا کرنے کی توفیق عطا فرما اور ہمارا شمار صادقین میں کر دے، ہماری آرزو بھی آپ کی راہ میں حق پھیلاتے ہوئے شہادت کی ہے اسے بھی عطا فرمایئے۔ آمین رَب العالمین!

۱۳- حسن اخلاق

(حَسُنَ، یَحْسُنُ، حُسْنًا) بہتر اور اچھا ہونا، حسین ہونا۔ حَسَنٌ (ح کی زبر کے ساتھ) اچھائی، بھلائی اور حُسْنٌ (ح کی پیش کے ساتھ) جمال، خوبصورتی کا عربی مادہ (ح س ن) ہے اور اپنی بلاغت میں معنی خیز لفظ ہے، عربی زبان اپنی فصاحت میں عظیم شان رکھتی ہے، گویا اس لفظ سے پتا چل رہا ہے کہ بھلائی کرنے ہی میں انسان کا جمال ہے، اسی سے لفظ احسان ہے، اچھا برتاؤ، نیک عمل مُحْسِن، وہ شخص ہوتا ہے جو لوگوں کے ساتھ احسان و مروت سے پیش آتا ہے، اِسْتِحْسان، پسندیدگی، 'اَلْحَسَنَةُ' ایسی نعمت اور بھلائی ہے جس سے انسان کے روح و بدن کو سرور اور طمانیت ملے اور اس لفظ کی ضِدُ 'اَلسَّيِّئَةُ' (بدی اور مصیبت) ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿مَآ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَآ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ﴾

(النساء:٤/٧٩)

''(اے انسان!) تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے۔''

قرآن حکیم میں حسن بمعنی بصیرتِ حق اور سچی بات، خوبصورت اور پاکیزہ قول، نیکی اور بھلائی، نیز جنت کے معنوں میں آیا ہے۔ان آیات مبارکہ پر غور کیجیے:

- ﴿اَلَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ﴾ (الزمر:٣٩/١٨)

''(خوشخبری ان نیک بندوں کو) جو بات کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر جو بہترین بات ہو، اُس کی اتباع کرتے ہیں (غور سے بات سننے والے صاحب بصیرت ہیں)۔''

- ﴿وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا﴾ (بنی اسرائیل:١٧/٢٣)

''اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو'' [اِحسان بمعنی بِرّ (نیکی)]

- ﴿اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا﴾ (الکهف:١٨/٢)

''(ایمان لانے کے بعد صالحین کے لیے) بلاشبہ اچھا اجر ہے'' [حَسَنًا بمعنی جنت ہے]

- ﴿وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا﴾ (البقرہ:٢/٨٣)

''اورلوگوں سے اچھی بات کہو'' [یہاں حُسۡنًا سے مراد، حق اور سچی بات، پاکیزہ اور خوبصورت قول]

- ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ﴾ (النحل:١٦/٩٠)

''اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔''

احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے، دوسروں کا حق پورا پورا ادا کر دینا اور اپنا حق پورا پورا لے لینا، اس کا نام 'عدل' ہے، لیکن 'اِحسان' یہ ہے کہ دوسروں کو اُن کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے اور اس عادت کو اختیار کرنے والے ''محسنین'' کہلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے کہلاتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴾ (البقرہ:٢/١٩٥)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ محسنین کو پسند فرماتا ہے۔''

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ (حٰمٓ السجدہ:۴۱/۳۴)

''(اے نبی!) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، آپ بدی کو اس نیکی سے دفع کیجیے جو بہترین ہو، آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔''

﴿اَخْلَاق﴾ اس کا مفرد خُلُقٌ ہے جس کے معنی عادت، طبیعت، مزاج اور فطرت کے ہیں، خَلَقٌ (خ اور ل کی زبر کے ساتھ) اللہ کی مخلوق اور لوگ مراد ہیں، جبکہ خُلُقٌ (خ اور ل کی پیش کے ساتھ) خصلت اور طبیعت کے معانی ہیں اور دونوں الفاظ کا مادہ (خ ل ق) ہے، گویا کہ خَلَقَ انسان کی ظاہری شکل وصورت کا نام ہے اور خُلُق انسان کے باطنی اوصاف وفضائل کا نام ہے، رب کائنات نے اپنی رحمت اور قدرت سے انسان کو نہ صرف ظاہری طور پر حسین وجمیل بنایا ہے بلکہ باطنی خوبیوں سے بھی نوازا ہے اور اسی سے وہ مکمل انسان بنتا ہے:

﴿فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ﴾ (المومنون:۲۳/۱۴)

''پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

ارشاد ہوا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (التین:۹۵/۴)

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔''

اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ (القلم:۶۸/۴)

''اور بلاشبہ آپ اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہیں۔''

اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو اپنا کر ہی کوئی شخص حُسنِ اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کر سکتا ہے۔

﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۱)

''(مسلمانو!) یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ (کی حیات طیبہ) میں عمدہ نمونہ ہے۔''

حدیث میں آتا ہے کہ اُمّ المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ((کَانَ خُلُقُهُ الْقُرآن)) یعنی آپ ﷺ کے اخلاق تو قرآن (کی جیتی جاگتی) تصویر تھی۔

اخلاق کی ضرورت اور اہمیت:

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن وخوبی انجام دینا 'اَخلاق' ہے۔ اس کے اپنے ماں باپ، اہل وعیال، عزیز و رشتہ دار، دوست واحباب (اور وہ معاشرہ جس میں وہ رہتا سہتا ہے) سب سے تعلقات ہیں، بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلّہ، وطن، قومیت جنسیت یا اور کسی نوع کا واسطہ اور علاقہ رکھتا ہے، ان تعلقات کے سبب اُس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں جنہیں 'حسن اخلاق' سے ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

دنیا کی ساری خوشی، خوش حالی اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو کوئی حکومت و جماعت اپنی طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔'' (سیرت النبیؐ، جلد ششم)

حقیقت یہ ہے کہ رب کائنات نے انسان کو ہر لحاظ سے شرف بخشا ہے، نہ صرف شکل وصورت میں بلکہ عقل وفکر، علم و دانش اور فہم وبصیرت میں یقیناً تمام مخلوقات پر برتری اور فضیلت رکھتا ہے، قرآن حکیم کی پہلی وحی جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (العلق:٩٦/١-٤)

یعنی انسان کو پڑھنے لکھنے سے آراستہ کیا گیا ہے اور یہ فضیلت صرف اسی کے حصہ میں آئی ہے،

پھر غور کیجیے کہ یہ زبان و بیان کے شرف سے نوازا گیا ہے۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ O عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ O عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾(الرحمن:٥٥/١-٤)

اور پھر اسے رزق طیب سے نوازا گیا اور سیر و سفر کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل:١٧/٧٠)

اور سب سے بڑھ کر خلافت ارضی کا تاج اُس کے سر پر سجایا گیا۔ یعنی وہ احکام الٰہی کو اس کرہ ارض پر جاری وساری کرے:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ (البقرہ:٢/٣٠)

اس شرف وفضیلت کی بنا پر ضروری تھا کہ اُسے حُسنِ اخلاق سے نوازا جائے، ورنہ یہ زندگی بے مقصد ہو کر رہ جاتی اور اُس کے اور دوسری مخلوقات کے درمیان کوئی فرق نہ رہ جاتا۔

انبیاء علیہم السلام اور اخلاقی فضیلت:

تمام انبیاء علیہم السلام کو رب کریم نے ایمان واخلاق سے نوازا، اُن کی تعلیم وتربیت کا سروسامان بہم پہنچایا کیونکہ اُن کی زندگیاں دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ ٹھہریں اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکارمِ اخلاق کی تکمیل فرما دی گئی۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''اس دنیا میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے۔ انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے۔ خیرات نیکی اور چوری بدی ہے لیکن دین اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے، خود آپ ﷺ نے فرمایا:

((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)) (سیرت النبی، بحوالہ موطأ امام مالکؒ)

''میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی

آپ ﷺ مکہ میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو رسول اللہ ﷺ کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا، انہوں نے واپس آ کر اُن کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی وہ یہ تھے:

((رَأَيْتُهُ يَأْمُرُ بِمَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ)) (صحیح مسلم، بحوالہ ایضاً)

''میں نے اُن کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اَخلاق حسنہ کی تعلیم دیتے ہیں۔''

حبشہ کی ہجرت کے زمانے میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بُلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اُس وقت سیدنا جعفر طیار نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

''اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاری کرتے، ہمسائیوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست، زیردستوں کو کھا جاتے تھے۔ اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا۔ اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خون ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسائیوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔''

اسی طرح قیصرِ روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، جناب رسول اللہ ﷺ کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا، اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ اللہ کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ''وہ پاک دامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں۔''

رسول اللہ ﷺ مجسمۂ اخلاق تھے:

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ سراپا اخلاق تھی جس کی شہادت رب کریم نے دی ہے اور اس سے بڑھ کر کس کی شہادت ہو سکتی ہے: ﴿وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ صدق و صفا کے پیکر، تواضع و خاکساری کا نمونہ، شرم و حیا آپ ﷺ کی عادت، دیانت اور امانتداری آپ ﷺ کی طینت، عدل و انصاف کرنا آپ ﷺ کی خوبی اور عفو و درگزر آپ ﷺ کی جبلت، خوش کلامی اور نرمی آپ ﷺ کا رویہ اور احسان و مروت آپ ﷺ

کی خصلت، خدمتِ خلق آپ ﷺ کا معمول اور سخاوت آپ ﷺ کا شیوہ تھا، مختصر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی قرآن حکیم کا ٹھیک ٹھیک نمونہ تھی۔ جیسا کہ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں: ((کَانَ خُلُقُهُ الْقُرآن))

اور یہی مردِ مسلمان اور داعی الی اللہ کی شان ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

''آخر میں رسول اللہ ﷺ کے اچھے اخلاق کے متعلق ان فرمودات پر بھی غور کر لیجیے:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے دِیبا اور ریشم رسول اللہ ﷺ کی مبارک ہتھیلی سے زیادہ نرم نہیں چھوا اور کبھی کوئی خوشبو رسول اللہ ﷺ کی خوشبو سے زیادہ اچھی نہیں سونگھی اور میں نے آپ ﷺ کی دس برس خدمت کی، آپ ﷺ نے کبھی اُف بھی نہیں فرمایا اور نہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر آپ نے کبھی فرمایا کہ یہ کیوں کیا یا کیوں نہ کیا؟'' (ریاض الصالحین، باب الاخلاق)

سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

نبی ﷺ نے فرمایا:

''مومن بندے کی میزان عمل میں اچھے اخلاق سے زیادہ کوئی چیز وزنی نہ ہو گی اور اللہ تعالیٰ بیہودہ گو اور بدزبان آدمی کو ناپسند فرماتا ہے۔'' (حوالہ ایضاً)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کامل ترین ایمان اُس کا ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں اور تم میں اچھا وہ ہے جو اپنے

اہل وعیال کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئے۔" (حوالہ ایضاً)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے مومن اچھے اخلاق کے ذریعے پے در پے روزے رکھنے والے اور عابد کا درجہ پا لیتا ہے۔" (حوالہ ایضاً)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"روزِ قیامت مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو اچھے اخلاق والے ہیں اور مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہوں گے جو باتونی، چرب زبان، تصنع کرنے والے اور متکبر ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اچھے اخلاق سے آراستہ فرما دے اور آخرت میں پیارے رسول اللہ ﷺ کی رفاقت عطا فرمائے۔ آمین!

((اَللّٰھُمَّ کَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِیْ فَحَسِّنْ خُلُقِیْ))

"یا اللہ! جس طرح آپ نے میری شکل کو اچھا بنایا ہے میرے اخلاق بھی اچھے کر دیجیے۔"

۱۴۔ اَلْحِکْمَۃُ:

اس لفظ کا مادہ (ح ک م) ہے، حَکُمَ یَحْکُمُ حُکْماً دانش مند ہونا، صاحب بصیرت ہونا، 'اَلْحِکْمَۃُ' دانائی، دانش فکر و تدبر کا ایسا انداز جس میں دانش، استواری اور انسانی خیر خواہی پائی جائے۔

'اَلْحکیم' اللہ تعالیٰ کی صفت، جس کی تخلیق اور کاریگری میں جس کے احکام اور امور میں کمال دانائی پائی جاتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حکمت اعلیٰ ترین علوم کے ذریعہ اعلیٰ ترین اشیاء کا علم ہے، اللہ عزوجل دانائے حق ہے اس لیے کہ وہی عظیم الشان علم کے ذریعہ عمدہ اشیاء کا علم رکھتا ہے، اس کا علم دائمی اور ازلی ہے جس پر کبھی بھی زوال نہیں ہے۔" (بحوالہ کتاب المقصد الأسنی)

قرآن حکیم میں قانونِ وراثت بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا:

﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ (النساء:٤/١١)

''یہ حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمتوں والا ہے۔''

ایک اور مقام پر زکوٰۃ وصدقات کا ذکر کیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں، پھر آخر میں ارشاد ہوا:

﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ (التوبہ:٩/٦٠)

''یہ فرض اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔''

زمین وآسمان اور اس کی ہر چیز کا وہی مالک ہے اور اُس نے یہ تمام کارخانہ اپنی عظیم حکمت سے تخلیق کیا، دنیا اور آخرت میں حمد وثنا صرف اسی کے لیے ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِى الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾

''حمد اُس اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور آخرت میں بھی اُسی کے لیے حمد ہے، وہ دانا اور باخبر ہے۔''

قرآن حکیم بھی حکمت ہے

اللہ تعالیٰ حکیم ہے تو اُس کی کتاب بھی حکمتوں سے لبریز ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰسٓ ۝ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ﴾ (یٰسٓ:٣٦/١-٤)

''یٰسین، قسم ہے، قرآن باحکمت کی! کہ بلاشبہ آپ (ﷺ) رسولوں میں سے ہیں، سیدھے راستے پر ہیں اور یہ (قرآن) اللہ غالب، مہربان رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔''

یہاں پر قسم بمعنی شہادت (گواہی) آئی ہے، دانش وحکمت سے لبریز قرآن حکیم اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر رب کریم کی شہادت ہے اور اُس سے بڑھ کر بھلا کس کی سچی بات ہوسکتی ہے:

﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ (النساء:٤/٨٧)

''اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات والا اور کون ہوگا۔''

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟

آں کتابِ زندۂ قرآنِ حکیم حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

(اے مسلمان!) کیا تو جانتا ہے کہ تیرا آئین کیا ہے؟ آسمان کے نیچے تیری شان و شوکت کا راز کیا ہے؟ وہ کتاب زندہ قرآنِ حکیم ہے، یقیناً اس میں درج حکمت کی باتیں ہمیشہ رہنے والی اور قدیم ہیں (اور حکمت کبھی پرانی نہیں ہوتی) یہ عظیم کتاب دنیا بھر کے مال و متاع سے کہیں بہتر ہے کہ اس سے مسلمان دنیا اور آخرت کی فلاح و بہبود کا راستہ پاتے ہیں:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾

(یونس:١٠/٥٨)

''(اے رسول! ﷺ) کہہ دیجیے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (یہ کتاب آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے) تو اس پر انہیں خوش ہونا چاہیے، کیونکہ یہ (روحانی عظمتوں کا گنجینۂ لازوال ہے) اور ان تمام مادی وسائل سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔''

اس آیت مبارکہ پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''دنیا کا نفع اول تو قلیل اور پھر فانی، قرآن کا نفع ایک تو کثیر اور پھر باقی، ﴿بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ، فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ سے اشارہ اسی فضل و رحمت ہی کی جانب ہے (یعنی قرآن کی طرف) اور مقصود اس ترکیب کلام میں تاکید اور زور ہے، ورنہ یہی مفہوم سادہ صورت میں ''فَبِذٰلِکَ'' کے بغیر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ فقرہ کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ کسی چیز پر اگر خوش ہونا ہی ہے تو وہ یہی ہے نہ کہ کچھ اور، اور ترکیب کلام نے معنیٰ حَصَرُ (زور بیان) کے پیدا کر دیے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی)

قرآن حکیم کتاب عظیم ہے، اِسی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہمارے اسلاف قدر و منزلت اور عروج و سر بلندی سے ہمکنار ہوئے تھے۔ آج امتِ مسلمہ اس دولت بے بہا اور متاعِ گرانمایہ سے

غافل ہو چکی ہے، اسے محض برکت کے طور پر محفلوں اور مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے، مگر اس کی قیمتی اور لازوال تعلیمات کا اثر کہیں دکھائی نہیں دیتا ہے، یہ مسلمان کے لیے زندگی گزارنے کا آئین (دستورِ حیات) ہے، مگر آج مسلمان کے لیے ہر طرف سے ذِلت وخواری ہے:

مِلّتے راہ رفت چوں آئین زدست — مثل خاک اجزائے اُو ازہم شکست
ہستی مسلم ز آئین است و بس — باطن دین نبی ایں است و بس
بَرگِ گلُ شدُ چوں ز آئیں بستہ شد — گُل ز آئیں بستہ شُد گلدستہ شُد
نَغمَہ اَزْ ضبطِ صدا پیدا ستے — ضبط چوں رفت اَزْ صدا غوغا ستے

''(ہائے افسوس!) جب آئین ملت کے ہاتھ سے چلا گیا تو مٹی کی طرح اس کے اجزاء بھی بکھر گئے، مسلمان کی ہستی صرف آئین پر ہی ہے اور بس، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا باطن یہی ہے اور بس، جب پھول کی پتیاں آئین سے وابستہ ہو جاتی ہیں تو گلدستہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ (کیا یہ حقیقت نہیں ہے) کہ آواز کو ضابطے میں لانے سے نغمہ پیدا ہوتا ہے اور جب نظم و ضبط ختم ہو جاتا ہے تو وہ محض بے ہنگم شور وغل ہوتا ہے۔''

ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد ہوا:

﴿وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ﴾ (النساء ٤:١١٣)

''اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور آپ کو وہ سکھا دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے۔''

اس پر مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''حکمت کا لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے، اس کے معنیٰ ایسی استوار اور محکم رائے کے بھی ہیں جو دین کی روح کے عین مطابق ہو، معاملہ فہمی اور عام سمجھ بوجھ کے بھی ہیں جس کے ذریعے مسائل کے حل وکشود میں خصوصیت سے مدد ملتی ہے اور اس حکیمانہ طریقِ اِفہام وتفہیم کے بھی ہیں جس میں مخاطب کی نفسیات اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر اسلامی

حقائق کو پیش کیا جائے جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ﴾

اَلۡحِکۡمَۃُ بمعنیٰ اَلسُّنّۃ

﴿وَاَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ﴾

میں حکمت کے معنی ایک خاص سلیقۂ فہم وادراک کے ہیں جس کے بل پر رسول اللہ ﷺ نے قرآن حکیم کی آیات سے یا تائید وحی سے زندگی کے ایک مکمل نظام کی نشان دہی کی، فہم وادراک کی یہ تابش وضَوْ رسول اللہ ﷺ کا خاصا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن فہمی کے لیے شرط اول یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ آپ ﷺ نے قرآن کو کیونکر سمجھا، آپ ﷺ کے دور میں اس پر کس انداز سے عمل ہوا اور عبادت سے لے کر معاملات تک کی گتھیوں کو آپ ﷺ نے کس طرح سلجھایا؟

جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے فہم وادراک اور آپ ﷺ کی تبیین وتشریح سے بے نیاز ہو کر محض لغت اور ڈکشنری کی بنیاد پر قرآن فہمی کے مدعی ہیں، وہ اس حکمت سے قطعی محروم ہیں جس کی وجہ سے خود رسول اللہ ﷺ اس لائق ہوئے کہ معارفِ دین کی تہہ تک پہنچ پائیں اور دین کو ایک عمل، ایک جیتی جاگتی تحریک اور جامع نقشۂ حیات کے طور پر پیش کر سکیں۔'' (لسان القرآن، ج۲)

اَلۡحِکۡمَۃ بمعنیٰ نبوت

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم وتربیت، ہدایت اور رہنمائی رب کریم کی طرف سے ہوتی ہے، اس لیے کہ ان پاکبازوں کی زندگیاں لوگوں کیلئے مشعل راہ اور نمونہ بنتی ہیں، سیدنا داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿وَشَدَدۡنَا مُلۡکَہٗ وَاٰتَیۡنٰہُ الۡحِکۡمَۃَ وَفَصۡلَ الۡخِطَابِ﴾ (صٓ:۳۸/۲۰)

''اور ہم نے انہیں (سیدنا داؤد علیہ السلام) نبوت اور بات کرنے کے سلیقہ سے نوازا (یعنی لوگوں میں عدل وانصاف کے لیے صلاحیت وبصیرت وتفقہ اور استدلال و بیان کی قوت

سے رب کریم نے انہیں بہرہ ور فرمایا)۔

اَلْحِکْمَة بمعنی قرآنی بصیرت

قرآنِ حکیم کی بصیرت، اس کے معنی اور مفہوم کو واضح کر دینا بہت بڑا انعام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان بندوں کو ملتا ہے جو اس کے شکر گزار اور فرمانبردار بن کر رہتے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی ترغیب آئی ہے اور بندوں کو حکم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے رزقِ طیب میں سے فقرا و مساکین کی خدمت کریں اور ہمیشہ اچھا مال اُس کی راہ میں خرچ کریں اور کبھی شیطان کے بہکاوے میں نہ آئیں، اس لیے کہ وہ تمہیں تنگدستی اور فقر سے ڈراتا ہے، جبکہ رب کریم اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے اور جو لوگ اپنے مولا و مالک کی رضا کی خاطر اللہ کی راہ میں مال لٹاتے رہتے ہیں وہ یقیناً دانائی سے بہرہ ور ہوتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿یُّؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (البقرہ:۲/۲۶۹)

''اللہ تعالیٰ جسے چاہے حکمت اور دانائی دیتا ہے اور جو شخص حکمت اور دانائی سے نوازا جائے وہ تو خیر کثیر سے نوازا جاتا ہے۔''

اَلْحِکْمَة بمعنی المواعِظُ الْحَسَنَةُ

دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں جہاں دانش و حکمت کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ''موعِظۃ حسنۃ'' عمدہ اور دلنشین انداز میں دعوت دینے کی بھی اہمیت ہے جس کا ذکر سورۃ النحل میں آیا ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''حکمت'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو موقع محل دیکھ کر دعوت دی جائے، یعنی اُس وقت دعوت دی جائے جب مخاطب کے دل میں سننے کی خواہش ہو اور وہ سننے کو تیار ہو اور دوسرے جو بات کی جائے وہ مخاطب کی عقل و فہم کو ملحوظ رکھ کر کی جائے، ''موعِظۃ حسنۃ''

عمدہ نصیحت سے مراد یہ ہے کہ جو بات آپ کہیں، میٹھے اور دلنشین انداز میں کہیں جو مخاطب کے دل میں اُتر جائے، عقلی دلیل کے ساتھ ترغیب و ترہیب اور جذبات کو اپیل کرنے والی باتوں کی طرف بھی توجہ دلائیں، آپ کے دل میں اس کے لیے تڑپ ہونی چاہیے، حتیٰ کہ مخاطب یہ سمجھے کہ آپ فی الواقع اس کے لیے ہمدرد ہیں اور محض علمی برتری جتلانے اور دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔'' (تیسیر القرآن)

مولانا محمد عبدالحیؒ خندہ جبینی پر لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر تم اپنے بھائی کو مسکرا کر دیکھو تو یہ بھی صدقہ ہے، بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ہنس مکھ رہنے کی اہمیت سے واقف ہیں، وہ نہیں جانتے کہ ان کی اپنی شخصیت کے اندر کتنی قوتیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو اندازہ نہیں ہوتا کہ دل کش مسکراہٹوں کی کیا قیمت ہے، دوسروں کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے خندہ پیشانی کتنا زبردست ہتھیار ہے۔ مسکراہٹ الفاظ سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے، مسکراتا ہوا چہرہ زبانِ حال سے کہتا ہے کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور اگر کسی کی بھنویں چڑھی ہوئی ہیں، ماتھے پر بل ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے کہہ رہا ہے کہ مجھے تم سے بات کرنا پسند نہیں، میرے دل میں تمہاری کوئی محبت نہیں۔

ترش روئی اور بدمزاجی لوگوں کو اپنے سے دور کرنے کے لیے سب سے آسان ترکیب ہے، لیکن جسے لوگوں کو اپنے ہاتھ میں لینا ہو جو دوسروں کے دلوں میں گھر کر کے اُن کے ذہن و دماغ کو بدلنے کا ارادہ رکھتا ہو، جس کی آرزو ہو کہ لوگوں کے خیالات کو بدلے، اُن کے دل میں اپنی بات اتارے، وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ لوگ اس سے بھاگیں، اُس کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہ ہر وقت خوش مزاج رہے۔ لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، مسکراتا ہوا چہرہ دوسروں کے دلوں کو جیت لینے کے لیے سب سے زیادہ کارآمد ہتھیار ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا مطلب بناوٹی ہنسی نہیں ہے، بناوٹی ہنسی کسی کو پسند نہیں،

کوئی اُس کے دھوکے میں مبتلا نہیں ہوسکتا، اس سے مراد اصلی ہنسی ہے، دل کو گرمانے والی مسکراہٹیں جو دل سے نکلتی ہیں ان کا اثر پڑتا ہے، ہر قسم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان خوش مزاج رہے، یوں بھی آپ کی طاقتیں کئی گناہ بڑھ جائیں گی اور آپ کا وقت ہنسی خوشی گزرے گا۔ ذرا دوسروں سے مل کر اظہارِ مسرت تو کیجیے، دیکھیے وہ کتنی جلدی آپ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، ہنس مکھ چہرے کی قدر و قیمت اور مسکراہٹوں کا اثر تجربہ کرنے پر ہی معلوم ہوسکتا ہے، یہاں تک کہ یہ چیز آپ کی گھریلو زندگی کو جنت بنا سکتی ہے، بچوں کی تربیت میں معاون ہوسکتی ہے، دوسروں کے دلوں میں گھر کرسکتی ہے۔

اگر آپ کو ہنس مکھ رہنے اور خوش مزاجی کی عادت نہ ہو تو اس کی عادت ڈالیے، مانا کہ کچھ پریشانیاں آپ کے دل کو بے چین کر رہی ہیں، ان پر قابو پانے کی کوشش کیجیے، آخر پریشان ہونے سے بھی تو دل کو چین نصیب نہیں ہوتا، پریشانی کا اظہار کرنے سے بھی مشکل آسان نہیں ہوتی، بلکہ جس قدر آپ رنجیدہ رہتے ہیں، اُسی قدر آپ کی قوت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ آپ کے اندر برداشت کی طاقت کم ہونے لگتی ہے، یہ صحیح ہے کہ کچھ حالات ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو فطرتاً رنج پہنچاتے ہیں، لیکن اگر آپ نے چھوٹی چھوٹی پریشانیوں پر دھیان نہ دیا تو امید ہے کہ بڑے بڑے رنج سہنا بھی آپ کے لیے آسان ہو جائیں گے، لیکن جو تھڑ دلے ذرا ذرا سی ناخوشگوار بات پر بے چین ہو جاتے ہیں وہ واقعی کسی پریشانی کے وقت تو پاگل ہو جاتے ہیں۔

اونچے خیالات اور بلند نگاہ آپ کے دل کو حوصلہ مند بناتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں آپ پر اثر نہیں ڈال سکتیں، وہ شخص جس کے سامنے کوئی نصب العین ہے، وہ اگر دوسروں سے اوجھل نہ ہونے پائے تو آپ سے زیادہ حوصلہ مند اور بلند نگاہ کون ہوسکتا ہے، پھر آپ تو ایمان کی دولت سے سرفراز ہیں، آپ کو تو یہ یقین ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے، آپ کو اپنے رب پر پورا بھروسا ہے، آپ اُس سے بہتر امیدیں

رکھتے ہیں، آپ اس کی مہربانی کے امیدوار ہیں، پھر آپ سے زیادہ اطمینان کسے نصیب ہوسکتا ہے اور جسے اطمینان نصیب ہو وہی تو خوش رہ سکتا ہے، اب اگر آپ کے چہرے سے بھی اطمینان اور مسرت کا اظہار نہیں ہوتا، تو پھر اس کی امید کس سے ہوسکتی ہے۔ ہنسی خوشی رہیے۔ اس سے آپ کو بھی فائدہ ہے اور اس کے بغیر آپ دوسروں سے قریب بھی نہیں ہوسکتے اور آپ کی دعوت وتبلیغ کے کام میں رکاوٹ آسکتی ہے۔''

(تبلیغ کی حکمت)

داعیِ اعظم جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی نرم دلی، خندہ جبینی، لطافت اور خوش مزاجی مثالی تھی، قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران:۳/۱۵۹)

''اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔''

آپ ﷺ کا یہ پاکیزہ خلق تھا کہ لوگ آپ کی بات غور سے سنتے اور آپ کی دعوت پر لبیک کہتے چلے گئے۔ ہر داعی الی اللہ کو اللہ تعالیٰ سے خوش خلقی طلب کرنی چاہیے، آپ ﷺ کی نرمی اور شفقت کے اس واقعہ کو پڑھتے جایے۔

''سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بڑے خوش اخلاق تھے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اُس وقت سے کی جبکہ میں آٹھ برس کا تھا۔ میں دس برس آپ کی خدمت میں رہا، اس تمام عرصہ میں آپ نے مجھے کبھی ملامت نہ فرمائی بلکہ اگر اہل بیت میں سے کسی نے بھی ملامت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو، اگر تقدیر میں کوئی بات ہوتی ہے تو ہو کر رہتی ہے۔'' (مشکوٰۃ، بحوالہ اسوۂ رسولؐ، ڈاکٹر عبدالحی)

قرآن حکیم میں حکمت کی وسعت:

سورۃ بنی اسرائیل میں رب کریم نے مسلمانوں کو بہت سے اخلاقی فضائل سے آراستہ فرمایا۔

ارشاد ہوتا ہے:

’’تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُسی کی، والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں ’اُف‘ تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو، اُن کے لیے عاجزی کے بازو پھیلا دو اور ان کے لیے (رب کے حضور) دعا کیا کرو کہ ’’پروردگار! ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔‘‘ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں سے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں، رشتہ داروں کو ان کا حق دو اور مسکین اور مسافر کے ساتھ بھی اچھا رویہ رکھو، فضول خرچی سے اجتناب کرو، فضول خرچ تو شیطان کا بھائی ہے اور شیطان تو اپنے رب کا ناشکرا ہے، اگر اُن سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اُس رحمت کو، جس کے تم امیدوار ہو، تلاش کر رہے ہو (یعنی رزق حلال میں سے ابھی گنجائش نہیں ہے) تو انہیں نرم جواب دے دو، نہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو (خرچ کرنے میں اعتدال کا راستہ اختیار کرو) کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ، تمہارا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے (اللہ سے رزق حلال کی طلب کرتے رہو) وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے، اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی، درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔ زنا (بے حیائی) کے قریب بھی نہ پھٹکو، وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ ہے، قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو، جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ (عدل و انصاف اسلامی حکومت کا فریضہ ہے) اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو، اُس کے ولی کو ہم نے قصاص

کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے (انصاف سے انتقام لے) اُس کی مدد کی جائیگی (اسلامی حکومت انصاف فراہم کرے) مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریق سے (غریب سرپرست حقِ خدمت کا تھوڑا سا معاوضہ لے سکتا ہے) یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے (اُس وقت اُن یتامیٰ کا مال انہیں ٹھیک ٹھیک واپس کر دو) عہد کی پابندی کرو اور بلاشبہ (روزِ قیامت) عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو (پیمائش، پیمانہ دونوں باتوں میں خیال رکھو) اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو (کہ معاشرتی زندگی صاف ستھری ہو جائے) یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظِ انجام بھی یہی بہتر ہے۔ کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو (جہالت اور نادانی کی بجائے یقین اور تحقیق کا راستہ اختیار کرو کہ وقت بڑا قیمتی ہے، اسے ضائع ہونے سے بچاؤ) یقیناً آنکھ، کان اور دل (دیگر اعضا) سب ہی کی باز پرس ہوگی (یہ جسم، تمام اعضاء اور اوقات و اعمال کا روزِ قیامت محاسبہ ہے۔ یہ امانت ہیں اور ہم اس کے امین ہیں) زمین پر اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو (اللہ تعالیٰ کو یقیناً عاجز و خاکسار لوگ پسند ہیں)، ان امور میں سے ہر ایک برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے (یعنی ان احکام میں سے جس حکم کی بھی نافرمانی کی جائے وہ ناپسندیدہ ہے)۔'' (آیات کا ترجمہ ۲۲ تا ۳۹)

آخر میں ارشاد ہوا:

﴿ذٰلِکَ مِمَّآ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَةِ﴾

''یہ پرحکمت باتوں میں سے تیری طرف تیرے رب کی وحی ہے۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں رب کریم ان تمام احکامات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

((اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَ حُسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضَاءَ بِالْقَدْرِ))

''اے اللہ! ہم آپ سے صحت، عفت (پاکدامنی) پاکیزہ اخلاق اور تقدیر پر راضی رہنے

کی بھیک مانگتے ہیں۔''

۱۵- تقویٰ:

اس لفظ کا مادہ (و ق ی) ہے وَقَی، یَقِیُ، وَقُیاً وَ وِقَایَۃً، تکلیف سے بچانا، حفاظت کرنا، کسی کو دعا دی جاتی ہے:

((وَقَاہُ اللّٰہُ مِنَ السُّوءِ))

''اللہ تعالیٰ اُس کو برائی سے محفوظ رکھے۔'' (القاموس الوحید)

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

﴿اَلْوِقَایَۃُ: حِفْظُ الشَّیْءِ مِمَّا یُؤْذِیهِ وَیَضُرُّہُ ''وَقَیْتُ الشَّیْءَ'' وِقَایَۃً وَ وَقَاءً﴾ کے معنی کسی چیز کو مضر اور نقصان دہ چیزوں سے بچانا کے ہیں، جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿فَوَقٰـھُمُ اللّٰہُ شَرَّ ذٰلِکَ الْیَوْمِ﴾ (الدھر:۷۶/۱۱)

''(ابرار و صالحین کو) اللہ تعالیٰ اُس دن کے شر سے بچالے گا (روز قیامت ہر قسم کی تکلیف سے دور رکھے گا)''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ وَقٰـھُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ﴾ (الدخان:۴۴/۵۶)

''اور اللہ اپنے فضل سے اُن کو جہنم کے عذاب سے بچالے گا۔''

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ وَّاقٍ﴾ (الرعد:۱۳/۳۴)

''(کفار کو) کوئی ایسا نہیں جو انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا ہو۔''

اہل ایمان کو حکم ہوتا ہے:

﴿قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶۶/۶)

''(اے ایمان والو!) اپنے آپ کو اپنے اہل و عیال کو آتش جہنم سے بچالو۔''

﴿اَلتَّقوىٰ﴾ اس کے اصل معنی نفس کو ہر اُس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اصطلاحِ شریعت میں نفس کو ہر اُس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جو گناہ کا موجب ہو اور یہ بات شریعت کی منع کردہ باتوں سے رک جانے سے حاصل ہوتی ہے، مگر اس میں درجۂ کمال حاصل کرنے کے لیے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے، چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ، وَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمَى يُوْشِكُ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ))

''حلال بھی روشن ہے اور حرام بھی، جو کسی چراگاہ کے گرد بھیڑیں چراتا ہے (اگرچہ یہ جگہ جائز ہے) مگر خدشہ ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے (جو کہ ناجائز ہے)۔''

لہٰذا 'تقویٰ' کا تقاضا کہ وہ چراگاہ سے دور رہے۔

سید سلمان ندوی لکھتے ہیں:

''تقویٰ، اِخلاص، توکل، صبر اور شکر، یہ وہ فرائض ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لیے ان کا نام ''قلبی عبادات'' رکھا جا سکتا ہے، یہ وہ فرائض یا ''قلبی عبادات'' ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصل جوہر ہیں جن کے الگ کر دینے سے وہ عباداتِ پنجگانہ (ارکانِ اسلام) بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے جسد بے روح بن جاتی ہیں۔

قلبی عبادات

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لیے خلش ہو، یہ 'تقویٰ' ہے، پھر اس کام کو ربِّ واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے یہ 'اخلاص' ہے۔ پھر اس کام کے کرنے میں صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسا رہے یہ 'توکل' ہے۔ اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور اللہ تعالیٰ سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے یہ 'صبر' ہے اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے اس کو اللہ

تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان اور زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ 'شکر' ہے۔''

(سیرت النبی، جلد پنجم)

تقویٰ کی اہمیت:

اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو 'تقویٰ' سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قلب میں اسی تقویٰ کی روح پیدا کرنا ہے، قرآن حکیم نے اپنی دوسری ہی سورت میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں:

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (البقرہ:۲/۲)

''یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔''

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی 'تقویٰ' کا حصول ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

(البقرہ:۲/۲۱)

''لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے تاکہ تم ''تقویٰ'' پاؤ۔''

روزہ کا بھی یہی مقصد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

حج کا منشا بھی یہی ہے:

﴿وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (الحج:۲۲/۳۲)

’’اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔‘‘

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

﴿لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُھَا وَ لَا دِمَآؤُھَا وَ لٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ﴾ (الحج:۲۲/۳۷)

’’اللہ کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا مگر اُسے تمہارا تقویٰ (دل کا ادب اور پرہیزگاری) پہنچتا ہے۔‘‘

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ اللہ کے لیے جھکتی ہے، اُس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہیے:

﴿اَفَمَنۡ اَسَّسَ بُنۡیَانَہٗ عَلٰی تَقۡوٰی مِنَ اللّٰہِ﴾ (التوبہ:۹/۱۰۹)

’’جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف پر رکھی ہو۔‘‘

پھر ارشاد ہوا:

﴿لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقۡوٰی﴾ (توبۃ:۹/۱۰۸)

’’وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہو (اسی میں نماز پڑھنی چاہیے)‘‘

حج کے سفر اور راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے:

﴿وَ تَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَیۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰی﴾ (البقرہ:۲/۱۹۷)

’’اور سفر (حج) میں زادِ راہ لے کر چلو اور سب سے اچھا زادِ راہ تقویٰ ہے۔‘‘

ہماری زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے:

﴿وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ذٰلِکَ خَیۡرٌ﴾ (الاعراف:۷/۲۶)

’’اور تقویٰ کا لباس (شرم و حیا کا لباس) وہ سب سے اچھا ہے۔‘‘

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

﴿وَ اَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی﴾ (البقرہ:۲/۲۳۷)

’’اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔‘‘

﴿اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (المائدہ:۵/۸)

''انصاف کیا کرو، انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔''

زندگی میں صبر کا راستہ بڑے حوصلے کی بات ہے:

﴿وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (اٰل عمران:۳/۱۸۶)

''اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔''

لوگوں میں صلح صفائی کرانا بھی تقویٰ کی راہ ہے:

﴿وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ﴾ (البقرہ:۲/۲۲۴)

زندگی کو نیکیوں سے آراستہ کرنا بھی تقویٰ کی راہ ہے:

﴿وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا﴾ (نساء:۴/۱۲۸)

''اور اگر اچھے کام کرو اور تقویٰ اختیار کرو، تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی مدد کن لوگوں کو پہنچتی ہے؟

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾ (النحل:۱۶/۱۲۸)

''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔''

زندگی میں روشنی کا سامان جس سے کھرے اور کھوٹے میں تمیز ہو سکے اور انسان صراط مستقیم پر گامزن رہے یہ یقیناً بہت بڑا انعام ہے اور یہ اہل تقویٰ کے نصیب میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا﴾ (الانفال:۸/۲۹)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا (کہ حق اور باطل میں فرق کر سکو گے)۔''

زندگی کی مشکلات سے نجات کی راہ اور سہولتوں کا حصول بھی 'تقویٰ' اپنانے سے ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا﴾ (الطلاق:۶۵/۴)

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا، اللہ اُس کے (ہر) کام میں آسانی فرما دے گا۔''

مصائب اور مشکلات سے نکلنے اور رزق میں کشادگی کے لیے تقویٰ کی راہ اختیار کی جائے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ○ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾

(الطلاق:٦٥/٢-٣)

''جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی کے لمحات گزارے گا، اللہ اُس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اُسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔''

دائمی فوز و فلاح اہل تقویٰ کے لیے ہے، اور امن و سلامتی بھی انہی کے لیے ہے۔

﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا﴾ (النساء:٧٨/٣١)

''یقیناً متقیوں کے لیے (دنیا و آخرت میں) کامیابی ہے۔''

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ○ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ﴾ (الدخان:٤٤/٥١-٥٢)

''متقین یقیناً امن کی جگہ میں ہوں گے، باغوں اور چشموں میں (خوشی کی دائمی زندگی گزاریں گے)۔''

اہل تقویٰ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے اور معزز ترین لوگ ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (التوبہ:٩/٤)

''اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کو پسند فرماتا ہے۔''

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات:٤٩/١٣)

''درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جو تمہارے اندر سب سے زیادہ متقی ہے۔''

خوبصورت زندگی، حسن و جمال سے بھرپور، احسان و مروت سے لبریز اور یقینی کامیابی کا مژدۂ جانفزا!

﴿وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (ال عمران:٣/١٣٣-١٣٤)

''(لوگو!) دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی

ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے (اُس کی وسعت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے) وہ اُن متقین کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ تنگ دست ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں، ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔''

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟

سید سلمان ندوی لکھتے ہیں:

''تقویٰ اصل میں وقی ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں لیکن وحی محمدی کی اِصطلاح میں یہ دل کی اُس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اُس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔''

(سیرت النبیؐ، جلد پنجم)

''تقویٰ'' اور ''احسان'' کا گہرا تعلق ہے۔

احسان کے معنی جہاں احسان و مروت کے ہیں، وہاں حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے، ارشاد فرمایا:

((اَلْاِحْسانُ، اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرٰكَ))

(مسلم، حدیث جبرئیل)

احسان اس کا نام ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اُس کو نہیں دیکھتے ہو تو وہ تم کو دیکھتا ہے، اور ''عبادت'' یعنی بندگی کا مفہوم صرف نماز تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر لمحہ اور ہر ساعت میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کو ماننا ہی حقیقی بندگی ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''حدیث میں 'تَعبُدُ' کا لفظ ہے جس کے معنی مطلق عبادت اور بندگی کے ہیں، لہٰذا نماز کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ اسی حدیث کی ایک اور روایت میں بجائے 'تَعبُدَ' کے 'تَخشٰی' کا لفظ بھی آیا ہے، یعنی 'اَلْاِحْسان، اَنْ تَخْشَی اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ' جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ 'احسان' یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو اور اسی واقعہ کی ایک روایت میں اس موقع پر یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ ((اَلْاحْسَانُ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ کَاَنَّكَ تَرَاهُ)) جس کا ترجمہ یہ ہو گا کہ ''احسان اس کا نام ہے کہ تم ہر کام اللہ کے لیے اس طرح کرو کہ گویا تم اُس کو دیکھ رہے ہو۔'' ان دونوں روایتوں (جس میں تَخشٰی اور تعْمَلُ کے لفظ آئے ہیں) سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ ''اِحسان'' کا تعلق صرف 'نماز' ہی سے نہیں ہے بلکہ انسان کی پوری زندگی سے ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ہر عبادت اور بندگی اور اس کے ہر حکم کی اطاعت اور فرمانبرداری اس طرح کی جائے اور اُس کے مؤاخذہ سے اس طرح ڈرا جائے کہ گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور ہماری ہر حرکت وسکون کو دیکھ رہا ہے۔'' (معارف الحدیث، جلد اول)

قرآن حکیم کی متعدد آیات میں تقویٰ بمعنی اطاعت کے آئے ہیں، اس آیت مبارکہ پر غور کیجیے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾

(آل عمران ۳:۱۰۲)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے، تم کو موت نہ آئے مگر اِس حال میں کہ تم مسلم ہو (یعنی ہر لمحہ اس کی اطاعت کا دم بھرنے والے ہو)۔''

ان احادیث مبارکہ پر بھی غور کر لیجیے، رسول اللہ ﷺ 'حجۃ الوداع' کے خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

((اِتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّکُمْ، وَ صَلُّوْا خَمْسَکُمْ، وَ صُوْمُوْا شَهْرَکُمْ وَ اَدُّوْا زَکَاةَ

أَمْوٰلِكُمْ، وَ أَطِيعُوْا ذَا أَمْرِكُمْ، تَدْخُلُوا جَنَّةَ رَبِّكُمْ))

(الترمذی، رقم الحدیث:٦١٦)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو، پانچ نمازیں (بروقت، باجماعت) ادا کرو، رمضان المبارک کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو اور اپنے امیر کی اطاعت کرو (یہ بات ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو) اس طرح تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور عرض کرنے لگا کہ میں سفر کا ارادہ کرتا ہوں میرے لیے توشۂ راہ کے بارے میں فرمایے، آپ ﷺ نے کتنے خوبصورت الفاظ میں توشۂ راہ کے موتی عنایت فرمائے:

((زَوَّدَكَ اللّٰهُ التَّقْوٰى" قَالَ زِدْنِيْ، قَالَ: "غَفَرَ ذَنْبَكَ" قَالَ: زِدْنِيْ بِأَبِي اَنْتَ وَ أُمِّيْ قَالَ: "وَيَسَّرَلَكَ الْخَيْرَ حَيْثُمَا كُنْتَ)) (ترمذی، رقم الحدیث:٢٤٤٤)

''اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ کی دولت سے مالا مال فرمائے''، اُس نے کہا: کچھ اور فرمایے فرمایا ''وہ تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے، اُس نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں کچھ اور اضافہ کیجیے، ارشاد ہوا ''جہاں کہیں بھی جاؤ اللہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔''

((سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ قَالَ: تَقْوَى اللّٰهِ وَ حُسْنُ الْخُلُقِ)) (ترمذی، رقم الحدیث:٣٢٧١)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: لوگوں کا جنت میں جانے کا کیا نسخہ ہے؟ ارشاد ہوا ''اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور پاکیزہ اخلاق۔''

اور اس نیلگوں آسمان کے نیچے حُسنِ اخلاق اور تقویٰ کا نمونہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ تھی جس کی رب کریم نے شہادت دی ہے:

﴿وَ اِنَّکَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

اور یہی ہر داعی الی اللہ کا زادِ راہ ہے، رسول اللہ ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا، اَنْتَ وَلِیُّھَا وَ مَوْلَا ھَا))

''اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ سے مزین فرمایے، اس کو تزکیہ سے آراستہ کر دیجیے، آپ ہی اس کا بہتر تزکیہ فرمانے والے ہیں۔ آپ ہی اس کے مالک اور والی ہیں۔''

معرفة اللّٰہِ عزّوجلّ

معرفت کے لغوی معنی، اس لفظ کا مادہ (ع ر ف) ہے، عَرَفَ، یَعْرِفُ، عِرفَانًا وَ مَعْرِفَةً، اس کے معنی پہچاننا، معلوم کرنا، شناخت کرنا، واقف ہونا۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اَلْمَعْرِفَةُ والْعِرْفَانُ کے معنی ہیں کسی چیز کے شواہد و آثار پر غور و فکر کر کے اس کا ادراک کر لینا، یہ علم سے کم درجہ رکھتا ہے، اس لیے کہا جاتا ہے ((فُلَانٌ یَعْلَمُ اللّٰہَ)) یعنی وہ اللہ کو جانتا ہے استعمال نہیں ہوتا کیونکہ انسان ذاتِ الٰہی کا علم حاصل نہیں کر سکتا، البتہ کائنات اور آثارِ قدرت پر غور و فکر کر کے اس کی صفات کا اندازہ لگا سکتا ہے، اسی طرح اللّٰہ یَعْرِفُ کَذا، یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کی معرفت ہے نہیں کہتے کیونکہ معرفت اس اِدراک پر بولا جاتا ہے جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتا ہے جس سے رب العزت کی ذات بلند و برتر ہے (اسے تو ہر باریک سے باریک بات کا بھی علم ہے)۔

''معرفت'' کے مقابلہ میں ''اِنکَارٌ'' اور ''عِلْمٌ'' کے مقابلہ میں ''جَھالَةٌ'' استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا﴾ (النحل:۱٦/۸۳)

''(یہ کفار) اللہ تعالیٰ کے احسان کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول دو طرح سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ رب کائنات کا اس کی بنائی ہوئی اشیاء پر غور و فکر کیا جائے، یعنی اَنفس و آفاق کا بغور مطالعہ اور

مشاہدہ خالق کائنات کی رسائی کا ذریعہ ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَ بَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۶۴)

”جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، اس میں عقل مند قوم کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں (اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازیاں)۔“

اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت عیاں ہوتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی عام آیات پر غور وفکر کیا جائے تو رب کائنات تک رسائی آسان ہو جاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوۡۤا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ﴾ (صٓ:۳۸/۲۹)

”یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ!) ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔“

(الفوائد)

اللہ تعالیٰ کی معرفت کی آیات

ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلرَّحۡمٰنُ ○ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ○ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ○ عَلَّمَهُ الۡبَیَانَ﴾(الرحمٰن ۵۵:۱-۴)

''نہایت ہی مہربان (اللہ رب العزت) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے، اُسی نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے بولنا سکھایا۔''

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم کے اَن گنت انعامات کے بیان میں یہ اس سورۂ مبارکہ کا پہلا پیراگراف ہے۔

﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ﴾ (اس نے قرآن کی تعلیم دی) اور قرآن کی تعلیم کی شکل میں اللہ نے اپنے بندوں پر عظیم رحمت فرمائی، قرآن جو احکام الٰہی کا ترجمان ہے، یہ اہل زمین کے لیے آسمان کا منہاج ہے اور یہ منہاج اہالیانِ زمین کو احکام الٰہی سے ملاتا ہے اور یہ ان کے عقائد، ان کے تصورات، ان کے پیمانوں، ان کی قدروں، ان کے اداروں اور ان کے حالات کو نہایت ہی مضبوط بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔

قرآن انسانوں کے حواس اور ان کے شعور کو اس پوری کائنات کے لیے کھولتا ہے کہ دیکھو کیا ہی خوبصورت ہے یہ کائنات ! اور قرآن ان کو اس کا مشاہدہ یوں کراتا ہے کہ گویا انسانیت نے کائنات کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے وہ دیکھتے رہے تھے، لیکن یہ ایک نیا مطالعہ ہے، انہوں نے خود اپنی ذات کا ازسرِ نو مطالعہ کیا ہے، انہوں نے اپنے اردگرد کائنات کو پڑھنا شروع کیا ہے، بلکہ قرآن نے اس پورے کائناتی ماحول کو ایک زندگی عطا کر دی اور یہ ماحول انسان کے ساتھ ساتھ چلنا شروع ہو گیا ہے، اب انسان اس کائنات کی چیزوں کا دوست بن گیا ہے، ساتھی اور ہم قدم بن گیا ہے اور اس ذہن پر انسان کا یہ سفر نہایت ہی خوشگواری سے چلنے لگا۔

اس قرآن نے انسان کے ذہن نشین کرایا ہے کہ انسانو! تم اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے خلفاء ہو، اُس کے نزدیک بہت مکرّم ہو، تمہیں اللہ نے یہ قرآن ایک عظیم امانت دی ہے، وہ امانت کہ زمین و آسمانوں اور پہاڑوں نے اس کے اٹھانے سے معذرت کر لی تھی، قرآن تمہیں جو اعلیٰ انسانیت عطا کرتا ہے، اس کی قدر و قیمت کو سمجھو اور یہ فہم و

ادراک صرف قرآن کے ذریعے ممکن ہے، ایمان کی راہ سے ہی ممکن ہے، ایمان ہی تمہاری روح میں یہ جذبہ، یہ ہدایت پھونک سکتا ہے اورصرف قرآن کے ذریعے سے تم اللہ کی عظیم نعمت حاصل کر سکتے ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور اسے وجود بخشنے کی نعمتوں سے بھی پہلے تعلیم کا ذکر کیا کیونکہ علمِ قرآن کے ذریعہ ہی انسان، انسان بن سکتا ہے۔

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ ''انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔''

ہم یہاں انسان کی تخلیق کی نعمت پر کلام نہیں کرتے، جلد ہی اس کا بیان بھی آ جائے گا، یہاں پر اصل مقصود تعلیم کا بیان ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بات کرتا ہے، مافی الضمیر تعبیر کرتا ہے۔ بیان کرتا ہے کہ ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہیں اور پھر انسان باہم تعاون کرتے ہیں، یہ کام چونکہ ہر وقت ہمارے درمیان ہوتا رہتا ہے، اس لیے اللہ کی اس نعمتِ عظمیٰ کو ہم نے بھلا دیا ہے، ورنہ ذرا بھی غور کیا جائے تو یہ ایک عجوبہ ہے (اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے یہ نعمت اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی ہے) قرآن ایسی کئی نعمتوں کی یاد دہانی کراتا ہے اور ہمیں جگاتا ہے۔

انسان کیا چیز ہے؟ اس کی اصلیت کیا ہے؟ اسے یہ بیان کس طرح سکھا دیا جاتا ہے؟ انسان کی حیثیت تو یہ ہے کہ یہ ایک معمولی سا خلیہ ہے جو باپ کے مادہ منویہ میں ہوتا ہے اور رحمِ مادر میں نہایت ہی سادہ شکل میں زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ یہ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے، کمزور ہوتا ہے، یہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ یہ صرف آلات کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے، نہ یہ نظر آتا ہے اور نہ یہ اظہار کر سکتا ہے۔

یہ خلیہ جلد ہی جنین کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس جنین میں خلیوں کی تعداد پھر کئی ملین ہو جاتی ہے۔ ہڈی کے خلیے، نرم ہڈیوں کے خلیے، عضلات کے خلیے، اعصاب کے خلیے اور جلد کے خلیے، پھر اعضاء بنتے ہیں اور ان اعضا کے حیران کن کام اور صلاحیتیں۔ سننا، دیکھنا، چکھنا، سونگھنا، چھونا، پھر شعور اور الہام۔ یہ سب خلیے اور یہ سب خواص اس ایک

خلیے سے بن گئے جو ایک سادہ معمولی سا خلیہ تھا، نہایت چھوٹا جو نظر نہ آتا تھا اور نہ اظہار کرسکتا تھا یہ کیسے ہوا؟ کہاں سے آیا؟ یہ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم کی کاریگری ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس مخلوق کو کس طرح قوتِ گویائی سے نوازا ہے۔

اس بات کو حکیمانہ انداز میں سورۃ المؤمنون میں بیان کیا:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾

(المؤمنون ٢٣:١٢-١٤)

''(رب کریم کا ارشاد ہے) یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر اسے نطفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دیا (یعنی رحمِ مادر میں) پھر نطفہ کو ہم نے جما ہوا خون بنا دیا، پھر اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا، پھر گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں بنا دیں، پھر ہڈیوں کو ہم نے گوشت پہنا دیا، پھر دوسری بناوٹ میں اس کو پیدا کر دیا (جیتا جاگتا انسان بنا دیا) برکتوں والا ہے، وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے (اللہ تعالیٰ کے سوا بھلا اور کون ہے جو ایسی کاریگری کا نمونہ پیش کر سکے؟)''

پھر اس خالق و مالک کی کاریگری دیکھیے کہ وہ نہ صرف نک سک سے درست فرماتا ہے بلکہ ہر انسان کی تصویر گری بھی فرماتا ہے، ہر انسان کا رنگ روپ، شکل وصورت بھی جیسے چاہتا ہے بنا دیتا ہے، اُس کی تخلیق کا یہ بہت بڑا کمال ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ يُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

(آل عمران:٣/٦)

''وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے، اُس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔''

پھر اس خالق و مالک کی قدرت وحکمت کا نظارہ کرو کہ اس کی عطا و بخشش میں کسی کو کوئی عمل

دخل نہیں ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی نہ صرف شکل وصورت میں فرق ہے بلکہ ان کی آوازیں بھی مختلف ہیں کہ ہر اس شخص کی آواز کو جن سے آپ مل چکے ہیں ٹیلیفون پر پہچان لیتے ہیں:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ○ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَّيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ﴾ (الشوریٰ:۴۲/۴۹-۵۰)

”اللہ ہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے، وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے (اور یہ وہ حقیقت ہے جو ہمارے مشاہدے میں آتی رہتی ہے)۔“

قرآن حکیم نے انسان کو کئی مقامات پر توجہ دلائی ہے کہ اپنی تخلیق پر غور کرے تو اسے خالق کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ○ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ○ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾

(البلد: ۹۰/۸-۱۰)

”(رب کریم کا ارشاد ہے) کیا ہم نے اسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ (نیکی اور بدی) دونوں راستے نمایاں نہیں کر دیے؟“

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے انسان کا اپنا جسم ہی کافی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ○ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾

(الذریت: ۵۱/۲۰-۲۱)

”اور یقین والوں کے لیے تو زمین میں (اللہ تعالیٰ کی قدرت) کی بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی، تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟“

رزق اور رب کائنات کی معرفت

طرح طرح کے رزق جو ہم کھاتے ہیں اور جن سے ہماری صحت برقرار رہتی ہے، یہ کس کی عطا

اور بخشش ہے؟ قرآن انسان کو دعوت دیتا ہے کہ اس پر غور کرے، کسی بات پر غور اور تدبر ہی اس کے ذہن کے دریچے کھولتا ہے اور وہ راہ حق پا لیتا ہے:

﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُونًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّأَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ﴾ (عبس: ۸۰/۲۴-۳۲)

''(اللہ کریم کا ارشاد ہے) پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے کہ ہم نے خوب پانی برسایا، پھر زمین کو عجیب طرز سے پھاڑا پھر اس میں (طرح طرح) کے اناج اُگائے اور انگور (کے باغات) اور (قسم قسم) کی سبزیاں اور زیتون اور کھجور اور (دیگر) باغات اور میوہ جات اور (گھاس) چارہ (بھی اُگایا) جو تمہارے استعمال اور فائدہ کے لیے ہے (تمہاری صحت برقرار رہتی ہے) اور تمہارے چوپایوں کے لیے (بھی فائدہ ہے)۔''

محترم حافظ مبشر حسین صاحب لکھتے ہیں:

''انسان زمین میں چھوٹا سا بیج ڈالتا ہے اور ایک خاص مدت کے بعد اسی بیج سے پودا نکلتا ہے جو بتدریج بڑھتے بڑھتے تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اِسی طرح ایک کسان زمین میں گندم کے دانے ڈالتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد اُس سے پودے نکلتے ہیں جو چند ماہ میں لہلہاتی فصل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ وہ مثال ہے جس کا مشاہدہ ہم آئے روز کرتے رہتے ہیں، لیکن کبھی ہم نے یہ سوچا ہے کہ آخر ایک بیج اور دانے سے پودا کیسے پیدا ہو جاتا ہے؟ پھر وہ پودا بڑھتے بڑھتے فصل یا درخت کی شکل کیونکر اختیار کر لیتا ہے؟ پھر اس پر مزیدار پھل اور خوشبودار پھول کیسے اُگ آتے ہیں؟

اگر تو کوئی انسان یہ کہے کہ زمین کی قوت، پانی کی طاقت، سورج کی حرارت، ہوائی گیسوں (آکسیجن، کاربن، نائٹروجن وغیرہ) کا عمل اور خود کسان کی محنت سے یہ سب کچھ وجود میں آتا ہے تو اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کو اُگانے کی قوت آخر کس نے

دی ہے؟ پانی، نمی، حرارت، گرمی اور ہوا وغیرہ میں اُگانے کی خصوصیات کس نے رکھی ہیں؟ پھر ان تمام چیزوں میں وہ توازن کس نے پیدا کر دیا جو فصلوں کی پیداوار کے لیے ضروری ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود پانی، ہوا اور حرارت کو کس نے وجود بخشا ہے؟ پانی اگر گیسوں (ہائیڈروجن اور آکسیجن) سے مل کر بنتا ہے تو ان گیسوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ حرارت اگر سورج سے پیدا ہوتی ہے تو خود سورج کو کس نے پیدا کیا ہے؟

اگر ہم ہوا، پانی اور حرارت کا وجود تسلیم کرتے ہیں تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انہیں وجود عطا کرنے والا بھی کوئی ہے اور یہ ساری چیزیں ہر لحاظ سے اس کے کنٹرول میں ہیں کیونکہ ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ کسان کے ہل چلانے، گوڈی کرنے، بیج ڈالنے، پانی دینے اور رکھوالی کرنے کے باوجود زمین فصل اگانے سے انکار کر دیتی ہے یا ہوا اپنے توازن و اعتدال سے ہٹ کر طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے یا پانی سیلاب بن کر بہہ پڑتا ہے اور کھڑی ہوئی فصلیں تباہ اور پھلوں کی نوید سنانے والے باغات ویران ہو جاتے ہیں پھر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی قطعۂ ارضی پر ایک کی فصل اچھی اگتی ہے، جبکہ دوسرے کی فصل پودے بھی نکال نہیں پاتی۔ ایک ہی وقت پر آنے والا طوفان ایک کے کھیت کھلیان اور باغ کو ایسا تباہ کر دیتا ہے کہ ایک بھی پھلدار درخت باقی نہیں بچتا، جبکہ ساتھ ہی موجود دوسرے کا نہ کھیت اجڑتا ہے اور نہ پھل ضائع ہوتا ہے۔ (گویا کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے)۔

یہ سب اشارات ہیں اس بات کے کہ ایسا اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ کسی طے شدہ منصوبے کے تحت ہوتا ہے، عقلمند تو بہت جلد سمجھ لیتا ہے کہ کوئی ذات اور ہستی ایسی ضرور ہے جو چاہے تو ہوا، پانی، حرارت وغیرہ میں توازن پیدا کر کے نباتات اُگا دے اور قطعۂ ارضی کو پھلوں اور پھولوں سے بھر دے اور چاہے تو ان اشیاء کا توازن خراب کر کے ہوا کو طوفان، پانی کو سیلاب، حرارت کو آگ اور زرعی زمین کو بنجر و بے آب و گیاہ بنا دے، عقلمند بالآخر یہی فیصلہ کرتا ہے کہ یہ پانی، ہوا، روشنی وغیرہ جس ہستی کے کنٹرول میں ہیں، میں اسی ہستی

کواپنا محبوب بنا لوں اور اسی کی رضا حاصل کرنے کے لیے جو کچھ ممکن ہے وہ سب کر گزروں، یقین کیجیے! عقل و منطق کی عدالت میں اس کے علاوہ اور کوئی فیصلہ کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ یہ سب اشیاء تو کسی بلند و بالا آقا کی غلام و خُدّام ہیں، جبکہ آقا اور غلام کے مقابلہ میں غلام کو نہیں بلکہ آقا کو راضی کیا جاتا ہے، مگر بے وقوف ہے وہ شخص جو آقا کو چھوڑ کر غلام کو راضی کرنے لگے (آقا بھی ایسا محسن و مہربان ہے جس نے جسم و جان سے لے کر ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے اور عرش سے فرش تک تمام چیزوں کو انسان کا خادم اور نفع رساں بنا دیا ہے) جو ہوا روشنی اور پانی کے خالق کو چھوڑ کر خود انہی چیزوں کو بلند و بالا سمجھ لے اور ان کے آگے سجدہ ریز ہو جائے (جبکہ یہ تمام چیزیں خالقِ ارض و سما کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور اسی کی تسبیح میں مصروف کار ہیں:

﴿وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ﴾

(بنی اسرائیل:۱۷/۴۴)

''کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔''

اس سلسلہ میں قرآن مجید بھی عقلمندوں کے فیصلے کی تائید کرتا اور یہ پیغام دیتا ہے کہ ہوا، پانی، روشنی اور تمام کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، زمین سے نباتات اُگاتا ہے اور ہوا، روشنی اور نمی میں توازن پیدا کرتا ہے، ان میں سے ایک ہی چیز کو اگر وہ چھین لے یا اس کا توازن بگاڑ دے تو ساری دنیا کے کسان مل کر ایک دانہ بھی پیدا نہیں کر سکتے، اس لیے وہی عبادت کا مستحق ہے۔ (اللہ اور انسان)

یہ مال و دولت، دنیا، رشتہ و پیوند — بتانِ وہم و گماں لا اِلٰہ اِلّا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلّا اللہ

پانی رب کائنات کی عظیم نعمت

قرآن حکیم نے یہ حقیقت ہمارے سامنے رکھی ہے:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ﴾ (الانبیا:۲۱/۳۰)

”(اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے) اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا (اور پانی ہی سے اس کی زندگی کا سروسامان ہے)“

پانی نہ صرف انسان اور ہر ذی روح کے لیے ضروری ہے بلکہ نباتات کی بھی نشوونما اور تروتازگی پانی ہی کی وجہ سے ہے، انسان کو اگر چند گھنٹے گزرنے کے بعد پانی نہ ملے تو اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے اور پھر اگر پانی کڑوا کسیلا ہو تو بھی اسے نگلنا محال ہو جاتا ہے، قرآن اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ○ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ﴾ (الواقعة:۵۶/۶۸-۷۰)

”کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے ہو اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں، ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں۔“

کھیت خشک پڑے ہوتے ہیں کہ بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے اور وہ سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ﴾ (الحج:۲۲/۵)

”تم دیکھتے ہو کہ زمین (بنجر اور) خشک ہے، پھر ہم اس پر بارشیں برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے تو ہر قسم کی رونق دار نباتات اُگاتی ہے۔“

پھر ہم موسم برسات میں اس بات کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شہر اور ایک ہی علاقہ کے بعض حصوں میں بارش ہوتی ہے اور بعض خشک رہ جاتے ہیں، یعنی بادل بھی رب کائنات کے مطیع ہیں جہاں اُس کا حکم ہوتا ہے وہیں برستے ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”دیکھو! زمین بنجر اور مردہ ہوتی ہے، لیکن بارش کے بعد یہ کس طرح زندہ اور شاداب اور

انواع اقسام کے غلے، میوہ جات اور رنگ برنگ کے پھولوں سے مالا مال ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انسانوں کو بھی ان کی قبروں سے اٹھا کھڑا کرے گا، جس طرح حدیث میں ہے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا اللہ تعالیٰ انسانوں کو جس طرح پیدا فرمائے گا، اس کی کوئی نشانی مخلوقات میں سے بیان فرمایے، نبی ﷺ نے فرمایا ''کیا تمہارا گزر ایسی وادی سے ہوا ہے، جو خشک اور بنجر ہو، پھر دوبارہ اسے لہلہاتا ہوا دیکھا ہو؟ اس نے کہا، ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا، بس اسی طرح انسانوں کا جی اٹھنا ہوگا۔''

(احسن التفاسیر، بحوالہ مسند احمد)

موت وحیات کا اللہ ہی مالک ہے

کوئی شخص زندگی کا خواہ کتنا ہی منکر ہو مگر وہ موت کا انکار نہیں کرسکتا، دنیا میں کتنے طبیب اور ڈاکٹر گزرے مگر ان میں سے کوئی بھی آج تک موت کا تریاق نہ تلاش کرسکا، موت وحیات کا صرف اور صرف وہی مالک ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك:٦٧/٢)

''وہ اللہ ہے جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے (تاکہ نیکیوں پر تمہیں انعام دے اور برائیوں پر سزا کہ یہ زندگی سراسر امتحان ہے)۔''

پھر جب کسی شخص کی موت کا وقت آتا ہے، تو ایک سیکنڈ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ﴾

(الاعراف:٧/٣٤)

''ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت (اس دنیا میں) مقرر ہے، پھر جس کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر وتقدیم نہیں ہوتی۔''

بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی شخص کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کس مقام پر اُس کا دم اکھڑ جائے گا۔

﴿وَ مَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ﴾ (لقمٰن:۳۱/۳٤)

''اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کی موت آنی ہے۔''

بقول شاعر ؎

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و دَر میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قُلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے مَوجُ کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، ایک طوقِ گلو افشار ہے

حق بات صرف اور صرف یہ ہے، جو قرآن نے نشان دہی کر دی ہے:

﴿کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ ۝ وَّیَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ﴾

(الرحمن:۵۵/۲٦-۲۷)

''(لوگو!) ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب جلیل و کریم کی ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص اور خصوصاً داعی الی اللہ اَنۡفُس و آفاق کی آیات (نشانیوں) پر غور و فکر کرے، نیز قرآن حکیم کی آیات (کہ ہر آیت اللہ تعالیٰ کی حکمت و بصیرت سے لبریز ہے) پر تدبر و تفکر کرے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (اٰل عمران:۳/۱۹۰-۱۹۱)

''زمین و آسمانوں کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری سے آنے میں ان

ہوشمندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت پر غور وفکر کرتے ہیں (اور بے اختیار ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتا ہے) ''اے ہمارے رب! یہ سب کچھ آپ نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، آپ پاک ہیں اس سے کہ عبث اور بے فائدہ کوئی چیز پیدا فرمائیں، پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیجیے۔'' (آمین!)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ سے آخرت میں ملاقات کی سعادت اسی شخص کے حصے میں آ سکتی ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں ڈوب جائے اور اس کا حصول بغیر اس کی معرفت کے نہیں ہو سکتا اور یہ معرفت دائمی غور وفکر سے حاصل ہوتی ہے۔ (احیاء علوم الدین)

رب کریم! یہ سطور لکھتے ہوئے دل آپ کے حضور دعا کر رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں کہ ہمیں اپنی معرفت سے نوازیے۔ آمین!

قوۃ البیانِ

﴿قُوَّةُ الْبیانِ﴾ یعنی بولنے کی قوت، اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے کی صلاحیت، قوتِ گویائی اور حسن بیان کی خوبی جو رب کریم کے اَنْ گِنَت احسانات میں سے وہ عظیم احسان ہے جو انسان کو ودیعت کیا گیا ہے اور تمام مخلوقات میں سے اس صفت سے صرف انسان ہی کو نوازا گیا ہے۔

اس پر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں:

''خالق کون و مکان رب العالمین اللہ جل جلالہ نے اولادِ آدم پر جو احسانات کیے ہیں اور اسے جس انعام و اکرام سے نوازا ہے اس کا حصر و اِحاطہ اور قلم و قرطاس کی حدود سے باہر ہے، یہی احسان کیا کم ہے کہ اسے انسان بنا کر اشرف المخلوقات کے مرتبے پر فائز کیا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (التین:۹۵/۴)

کے مطابق اسے حسن و جمال اور اخلاق و خصائل کے بہترین سانچے میں ڈھالا اور پھر

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ﴾ (بنی اِسرائیل:۱۷/۷۰)

کی رو سے اسے عزت و تکریم کا تاج پہنایا، ان لا تعداد انعامات ربانی میں سے ایک اہم فضل و انعام نطق و بیان کی صلاحیت اور قلم کا استعمال بھی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾

(الرحمن:۵۵/۱-۴)

رحمٰن وہ ہے جس نے قرآن سکھایا، انسان کی تخلیق فرمائی، پھر اسے نطق و بیان کی تعلیم دی۔

عقل و شعور اور نطق و بیان کی نعمتِ عظمٰی کی تکمیل قلم و قرطاس کی محتاج تھی، علم و دولت کی سعادت دراصل عقل و شعور کی تربیّت اور نطق و بیان کو رعنائی بخشنے کے لیے تھی، عقل و شعور کے ظرف کے مطابق انسان کو علم کی دولت میسر نہ آئے تو اس کی شخصیت میں اعتدال و توازن پیدا ہوسکتا ہے اور نہ نطقِ بیان کی صلاحیت کو جلا مل سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اَفصَحُ العرب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب شرفِ نبوت سے نوازا گیا تو تخلیق و ہدایت کے احسانِ ربّانی کے ساتھ دولتِ علم اور قرطاس و قلم کی عظمت کا بھی اعلان ہوا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (العلق:۹۶/۱-۴)

”(اے نبی!) پڑھیے! اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھتے رہیے آپ کا رب بڑے ہی کرم والا ہے جس نے (انسان کو) قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔“ (فصاحت نبویؐ)

اَنبیاء علیہم السلام کو رب کریم نے یقیناً فصاحت و بلاغت سے نوازا اور زبان و بیان پر قدرت عطا فرمائی، چنانچہ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ فرعون کے دربار میں جا کر اسے دعوتِ حق دیں تو انہوں نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو فصاحتِ کلام میں اپنے سے بہتر پایا، رب کریم کے حضور دعا

فرمائی کہ میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے اور اس کی وجہ بھی بیان کر دی۔

﴿وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ﴾ (القصص ۲۸:۳۴)

''اور میرا بھائی (ہارون علیہ السلام) مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے، تو اسے میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیجئے۔''

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی اس التجا کو قبول کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ساتھ فرعون کو دعوتِ حق پیش کرتے وقت لطافت اور نرمی سے بات کرنے کی تلقین فرمائی، ارشاد ہوا:

﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰى﴾

(طٰہٰ: ۲۰/۴۳-۴۴)

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بڑی سرکشی کی ہے، اسے نرمی سے سمجھاؤ کہ شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے۔''

یعنی ظالم اور سرکش کے سامنے بھی کلمۃ الحق کو برملا کہا جائے، مگر لب ولہجہ نرم، شائستہ، مٹھاس اور محبت سے بھرا ہوا ہونا چاہیے اور یہی موقف ہر داعی الی اللہ کا زادِ راہ ہے، اگر مخالف جواب میں سخت سست بات بھی کہہ جائے تو اس کا جواب بہتر کلام سے دینا چاہیے، اسلام کی بلند تعلیمات پر غور کیجیے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۱/۳۴)

''(مسلمانو!) نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، برائی کو بھلائی سے دفع کیا کرو، (پھر دیکھو!) وہی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے ایسا ہو جائے گا جیسے دِلی دوست۔''

سیرت طیبہ کا یہ پہلو بھی نہایت درخشاں اور روشن ہے، آپ ﷺ نے ہمیشہ سختی کا جواب نرمی سے، تلخی کا جواب شفقت سے، برائی کا جواب اچھائی سے، جبکہ وادیٔ طائف میں پتھروں کا جواب دل گداز دعاؤں سے دیا، جس سے سنگدل بھی موم ہو گئے اور آپ ﷺ کے دست حق پرست پر بالآخر دعوتِ اسلامی کو قبول کر لیا۔ آپ ﷺ کی فصاحت وبلاغت بھی بے مثل اور بے مثال تھی، بات

کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں جن کی مہک سے اردگرد کا ماحول معطر ہو رہا ہے، آپ ﷺ کی گفتگو مختصر مگر مضبوط، دلنشین، اثر انگیز اور معرفت و یقین سے لبریز ہوتی تھی۔

امام ابن قیمؒ سیرت طیبہ پر اپنی معروف کتاب ''زاد المعاد'' میں لکھتے ہیں:

''دلائل بیہقی اور حاکم میں سیدنا عقبہ بن عامر سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ غزوۂ تبوک کے لیے نکلے، ایک شب نبی ﷺ آرام فرمانے لگے، (تھکاوٹ کی وجہ سے) بیدار نہ ہو سکے، جب بیدار ہوئے تو آفتاب ایک نیزے کے بقدر طلوع ہو چکا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے بلال! میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ ہمیں فجر کے وقت بیدار کر دینا۔'' انہوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے نیند نے بے بس کر دیا، جس طرح آپ ﷺ کے ساتھ ماجرا گزرا۔''

اس کے بعد نبی ﷺ اس جگہ سے ہٹ کر تھوڑی دور آگے جا کر اترے اور نماز ادا کی، پھر باقی دن رات سفر جاری رکھا اور تبوک میں صبح ہوئی، وہاں آپ ﷺ نے نہایت ہی اثر انگیز خطبہ ارشاد فرمایا جس کا ایک ایک جملہ موتیوں کی لڑی میں پرویا ہوا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کی دلنشین انداز میں تشریح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

رسول اللہ ﷺ کا خطبۂ تبوک:

- ((فَإِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ))

''بلاشبہ سب سے سچی بات اللہ کی کتاب ہے۔''

رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الحجر: ۱/۱۵)

''الرٰ، یہ آیات ہیں کتاب الٰہی کی (یعنی) واضح اور روشن قرآن کی۔''

جس کی ہر بات واضح اور قابل فہم ہے، اس بات کو ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ﴾ (الزمر: ۲۳/۳۹)

''اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے۔''

● ((وَ أَوْثَقُ الْعُرَى كَلِمَةُ التَّقْوٰى))

''اور مستند و قابل اعتماد بات ''کلمہ تقویٰ'' ہے۔''

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر تقویٰ اور اہل تقویٰ کی اہمیت پر زور دیا ہے، مثلاً سفر حج کے لیے حکم ہوتا ہے کہ زاد راہ لو مگر پرہیز گاری کے زادِ راہ کو نہ بھولو:

﴿وَ تَزَوَّدُوْا، فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾

''اور (حج پر جاتے وقت) اپنے ساتھ سفر خرچ لے لیا کرو اور سب سے بہتر توشہ تو اللہ تعالیٰ کا ڈر (تقویٰ) ہے۔''

لباس انسان کے لیے زیب و زینت کا سامان ہے، اس لیے مردوں اور عورتوں کو ایسا لباس زیب تن کرنے کا حکم ہے جو شرم و حیا کی پاسداری کرے، اسی کو 'لباس تقویٰ' کا نام دیا گیا ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ (الاعراف:۷/۲۶)

''(رب کریم کا ارشاد ہے) اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانپ لے اور تمہارے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو (یاد رکھو!) اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔''

ایک اور جگہ اہل ایمان کے لیے تقویٰ کی پابندی کا ذکر فرمایا:

﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا﴾

''اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حقدار اور اہل تھے۔''

اور صبر و تقویٰ کا انجام و انعام بھی کیا ہی اچھا اور عمدہ ہے:

﴿فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (ھود:۱۱/۴۹)

''(اے نبی!) صبر کی راہ اختیار کیجیے (ہمت نہ ہاریے، دین کے کام میں لگے رہیے) انجام کار متقیوں کے حق میں ہے۔''

● ((وَ خَيْرُ الْمِلَلِ مِلَّةُ اِبْرٰهِيْمَ))

''اور تمام ملتوں سے بہترین ملت، ملتِ ابراہیم علیہ السلام ہے۔''

﴿اَلْمِلَّة﴾ ملت اس 'دستورِ حیات' کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اَنبیاء کی زبان پر بندوں کے لیے مقرر فرمایا، تاکہ اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں۔

دین اور ملت میں فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف اس نبی کی طرف ہوتی ہے جس کا وہ دین ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (آل عمران:۳/۹۵)

''تم کو یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہیے اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔'' (مفردات القرآن)

یعنی سیدنا ابراہیمؑ کا جو طریقہ زندگی تھا وہ ٹھیک اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دینِ اسلام کے مطابق تھا، اور دنیا میں جتنے بھی نبی اللہ کی طرف سے آئے وہ دین اسلام ہی کی دعوت لے کر آئے اور اس دین کی تکمیل خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ:۵/۳)

''(رب کریم کا ارشاد ہے) آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

- ((وَ خَيْرُ السُّنَنِ سُنَّةُ مُحَمَّدٍ))

''اور تمام سنن سے بہترین سنت، سنتِ محمد ﷺ ہے۔''

سنتُ النبی سے مراد رسول اللہ ﷺ کا وہ طریقہ ہے جسے آپ ﷺ اختیار فرماتے تھے۔

(مفردات القرآن)

ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر لمحہ اور ہر ساعت اطاعتِ رب میں بسر ہوتی تھی اور آپ ﷺ کے اَخلاق قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر تھے ﴿كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن﴾ اس لیے رب

کریم نے آپ ﷺ کی پاکیزہ زندگی اور اسوۂ حسنہ کو مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۱)

''(مسلمانو!) یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ (کی حیات طیبہ میں) عمدہ نمونہ موجود ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں ہی اللہ تعالیٰ کی رضا مندی، مغفرت اور رحمت و بخشش کی خوشخبری ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران:۳/۳۱)

''اے نبی! (لوگوں کو کہہ دیجیے) اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

- ((و أَشْرَفُ الْحَدِيْثِ ذِكْرُ اللّٰهِ))

''اور سب سے عظمت والی بات اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔''

قرآن حکیم میں ذکر اللہ کی فضیلت میں متعدد آیات ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ○ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾

(الاحزاب:۳۳/۴۱-۴۲)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو (اس کی یاد سے ہی شیاطین کے مکرو فریب سے بچ سکتے ہو اور صراط مستقیم پر گامزن رہ سکتے ہو) اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔''

اللہ تعالیٰ کے بندے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اپنے مولا و مالک کو یاد کرتے ہیں اور اسی یاد سے ان کی سوجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا اور وہ اَنْفُس و آفاق میں غور وفکر کرتے ہیں اور راہ حق پا لیتے ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(آل عمران ۳:۱۹۱)

”جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے، بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں و زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں (اور بے اختیار ان کی زبانوں پر یہ کلمات جاری ہوتے ہیں) اے ہمارے رب! آپ نے (اس کائنات کو) بے فائدہ نہیں بنایا، آپ پاک ہیں (ہر غلطی اور خطا سے) پس ہمیں آگ سے بچا لیجیے۔“

اور نماز بھی اللہ تعالیٰ کی یاد ہے، بلکہ سب سے اچھی یاد ہے، کیونکہ بندۂ مومن کو اپنے رب سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے:

﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾ (طٰهٰ:۲۰/۱٤)

”(لوگو!) بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا عبادت کے لائق اور کوئی نہیں، پس تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

- ((اِنَّ الْمُصَلِّیْ یُنَاجِیْ رَبَّهٗ فَلْیَنْظُرْ بِمَا یُنَاجِیْهِ بِهٖ)) (موطأ، امام مالك، كتابُ النداء للصلاة)

”بلاشبہ نمازی اپنے رب سے ہمکلام ہوتا ہے، اسے جاننا چاہیے کہ وہ کیا کلام کر رہا ہے۔“

یہ اتنا بڑا شرف ہے جو صرف نمازی کے حصے میں آتا ہے۔

آج مسلمان نماز سے غافل ہے، جبکہ ہمارے اسلاف کا یہ حال تھا کہ میدان جنگ میں بھی نماز سے غافل نہ ہوئے اور یہی ان کی کامیابیوں کا راز تھا ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

قرآن حکیم کی تلاوت، اس کی آیات پر تدبر و تفکر اور اس کی تعلیمات کو حرزِ جاں بنانا بھی ذکر

ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر:۵۴/۱۷)

''ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟''

اس وقت دنیا میں صرف یہی وہ صحیفۂ ربانی ہے جو ہر قسم کی رد و بدل اور تحریف و تغیر سے محفوظ و مامون ہے، اس لیے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں، ضروری تھا کہ قرآن حکیم کو محفوظ کر دیا جائے۔ اس لیے قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۱۵/۹)

''ہم ہی نے اس قرآن کو (محمد ﷺ) پر نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

جب قرآن حکیم کئی صدیاں بیت جانے کے باوجود حرف بحرف صحت کے ساتھ موجود ہے تو جن پر قرآن نازل ہوا ان کی سیرت طیبہ بھی محفوظ ہے، الحمدللہ! اس لیے مسلمانوں کی عزت و سرفرازی کا راز بھی اسی چشمۂ صافی کی فیض یابی میں مضمر ہے ؎

نوع انساں را پیامِ آخریں حامل اُوْ رَحْمَةً لِّلعَالِمِین
گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوۂ تبوک کے موقع پر میدان تبوک میں خطبہ ہے۔

- ((وَ أَحْسَنُ الْقَصَصِ هٰذَا الْقُرْآنُ))

''اور سب سے بہتر لکھی جانے والی بات قرآن حکیم کی ہے۔''

قرآن حکیم رب العالمین کا کلام ہے جو خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر فرشتۂ وحی جبرئیل علیہ السلام لے کر تشریف لاتے رہے اور بلاشبہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو صاف ستھرا اور سیدھا سادھا ہے۔

اور اس پر چلنے والوں کے لیے اجر عظیم کی خوشخبری دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۹/۱۷)

''حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے جو لوگ اسے جان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

یہ مسلمانوں کی روحانی بیماریوں کے لیے شِفا ہے، بلکہ اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے والے جسمانی طور پر بھی مضبوط اور توانا رہتے ہیں۔

﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (بنی اسرائیل:۸۲/۱۷)

''(رب کریم کا ارشاد ہے) یہ قرآن جو ہم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لیے سراسر شفا اور رحمت ہے۔''

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ یہ آسان اور عام فہم ہے اور اس کی آیات دل میں اتر جانے والی ہیں۔

''ہم نے اس قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے، پس کیا کوئی (اس کی پاکیزہ تعلیمات سے) نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟''

پس جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ اور غور سے سنو:

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (الاعراف:۲۰۴/۷)

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے گوشِ دل سے سنو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم ہو (تم پر رحمتِ الٰہی نازل ہو اور فہمِ قرآن سے بہرہ ور ہو جاؤ)۔''

قرآن حکیم کی آیات پر مسلسل تدبر کرنا اہل عقل و بصیرت کا دستور ہے۔

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ص:۲۹/۳۸)

''(اے نبیؐ!) جو کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے، بڑی بابرکت ہے تا کہ لوگ اس کی آیات پر غور وفکر کریں اور تا کہ اہل عقل و بصیرت سبق حاصل کریں۔''

یہ دنیا کے تمام خزانوں سے بہتر ہے، کاش کہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں۔

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾

(یونس:۵۸/۱۰)

''(اے رسول! ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (یہ کتاب نازل ہوئی ہے) تو اس پر انہیں فرحاں وشاداں رہنا چاہیے کیونکہ یہ (روحانی عظمتوں کا گنجینۂ لازوال) ان تمام مادی وسائل سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔''

قرآن حکیم میں رب کریم نے مسلمانوں کو یہ خوشخبری دی ہے کہ تم اگر سچے مومن بن جاؤ تو تم ہی غالب رہو گے:

﴿وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ (آل عمران:۱۳۹/۳)

''نہ کمزوری دکھاؤ اور نہ غم زدہ ہوؤ، تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مسلمان ہو۔''

اس کا یہ وعدہ سچا ہے، ہمارے اسلاف اس کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر دین و دنیا کی کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے، اگر آج ہم بھی اس کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات کو خلوص اور صدق دل سے قبول کر لیں اور اپنی زندگیاں اس کے زریں اصولوں کے مطابق گزارنے لگیں، اس کی تعلیمات کو صرف اپنی نجی زندگی تک محدود نہ رکھیں، بلکہ حکومت کا نظام چلانے کے لیے بھی اس کے ضابطوں پر عمل کریں، اس کی تلاوت پر غور و تدبر کے ساتھ ساتھ اپنے انفرادی اور اجتماعی ماحول کو اسی کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال لیں تو آج ہم بھی دنیا کی قوموں میں باعزت مقام حاصل کر سکتے ہیں ؎

تو ہمی دانی کی آئین تُو چیست؟ زیرِ گردُوں سرِ تمکین تُو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمت اُو لا یزال است و قدیم
نوعِ انساں را پیامِ آخریں حامل اُو رحمَةً لِلْعٰلَمِیْنَ
گرتو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

''(اے مسلمان!) کیا تو جانتا ہے کہ تیرا آئین کیا ہے؟ دنیا میں تیری شان و شوکت کا راز کیا ہے؟ وہ زندہ کتاب قرآن حکیم ہے جس کی حکمت قدیم اور ہمیشہ رہنے والی ہے، وہ نوعِ انسانی کے لیے آخری پیغام ہے اور اسے ''جہانوں کے لیے رحمت'' خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ اے مسلمان! اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے تو قرآن کے

بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔''

حقیقت تو یہی ہے کہ قوموں کا عروج و زوال قرآن کی تعلیمات سے وابستہ ہے، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرۡفَعُ بِهٰذَا الۡكِتَابِ اَقۡوَامًا وَّ يَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيۡنَ))

(صحیح مسلم، بحوالہ معارف الحدیث، کتاب الاذکار والدّعوات)

''اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن حکیم) کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو رفعت اور بلندی عطا فرماتا ہے (عمل سے) اور بہت سے لوگوں کو پستی اور ذلت دیتا ہے (بدعملی سے)۔''

اس حدیث مبارکہ پر مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو قوم اور جو امت خواہ وہ کسی نسل سے ہو، اس کا کوئی بھی رنگ ہو اور کوئی بھی زباں ہو، قرآن مجید کو اپنا رہنما بنا کر اپنے آپ کو اس کا فرمانبردار بنا دے گی اور اس کے ساتھ وہ تعلق رکھے گی جو کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے اس کا حق ہے، اللہ تعالیٰ اس کو دنیا اور آخرت میں سربلند کرے گا اور اس کے برعکس جو قوم اور امت اس سے انحراف اور سرکشی کرے گی وہ اگر بلندیوں کے آسمان پر بھی ہو گی نیچے گرا دی جائے گی، اسلام اور مسلمانوں کی پوری تاریخ اس حدیث کی صداقت پر گواہ اور اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی آئینہ دار ہے، اس حدیث میں ''اقواماً'' کے لفظ سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ عروج و زوال کے اس الٰہی قانون کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ قوموں اور امتوں سے ہے۔'' (معارف الحدیث، ج:۵)

اس نکتہ کو شاعر نے اپنی زبان میں کیا خوب ادا کیا ہے ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

گردشِ ایام کا گلہ کرنا اور عمل سے خالی رہنا، صداقت اور صدق کی خلاف ورزی ہے، دراصل انسان کے اعمال ہی وقت اور زمانے کو بہتر بناتے ہیں، یہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے کہ اپنے

برے اعمال کو زمانے کی نحوست قرار دیتا ہے ؎

خوار از مہجوریِ قرآں شُدی　　　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شُدی

''(مسلمان!) تو قرآن کو چھوڑ کر ذلیل ہوا، لیکن زمانے کی گردش کا گلہ کرنے لگا۔''

قرآن حکیم مکمل دستور حیات ہے۔ یہ ہر شعبۂ زندگی میں بہترین رہنما ہے، اس میں انفرادی، اجتماعی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے روشن اصول اور ہدایات ہیں، ہم نے ان ہدایات سے فیض یاب ہونے کی بجائے اس کتاب عظیم کو صرف محفلوں اور مجلسوں میں تلاوت کے لیے محدود کر دیا ہے یا پھر کسی قریبِ مرگ شخص کے پاس اس لیے تلاوت کرتے ہیں کہ اس کی ''سورۂ یٰسین'' سے اسے نزع کی تکلیف سے رہائی مل جائے، یا پھر جعلی پیروں اور درویشوں سے دم جھاڑ کرواتے ہیں۔ افسوس ہے کہ جو قرآن زندگی عطا کرنے کے لیے آیا تھا۔ ہم نے اسے صرف موت میں آسانی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے ؎

بہ بند صوفی و مُلّا اسیری　　　　حیات از حکمتِ قرآں نگیری

بہ آیاتش تُرا کارے جز ایں نیست　　　　کہ از یٰسین اُو آساں بمیری

''تو صوفی و ملا کے بندھنوں کا اسیر ہے اور قرآن حکیم کی حکمت سے زندگی حاصل نہیں کرتا، تجھے اس کی آیات سے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں کہ اس کی سورۂ یٰسین سے مرنے میں آسانی ہوتی ہے۔''

خطبۂ تبوک میں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

- ((وَ خَيْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِ مُهَا، وَ شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَا تُهَا))

''اور سب سے بہتر کام وہ ہے جو مستقل مزاجی سے سرانجام دیا جائے اور سب سے بدتر کام بدعات ہیں۔''

نیک اعمال میں استقلال اور دوام کو سراہا گیا ہے اور اس میں بھی قرآن وسنت کی اتباع کو پسند کیا گیا ہے، اعتدال اور میانہ روی اسلامی تعلیمات کا زریں اصول ہے، اور ﴿خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا﴾ ''یعنی بہترین کام وہ ہیں جنہیں اعتدال کے ساتھ سرانجام دیا جائے۔'' آپ غور کیجیے

کہ اگر پانچ وقت مساجد میں نماز کے لیے بلایا گیا ہے تو نماز سے فراغت کے بعد رزق حلال کی تلاش کو بھی ضروری قرار دیا گیا:

﴿فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ .... فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (الجمعة:٦٢/٩-١٠)

”(مومنو!) جمعہ کے دن نماز کی اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو (لگن اور تڑپ سے جاؤ) اور خرید و فروخت چھوڑ دو.......... پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق حلال) تلاش کرو۔“

اس آیت میں اگرچہ نماز جمعہ کا ذکر ہے مگر یہی حکم صبح و شام کی پانچ نمازوں کے لیے ہے، اس لیے موذن ہر نماز کے لیے ﴿حَیَّ عَلیٰ الصَّلوٰة﴾ کی پکار لگاتا ہے، حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا ہوتا ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِیهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ﴾ (النور:٢٤/٣٧)

”(اللہ کے یہ بندے ایسے ہیں) کہ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور اقامتِ صلوٰۃ سے نہیں روکتی۔“

رب کریم نے اپنے بندوں کے لیے جو احکام نازل فرمائے ہیں وہ بڑے معتدل اور متوازن ہیں، مثلاً آپ غور کیجئے کہ دن بھر انسان محنت و مزدوری کرتا ہے اور شام کو تھکا ہارا گھر آتا ہے تو رات کو آرام کے لیے بنا دیا:

﴿وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ○ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾ (النباء:٧٨/١٠-١١)

”اور رات کو ہم نے (آرام کے لیے) پردہ بنایا اور دن کو ہم نے وقتِ روزگار بنایا۔“

سال میں ایک ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھے گئے جس سے نہ صرف روحانی تربیت کا سروسامان ہوتا ہے بلکہ جسمانی طور پر بھی اس کے ثمرات مرتب ہوتے ہیں اور اس میں بھی بیمار اور مسافر کو رخصت دی گئی کہ وہ سہولت میسر ہونے پر روزوں کی گنتی پوری کرے تا کہ اس کے اجر میں کسی طرح کی کمی نہ رہ جائے۔

حج بھی ان لوگوں پر فرض کیا گیا جنہیں صحت کے علاوہ سفر خرچ برداشت کرنے کی قوت ہو، اس سفر سے بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کو بے پناہ روحانی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اسی طرح ’’زکوٰۃ‘‘ بھی ان لوگوں پر فرض کی گئی جو’’صاحبِ نصاب‘‘ ہوں اور وہ بھی امیروں سے لے کر غریبوں کو لوٹا دی جاتی ہے تاکہ معاشرتی زندگی کو صاف ستھرا بنا کر اسے معاشی ناہمواریوں سے محفوظ رکھا جائے۔

اس ساری گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات اعتدال پر مبنی ہیں اور انہیں مستقل مزاجی سے سرانجام دینے ہی میں خیر و برکت ہے۔ان احادیث مبارکہ پر غور کیجیے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

((وَكَانَ اَحَبُّ الدِّيْنِ اِلَيْهِ مَا دَاوَمَ صَاحِبُهُ عَلَيْهِ))

(رياض الصالحين، باب فی المحافظة على الاعمال)

’’یعنی اللہ تعالیٰ کو وہی عبادت اور عمل محبوب ہے جس پر عمل کرنے والا ہمیشہ قائم رہے۔‘‘

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے یہ نصیحت فرمائی:

((يَا عَبْدَ اللّٰهِ لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ كَانَ يَقُوْمُ الَّيْلَ فَتَرَكَ قِيَامَ الَّيْلِ))

(متفق عليه، رياض الصالحين، حواله ايضاً)

’’عبداللہ! تم اس شخص کی طرح نہ ہونا جو رات کو عبادت کیا کرتا تھا پھر اسے چھوڑ دیا۔‘‘

بسا اوقات انسان کی تہجد کے لیے آنکھ نہیں کھلتی تو اس کے لیے ثواب حاصل کرنے کی یہ خوشخبری بھی ہے۔

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهٖ مِنَ الَّيْلِ أَوْ عَنْ شَىْءٍ مِنْهُ فَقَرَأَهُ مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَ صَلَاةِ الظُّهْرِ كُتِبَ لَهٗ كَاَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ الَّيْلِ)) (مسلم، رياض الصالحين، حواله ايضاً)

’’جو شخص تہجد سے پہلے سو جائے (تھکاوٹ سے اس کی آنکھ لگ جائے) پھر وہ (فوت

شدہ نماز) صبح اور ظہر کے درمیان پڑھ لے تو اس کو ویسا ہی ثواب ملے گا گویا کہ رات ہی کو پڑھی (سبحان اللہ! کیا ہی آسان دین ہے جہاں ہر طرف اجر وثواب کی بشارتیں ہیں)''

تہجد کی نماز پڑھنا آپ کا معمول تھا اور اللہ تعالیٰ کا حکم بھی تھا:

﴿وَ مِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/۷۹)

''(اے نبی!) رات کو تہجد پڑھیے، یہ آپ کے لیے نفل ہے (رفع الدرجات کا باعث ہے)۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو اٹھ اٹھ کر رب کے حضور قیام وسجود میں رہتے کہ پاؤں مبارک میں ورم آ جاتے، بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں عرض کرتی کہ آپ اپنی عبادت میں کمی کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف فرما دیے ہیں تو فرماتے ''اَفَلَا اَکُوۡنَ عَبۡدًا شَکُوۡرًا'' کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی درد یا تکلیف کی وجہ سے تہجد چھوڑ دیتے تو صبح کو بارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ (مسلم، بحوالہ ریاض الصالحین)

یہی وہ دوامِ عبادت ہے جس کی طرف رب کریم نے حکم دیا ہے:

﴿وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ﴾ (الحجر:۱۵/۹۹)

''(اے نبی!) اپنے رب کی بندگی کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے تشریف لے جائیں۔''

اسلام نے اعتدال کی پسندیدہ راہ پر ڈالا ہے اور اس 'امت' کو بھی ﴿اُمَّۃً وَّسَطًا﴾ بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا﴾ (البقرہ:۲/۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ''امتِ وسط'' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''امت وسط سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا ہو اور ناحق ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

اور روز قیامت شہادت سے مراد یہ ہے ''کہ آخرت میں جب پوری نوع انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اس وقت اللہ تعالیٰ کے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے رسول ﷺ تم پر گواہی دیں گے کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے انہیں دی تھی، وہ اس نے تم کو (امتِ مسلمہ کو) بے کم و کاست پوری کی، پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا، اس کے بعد رسولؐ کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسان پر گواہ بنا کر اٹھنا ہو گا اور یہ شہادت دینی ہو گی کہ رسولؐ نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا، وہ تم نے انہیں پہنچانے میں اور جو کچھ رسولؐ نے تمہیں عمل کر کے دکھایا تھا وہ تم نے انہیں عمل کر کے دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔''

(ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی)

جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے میدانِ تبوک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا اپنی فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

- ((وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَا تُهَا))

''اور سب سے بدتر کام بدعات ہیں۔''

بدعت کیا ہے؟ امام راغبؒ اصفہانی لکھتے ہیں:

﴿وَالْبِدْعَةُ فِی الْمَذْهَبِ اِيْرادُ قَوْلٍ لَمْ يَسْتَنَّ قَائِلُهَا وَ فَاعِلُهَا فِيْهِ بِصَاحِبِ الشَّرِيْعَةِ وَأَمَائِلِهَا الْمُتَقَدِّمَةِ وَ أُصُوْلِهَا الْمُتَقَنَةِ وَ رُوِیَ: كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَ كُلُّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ﴾ (مفردات القرآن)

یعنی مذہب میں نئی بات داخل کرنا جس کا قائل یا فاعل (کہنے والا اور عمل کرنے والا)

صاحبِ شریعت (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی اقتداء نہ کرے اور نہ سلف صالحین اور اصولِ شریعت ہی سے اس کا ثبوت ملتا ہو، ایک روایت ہے کہ (دین میں) ہر نئی بات نکالنا بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام آگ ہے۔''

بدعت کیونکر پیدا ہوتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مخلوقات میں سب سے افضل بنایا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (التین:٩٥/٤)

''(رب کریم کا ارشاد ہے) ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل:١٧/٧٠)

''ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں (طرح طرح کی) سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔''

انسان کی برتری دوسری مخلوقات پر علم کی وجہ سے بھی ہے:

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرہ:٢/٣١)

''اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام علوم سے بہرہ ور فرمایا۔''

فہم و بصیرت سے بھی یہ نوازا گیا تا کہ کھرے اور کھوٹے میں فرق کر سکے۔

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا﴾ (الشمس:٩١/٨)

''پھر اسے خیر اور شر کا شعور عطا کر دیا (تا کہ وہ نیکی کو اپنائے اور بدی سے اجتناب کرے)۔''

مزید رہنمائی اور رہبری کے لیے لوگوں میں سے اچھے لوگوں کا انتخاب فرمایا جن پاکبازوں کی زندگیاں دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بنیں۔ انہیں ہدایت اور روشنی سے نوازا گیا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ

بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:۵۷/۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔''

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

اس مختصر سے فقرے میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا پورا لب لباب بیان کر دیا گیا ہے، دنیا میں اللہ کے جتنے بھی رسول اس کی طرف سے آئے وہ سب تین چیزیں لے کر آئے تھے۔

۱) بینات: یعنی کھلی کھلی نشانیاں، روشن دلائل اور واضح ہدایات

۲) کتاب: جس میں وہ ساری تعلیمات لکھ دی گئی تھیں جو انسان کی ہدایت کے لیے درکار تھیں تاکہ لوگ رہنمائی کے لیے اس کی طرف رجوع کر سکیں، (کتاب کے ساتھ صاحب کتاب، یعنی رسول کی سیرت اس کتاب کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہوتی ہے اور اُس کی زندگی احکام الٰہی کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے، تاکہ وہ لوگوں کے لیے نمونہ بنے)

۳) میزان: یعنی وہ معیارِ حق و باطل جو ٹھیک ٹھیک ترازو کی طرح تول تول کر یہ بتا دے کہ افکار، اخلاق اور معاملات میں افراط و تفریط کی مختلف انتہاؤں کے درمیان انصاف کی بات کیا ہے۔'' (ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی)

انسان کو رب کائنات نے اس قدر عزت و عظمت سے نوازا، فہم و بصیرت سے آراستہ کیا، عقل و خرد کی دولت عطا کی انبیائے کرام کی زندگیوں کو نمونہ ٹھہرایا، پھر یہ راہ حق سے کیوں بہکتا اور بھٹکتا ہے؟ اس کی وجہ قرآن کے مطالعہ سے یوں سامنے آتی ہے ۔

۱-خواہشاتِ نفس کا شکار ہونا:

انسان جب عقل و بصیرت اور ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال دے اور خواہشاتِ نفس کا شکار ہو جائے تو وہ راہ حق سے بھٹک کر بدعتوں میں مبتلا ہو جاتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (الجاثیہ:۴۵/۲۳)

''کیا آپ نے اسے بھی دیکھا؟ جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور باوجود سمجھ بوجھ کے اللہ نے اسے گمراہ کر دیا (علم سے غلط فائدہ اٹھایا) اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر بھی پردہ ڈال دیا ہے (اس لیے کہ وہ ان حواس سے کام نہیں لیتا) اب ایسے شخص کو اللہ کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے؟''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوَاهُ﴾ پس وہ اسی کو اچھا سمجھتا ہے جس کو اس کا نفس اچھا اور اس کو برا سمجھتا ہے جس کو اس کا نفس بُرا قرار دیتا ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مقابلے میں اپنی نفسانی خواہشِ کو ترجیح دیتا یا اپنی عقل کو اہمیت دیتا ہے، حالانکہ عقل بھی ماحول سے متاثر یا مفادات کی اسیر ہو کر خواہش نفس کی طرح غلط فیصلہ کر سکتی ہے۔'' (احسن البیان)

﴿وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ﴾ یعنی وہ بلوغ علم اور قیامِ حجت کے باوجود، وہ گمراہی ہی کا راستہ اختیار کرتا ہے، جیسے بہت سے پندارِ علم میں مبتلا گمراہ اہل علم کا حال ہے، ہوتے وہ گمراہ ہیں، موقف ان کا بے بنیاد ہوتا ہے، لیکن ''ہم چومَا دیگرے نیست'' کے گھمنڈ میں وہ اپنے 'دلائل' کو ایسا سمجھتے ہیں گویا آسمان سے تارے توڑ لائے ہیں اور یوں ''علم و فہم'' رکھنے کے باوجود وہ گمراہ ہی نہیں ہوتے، دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر فخر کرتے ہیں، نُعوذ باللّٰہِ مِنْ ھٰذَا الْعِلْمِ الضَّالِ وَ الْفَھْمِ السَّقِیْمِ وَالْعقلِ الزَّائِغِ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی پناہ میں رکھے ایسے گمراہ کن اور ناقص علم سے، نارسا اور بیمار بصیرت سے اور ٹیڑھی اور ادھوری عقل سے۔ آمین! (حوالہ ایضاً)

معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ حق بات کو پہچانتے ہوئے اس پر پردہ ڈالتے ہیں، قرآن حکیم اس حقیقت کو اس طرح واشگاف کرتا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۴۶)

''جنہیں ہم نے کتاب دی ہے (یعنی یہود) وہ اسے ایسے پہچانتے ہیں جیسے کوئی اپنے بچوں کو پہچانے اور ان کی ایک جماعت حق کو پہچان کر چھپاتی ہے اور وہ اسے خوب جانتی ہے۔''

ان لوگوں کی ڈھٹائی اور دلیری کا حال یہ ہے کہ اللہ کے کلام میں اپنی مرضی اور خواہش سے تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (النساء:٤/٤٦)

''ان میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو (کلام الٰہی میں ان کے) محل سے پھیر دیتے ہیں (کبھی الفاظ بدلتے ہیں اور کبھی مفہوم اپنی مرضی سے بنا لیتے ہیں)''

ان میں حلال وحرام کی تمیز اٹھ گئی ہے، سچ اور جھوٹ کا فرق رخصت ہو گیا ہے:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ للسُّحْتِ﴾ (المائدہ:٥/٤٢)

''بہت زیادہ جھوٹ سننا (اور کہنا) اور بہت زیادہ حرام مال کھانا ان کی عادت ہے۔''

ان لوگوں کی گری ہوئی حرکات کے باوجود اسلام کی بلند اور عظیم تعلیمات کا اندازہ لگایے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کے پاس کسی بات میں فیصلہ کرانے آئیں تو 'عدل' کو پیش نظر رکھیے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (المائدہ:٥/٤٢)

''اگر آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو پھر ٹھیک انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

لوگوں سے مال ہتھیانے کے لیے مسائل کو بدلنا اور بدعات کو رواج دینا ان کا شیوہ رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:٩/٣٤)

''ان اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل

طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔"

ایسے علمائے سوء اور درویش ہر دور میں رہے ہیں جو لوگوں کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں اور بدعات کو فروغ دیتے ہیں۔

اس آیت پر حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

"أَحبار، حِبرُ' کی جمع ہے، یہ ایسے شخص کو کہا جاتا ہے، جو بات کو خوبصورت طریقے سے پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو، خوبصورت اور منقش کپڑے کو 'ثَوبٌ مُحَبَّرٌ" کہا جاتا ہے، مراد علماء یہود ہیں "رُہبان" راہب کی جمع ہے جو رہبہ سے مشتق ہے، اس سے مراد علمائے نصاریٰ ہیں، بعض کے نزدیک یہ صوفیائے نصاریٰ ہیں۔ علماء کے لیے ان کے ہاں "قِسّیسین" کا لفظ ہے، یہ دونوں ایک تو کلام اللہ میں تحریف وتغیر کر کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق مسئلے بتاتے اور یوں لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ دوسرے اس طرح لوگوں سے مال اینٹھتے ہیں جو ان کے لیے باطل اور حرام تھا، بد قسمتی سے بعض علماء مسلمین کا بھی یہی حال ہے اور یوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کا مصداق ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ)) (صحیح بخاری، کتاب الاعتصام)

"تم پچھلی امتوں کے طور طریقوں کی ضرور پیروی کرو گے۔" (احسن البیان)

یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ "کتاب اللہ، یعنی قرآن حکیم کی حفاظت کا رب کریم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انتظام فرما دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹/۱۵)

"ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔"

یہ آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے، چونکہ یہ کتاب آپ ﷺ پر نازل ہوئی اور آپ ﷺ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی حفاظت کا سروسامان فرما دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سچی ہدایت انسانوں کے لیے کسی دور میں بھی منقطع نہیں ہوئی۔

چنانچہ تواتر سے اسے حفظ کرنے پر ہزاروں لوگ موجود ہیں۔ اس کے معنی و مطالب پر غور کرنے کے لیے ''علمائے حق'' کا ایک طبقہ ہر دور میں موجود رہا ہے، دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں، ہر نسل اور ہر زبان میں اس کی تعلیمات کا انتظام ہے۔ الحمدللہ!!

جس طرح قرآن حکیم کی تعلیمات محفوظ ہیں، اسی طرح سیرت طیبہ کی حفاظت کا اہتمام بھی ہر دور میں موجود رہا ہے، اگر مفسرین کی جماعت موجود رہی ہے جو قرآن سے موتیوں کو چن کر اس کی روشنی پھیلاتی رہی ہے تو سیرت نگار حضرات بھی اس خدمت پر مامور رہے ہیں جو سیرت طیبہ کے پھولوں کو چن کر ان کی خوشبو بکھیرتے رہے ہیں۔

بدعت کی راہ اس طرح ہموار ہوتی ہے

جب لوگ اللہ کی کتاب اور رسولﷺ کے نقش قدم کو چھوڑ کر خود غرض علماء اور درویشوں کی باتوں پر چل پڑیں تو سیدھا راستہ گم ہو جاتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم نے اہل کتاب کا مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے، ایک جگہ اس طرح فرمایا:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:۹/۳۱)

''(اہل کتاب نے) اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا۔''

عدیؓ بن حاتم (جو پہلے عیسائی تھے اور فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے) رسول اللہﷺ کی خدمت میں آئے اور پوچھنے لگے کہ ہم تو (اپنے علماء اور درویشوں کی) عبادت نہیں کرتے تھے تو آپﷺ نے فرمایا:

((أَلَيْسَ يُحَرِّمُوْنَ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ، فيُحَرِّمُونَهٗ، وَ يُحِلُّوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ، فَيَسْتَحِلُّوْنَه))

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ یہ لوگ حرام قرار دیتے جبکہ وہ چیز اللہ نے حلال ٹھہرائی، تم اسے حرام ہی سمجھتے اور جو کچھ وہ حلال قرار دیتے، جبکہ اللہ نے اسے حرام ٹھہرایا تو تم لوگ حلال سمجھتے۔''

عدیؓ عرض کرنے لگے، ہاں! یہ تو صحیح ہے۔

آپﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ذٰلِكَ عِبادَتُهُمْ))

''یہی ان کی بندگی تھی۔''

اصل بات تو خواہشات سے بچنا اورحق بات کی اتباع کرنا ہے کہ بدعات سے محفوظ رہا جا سکے۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ﴾ (یونس:۱۰/۳۲)

''پھرحق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟''

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''خیال رہے کہ خطاب عام لوگوں سے ہے اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ تم کدھر پھرے جاتے ہو؟ بلکہ یہ ہے کہ تم ''کدھر پھرائے جا رہے ہو'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایسا گمراہ کن شخص یا گروہ موجود ہے جو لوگوں کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ پر پھیر رہا ہے، اسی بنا پر لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنمائی کرنے والوں کے پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو؟ اپنی گرہ کی عقل سے کام لے کر سوچتے کیوں نہیں کہ جب حقیقت یہ ہے تو آخر تم کو کدھر چلایا جا رہا ہے۔'' (مختصر حواشی)

آپ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر میدان تبوک میں حکمت و بصیرت سے لبریز خطبہ میں ارشاد فرمایا:

- ((وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا))

''اور سب سے بدتر کام بدعات ہیں۔''

گزشتہ سطور میں بدعت کی تعریف کی گئی اور بتایا گیا کہ ''بدعات'' کیونکر جنم لیتی ہیں۔اس میں سب سے پہلی بات خواہشاتِ نفس ہیں، دوسرا بڑا سبب بدعات کو رواج دینے میں شیطان اور اس کے ساتھیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

''شیطان''

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''الشیطٰن'' اس میں نون اصلی ہے اور یہ ''شَطَنَ'' سے مشتق ہے، جس کے معنی دور ہونے کے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''شَطَنَتِ الدَّارُ'' گھر کا دور ہونا یا ''غُرْبَۃٌ شُطُوْنٌ'' وطن سے دوری، وغیرہ محاورات اسی سے مشتق ہیں۔ شیطان کو اس وجہ سے یہ نام دیا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی بنا پر اس کی رحمت سے دور ہو گیا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ ۝ وَّ اِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَۃَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ﴾

(الحجر:۱۵/۳۴،۳۵)

''اچھا تو نکل یہاں سے (میری بارگاہ سے) کیونکہ تو مردود ہے اور اب روز جزا تک تجھ پر لعنت ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہے)۔''

اس شیطان کا نام حقیقت میں ابلیس تھا اور یہ جنوں میں سے تھا اور ان کی تخلیق آگ سے ہوئی جبکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خاک سے پیدا فرمایا، انسانوں سے پہلے جنات کو بنایا گیا اور انہیں بھی عبادت کی غرض سے پیدا کیا گیا، جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریٰت:۵۱/۵۶)

''میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔''

گویا کہ اس کائنات میں صرف جنات اور انسان ''مکلّف'' مخلوق ہیں اور یوم جزا وسزا ان کا حساب کتاب ہو گا اور ثواب وعقاب کا سامنا ہو گا اور ''عبادت'' کے معنی صرف صوم وصلوٰۃ تک محدود نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں احکام الٰہی کی پابندی ہے جنہیں اُسوۂ رسول ﷺ کے مطابق ادا کیا جائے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''(جنات و انس کو) میں نے انہیں دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے، میری بندگی تو ان کو اس لیے کرنی چاہیے کہ میں ان کا خالق ہوں، دوسرے کسی نے جب ان کو پیدا نہیں کیا ہے تو اس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ یہ اس کی بندگی

کریں اور ان کے لیے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ ان کا خالق تو ہوں میں اور یہ بندگی کرتے پھریں دوسروں کی۔'' (مختصر حواشی)

ابلیس کس طرح رحمت سے دور ہوا؟

قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت و ریاضت سے یہ فرشتوں کی جماعت میں شامل ہو چکا تھا۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو فرشتوں کو حکم ہوا کہ انسان کی (یعنی سیدنا آدم علیہ السلام) کی عزت و توقیر کریں (سجدہ تعظیمی بجالائیں) فرشتوں نے تو حکم کی تعمیل کی مگر ابلیس غرور و تکبر کا شکار ہو گیا اور اس نے اس حکم سے سرتابی کی، اس طرح نہ صرف اس کی سالہا سال کی عبادت ضائع گئی بلکہ اللہ کی رحمت سے بھی محروم ہو گیا، اس کا ذکر قرآن میں اس طرح آتا ہے:

رب کریم نے فرمایا:

''ہم نے انسان کو سڑی ہوئی کھنکھناتی مٹی (جو خشک ہو کر کھن کھن بولنے لگے) سے پیدا فرمایا ہے اور اس سے پہلے جنوں کو لُو والی آگ سے پیدا فرمایا ہے، اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ ''میں سڑی ہوئی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا (عزت بجالانا) چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا (احترام میں جھک گئے) مگر ابلیس نے ان سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا، رب کریم نے پوچھا ''اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟'' اس نے کہا: ''میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا۔'' رب کریم نے فرمایا: ''اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے اور اب روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہے۔'' اس نے عرض کیا: ''میرے رب! یہ بات ہے تو پھر مجھے، اس روز تک کے لیے مہلت دے جبکہ سب انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے'' فرمایا: ''اچھا، تجھے مہلت ہے اس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے، وہ بولا ''میرے رب! جیسا کہ تو نے مجھے بہکایا، اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے معاصی (گناہوں کو) مزیّن کر کے

سب کو بہکاؤں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو۔" فرمایا "یہ راستہ ہے (اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا راستہ جو انبیائے کرام علیہم السلام کو اس کی طرف سے ملا) جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے، بیشک جو میرے حقیقی بندے ہیں، ان پر تیرا بس نہ چلے گا، تیرا بس تو ان بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا۔ جو تیری پیروی کریں گے اور ان سب کے لیے جہنم کی وعید ہے۔" (ترجمہ آیات سورۃ الحجر:٢٦-٤٣)

ان آیات سے ان حقائق کا پتا چلتا ہے۔

(ا) انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی، لیکن اس کی شکل گوشت پوست اور ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ ہے جس کو رب کریم نے انتہائی خوبی اور خوبصورتی سے سجا دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (التین:٩٥/٤)

"یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل:١٧/٧٠)

"یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔"

غور کیجیے کہ عقل و فہم، غور و فکر، علم و دانش، سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کی نعمت سے انسان ہی کو نوازا گیا ہے۔علم و دانش ہی کی نعمت اُسے فرشتوں سے ممتاز کرتی ہے:

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرہ:٢/٣١)

"اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام علوم سے بہرہ ور فرمایا۔"

ان علوم کے سامنے فرشتے بھی عاجز اور بے بس ہو گئے اور یہ زمین پر رب کائنات کی خلافت قائم کرنے کے علوم تھے، یہ تمام معاشی اور معاشرتی، سیاسی اور تمدنی، اخلاقی اور روحانی ضابطے تھے

جس کی انسان کو معاشرتی زندگی میں ضرورت تھی اور ان کا علم خلافت فی الارض کے لیے ضروری تھا۔
ارشاد فرمایا:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (البقرہ:۲/۳۰)

''میں زمین میں (انسان کو) خلیفہ بنانے والا ہوں (جو پوری طرح اس زمین پر احکام الٰہی کا نفاذ کر سکے)۔''

انسان کی ان تمام تر خوبیوں کے باوجود اس کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے اور مرنے کے بعد اسے دوبارہ اسی مٹی میں جانا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ (طٰہٰ:۲۰/۵۵)

''اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا، اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو (حساب کتاب کے لیے) دوبارہ نکالیں گے۔''

پس انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ عاجزی اور خاکساری سے رب کائنات کی بندگی کا حق ادا کرے، لیکن افسوس کہ انسان کی اکثریت نے اس حق کو فراموش کر دیا، خواہشاتِ نفس اور شیطان کے بہکاوے میں آ گئے:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (الانعام:۶/۹۱)

''اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی قدر کرنا واجب تھی ویسی قدر نہ کی۔''

اس زمین پر انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین نے یقیناً خلافت کا حق ادا کیا، اسی ذمہ داری سے پوری دیانت و امانت سے عہدہ برآ ہوئے، اس لیے انعام یافتہ گروہ یہی ہے اور جس کی پیروی میں کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے اور اسی خواہش کی آرزو نماز کی ہر رکعت میں اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے حضور کرتے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ (الفاتحہ:۱/۶-۷)

''اے اللہ! ہمیں سیدھی اور سچی راہ پر چلا، ان لوگوں کی راہ جن پر آپ نے انعام کیا۔''

اس انعام یافتہ گروہ کا ذکر دوسری جگہ اس طرح آیا:

﴿وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا﴾ (النساء:٤/٦٩)

”جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔“

یہی لوگ دائمی اور ابدی کامیابی سے ہمکنار ہوں گے:

﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾

(المائدہ:٥/١١٩)

”یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہو گیا، وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔“

اسلام اور ایمان کا راستہ، قرآن وسنت کا راستہ ہی کسی شخص کو ہدایت پر مضبوط رکھ سکتا ہے اور وہ بدعات اور گمراہی سے بچ سکتا ہے، اس کے علاوہ تباہی اور ضلالت کی راہیں جو انسان کو راہ حق سے دور لے جاتی ہیں۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام:٦/١٥٣)

”یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے، یہ ہے وہ ہدایت، جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔“

ابووائل سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے ایک دن ایک لکیر کھینچی، پھر فرمایا کہ یہ اللہ کی راہ ہے، پھر اس کے دائیں اور بائیں چند

لکیریں کھینچیں اور فرمایا کہ یہ بھی راستے ہیں۔ ان میں سے ہر راستہ پر ایک ایک شیطان بیٹھا ہوا اپنی طرف دعوت دیتا ہے، پھر آپ ﷺ نے مندرجہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔

(رواہ الامام احمد و حاکم)

جو بندے صراط مستقیم پر ڈٹ جاتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے، شیطان کے حربوں اور حملوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ ''شیطان'' جس کا سرغنہ اور لیڈر ابلیس ہے، اس نے برملا کہا تھا:

﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (الحجر:١٥/٣٩-٤٠)

وہ بولا ''میرے رب! جیسے تو نے مجھے بہکایا، اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکاؤں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو (یعنی تیرے وفادار اور موحد بندے میرے بہکاوے میں نہیں آسکتے)''

شیطان (ابلیس) کو شر اور فساد پھیلانے کی اجازت کیوں ملی؟ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ انسان کا امتحان لیا جائے کہ وہ صحیح راستہ اختیار کرتا ہے یا غلط راہ پر چلتا ہے اور یہ زندگی تو سراسر ابتلاء و آزمائش ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك:٦٧/٢)

''(وہ رب) جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے۔''

مگر غور کیجیے کہ کامیاب زندگی گزارنے کی اس نے تمام راہیں روشن اور آسان بنا دی ہیں۔ انسان کو عقل و شعور کی دولت عطا فرمائی، انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ کتابیں عطا کیں اور ان نفوس قدسیہ کی صاف ستھری زندگیوں کو نمونہ بنایا اور دین کی باتیں بھی ایسی ہیں جن پر چلنا دشوار نہیں آسان ہے اور جو انسان کے جسم و روح دونوں کے لیے مفید ہیں، اس قدر واضح اور روشن ہدایات کو چھوڑ کر وہ خواہشات کا پجاری بن جائے یا شیطان (ابلیس) کے بہکاوے میں آجائے تو یہ اس کا اپنا

قصور ہے۔

ابلیس اور جن:

اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ ابلیس جنوں میں سے تھا اور جنات میں بھی نیک اور بد ہوتے ہیں، جیسا کہ سورۃ ''الجن'' میں ہے:

﴿وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَأُولٰٓئِکَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ○ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَکَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ (الجن:٧٢/١٤-١٥)

''(جنوں نے کہا) ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف ہیں تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا تو انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔''

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''سوال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی رو سے جن تو خود آتشیں مخلوق ہے، پھر جہنم کی آگ سے ان کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی رو سے تو آدمی بھی مٹی سے بنا ہے، پھر اگر اسے مٹی کا ڈھیلہ کھینچ مارا جائے تو اسے چوٹ کیوں لگتی ہے۔''

(مختصر حواشی)

''سورۃ الجن اور سورۃ الاحقاف سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کا قرآن سن کر دعوتِ ایمان کو قبول کر لیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت جن و انس دونوں کی طرف ہے۔

سورۃ الاحقاف میں اس طرح ہے:

''اور یاد کرو، جبکہ ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ ﷺ کی طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں، پس جب (نبی ﷺ کے) پاس پہنچ گئے تو (ایک دوسرے سے) کہنے لگے خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پڑھا جا چکا، تو وہ اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے واپس لوٹ گئے تو کہنے لگے: اے ہماری قوم! ہم نے یقیناً وہ کتاب سنی ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد

نازل کی گئی، جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، جو سچے دین کی اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے (یعنی محمد ﷺ) کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ تو اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا اور جو کوئی اللہ کے داعی (جناب محمد رسول اللہ ﷺ) کی بات نہ مانے، وہ زمین میں کہیں (بھاگ کر اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتا اور نہ اس کے کوئی حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچا لیں، ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔" (الاحقاف:٤٦/٢٩-٣٢)

سورۃ الجن میں اس طرح ہے:

"(اے نبی! ﷺ) کہیے کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے (قرآن) غور سے سنا اور پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے) کہا "ہم نے بڑا عجیب کلام سنا ہے جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں، اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ (الجن:٧٢/١-٢)

"صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مکہ کے قریب "وادی نخلہ" میں پیش آیا، جہاں آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، جنوں کو تجسس تھا کہ آسمان پر بہت زیادہ سختی کر دی گئی ہے اور اب ہمارا وہاں جانا تقریباً ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ کوئی بہت ہی اہم واقعہ رونما ہوا ہے جس کے نتیجے میں ایسا ہوا ہے، چنانچہ مشرق و مغرب کے مختلف اطراف میں جنوں کی ٹولیاں واقعے کا سراغ لگانے کے لیے پھیل گئیں۔ ان میں سے ایک ٹولی نے یہ قرآن سنا اور یہ بات سمجھ لی کہ نبی ﷺ کی بعثت کا یہ واقعہ ہی ہم پر آسمان کی بندش کا سبب ہے اور جنوں کی یہ ٹولی آپ پر ایمان لے آئی اور جا کر اپنی قوم کو بھی خبر دی۔ (مسلم، کتاب الصلوٰۃ، بحوالہ تفسیر احسن البیان) بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کی دعوت پر ان کے ہاں بھی تشریف لے گئے اور انہیں جا کر بھی اللہ کا پیغام سنایا اور متعدد مرتبہ جنوں

کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔" (فتح الباری، بحوالہ احسن البیان)

آپ ﷺ کی لسانِ صدق سے میدان تبوک میں جو آبدار موتی بکھرے ان کا ذکر ہو رہا ہے۔

- ((وَشَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا))

"اور سب سے بدتر کام بدعات ہیں۔"

بات ہو رہی تھی کہ بدعات پھیلانے میں ابلیس (شیطان) کا بھی بڑا دخل ہے، انسان کا یہ شروع دن ہی سے دشمن ہے، چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے دربار سے بوجہ نافرمانی ذلت وخواری سے نکلا، اس لیے اس نے انسانوں کو بھٹکانے کا ارادہ کرلیا اور برملا کہا:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الاعراف:۷/۱۶-۱۸)

"ابلیس بولا (اے رب!) بسبب اس کے (یعنی آدم) آپ نے مجھ کو گمراہ کیا (حالانکہ گمراہ تو اپنے تکبر اور غرور کی بنا پر ہوا) میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لیے (انسانوں کو بہکانے اور بھٹکانے کے لیے) آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا، پھر ان پر حملہ کروں گا، اُن کے آگے سے بھی اور اُن کے پیچھے سے بھی اور اُن کی داہنی جانب سے بھی اور ان کی بائیں جانب سے بھی اور آپ اُن میں اکثر کو شکرگزار نہ پائیں گے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں سے ذلیل وخوار ہو کر نکل جا، جو شخص ان میں سے تیرا کہنا مانے گا، میں ضرور تم سب سے جہنم بھر دوں گا۔

ابلیس کی مکاریاں:

ابلیس نے اپنے ساتھی اور ہمنوا جنوں اور انسانوں میں سے اپنے ساتھ ملا لیے یا ان میں سے ان لوگوں نے اس کا ساتھ دیا جنہوں نے احکام الٰہی کو بھلا دیا اور جو سفلی خواہشات اور فریبِ نفس کا شکار ہوئے، اس طرح یہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اِدھر اُدھر پھیل گئے اور نت نئے حربوں، چکنی چپڑی

باتوں، اوچھی چالوں اور مکروفریب سے لوگوں کو ورغلانا اور بہکانا شروع کر دیا، اس طرح انہوں نے دنیا میں شرک، بت پرستی، فحاشی اور بے حیائی، گمراہی اور بد اخلاقی، رقص وسرود کی محفلوں کو فروغ دیا اس کے ساتھ ساتھ گھروں میں فتنہ وفساد پھیلایا۔ میاں اور بیوی کے جھگڑوں، بھائیوں کے درمیان دشمنیوں اور عداوتوں، والدین اور بچوں میں اختلافات اور نافرمانیوں کو ہوا دی، قبیلوں اور قوموں میں دنگہ وفساد برپا کیا، ملکوں اور ریاستوں کو آپس میں بھڑا دیا اور ان کے درمیان قتل وخوں ریزی کے شعلے بلند کیے۔ حکمرانوں کو ظلم وستم پر اکسایا اور محکوموں کو بغاوت اور سرکشی پر آمادہ کیا۔ حرص وطمع، خود بینی اور خودنمائی، غداری اور دغا بازی، خیانت اور بد دیانتی، کذب و دروغ گوئی ایسے رذائل کو پھیلایا غرضکہ شب و روز ہر بدی اور بے حیائی کو پھیلانے اور اسے دلکش بنا کر پیش کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، ان کے خوشنما جال سے جو انہوں نے پھیلا رکھے ہیں، وہی لوگ بچ پاتے ہیں جو اپنے خالق و مالک اللہ وحدہ لاشریک لہٗ سے لَو لگاتے ہیں، کبھی شیاطین انہیں ورغلانے کی کوشش کریں تو وہ فوراً اپنے رب کی پناہ طلب کرتے ہیں اور محفوظ ہو جاتے ہیں، آیئے! اب قرآن حکیم کی مختلف آیات سے شیطان کے مکروفریب کا جائزہ لیں اور پھر ان سے بچاؤ کی تدابیر پر بھی غور کریں کہ جس سے زندگی کامیابی سے ہمکنار ہو۔

ہدایت سے منہ موڑنا اور شیطان کی پیروی کرنا:

ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَلَوْ لَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الانعام:٦/٤٣)

”سو (ان لوگوں نے جن کو ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے) سزا پہنچی تھی تو انہوں نے عاجزی کیوں نہ اختیار کی؟ لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے خیال میں آراستہ کر دیا۔“

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”قومیں جب اخلاق و کردار کی پستی میں مبتلا ہو کر اپنے دلوں کو زنگ آلود کر لیتی ہیں تو

اس وقت اللہ کے عذاب بھی انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے میں ناکام رہتے ہیں، پھر ان کے ہاتھ طلب مغفرت کے لیے اللہ کے سامنے نہیں اٹھتے، اُن کے دل اُس کی بارگاہ میں نہیں جھکتے اور ان کے رخ اصلاح کی طرف نہیں مڑتے، بلکہ اپنی بداعمالیوں پر تاویلات و توجیہات کے حسین غلاف چڑھا کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتے ہیں، اس آیت میں ایسی ہی قوموں کا وہ کردار بیان کیا گیا ہے جسے شیطان نے ان کے لیے خوبصورت بنا دیا ہوتا ہے۔'' (احسن البیان)

احمق انسان جنات سے پناہ طلب کرتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾

(الجن:٧٢/٦)

''اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

زمانۂ جاہلیت میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ وہ سفر پر کہیں جاتے تو جس وادی میں قیام کرتے، وہاں جنات سے پناہ طلب کرتے، جیسے علاقے کے بڑے آدمی اور رئیس سے پناہ طلب کی جاتی ہے، اسلام نے اس کو ختم کیا اور صرف ایک اللہ سے پناہ طلب کرنے کی تاکید کی۔

یعنی جب جنات نے دیکھا کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں اور ہماری پناہ طلب کرتے ہیں تو ان کی سرکشی اور تکبر میں اضافہ ہو گیا۔'' (احسن البیان)

طاغوت کی پیروی کرانا:

ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ (النساء:٤/٦٠)

ان کتابوں پر جو آپ سے'' (اے نبی!) آپ نے دیکھا تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان

فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت لائے ہیں، اس کتاب پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور

پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا

کی طرف رجوع کریں، حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا (حقیقت یہ

ہے کہ) شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔''

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

﴿اَلطَّا غُ وْتُ﴾ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حدود شکن ہو اور ہر وہ چیز جس کی اللہ کے

''﴿

سوا پرستش کی جائے۔'' (مفردات القرآن)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہاں صریح طور پر طاغوت'' سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا دوسرے

قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اس سے مراد وہ نظامِ عدالت جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ

کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔''

دراصل ایمان لانے کے بعد 'طاغوت' کا برملا انکار ہی انسان کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَ قَ ِدِ ا اسْ تَ مْ سَ كَ بِا لْ عُ رْ وَ ةِ ا لْ وُ ثْقٰى لَا

﴿فَ مَ نْ يَّ كْ فُ رْ بِالطَّا غُ وْ تِ وَ يُؤْ مِ نْۢ بِاللّٰ ِهِ

لَ هَا﴾ (البقرہ:۲/۲۵٦)

ا نْ فِ صَا مَ

''اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا تو اس نے ایک ایسا سہارا تھام

لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اللہ تعالیٰ ایسے ہی اہل ایمان کا سرپرست ہوتا ہے۔''

نیز فرمایا:

وَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْ رِ وَ الَّذِيْنَ كَ فَ رُ وْٓا

اَللّٰ هُ وَ لِيُّ الَّذِ يْنَ اٰ مَ نُوْا يُ خْرِ جُ هُ مْ مِّ

”جو لوگ ایمان لائے ہیں (اور اپنے ایمان کو مضبوط رکھتے ہیں اور عمل کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتے ہیں) ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو (کفر و نفاق کی) تاریکیوں سے (ایمان و اسلام) کی روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی اور مددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں، یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔“

”طاغوت“ کی اطاعت کے زمرہ میں وہ تمام لوگ آتے ہیں جو کہلاتے تو مسلمان ہیں مگر رب چاہی زندگی چھوڑ کر من چاہی زندگی گزارتے ہیں اور وہ حاکم بھی آ جاتے ہیں جو حکومت تو مسلمانوں پر کرتے ہیں مگر قانون اور منشا احکام الٰہی کو چھوڑ کر غیروں کی پیروی کرتے ہیں۔

شیطان برائی اور بے حیائی پھیلاتا ہے:

شیطان اپنے چیلوں سے مل کر ہر برائی اور ہر بے حیائی کو پھیلاتا ہے:

﴿اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

(البقرہ:۲/۱۶۹)

”(شیطان) تمہیں بدی اور فحش کا حکم دیتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔“

لفظ ”اَلسُّوْءِ“ میں ہر قسم کی برائی آ جاتی ہے (شرک و کفر، دھوکہ وفریب مکر اور جھوٹ وغیرہ) اور ”اَلفَحشآ“ سے مراد ایسے برے کام ہیں جو انسان کو قعرِ مذلت میں گرا دیتے ہیں (بدکاری، شراب نوشی وغیرہ)

﴿وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾

”اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت ایسی باتیں کہو، جن کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔“

مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں:

”یعنی اپنی طرف سے نکالی ہوئی چیزوں کو احکامِ الٰہی کی طرح سمجھنے لگو، اس وعید کے تحت

میں صرف کفر ہی کے نہیں بلکہ بدعت کے اقوال بھی آ جاتے ہیں۔“ (تفسیر ماجدی)

معلوم یہ ہوا کہ جو بات اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت میں نہیں وہ اپنی طرف سے بنائی ہوئی یعنی ”بدعت“ ہے، ہر مسلمان کا یہ فرض بنتا ہے کہ قرآن و سنت سے حقیقت کا راستہ معلوم کرے۔ اب جو لوگ اہل ایمان میں بے حیائی پھیلانے کے مرتکب ہوتے ہیں ان کا انجام شیطان اور اس کے ساتھیوں جیسا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النور:۲۴/۱۹)

”جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کے آرزو مند رہتے ہیں، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔“

شیطان انفاق فی سبیل اللہ میں رکاوٹ بنتا ہے:

انفاق فی سبیل اللہ، غربا و مساکین کی خدمت، بیوگان اور یتامیٰ کی مدد کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا ہے، شیطان خرچ کی اس مد میں رکاوٹ بنتا ہے اور وساوس ڈالتا ہے کہ دیکھو تمہارا مال کم ہو جائے گا، ہاں لہو و لعب اور کھیل تماشوں میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مثلاً کوئی شخص اپنے کسی بچے کی شادی پر بے تحاشا چراغاں کر کے اور آتش بازی پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتا ہے اور یہ سب نمود و نمائش کے لیے ہوتا ہے مگر وہ شخص کسی یتیم بچی کی شادی کے لیے تھوڑی سی رقم دینے کو تیار نہیں ہوتا، قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَ اللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلاً وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ (البقرہ:۲/۲۶۸)

”شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے، اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔“

قرآن حکیم میں رب کریم نے کئی مقامات پر نیک کاموں میں خرچ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اور بے جا خرچ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ○ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾

(بنی اسرائیل:۱۷/۲۶-۲۷)

''اور رشتے داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو اور اسراف اور بیجا خرچ سے بچو، بیجا خرچ کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

شیطان نے بت پرستی کو رواج دیا

سورہ نوح میں آتا ہے:

﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا﴾

(نوح: ۷۱/۲۳)

''(قوم نوح کے لوگوں نے کہا) ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑو وَدّ اور سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ قوم نوح کے (فوت شدہ) وہ لوگ تھے جن کی وہ عبادت کرتے تھے اور ان کی اتنی شہرت ہوئی کہ عرب میں بھی ان کی پوجا ہوتی رہی، چنانچہ وَدّ دومۃ الجندل میں قبیلۂ کلب کا، سواع ساحل بحر کے قبیلۂ ہذیل کا، یَغُوث سَبا کے قریب جرف جگہ میں قبیلۂ مراد اور غطیف کا، یَعُوق ہمدان قبیلے کا اور نسر حمیر قوم کے قبیلہ ذوالکلاع کا معبود رہا۔''

(ابن کثیر و فتح القدیر، بحوالہ احسن التفسیر)

''یہ پانچوں قومِ نوح علیہ السلام کے نیک آدمیوں کے نام تھے، جب یہ مر گئے تو شیطان نے ان کے عقیدت مندوں کو کہا کہ اُن کی تصویریں بنا کر تم اپنے گھروں میں اور دکانوں میں رکھ لو تاکہ اُن کی یاد تازہ رہے اور اُن کے تصور سے تم بھی اُن کی طرح نیکیاں کرتے رہو، جب یہ تصویریں بنا

کر رکھنے والے فوت ہو گئے، تو شیطان نے اُن کی نسلوں کو یہ کہہ کر شرک میں ملوث کر دیا کہ تمہارے آبا تو ان کی عبادت کرتے تھے جن کی تصویریں تمہارے گھروں میں لٹک رہی ہیں، چنانچہ انہوں نے اُن کی پوجا شروع کر دی۔" (صحیح بخاری، تفسیر سورۂ نوح، بحوالہ احسن البیان)

ہمارے ہاں جو قبر پرستی ہے وہ بھی شیطان کی مکاریاں اور حیلہ سازیاں ہیں، شیطان کو اس قدر ڈھیل کیوں دی گئی ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ انسان کی ساری زندگی امتحان ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ وہ کامیابی کا راستہ اختیار کرتا ہے یا ناکامی کا جبکہ رب کریم نے اُسے عقل وشعور کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔

علوم سے بہرہ ور فرمایا اور وحی الٰہی سے اسے صحیح راہ دکھا دی جبکہ انبیائے کرام کی سیرت کو قدوہ اور نمونہ ٹھہرایا یہ اس کی بڑی ہی بدنصیبی ہو گی کہ روشن اور واضح شاہراہ کو چھوڑ کر قعر مذلت میں گرے۔

غزوہ تبوک کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو قیمتی نصائح ارشاد فرمائیں، اس میں سے:

- ((وَشَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا)) (صحیح بخاری)

"یعنی سب سے بدتر کام بدعات ہیں۔"

اس پر گزشتہ صفحات میں گفتگو کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ بدعات کو پھیلانے میں شیطان (ابلیس) اور اس کے ساتھیوں کا بڑا ہاتھ ہے، قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر جہاں شیطان کے مکروفریب کو بیان کیا گیا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ان سے بچاؤ اور حفاظت کا راستہ بھی سمجھا دیا گیا ہے۔

دراصل شیطان (ابلیس) اور انسان کے درمیان دشمنی شروع دن ہی سے قائم ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ شیطان اور انسان دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، شیطان نے تکبر اور غرور کا راستہ اختیار کیا جبکہ سیدنا آدم علیہ السلام نے عجز و خاکساری کو اپنایا اور اللہ تعالیٰ کو عاجزی اور خاکساری ہی پسند ہے، شیطان (ابلیس) نے جنوں اور انسانوں میں جو اپنے ہمنوا اور ساتھی بنائے انہوں نے اس زمین میں شر اور فساد پھیلانے شروع کیے جبکہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے نیکیوں اور بھلائیوں کو

فروغ دیا، ایسا کیوں ہوا؟ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی ہے اور اس میں آزمائش اور امتحان بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی جنت اس امتحان میں کامیاب ہونے والوں کے لیے ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کون حق وصداقت کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون شر اور بدی کے راستے پر چل پڑتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ (الدهر:۷۶/۳)

''ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔''

حافظ صلاح الدین یوسف حفظ اللہ لکھتے ہیں:

''(نیکی اور بدی کو پہچاننے کی قوتوں اور صلاحیتوں کے علاوہ) اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام، اپنی کتابوں اور داعیانِ حق کے ذریعے سے صحیح راستے کو بیان اور واضح کر دیا ہے، اب یہ اس کی مرضی ہے کہ اطاعتِ الٰہی کا راستہ اختیار کر کے شکر گزار بندہ بن جائے یا معصیت کا راستہ اختیار کر کے اس کا ناشکرا بن جائے۔ جیسے ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوا فبائِعٌ نَفْسَهُ فَمُوْبِقُهَا اَوْ مُعْتِقُهَا))

''ہر شخص صبح اس حال میں کرتا ہے کہ وہ اپنے نفس کی خرید وفروخت کر رہا ہوتا ہے، پس اسے (خواہشاتِ نفس یا شیطان کے راستے پر چل کر) ہلاک کر لیتا ہے یا (نیکی اور ہدایتِ الٰہی کا راستہ اختیار کر کے) اسے آزاد کر لیتا ہے۔''

(صحیح مسلم، کتاب الطهاره، بحواله احسن البیان)

ایک اور مقام پر فوز وفلاح کے راستے کو اختصار اور جامع الفاظ میں اس طرح بیان کیا گیا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (الشمس:۹۱/۹-۱۰)

''جس نے اس (نفس) کا تزکیہ کیا یقیناً وہ فلاح پا گیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے خاک میں ملا دیا۔''

'تزکیہ' سے مراد نفس کو شرک وکفر، گناہ اور معصیت سے صاف کر کے، ایمان اور اسلام، اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری سے آراستہ کرنا ہے۔

''دسّی، بُدَسِّی'' کے معنی چھپانے اور خاک میں ملانے کے ہیں یعنی جس نے راہِ حق کو چھپا کر اپنے آپ کو معصیت اور کفر کی راہ سے آلودہ کر لیا۔ حق اور باطل، اسلام اور کفر کی آویزش روزِ اول ہی سے رہی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا اِمروز　　چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

حزب اللہ ہمیشہ کامیاب و کامران، غالب اور فتح یاب ہوئے جبکہ حزب الشیطان ناکام و نامراد، مغلوب و مقہور رہے، حزب اللہ کون لوگ ہیں؟ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَ مَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾

(المائدہ:۵/۵۶)

''جو اللہ اور اسکے رسولؐ اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے، وہ یقین مانے کہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔''

اور حزب الشیطان اور ان کی پسپائی کا ذکر اس طرح آتا ہے:

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰھُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (المجادلہ ۵۸:۱۹)

''ان پر (خواہشات نفس کے پجاریوں) شیطان نے غلبہ حاصل کر لیا ہے اور انہیں اللہ کا ذکر بھلا دیا ہے، (احکامِ الٰہی سے غافل کر دیا ہے) یہ شیطانی لشکر ہے، کوئی شک نہیں کہ شیطانی لشکر خسارے والا ہے۔''

آخرت میں تو سراسر ان کی تباہی و بربادی ہے اور دنیا میں بھی بارہا ایسا ہوا ہے کہ اہل ایمان کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو اہل کفر کی بڑی بڑی جماعتوں پر اللہ نے غالب کیا ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ (البقرہ:۲/۲۴۹)

''بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اِذن سے ایک کثیر گروہ پر غالب آ گیا ہے۔''

پھر رب کائنات کا یہ کتنا بڑا انعام ہے کہ اس نے نیکی کی قیمت اور اس کا پلڑا وزنی رکھا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا﴾ (الانعام:٦/١٦٠)

''جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس کا دس گنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا۔''

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہمت مضبوط رکھتا ہے:

بدرِ صغرٰی کے موقع پر شیطان نے اپنے چیلے چانٹوں کے ذریعے مسلمانوں میں یہ خبر مشہور کر دی:

''کہ کافروں نے تمہارے مقابلے پر لشکر جمع کر لیے ہیں، تم ان سے خوف کھاؤ، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے'' آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے اور انہیں کوئی برائی نہ پہنچی، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی پیروی کی، یہ خبر دینے والا صرف شیطان ہی ہے، جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے (اس کے دوست تو کفار ہیں) تم ان کافروں سے نہ ڈرو اور میرا خوف رکھو، اگر تم مومن ہو۔'' (آل عمران:٣/١٧٣-١٧٥)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یعنی جب وہ تمہیں (کفار کے خوف سے ڈرائے) تو تم صرف اور صرف اللہ ہی پر بھروسا رکھو اور اسی ہی کی طرف رجوع کرو، وہ تمہارے لیے کافی ہے اور تمہارا حافظ و ناصر ہے، جیسا کہ سورۂ الزمر میں ارشاد ہوا:

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ (الزمر٣٩:٣٦)

''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟''

اگرچہ اس آیتِ مبارکہ میں نبی ﷺ کو بشارت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں تمام مومنوں کو تسلی اور تسکین ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی رحمت شامل حال ہو تو شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَ اِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (آل عمران:۳/ ۱۶۱)

''اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔''

اس آیتِ مبارکہ کی روشنی میں یہ بات بالیقین کہی جا سکتی ہے کہ اگر دنیا بھر کے کفار اور شیاطین مع اپنے سازو سامان کے اکٹھے ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد سے اہل ایمان کو شکست نہیں دے سکتے ہیں۔

اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے پابند ہوں، ان کی صفوں میں پوری طرح اتحاد ہو۔ اس لیے قرآن حکیم نے مسلمانوں کو خبردار کر دیا تھا:

﴿وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُکُمْ﴾ (الانفال:۸/ ۴۶)

''اور (دیکھو) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

غور کیجیے، تو قرآن حکیم کی مضبوط اور شفاف تعلیمات سے روگردانی ہی آج مسلمانوں کی ذلت اور رسوائی کا باعث ہے، جبکہ ہمارے اسلاف اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر عزت و عظمت سے ہمکنار ہوئے ہیں ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

شیاطین کے حملے کن لوگوں پر کارگر ہوتے ہیں:

ارشاد ہوتا ہے:

﴿هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ○ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ○ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ﴾ (الشعراء:٢٦/٢٢١-٢٢٣)

''لوگو! کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں، وہ ہر ایک جھوٹے، گنہگار پر اترتے ہیں جو سنی سنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں، ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔''

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

''اس سے قبل کی آیات میں یہ بیان ہو رہا تھا کہ قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کی تنزیل شیاطین کے بس کا روگ نہیں اور یہ بات ناممکنات سے ہے کہ وہ اُس جیسی ایک آیت بھی لا سکیں، اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ شیطان کیسی چیز اُتارتے ہیں اور کیسے لوگوں پر اترتے ہیں، شیطان صرف جھوٹوں بدمعاشوں اور بدکاروں پر اترتے ہیں، وہ دیانتدار، راست باز اور نیک لوگوں سے بیزار ہوتے ہیں۔ (اگر وہ انہیں پریشان کریں بھی تو نیک لوگ اللہ کی رحمت سے ان کے حیلوں سے بچ نکلتے ہیں) اور انہیں برا جانتے ہیں، وہ جھوٹے اور دغا باز قسم کے لوگوں پر خوش ہوتے ہیں اور یہی لوگ اُن کی مرضی کے موافق ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگ شیاطین کے اِلقاء (وساوس) کے مطابق کہانت کا کاروبار چلاتے ہیں اور ان سے مراد کاہن، جوتشی، فال نکالنے والے، رمّال، جفّار اور عامل قسم کے لوگ ہیں جو (جھوٹی) غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے، لچھے دار باتیں بناتے اور لوگوں کو اُن کی قسمتیں بتاتے پھرتے ہیں (اور جاہل ان کے فریب میں آ جاتے ہیں)۔'' (تسیر القرآن)

فضول خرچ

صدقہ و خیرات کرنا، غربا و مساکین کی خدمت کرنا، بیواؤں اور یتامیٰ کی مدد کرنا یقیناً نیکی کے کام ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جاتی ہے، اس کی بجائے شیطان لوگوں کو لہو ولعب میں جیسا کہ آتش بازی، پتنگ بازی وغیرہ پر خرچ کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾

(بنی اسرائیل:۱۷/۲۷)

''اور فضول خرچ تو شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

ذکر سے منہ موڑنا:

احکامِ الٰہی کو فراموش کر دینا اور اللہ کے ذکر سے منہ موڑنا شیطان کے حملوں کا باعث ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴾ (الزخرف:۴۳/۳۶)

''اور جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق (دوست) بن جاتا ہے۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''وہ شیطان، اللہ کی یاد سے غافل رہنے والے کا ساتھی بن جاتا ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور نیکیوں سے روکتا ہے یا انسان خود اسی شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے اور اس سے جدا نہیں ہوتا (گویا انسان اور شیطان ہم دم اور ہم راز بن جاتے ہیں) بلکہ تمام معاملات میں اسی کی پیروی ہو اور اس کے تمام وسوسوں سے اس کی اطاعت کرتا ہے۔''

(احسن البیان)

حماقت کی انتہا کیا ہے؟

یہ حماقت کی انتہا ہے کہ انسان غلطی پر ہو اور اپنے آپ کو درست اور حق بجانب خیال کرتا رہے، شیاطین کا یہی سب سے بڑا حربہ ہوتا ہے کہ وہ ہر برائی اور بے حیائی کو پھیلاتے ہیں اور ہر قسم کی بدعات اور خرافات کی نشر و اشاعت کرتے ہیں اور لوگوں کے فکر و خیال میں یہ بات بٹھاتے ہیں کہ تم درست ہو۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ (الزخرف:۴۳/۳۷)

”یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ پر سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔“

”یعنی وہ شیطان ان کے حق کے راستے کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور اس سے انہیں روکتے ہیں اور انہیں برابر سمجھاتے رہتے ہیں کہ تم حق پر ہو، حتیٰ کہ وہ واقعی اپنے بارے میں یہی گمان کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں یا کفار ان شیاطین کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہیں اور ان کی اطاعت کرتے رہتے ہیں۔“

(احسن التفاسیر)

دل کا اندھا پن سب سے بُرا ہے:

انسان کی ظاہری آنکھیں روشن ہوں مگر دل کی روشنی غائب ہو جائے یعنی بصارت موجود ہو اور وہ بصیرت سے محروم ہو جائے تو یہ بہت بڑی محرومی ہے:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾

(الحج: ٢٢/٤٦)

”کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں ہیں کہ اُن کے دل سمجھنے والے یا اُن کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔“

روزِ جزا و سزا بصارت بھی جاتی رہے گی:

اللہ تعالیٰ نے یہ بصارت پڑھنے لکھنے اور تدبّر و تفکّر سے کام لینے کے لیے عطا فرمائی ہے، اگر انسان اس نعمت کا ٹھیک ٹھیک فائدہ نہ اٹھائے تو روزِ قیامت یہ بھی جاتی رہے گی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ○ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ (طٰهٰ: ٢٠/١٢٤-١٢٦)

''اور (ہاں) جو میری یاد (احکام) سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی تنگی میں رہے گی (وہ اضطراب اور پریشانی میں رہے گا) اور ہم اُسے روزِ قیامت اندھا کر کے اٹھائیں گے، وہ کہے گا کہ الٰہی! مجھے تو نے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھتا بھالتا تھا، (جواب ملے گا) اسی طرح ہونا چاہیے تھا، تو میری آئی ہوئی آیات کو بھول گیا (نہ تو نے انفس و آفاق پر غور و فکر کیا اور نہ میرے احکام و ہدایات ہی کو مانا) تو آج تو بھی بھلا دیا گیا (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا)۔''

شیاطین سے بچاؤ کی تدابیر، رزق حلال:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ ہدایت میں جگہ جگہ قیمتی باتیں ارشاد فرمائی ہیں جنہیں اختیار کرنے سے انسان پاکیزہ زندگی گزار کر اس کا پسندیدہ بندہ بن سکتا ہے اور دین و دنیا کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوسکتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ (البقرۃ:۲/۱۶۸)

''لوگو! زمین میں جتنی بھی حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں، انہیں کھاؤ پیو اور شیطانی راہ پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

یعنی شیطان کے پیچھے لگ کر حلال کردہ چیز کو حرام مت کرو (اور نہ حرام کردہ اشیا کو حلال ٹھہراؤ) جس طرح مشرکین نے کیا کہ اپنے بتوں کے نام وقف کردہ جانوروں کو وہ حرام کر لیتے تھے، جس کی تفصیل سورۃ الانعام میں ہے، حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں نے اپنے بندوں کو حنیف پیدا کیا ہے، پس شیطانوں نے ان کو ان کے دین سے گمراہ کر دیا اور جو چیزیں میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں وہ انہوں نے اُن پر حرام کر دیں۔'' (صحیح مسلم، بحوالہ احسن البیان)

کھانے سے متعلق اس نے کتنی عمدہ ہدایت ارشاد فرمائی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۷۲)

''اے ایمان والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں، انہیں کھاؤ، پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر کیا کرو۔''

اس آیتِ مبارکہ میں خطاب مومنوں سے ہے کہ وہ اپنی روز مرہ زندگی میں پاکیزہ اور حلال چیزیں استعمال کیا کریں، کھانے کمانے کے ذرائع بھی جائز ہوں اور فی نفسہ وہ چیز بھی حلال ہو مثلاً محنت سے کمائی ہوئی حق حلال کی روزی ہو، رشوت اور حرام مال سے نہ ہو، پانی حلال ہے تو شراب حرام ہے، اس طرح عبادت و ریاضت میں حلاوت پیدا ہوگی اور ذہن وفکر پاکیزہ رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی توفیق نصیب ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح رب کریم کے حضور دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اكْفِنِیْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَ اَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ))

(ترمذی، بحوالہ اسلامی وظائف، عبدالسلام بستوی)

''اے اللہ! میرے لیے (رزق حلال) میں کفایت فرما اور حرام سے بچا اور اپنے فضل و کرم سے بہرہ ور فرما اور دوسروں سے بے نیاز کر دے۔''

میدان تبوک میں آپ ﷺ کا خطاب:

آپ ﷺ نے غزوہ تبوک کے موقع پر میدانِ تبوک میں حکمت کے جو موتی بکھیرے وہ یقیناً امت کے لیے روشنی کا سامان ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

- ((وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا))

''اور سب سے بدتر کام بدعات ہیں۔''

بدعات کو پھیلانے میں شیاطین کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ انسانوں کو بہکانے اور ورغلانے میں نت نئے حربے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان میں برائیوں اور بے حیائیوں کو پھیلاتے ہیں، حلال وحرام کی تمیز اٹھا دیتے ہیں، مکر وفریب کے جال بچھاتے ہیں اور آج کل تو بم دھماکے کراتے پھرتے ہیں جن

سے بے گناہ انسان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، مگر جو لوگ احکامِ الٰہی پر سنت نبویؐ کے مطابق مضبوطی سے عمل پیرا ہو جاتے ہیں اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کے متلاشی رہتے ہیں وہ شیاطین کو ناکام و نامراد کر کے انہیں شکست دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو ہدایت و رہنمائی سے ہمکنار رکھتا ہے۔

شیاطین سے بچاؤ کی تدابیر:

ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی لَا انۡفِصَامَ لَہَا وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ○ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ﴾ (البقرہ:۲/۲۵۶-۲۵۷)

''اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرے (ہر کفر و شرک، خواہشات نفس، بدعات اور شیاطین کا راستہ چھوڑ دے) اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اُس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے جو لوگ (صدقِ دل اور خلوص سے) ایمان لاتے ہیں، اُن کا حامی اور مددگار اللہ ہے، وہ اُن کو (کفر و شرک) کی تاریکیوں سے (ایمان و اسلام) کی روشنی میں نکال لاتا ہے۔''

بلکہ اس سے عظیم تر خوشخبری سے ہمکنار کرتا ہے دنیا اور آخرت کی کامیابی اور شادمانی کی اس سے بڑی خوشخبری کیا ہو گی؟ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ہُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ وَ کَانَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَحِیۡمًا ○ تَحِیَّتُہُمۡ یَوۡمَ یَلۡقَوۡنَہٗ سَلٰمٌ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ اَجۡرًا کَرِیۡمًا﴾

(الاحزاب:۳۳/۴۳-۴۴)

''وہی (مہربان رب) تو ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے، وہ مومنوں پر

بہت مہربان ہے جس روز وہ اس سے ملیں گے، ان کا استقبال سلام سے ہوگا اور اُن کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر فراہم کر رکھا ہے۔'' (اللہ اکبر!)

رزقِ حرام سے پرہیز

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ﴾ (الانعام:٦/١٢١)

''اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا، اُس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے، شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک واعتراضات ڈالتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں، اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی (شکوک وشبہات کو قبول کرلیا) تو یقیناً تم مشرک ہو۔''

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''شیطان نے اپنے ساتھیوں کے ذریعے سے یہ بات پھیلائی کہ یہ مسلمان اللہ کے ذبح کیے ہوئے (یعنی مردہ) کو تو حرام اور اپنے ہاتھ سے ذبح شدہ کو حلال قرار دیتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کو ماننے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیطان اور اُس کے دوستوں کے وسوسوں کے پیچھے مت لگو، جو جانور مردہ ہے یعنی بغیر ذبح کیے مر گیا، اُس پر چونکہ اللہ کا نام نہیں لیا گیا (اور نہ ہی شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا) اس لیے اس کا کھانا حلال نہیں (البتہ سمندری اور دریائی میتہ یعنی مچھلی حلال ہے)'' (احسن البیان)

مندرجہ بالا آیتِ کریمہ کے حکم میں وہ تمام جانور آ جاتے ہیں جو اگرچہ حلال ہیں (جیسا کہ بکرا، دنبہ وغیرہ) لیکن انہیں شرعی طریقہ سے ذبح نہیں کیا جاتا بلکہ مشینوں سے ان کی گردنیں کاٹی جاتی ہیں، جیسا کہ اکثر یورپی ممالک میں ہوتا ہے اور وہ جانور بھی آ جاتے ہیں جو اگرچہ حلال اور جائز ہیں مگر انہیں بتوں اور خاص لوگوں کے نام پر ذبح کیا جاتا ہے، ''سورۃ نوح'' وڈ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر وہ لوگ تھے جو فوت ہو چکے تھے اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر انہوں نے

اندھی عقیدت سے ان کے مجسمے تیا پوکھا پاٹ شروع کر دی اور ان کے نام پر جانور بھی ذبح کرنے لگے۔

رزقِ طیب

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے صرف رزقِ طیب کو پسند فرمایا ہے۔ ایسا رزق جو محنت و مشقت کے ساتھ حق حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو اور کھانے پینے کے لیے بھی صرف وہ اشیاء ہوں جنہیں شریعت اسلامیہ نے جائز قرار دیا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ خوراک کے جسم کی نشو ونما پر اثرات مرتّب ہوتے ہیں، پاکیزہ خوراک سے جسم میں صالح خون پیدا ہوتا ہے اور اس سے دل و دماغ بھی مصفّٰی رہتا ہے اور اعمالِ صالحہ کی توفیق ملتی ہے جبکہ فاسد اور حرام خوراک افکار و خیالات کو بھی متاثر کرتی ہے اور اعمالِ صالحہ سے محرومی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے رب کریم نے اپنے رسولوں کو حکم دیا:

﴿ یٰاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ﴾ (المومنون:۲۳/۵۱)

”اے رسولوں کی جماعت! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو۔“

رسولوں کی اطاعت کرنے والے مومنوں کو بھی اس حکم سے نوازا گیا:

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَ اشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ (البقرہ:۲/۱۷۲)

”اے ایمان والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں (بے تکلف) کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔“

ان آیات مبارکہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ”طیبات“ کے استعمال ہی سے اعمال صالحہ، عبادت وریاضت، ذکر وشکر کی توفیق ملتی ہے، نیز ”طیبّات“ میں حصولِ رزق کے ذرائع بھی جائز اور حلال ہونے ضروری ہیں۔ رزقِ حرام سے نہ صرف شرفِ انسانیت سے کوئی شخص محروم ہو جاتا ہے بلکہ اس کی دعا اور مناجات بھی ردّ کر دی جاتی ہیں، اس بات کی تائید اس حدیثِ مبارکہ سے ہوتی ہے۔

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ پاک ہے اور

پاکیزہ چیزوں کو ہی قبول فرماتا ہے، اس نے مومنوں کو اسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم اُس نے اپنے رسولوں کو دیا ہے، پھر آپ ﷺ نے مندرجہ بالا آیات (سورۃ المومنون کی آیت ۵۱ اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۲) تلاوت فرمائیں اور ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر پر ہے اور جس کے بال (اس سفر کے سبب پراگندہ اور غبار آلود ہو رہے ہیں (اس حال میں) وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کرتا ہے۔ ''اے میرے رب! اے میرے رب!'' بھلا اس کی دعا کیسے قبول ہو جبکہ اس کا کھانا، پینا اور اوڑھنا، بچھونا حرام کا ہے اور وہ حرام کھا کر ہی پلا بڑھا ہے۔''

(مسلم، کتاب الزکوۃ)

اللہ کے ذکر سے غفلت کا نتیجہ

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ○ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ (الزخرف:۴۳/۳۶-۳۷)

''(رب کریم کا فرمان ہے) جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے، یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے متعدد بار اہل ایمان کو ذکر پر دوام اور استقامت کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ○ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾

(الاحزاب: ۴۲/۳۳)

''اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔''

کہیں ارشاد ہوا کہ دیکھو! مال و اولاد کی فراوانی کہیں تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (المنافقون:۶۳/۹)

''اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں، جو لوگ ایسا کریں، وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔''

ذکر کیسے؟

نماز کو قائم کرنا، قرآن حکیم کی تدبر سے تلاوت کرنا، فریضہ حج کی ادائیگی اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے اس کی یاد اور اُنفس و آفاق میں غور وفکر، سب ذکر کی مختلف صورتیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ﴾ (طٰهٰ:۲۰/۱۴)

''(اے نبی!) میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے، پس تم میری بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿قَدۡ اَنۡزَلَ اللّٰہُ اِلَیۡکُمۡ ذِکۡرًا﴾ (الطلاق:۶۵/۱۰)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف (کتاب) نصیحت اتاری ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

﴿کَلَّاۤ اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ ۞ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ﴾ (عبس:۸۰/۱۱-۱۲)

''دیکھو! یہ (قرآن) نصیحت ہے، جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔''

حج کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ﴾ (البقرہ:۲/۲۰۳)

''اور اللہ تعالیٰ کو ان گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔''

ابرار و صالحین ہر پہلو پر اپنے رب کو یاد کرتے ہیں اور اُنفس و آفاق پر بھی غور وفکر کرتے ہیں:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۞ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ

النَّارِ﴾ (آل عمران:۳/۱۹۰-۱۹۱)

''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور شب و روز کے باری باری سے آنے میں (جو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر غور کرتے ہیں) ان ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمانوں کی ساخت پر غور وفکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! یہ سب کچھ آپ نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ آپ پاک ہیں، (اس سے کہ بیکار کوئی چیز بنائیں) پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالیں۔''

یہ ''ذکر'' بندۂ مومن کو ہمیشہ رب کریم کی حفاظت میں لے آتا ہے اور یہ اتنی بڑی خوشخبری ہے کہ دنیا کی ساری دھن دولت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرہ:۲/۱۵۲)

''اے بندو! تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔''

سبحان اللہ! بھلا جسے وہ مہربان آقا یاد رکھے، کیا وہ کبھی ضائع ہوسکتا ہے، دنیا اور آخرت کی کامرانیاں اُسی کے لیے ہیں۔

اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ:

ربِ کریم کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (البقرہ:۲/۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

اسلام کا مادہ ''س ل م'' ہے جس کے معنی آفات وغیرہ سے محفوظ رہنے اور سلامتی میں آنے کے ہیں اور اسلام کے معنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں، گویا اسلام یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کی فرمانبرداری سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق کی جائے تو یقیناً ایسا مطیع و فرمانبردار شخص (یعنی مسلم) امن

اور سلامتی میں آ جاتا ہے اور وہ شیطان کے حملوں سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اس آیت مبارکہ میں اہل ایمان کو کہا جا رہا ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اس طرح نہ کرو کہ جو باتیں تمہاری مصلحتوں اور خواہشات کے مطابق ہوں، ان پر تو عمل کر لو اور دوسرے حکموں کو نظر انداز کر دو، اس طرح جو دین تم چھوڑ آئے ہو (یعنی اپنے آبا و اجداد کا دین) اس کی باتیں اسلام میں شامل کرنے کی کوشش مت کرو، بلکہ صرف اسلام کو مکمل طور پر اپناؤ (یاد رکھو!) اس دین میں بدعات کی بھی نفی کر دی گئی اور آج کل کے ''سیکولر'' ذہن کی تردید بھی، جو اسلام کو مکمل طور پر اپنانے کے لیے تیار نہیں بلکہ دین کو عبادات یعنی مساجد تک محدود کرنا اور سیاست اور ایوانِ حکومت سے دیس نکالا دینا چاہتا ہے۔ اسی طرح عوام کو بھی سمجھایا جا رہا ہے جو رسوم و رواج اور علاقائی ثقافت و روایات کو پسند کرتے ہیں اور انہیں چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے جیسے مرگ اور شادی بیاہ کی مسرفانہ اور ہندوانہ رسوم اور دیگر رواج اور یہ کہا جا رہا ہے کہ شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، جو تمہیں مذکورہ خلافِ اسلام باتوں کے لیے حسین فلسفے تراش کر پیش کرتا اور برائیوں پر خوش نما غلاف چڑھاتا اور بدعات کو بھی نیکی باور کراتا ہے تاکہ اس کے دامِ ہم رنگ زمیں میں پھنسے رہو۔'' (احسن البیان)

آخر میں شیاطین سے بچنے کے لیے قرآنی دعا لکھی جاتی ہے:

﴿رَبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ﴾

''اے رب! میں شیاطین کے وسوسوں سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور اے رب! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔''

آپ ﷺ غزوۂ تبوک کے موقع پر میدان تبوک میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قیمتی نصائح ارشاد فرمائیں، اُس میں سے یہ بھی تھا:

- ((وَأَحْسَنُ الْهَدْیِ هَدْیُ الْاَنْبِیَاءِ))

''اور سب سے بہتر راہ انبیاء علیہم السلام کی راہ ہے۔'' (جامع الاحادیث، جلال الدین سیوطی:480/1)

یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں، جنہوں نے رب العالمین کا پیغام لوگوں تک پہنچایا، جو سیدنا آدم علیہ السلام سے خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ تک دعوتِ توحید کا پیغام لے کر تشریف لائے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ﴾

(النحل:١٦/٣٦)

''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔''

ہمارے لیے یہ سارے رسول واجب الاحترام ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ یہ سب سچے تھے، نیز:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ ۫ وَ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ﴾ (اٰل عمران:٣/٨٤)

''ہم اِن رسولوں کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان (مسلم) ہیں۔''

البتہ اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی، قرآن اس کا ذکر کرتا ہے:

﴿تِلۡکَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ﴾ (البقرہ:٢/٢٥٣)

''یہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔''

اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ سیّد الانبیاء ہیں اور آپ کی رسالت نسلِ انسانیت کے لیے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا﴾ (سبا:٣٤/٢٨)

''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو نسل انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔'' ؎

سالارِ کارواں ہے، میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی، آرامِ جاں ہمارا

لیکن آسمانِ نبوت کے یہ سب جگمگاتے ستارے ہیں اور سب کے سب واجب التعظیم ہیں اور ان کا راستہ سیدھا اور سچا ہے، اس لیے رب کریم نے ان کے راستے کو پسند فرمایا ہے اور ہمیں دعا سکھا دی ہے:

﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۞ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ﴾

''(اے اللہ!) ہمیں صراط مستقیم پر چلا، ان لوگوں کی راہ پر چلا جن پر آپ نے فضل فرمایا ہے۔''

یہ انعام یافتہ کون لوگ ہیں؟ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيۡقِيۡنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيۡنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا﴾ (النساء:٤/٦٩)

''اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین پر اور رفیق ہونے کے لحاظ سے یہ لوگ کتنے اچھے ہیں۔''

- ((وَاَشۡرَفُ الۡمَوۡتِ قَتۡلُ الشُّهَدَاءِ)) (مصنف ابن ابی شیبة:٨/١٦٢)

''اور سب سے بہتر موت شہداء کی ہے۔''

قرآن حکیم اعلان کرتا ہے:

﴿وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ يُّقۡتَلُ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ بَلۡ اَحۡيَآءٌ وَّ لٰكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ﴾

(البقرہ:٢/١٥٤)

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔''

شہداء کو مردہ نہ کہنا ان کے اعزاز و تکریم کے لیے ہے۔ یہ زندگی برزخ کی زندگی ہے، جسے ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔

- ((وَأَعۡمَى الۡعُمۡيِ الضَّلَالَةُ بَعۡدَ الۡهُدٰى)) (دلائل النبوة، امام بیهقی:٥/٣١٩)

''اور اندھوں کا اندھا وہ شخص ہے جو ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہو جائے۔''

ہدایت ایمان اور اسلام کی روشنی ہے جبکہ اندھا پن کفر اور ضلالت کا اندھیرا اور اندھوں کا اندھا وہ شخص ہے جو ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہو جائے اور دنیا میں راہِ حق سے منہ موڑنا خسارے کا باعث ہے، جس کا نقصان دنیا اور آخرت دونوں میں ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِيۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّ نَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى

﴿ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰی وَ قَدْ کُنْتُ بَصِیْرًا ○ قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتْکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَ کَذٰلِکَ الْیَوْمَ تُنْسٰی﴾ (طٰہٰ:۲۰/۱۲۴-۱۲۶)

''اور جو شخص میرے نظام نصیحت و ہدایت (یعنی قرآن حکیم کے دستورِ زندگی) سے روگردانی کرے گا، نہ صرف اس کی دنیاوی زندگی تنگی (اور اضطراب و بے چینی) میں گزرے گی بلکہ روزِ جزا و سزا بھی ہم اسے اندھا اٹھائیں گے، وہ کہے گا: اے میرے رب! مجھے تو نے نابینا کیوں اٹھایا ہے، میں تو بینا تھا؟'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ یونہی ہونا چاہیے تھا، تمہارے پاس ہماری آیاتِ بیّنات آئیں، تو نے ان سے تغافل برتا (اور پروا نہ کی) اسی طرح آج تجھ سے بھی وہی سلوک کیا جائے گا (تجھے فراموش کر دیا جائے گا)۔''

یہ بات مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ آج مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا سبب کیا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا بھی برباد اور آخرت بھی خسارے میں، جیسا کہ قرآن نے بیان فرمایا:

﴿خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةَ ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ﴾ (الحج:۲۲/۱۱)

''اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی، یہ ہے صریح خسارہ۔''

- ((وَخَیْرُ الْاَعْمَالِ مَا نَفَعَ)) (المقاصد الحسنة، امام سخاوی:۱/۱۱۰)

''اور بہترین اعمال میں سے وہ عمل ہے جو نفع دے۔''

ظاہر ہے کہ یہ وہ عمل وہی ہو سکتا ہے جو خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو اور سنت نبوی کے مطابق ہو، ایسا عمل جس میں ریاکاری نہ ہو، نفاق کی بو نہ ہو، جو حسد و بغض اور شرک و کفر سے بری ہو، ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ (الکهف:۱۸/۱۱۰)

''پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو (اور اس سے جزا کی تمنا رکھتا ہو) اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے (جو قرآن و سنت نبوی کے مطابق ہو) اور بندگی میں اپنے رب

کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔''

یہ زندگی اور اس کا ہر ہر عمل صرف اور صرف رضائے مولا کے لیے ہونا چاہیے۔ جیسا کہ قرآن مجید نے کہلوایا ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ (الانعام:۶/۱۶۲-۱۶۳)

''(اے نبی!) کہہ دیجیے میرا پورا نظامِ عبادت، میری قربانی و حج میری حیات و ممات اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس کی ربوبیتِ کبریٰ تمام جہانوں پر مُحیط ہے (اور وہ سب کے حال سے واقف ہے) اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے (کہ خالص اسی کی عبادت کروں اور اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کروں) اور میں سب سے پہلے اسی کا فرمانبردار ہوں۔''

- ((وَخَیْرُ الْهُدٰی مَا اتُّبِعَ)) (مصنف ابن ابی شیبه:۸/۱۶۲)

''اور بہترین ہدی (طریقہ) وہ ہے جس کا اتباع کیا جائے۔''

بھلا رسول اللہ ﷺ سے بہتر کس کا طریقہ ہوسکتا ہے؟ اور آپ کے اتباع ہی میں فوز و فلاح ہے۔

اس لیے آپ ﷺ اپنے ہر خطبہ مبارکہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے:

((وَخَیْرُ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ صَلی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم))

آپ ﷺ کی اتباع ہی سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا حصول ممکن ہے اور اس کی رضامندی اور بخشش کی خوشخبری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (آل عمران:۳/۳۱)

''(اے رسول!) لوگوں سے کہہ دیجیے، اگر تم اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم بھرتے ہو تو (میرے اسوۂ حیات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالو) تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے اور وہ تمہارے

گناہ معاف کر دے گا اور اللہ تو بڑا ہی معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

- ((وَشَرُّ الْعَمٰی عَمَی الْقَلْبِ))

"اور بدترین اندھا پن دل کا کور ہونا ہے۔"

حقیقت میں جس کا دل اندھا ہو جائے، وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے، بصارت رکھنے کے باوجود جو بصیرت کو ضائع کر دے وہ بڑا ہی بدقسمت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَ لٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾

(الحج:٢٢/٤٦)

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں (کہ انفس و آفاق میں اس ربِ قدیر کی قدرت کے نشانات بکھرے پڑے ہیں) کہ اُن کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔"

- ((وَالْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی)) (صحیح بخاری: کتاب الزکوۃ)

"اور اونچا ہاتھ (صدقہ و خیرات کرنے والا) نیچے والے ہاتھ (صدقہ و خیرات لینے والے) سے بہتر ہوتا ہے۔"

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت و اہمیت کے متعلق قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ کو پڑھ جایئے اور پھر سیرتِ طیبہ کے واقعات، صحابۂ کرام اور صلحائے امت کی سخاوت اور دریا دلی پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات انتہائی کشادہ اور فراخ ہے، اسی جذبۂ سخاوت سے انہیں دنیا میں عزت اور سربلندی نصیب ہوئی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اجرِ عظیم کا مستحق بنایا، ایسا بھی ہوا کہ فقر و فاقہ، تنگدستی اور غربت کے باوجود انہوں نے دوسروں کی خدمت کی۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے:

﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الحشر:٥٩/٩)

''یہ (صحابۂ کرامؓ) اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں اور (حقیقت یہ ہے کہ) جو حرص و ہوائے نفسانی سے بچا لیے گئے، وہی کامیاب و بامراد ہیں۔''

ان لوگوں نے ہمیشہ عزتِ نفس کو بلند رکھا اور خودداری کو اپنایا ؎

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''جود وسخا آپ ﷺ کی فطرت تھی، ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان کے مہینے میں آپ ﷺ اور زیادہ سخاوت کرتے تھے، تمام عمر کسی کے سوال پر 'نہیں' کا لفظ نہیں فرمایا۔

آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((اِنّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّ خَازِنٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ)) (سیرت النبیؐ جلد دوم)

''میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا اللہ ہے۔''

- ((مَا قَلَّ وَ کَفٰی خَیْرٌ مِّمَّا کَثُرَ وَ اَلْھٰی)) (مصنف ابن ابی شیبہ:۸۲/۷)

''جو چیز کم ہو مگر کافی ہو، وہ اس سے بہتر ہے جو ہو تو زیادہ مگر غافل کرنے والی ہو۔''

حق حلال کا رزق جو محنت اور دیانتداری سے کمایا جائے اگرچہ تھوڑا ہو پھر بھی وہ خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے کھانے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جسم کے رگ و ریشہ میں طہارت پیدا ہوتی ہے اور دل و دماغ پاکیزہ رہتے ہیں اور عبادت و ریاضت میں سرور پیدا ہوتا ہے اور وہ اس رزق سے کہیں بہتر ہوتا ہے جو اگرچہ وافر ہو مگر اُسے دھوکا فریب سے حاصل کیا گیا ہو۔ اس سے دل کا سکون چھن جاتا ہے، راہِ حق سے غفلت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں نہ ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ شرفِ قبولیت کا درجہ ہی حاصل کرتی ہے۔ قرآنِ حکیم کی اخلاقی تعلیمات میں اہل ایمان کو تاکید کی جا

رہی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ﴾ (النساء:۲۹/۴)

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔''

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمان داری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے، چار لفظوں میں ختم کر دیا ہے یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے، غصب کرے، چوری کرے یا اس میں خیانت کرے، رشوت لے، سود کھائے غرض جس ناجائز طریقہ سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔'' (سیرت النبی ج ششم)

- ((وَ شَرُّ الۡمَعۡذِرَةِ حِیۡنَ یَحۡضُرُ الۡمَوۡتُ)) (جامع الاحادیث، امام سیوطی:۱۳۰/۳۷)

''اور بدترین معذرت (توبہ) موت کے وقت کی معذرت ہے۔''

موت کی کیفیت اور حالت کا کسی شخص کو قطعی علم نہیں ہے۔

ہوائی جہاز چٹانوں سے ٹکڑا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں اور انسانی جانیں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں، ریلوے ٹرینیں اور بسیں تصادم کا شکار ہو جاتی ہیں اور آناً فاناً کچھ لوگ وہیں ختم ہو جاتے ہیں، کچھ ہسپتالوں میں دم توڑ دیتے ہیں، بحری جہاز اپنے سازوسامان اور مسافروں سمیت غرق ہو جاتے ہیں اور توبہ کا موقع ہی نہیں ملتا ۔

کلبۂ اِفلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قُلزُمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے؟ ایک طوقِ گلو افشار ہے

اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور اس کا وقت صحت اور تندرستی

کی حالت ہے جس میں ذرا بھی تاخیر نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾ (التحریم:٦٦/٨)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو (ایسی توبہ) جو خلوصِ دل سے ہو۔''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا﴾ (النساء:٤/١٧)

''ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی گناہ کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد (انہیں اس بات کا احساس ہو جاتا ہے) اور وہ جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجّہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔''

اور جو لوگ ڈھٹائی کے ساتھ گناہ کیے جاتے ہیں۔ ان کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے:

﴿وَ لَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ وَ لَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَ ھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا﴾ (النساء:٤/١٨)

''مگر توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں جو برے کام کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے اس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی اور اسی طرح توبہ اُن لوگوں کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں، ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔''

آپ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر میدانِ تبوک میں قیمتی ارشادات فرمائے، اُن میں یہ بھی تھے:

- ((وَشَرُّ النَّدَامَۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ)) (جامع الاحادیث، امام سیوطی:٢٧/١٣٠)

''اور بدترین شرمندگی وہ ہے جو روزِ قیامت ہوگی۔''

اپنی پڑی ہوگی، دنیا میں انسان جن میدانِ محشر میں نفسا نفسی کا عالم ہچانیں گے، قریب ترین عزیز و
گے اور اسے بدترین شرمندگی کا اقارِب بھی ایک دوسرے کے کام نہ آ سکیں گے، سب کو اپنی
خطاؤں اور گناہوں پر پردہ ڈالتا تھا وہ سب کے سامنے آ جائیں

سامنا کرنا پڑے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

ہِ ○ وَ صَاحِبَتِہٖ وَ بَنِیْہِ ○ لِکُلِّ امْرِیٍٔ

فِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ ○ وَ اُمِّہٖ وَ اَبِیْہِ

﴿ یَوْمَ یَ

یٍذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ﴾ (عبس:۸۰/۳۴-۳۷)

مِّنْهُمْ یَوْمَئِ

''(اس روز) انسان اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے
بھاگے گا، ان میں سے ہر شخص پر اُس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اُسے اپنے سوا کسی کا
ہوش نہ ہوگا۔''

پھر ارشاد ہوا:

فَمَا لَہٗ مِنْ قُوَّۃٍ وَّلَا نَاصِرٍ﴾ (الطارق:۸۶/۹-۱۰)

﴿ یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ ○

''جس روز پوشیدہ باتیں جانچی جائیں گی (نماز اس وقت لائیں) انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی
زور ہوگا اور نہ کوئی مددگار ہوگا۔ (عقلِ تعلیم وکثرتِ تقاضا) عبادات کا مقصد انسان کی اصلاح دنیا سے آگہی اور
شعور کا بیدار کرنا ہے۔ نماز پابندی وقت اور باقاعدگی کے ساتھ ادا کرنے سے
رب کا تعلق مضبوط ہوتا ہے ((الرحمٰن تعالیٰ ...)) (مصنف ابن ابی شیبہ:۸/۱۶۲)

((اِنَّ الْمُصَلِّیْ یُنَاجِیْ رَبَّہٗ)) (مصنف عبدالرزاق:۲/۴۹۸)

''نمازی کو اپنے رب سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔''

وہ آقا و مولا سے مغفرت و ہدایت کا طلبگار رہتا ہے۔ نمازوں میں قرآن حکیم کی تلاوت سے

احکامِ الٰہی سے آگاہی رہتی ہے، امام کی اقتدا میں نمازیں ادا کرنے سے زندگی میں نظم وضبط پیدا ہوتا ہے، مسلمانوں کی صف بندی سے اتحاد واتفاق کے جذبات پرورش پاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شامل ہونے کا احساس اُجاگر رہتا ہے، جمعہ کی نماز میں خطیب حضرات کے خطبات سے، وعظ ونصیحت اور قرآن وسنت کی تعلیمات سے روح کو غذا مہیا ہوتی ہے جو ایسی ہی ضروری ہے جس طرح جسم کے لیے آب ودانہ کی اہمیت ہے۔ رب کریم کا حکم ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (الجمعة:۶۲/۹)

''اے ایمان والو! جب بروز جمعہ تمہیں نماز کے لیے اذان دی جائے تو ذوق وشوق سے ذکرِ الٰہی کی طرف لپکو اور خرید وفروخت چھوڑ دو اگر تم جمعہ کی اہمیت وفضیلت کا علم رکھتے ہو تو تمہارے لیے یہی بات بہتر ہے۔''

پھر اسلام کی بلند تعلیمات پر غور کیجیے کہ وہ نماز سے فراغت کے بعد رزقِ حلال کی تلاش کو بھی عبادت ہی قرار دیتا ہے اور معاشیات کے شعبہ کو بھی مضبوط بناتا ہے:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (الجمعة:۶۲/۱۰)

''پھر جب نماز ادا ہو چکے تو زمین میں چلو پھرو اور اللہ تعالیٰ کی (مہیا کردہ حق حلال کی) روزی تلاش کرو اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی فرضیت واہمیت پر لوگوں کو اس طرح خطاب فرمایا:

''لوگو! موت آنے سے پہلے اللہ کی طرف لوٹ آؤ، مرنے سے قبل توبہ کر لو، آفات و مصائب کے نزول سے پہلے اعمالِ صالحہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرلو، اللہ کو کثرت سے یاد کر کے اپنے اور اپنے آقا کے درمیان تعلق کو مضبوط بنا لو، صدقہ وخیرات علانیہ اور پوشیدہ بہت زیادہ کیا کرو (بسا اوقات دوسروں کو ترغیب دلانے کے لیے علانیہ صدقہ دیا جاتا ہے، صدقہ علانیہ ہو یا پوشیدہ ہر حال میں اللہ ہی کی رضا حاصل کی جاتی ہے) اس

سے رزق میں برکت ہوتی ہے اور تمہارے دشمن زیر رہتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لوگو! یہ بات اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جمعہ فرض کیا ہے، میری اس جگہ میں، آج کے روز، اس ماہ اور اس سال میں (جب فرضیت کا حکم آ گیا تو آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا) ہاں، ہاں آج کے روز سے لے کر قیامت تک جمعہ فرض رہے گا، جو کوئی میری زندگی میں یا میرے بعد اسے ترک کر دے، امامِ وقت عادل ہو یا ظالم (خواہ کیسا ہو) جو بھی ترک کرے، اسے ہلکا جان کر یا اس سے انکار کرے، (ترکِ جمعہ) کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے سارے کام اس پر پراگندہ کر دے گا۔ اس کے دل کو کبھی اطمینان وسکون نصیب نہ ہوگا اور اس کے معاملات خیر و برکت سے محروم ہو جائیں گے۔

خبردار سن لو! تارکِ جمعہ کی نہ نماز قبول ہے، نہ زکوٰۃ نہ روزہ اور نہ ہی حج اور نہ اللہ تعالیٰ اس کی کوئی نیکی قبول فرمائے گا، جب تک وہ سچے دل سے توبہ نہ کرے (اور نماز جمعہ کو باقاعدگی سے شروع نہ کر دے) اور سچے دل سے توبہ کرنے والے کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے۔'' (ابن ماجہ، بحوالہ الصلوٰۃ نور، تالیف میاں محمد حنیف)

جمعہ کے آداب:

''حدیث شریف میں آیا ہے جو شخص جمعہ کے دن غسل کر کے صاف ستھرے کپڑے پہن کر خوشبو وغیرہ لگا کر جمعہ کی نماز کے لیے حاضر ہوتا ہے اور کسی کی گردن نہیں پھلانگتا یعنی جہاں جگہ ملے بیٹھ جاتا ہے، پھر جو مقدور ہو نفل ادا کرتا ہے، پھر جب امام خطبہ کے لیے کھڑا ہو تو خاموشی سے سنتا ہے تو اس کے اس جمعہ اور اس سے پچھلے جمعہ کے دن کے درمیانی وقفہ کے گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔'' (حوالہ ایضاً)

جمعہ میں دیر سے آنا:

جناب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں کچھ لوگ دیر سے جمعہ کی نماز میں شامل ہوتے تھے اور اب تو لوگوں کا معمول بن گیا ہے کہ آخری وقت میں شامل ہوتے

ہیں، نہ صرف وہ اجر وثواب میں پیچھے رہ جاتے ہیں بلکہ قرآن وسنت کی قیمتی ہدایات سے بھی محروم ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس غفلت سے بچائے۔آمین!

- ((وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّا يَذۡكُرُ اللّٰهَ اِلَّا هُجۡرًا)) (حلیة الاولیاء، ابو نعیم الاصبهانی:۱/۱۳۸)

''بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو کبھی کبھی یاد کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی یاد مومنوں کے لیے روح کی غذا، کامیابی کا راستہ، زندگی کی تاریکیوں میں روشنی کا سامان، شیاطین سے بچاؤ کا مضبوط ترین نسخہ اور دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کا توشہ ہے اور اہلِ ایمان کو حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کریں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِيۡرًا ۝ وَّ سَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّ اَصِيۡلًا﴾

(الاحزاب:۳۳/۴۱-۴۲)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔''

اور اہلِ دانش و بینش اور ابرار و صالحین کی عادت یہ ہے:

﴿ اَلَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ﴾ (ال عمران:۳/۱۹۱)

''جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے گویا کہ ہر حال اور (ہر پہلو) میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔''

ان کے دلوں کا اطمینان مال و دولت میں نہیں بلکہ اللہ کی یاد میں ہوتا ہے:

﴿اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُهُمۡ بِذِكۡرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ﴾

(الرعد:۱۳/۲۸)

''وہ لوگ جو ایمان والے ہیں، ان کے دلوں کو یادِ الٰہی سے تسکین ہوتی ہے، اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہی سے طمانیتِ قلب حاصل ہوتی ہے۔''

نمازوں سے غافل رہنا اور بددلی سے نمازیں ادا کرنا، ریاکاری کا شکار ہونا، مختصر وقت میں اللہ کو یاد کرنا تو منافقین کا خاصا ہے، جس کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے:

﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمۡ وَ اِذَا قَامُوۡۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوۡا

كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴿ (النساء:٤/١٤٢)

''یہ منافقین اللہ تعالیٰ سے کیا چال چلیں گے، اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں (درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکا میں ڈال رکھا ہے) جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔''

(اے رب کریم! اس نفاق سے ہمیں بچائیے، ہمارے اندر خشوع وخضوع پیدا کیجیے، نمازوں میں ذوق وشوق بیدار کیجیے اور کثرت سے اپنی یاد کی توفیق عطا فرمائیے، آمین یا رب العالمین)۔

● ((وَمِنْ أَعْظَمِ الْخَطَايَا اللِّسَانُ الْكَذَّابُ)) (دلائل النبوة، امام بيهقى:٥/٣١٠)

''اور جھوٹی زبان تمام خطاؤں سے بڑی خطا ہے۔''

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے بری اور مذموم عادت جھوٹ ہے، یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے، اس لیے یہ برائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کرسکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان سے یا عمل سے ظاہر کرے، اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی ہوں وہ کم ہیں کیونکہ اُس نے اسی آئینہ کو توڑ ڈالا جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس

کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے مگر رحمت الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے جس کا منہ جھوٹ کے بادِ سموم سے جھلس رہا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھۡدِیۡ مَنۡ ھُوَ مُسۡرِفٌ کَذَّابٌ﴾ (المؤمن: ٤٠/٢٨)

''اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب (جھوٹا) ہو۔''

(سیرت النبی ج٦)

کذب (جھوٹ) کی ضد صدق (سچ) ہے۔ ان میں سے پہلی بات کسی معاشرے کی تباہی اور زوال کا سامان ہے اور اس کا نقصان نہ صرف اس دنیا میں ہوتا ہے بلکہ اس کا اخروی انجام بھی برا ہے، جبکہ دوسری بات فلاح و بہبود کی دلیل ہے اور آخرت میں بھی کامیابی کی نوید ہے، اس حدیث مبارکہ پر غور کر لیجیے:

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا: ''سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے، وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا۔'' اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا: ''جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔'' (مسند احمد، بحوالہ سیرت النبی ﷺ)

- ((وَ خَیۡرُ الۡغِنٰی غِنَی النَّفۡسِ))

''اور بہترین تونگری (دولتمندی) تو دل کی تونگری ہے۔''

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہم روز مرّہ زندگی میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، ایک شخص سیم و زر کے انبار رکھتا ہے مگر انقباضِ نفس اور حرص و بخل کا اسیر ہے اور کسی تنگدست اور پریشان حال کو ادنیٰ سی رقم بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہے اور ہمیشہ اپنے مال کو گن گن کر رکھتا ہے، جس کا قرآن ذکر کرتا ہے۔

﴿ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہٗ ﴾ (الھُمزہ:۱۰۴/۲)

”وہ شخص جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا۔“

اور اس کی مثال قارون کی طرح ہے۔ تفصیل کچھ یوں ہے:

”یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک شخص تھا وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا اور اللہ نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی، جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ اس (دولتمندی) پر اتراؤ نہیں، اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جو مال اللہ نے تجھے دیا اُس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کرو (غربا و مساکین، بیوگان اور یتامیٰ کی خدمت کرو) اور دنیا کے مال و اموال میں اپنا حصہ نہ بھولو (ہاں اپنے اہل خانہ پر بھی جائز طور پر خرچ کرو) اور لوگوں پر اس طرح احسان کرو جس طرح تجھ پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ہے۔ (یہ مال و دولت اللہ ہی نے عطا کیا) اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو (یاد رکھو!) اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔ قارون بولا: یہ (سرمایہ) تو میرے اپنے علم و ہنر کا پیدا کردہ ہے۔“

ارشاد ہوا، کیا اسے علم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایسی (اَن گنت) امتوں کو ہلاک کر ڈالا، جو اس سے مالی قوت اور قومی جمعیت میں فزوں تر تھیں اور روزِ محشر مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا (سب اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہیں)۔

ایک روز وہ (قارون) اپنی قوم کے سامنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا، جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے، وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے: ”کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، یہ تو بڑے نصیبے والا ہے“ مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے، وہ کہنے لگے ”افسوس تمہارے حال پر (حقیقت یہ ہے کہ) جو صاحبِ ایمان اور نیکوکار ہے، اس کے لیے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعمالِ صالحہ کا بدلہ اور انعام اس (دنیا کی زندگانی سے) کہیں

زیادہ اچھا ہے، لیکن یہ (نعمتِ عظیم) تو صرف ان لوگوں کو عطا ہوتی ہے جو صبر و توکل علی اللہ کے پیکر ہیں۔ (ارشاد ہوتا ہے) آخر کار ہم نے اسے (قارون) اور اس کے گھر کو (گنجینہ ہائے بے بہا کے ساتھ) زمین میں دھنسا دیا، پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا، اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے، کہنے لگے: ''افسوس ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے، اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا، افسوس ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے۔'' (ترجمہ: القصص۲۸:۷۶-۸۶)

یہ تو انجام اس شخص کا ہے جس کے دولت کے انبار تھے، اس کے برعکس صحابہٗ کرام رضی اللہ عنہم تنگدست ہونے کے باوجود کشادہ دست تھے، بھوک اور فاقہ کی حالت میں بھی غربا و مساکین کی خدمت کو زندگی کی سعادت مندی خیال کرتے تھے۔ قرآن شہادت دیتا ہے:

﴿وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:۵۹/۹)

(یہ نفوسِ قدسیہ) اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔
بلبلِ شیراز نے کیا خوب کہا ہے ؎

تونگری بدل است نہ بمال
بزرگی بعقل است نہ بسال

''اور اللہ تعالیٰ کی جنت ایسے ہی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر میدانِ تبوک میں پر اثر خطاب سے صحابۂ کرامؓ کو نوازا، آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

- ((وَخَيْرُ الزَّادِ التَّقْوٰى))

''اور بہترین توشہ تقویٰ ہے۔''

''اَلتَّقْوٰى'' ڈر، خوف ''تَقْوَى الله'' اللہ تعالیٰ کا خوف یعنی اس کے احکام کی بجا آوری اور

اس کی منع کی ہوئی باتوں سے رک جانا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ذریعہ اُس کی سزا سے بچنا، پرہیز گاری۔ (القاموس الوحید)

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لیے خلش ہو (اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کوئی شخص اس بات کو اختیار کرے جس کا حکم اس کے آقا و مولا نے دیا ہے اور اس بات سے رُک جائے جس سے اس نے منع کیا) یہ 'تقویٰ' ہے پھر اس کام کو رب واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے یہ ''اخلاص'' ہے۔ پھر اس کام کے کرنے میں صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسا رہے۔ یہ 'توکّل' ہے۔ اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں یا نتیجہ مناسبِ حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور اللہ سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے بُرا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہے یہ 'صبر' ہے اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان اور زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ 'شکر' ہے۔'' (سیرت النبیؐ، جلد ۵)

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے:

اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو 'تقویٰ' سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ قرآن حکیم نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں:

﴿ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴾ (البقرہ:۲/۲)

''یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔''

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ﴾

(البقرہ:۲/۲۱)

''اے لوگو! اپنے اس رب کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا عبادت کرو۔ تاکہ تم تقویٰ پاؤ۔''

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز وسامان سے زیادہ تقویٰ ہے۔

﴿تَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَیۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰی﴾ (بقرہ:۲/۱۹۷)

''اور (سفرِ حج) میں زادِ راہ لے کر چلو اور سب سے اچھا زادِ راہ تقویٰ ہے۔''

اور ہماری زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

﴿وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ذٰلِکَ خَیۡرٌ﴾ (الاعراف:۷/۲۶)

''اور تقویٰ کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے (ایسا لباس جسے پہن کر انسان تکبر و غرور سے مبرّا رہے)۔''

آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انہی تقویٰ والوں کا حصہ ہیں۔ ارشاد گرامی ہے:

﴿اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ﴾ (القلم:۶۸/۳۴)

''یقیناً تقویٰ والوں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔''

اہلِ تقوای اللہ کے محبوب بندے ہیں:

یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے حقدار ہیں، جب وہ زندگی کے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے، تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے۔

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (آل عمران:۳/۷۶)

''بلاشبہ اہل تقویٰ ہی اللہ کے محبوب بندے ہیں۔''

معیّت الٰہی سے سرفراز:

اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیّت اور رحمت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے؟ تو متقی لوگوں ہی کے لیے معیّتِ الٰہی ہے:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۹۴)

اعمال کی قبولیت بھی اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے:

ایک کام ہزاروں اغراض اور سینکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف ان ہی کے کاموں کی پیش کش قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنے کام انجام دیتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (المائدہ:۵/۲۷)

''اللہ تعالیٰ تو تقوای والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔''

اس لیے ان ہی کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

تقوای والے کون لوگ ہیں؟

یہ جان لینے کے بعد کہ تقوای ہی اسلام کی تعلیم کی اصل غایت اور وہی ساری اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہلِ تقوای ہی کے لیے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقوای والے کون ہیں؟ قرآن حکیم نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورۂ زمر میں ہے:

﴿وَالَّذِىْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (الزمر:۳۹/۳۳،۳۴)

''اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ ہیں تقویٰ والے، ان کے لیے اُن کے رب کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلہ نیکی کرنے والوں کا (جو ہر وقت جذبۂ احسان سے سرشار رہتے ہیں)۔''

یعنی تقویٰ والا وہ ہے، جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے۔ وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ وعزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورۃ البقرہ میں ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

(البقرہ:۲/۱۷۷)

''نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف (یہ تو نظم ملی کا تقاضا ہے) بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو، یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں جو عہد کرتے ہیں تو ان کا ایفاء کرتے ہیں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو حق کے علمبردار ہیں اور یہی لوگ ہیں جو تقویٰ شعار ہیں۔ (حوالہ ایضاً)

تقوٰی میں اضافہ کیونکر ہوتا ہے؟

جس طرح اچھی خوراک سے جسم کی نشو ونمو ہوتی اور وہ مضبوط اور توانا بنتا ہے، اسی طرح روح کی بالیدگی اور مضبوطی کا بھی رب کریم نے انتظام فرمایا ہے۔قرآن حکیم کی روشنی میں تقوٰی مندرجہ ذیل باتوں سے بڑھتا ہے۔

(ا) راہِ حق کی اتباع

جب کوئی شخص راہِ حق کو صدق دل سے قبول کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے روشنی ملتی ہے اور اس کے تقوٰی میں اضافہ ہوتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًی وَّ اٰتٰهُمۡ تَقۡوٰهُمۡ﴾ (محمد:۱۷/٤۷)

''وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقوٰی عطا فرماتا ہے۔''

(ب) ماہِ صیام کی پابندی

رمضان المبارک میں روزوں کی پابندی ''تقوٰی'' کا باعث ہوتی ہے جبکہ اس فریضہ کو ایمان و احتساب سے ادا کیا جائے، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آدابِ صوم کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کا اجر اس طرح مرتب ہوتا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۸٤)

''اے ایمان والو! تم پر (رمضان کے) روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، توقع ہے کہ تم میں تقوٰی کی صفت پیدا ہو گی۔''

(ج) ایمان اور تقوٰی

ایمان اور تقوٰی لازم وملزوم ہیں۔ایمان تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دل و جان سے رب واحد مان کر اس کے احکام کی تعمیل سنتِ نبویؐ کے مطابق کی جائے، جب زندگی احکام الٰہی کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو اس سے صفتِ تقوٰی میں مضبوطی آتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَلَکُمۡ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ﴾ (ال عمران:۳/۱۷۹)

''اگر تم ایمان اور تقویٰ کی روش پر چلو تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔''

صبر اور تقویٰ

صبر اور تقویٰ کا بھی گہرا تعلق ہے، بندۂ مومن مشکلات و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اور ان لمحات میں بھی اس سے کوئی ایسا عمل سرزد نہیں ہوتا جو اس کے آقا و مولا کو ناراض کر دے، رب کریم اس کے اس عمل کا قدر دان ہوتا ہے۔

﴿وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ (ال عمران:۳/:۱۸۶)

''اگر تم صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔''

(س) احسان اور تقویٰ:

غربا و مساکین کے ساتھ یتامیٰ اور بیوگان کے ساتھ اور بیوی و بچوں کے ساتھ احسان و مروّت سے پیش آنا اور ان سے صلح و صفائی رکھنا بھی تقویٰ کی راہ اپنانا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا﴾ (النساء:٤/١٢٨)

''اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور تقویٰ سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اس طرزِ عمل سے بے خبر نہ ہوگا (اور روزِ جزا و سزا تمہیں اجر عظیم سے نوازے گا)۔''

حدیث مبارک کی روشنی میں لفظ احسان میں مزید وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ احسان یہ ہے:

((اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ کَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنۡ لَمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ))

(صحیح بخاری، کتاب الایمان)

''اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو یا (کم از کم یہ) خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

اگر بندۂ مومن ہر وقت اور ہر لمحہ جذبۂ احسان سے سرشار رہے تو اپنے مولا و مالک کی نگرانی میں کیا کوئی غلط کام کرسکتا ہے؟ یہی جذبہ تو اسے تقویٰ کی دولت سے آراستہ کرتا ہے۔

(س) عدل اور تقویٰ:

یہ بندۂ مومن کی ایسی صفت ہے جو اسے تمام انسانوں میں ممتاز بنا دیتی ہے، وہ کبھی مخبوط الحواس نہیں ہوتا ہے اور نہ کبھی طیش میں آ کر راہِ حق سے منہ موڑتا ہے، اپنے ہوں یا غیر ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرتا ہے۔ رب عظیم کا حکم ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (المائدہ:۵/۸)

''اے ایمان والو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کیا کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اللہ سے ڈر کر (زندگی کا) ہر کام سرانجام دو، (یاد رکھو!) جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

(ص) رزقِ طیب اور تقویٰ:

رزقِ طیب وہ حق حلال کی روزی ہے جسے محنت سے حاصل کیا گیا ہو، اس کے کھانے کے ذرائع بھی حلال ہوں اور وہ رزق ہو جسے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے مباح اور جائز قرار دیا ہو، مثلاً پانی حلال ہے جبکہ شراب حرام ہے، اسی طرح محنت کی روزی حلال ہے جبکہ رشوت کا مال حرام ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ﴾

(المائدہ:۵/۸۸)

''جو کچھ حلال اور طیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے، اسے کھاؤ پیو اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔''

(ض) تقویٰ اور صراط مستقیم:

صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) ایک ہی ہے اور وہ اسلام کا راستہ ہے، یہی راہ انسان کو دنیا اور

آخرت میں کامیابی سے ہمکنار کرسکتی ہے اس کے علاوہ جتنی راہیں ہیں ضلالت اور گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام:٦/١٥٣)

''یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے (یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے راستے) سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کردیں گے، یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔''

مسلمانوں کے لیے یہ آیت مبارکہ زبردست لمحۂ فکریہ ہے، کاش کہ وہ غور کرلیں۔

(ط) تقویٰ اور شیطانی وساوس:

'تقویٰ' ایک ایسا پاکیزہ راستہ ہے جو انسان کو ہر وقت چوکس اور ہوشیار رکھتا ہے اور اسے شیطانی وساوس کے خلاف مستعد اور تیار رکھتا ہے اور وہ اپنے رب کا سہارا لیتا ہے اور اس کی پناہ تلاش کرتا ہے۔ جس سے وہ 'صراط مستقیم' کو گم نہیں کرتا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾

(الاعراف:٧/٢٠٠-٢٠١)

''کبھی کبھی شیطان تمہیں اکسائے (وسوسوں سے غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کرے) تو اللہ کی پناہ مانگو (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم پڑھا کرو) اور حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں۔ ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنّے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقِ کار کیا ہے (اور وہ وہی ہے جو رب کریم کے احکام ہیں)۔''

زندگی کی صحیح شاہراہ:

زندگی کی صحیح شاہراہ صرف اور صرف یہ ہے کہ بندۂ مومن احکامِ الٰہی کو سنتِ نبوی ﷺ کے

مطابق ادا کرتا رہے۔ یہی مضبوط ترین راستہ اور تقویٰ کی پاکیزہ شاہراہ ہے، جس پر پھسلنے اور گرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ رب کریم کا اہل ایمان کو حکم ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ (الحجرات:۴۹/۱)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

''تقوٰی'' سے متعلق قرآن حکیم میں متعدد آیات ہیں۔ کہیں گھریلو حالات میں تقوٰی اختیار کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور کہیں تجارتی معاملات میں نکھار پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور خاص طور پر ''سودی کاروبار'' سے روکا گیا ہے اور کہیں معاشرتی معاملات میں تقوٰی اختیار کرنے کو کہا گیا ہے اور کبھی آپس کے عہد و پیمان کو پورا کرنے میں یہ خوف دلایا گیا ہے، اسلامی عبادات کی غرض و غایت 'تقوٰی' کی تعلیم و تربیت دینا ہی بتایا گیا ہے چنانچہ ابرار و صالحین رب کے حضور یہ دعا کرتے ہیں:

﴿اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ۝ وَ اکْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَیْکَ﴾ (الاعراف:۷/۱۵۵-۱۵۶)

''(اے ہمارے رب!) ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں، پس ہمیں معاف کر دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے، آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں اور ہمارے لیے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی، ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔''

جواب میں ارشاد ہوا:

﴿عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ﴾ (الاعراف:۷/۱۵۶)

''سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں (کلی اختیار کا مالک ہوں) مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو ''تقوٰی'' اختیار کرتے

ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور میری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔“

آپ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر میدان تبوک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے انتہائی معنی خیز ہیں اور امتِ مسلمہ کے لیے ہدایت اور کامیابی کا راستہ ہیں۔

- ((وَرَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ)) (مصنف ابن ابی شیبہ:۸/۱۶۲)

”اور دانائی کی جڑ اللہ عزوجل کا خوف ہے۔“

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں :

”یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح کوئی انسان شیر کے دیکھنے سے خوف اور ڈر محسوس کرتا ہے بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے خوف سے گناہوں سے بچتا رہے اور ہر وقت اس کی اطاعت کا دم بھرتا رہے اور جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ ’خائف‘ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہوسکتا اور التَّخْوِیف (بروزن تفعیل) ڈرانا اور خوف دلانا، اس کا مطلب ہے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرانا اور لوگوں کو بری باتوں سے بچتے رہنے کی ترغیب دینا ہے۔“ (مفردات القرآن)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑتے اور نافرمانی کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ﴾ (الزمر:۳۹/۱۴،۱۶)

”کہہ دیجیے کہ اصل دیوالیے تو وہی ہیں جنہوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو گھاٹے میں ڈال دیا، خوب سن رکھو! یہی کھلا دیوالیہ ہے، اُن پر آگ کی چھتریاں اوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی، یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، پس اے میرے بندو! میرے غضب سے بچو۔

رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ اعلان فرما دیجیے:

﴿قُلْ اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ﴾ (الزمر:۱۳/۳۹)

''(اے نبی!) کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔''

اہلِ ایمان کی زندگی کا صحیح رخ:

اہل ایمان کو رب کریم کا حکم ہوتا ہے کہ وہ شیطان اور اس کے ساتھیوں سے کبھی خوف زدہ نہ ہوں، کبھی وہ مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے ڈراتا ہے کہ دشمن اُن کے مقابلے میں بڑا قوی ہے اور کبھی انفاق فی سبیل اللہ کا خوف دلاتا ہے کہ اس سے تم تنگدست اور تہی دست ہو جاؤ گے، غرضیکہ ہر نیکی اور بھلائی کے کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ رب کریم اپنے بندوں کو یقین اور اطمینان کا راستہ دکھاتا ہے:

﴿اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآئَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ (آل عمران:۱۷۵/۳)

''شیطان تمہیں اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈراتا رہتا ہے، لہٰذا تم ایسے لوگوں سے نہ ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرنا، اگر تم صاحب ایمان ہو۔''

کہیں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ﴾ (البقرہ:۴۱/۲)

''اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔''

ایسے ہی متقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِکُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ﴾

(المومنون ۵۷:۲۳-۶۱)

''حقیقت میں تو وہ لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرنے والے ہوتے ہیں، جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں، جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور جن کا حال یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے) دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل اُن کے اِس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے انہیں پا لینے والے ہیں۔''

حافظ صلاح الدین یوسف اس آیتِ مبارکہ پر لکھتے ہیں:

''یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں لیکن اللہ سے ڈرتے بھی رہتے ہیں کہ کسی کوتاہی کی وجہ سے ہمارا عمل یا صدقہ نامقبول قرار نہ پائے، حدیث میں آتا ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا ''ڈرنے والے کون؟ وہ جو شراب پیتے، بے حیائی کا ارتکاب کرتے اور چوریاں کرتے ہیں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے، روزہ رکھتے اور صدقہ و خیرات کرتے ہیں لیکن ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نا مقبول نہ ٹھہریں۔'' (احسن البیان، بحوالہ مسند احمد)

خوف کے ساتھ رحمت کی امید:

''اللہ تعالیٰ سے خوف کے مفہوم'' کا تو مندرجہ بالا آیات سے پتا چلا کہ اس کے احکام کی نافرمانی سے بچا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ نیک اعمال سرانجام دینے کے باوجود اس کی رحمت کو تلاش کیا جائے، اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ نیک بندوں کا حال یہ ہے:

﴿يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/ ۵۷)

''وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔''

گویا کہ بندۂ مومن رجا اور خوف کے درمیان زندگی گزارتا ہے، وہ اپنے رب کی رحمتوں کو ہمیشہ اپنے دامن میں چنتا ہے اور اس کی نافرمانی سے مقدور بھر بچتا ہے اور اس کی نافرمانی سے بچنا بھی اس کی رحمت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴾ (یوسف:۱۲/۵۳)

''میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے، اِلّا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بیشک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنۡکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ﴾ (النور:۲۴/۲۱)

''اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہوسکتا، مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

قرآن حکیم میں متعدد بار اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذکر آیا ہے، تاکہ بندے اُس کے حضور اپنی خطاؤں پر بخشش طلب کرتے رہیں اور اس کی فرمانبرداری کا دم بھریں، وہ یہی چاہتا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو جائیں اور وہ انہیں جنت میں حیاتِ جاوداں سے سرفراز کرے، وہ کتنی شفقت اور محبت سے اپنے بندوں سے مخاطب ہوتا ہے:

﴿قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ﴾ (الزمر:۳۹/۵۳)

(اے نبیؐ! میری جانب سے لوگوں کو) کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے ''(خطاؤں کے ساتھ) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش، بڑی رحمت والا ہے۔''

انسان کی یہ کتنی بڑی شقاوت اور بدبختی ہے کہ اتنے مہربان آقا کی نافرمانی کرے جس نے اسے ان گنت انعامات سے نوازا ہے۔ یہ ہوا، یہ روشنی، یہ پھل پھول، یہ پانی، یہ جسم و جان اور سب سے بڑھ کر اس نے ہدایت کے لیے دین اسلام سے بہرہ ور فرمایا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ دنیا و

آخرت میں سرخرو ہوسکتا ہے، اسی بات کو قرآن مجید نے ''اِتمام نعمت'' سے بھی یاد فرمایا ہے۔ رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا﴾ (المائدہ:۵/۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین (نظامِ حیات) کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

پھر انسان کو ان الفاظ کے ساتھ جگایا اور متنبہ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الۡکَرِیۡمِ ○ الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ○ فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ﴾ (الانفطار:۸۲/۶-۸)

''اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا، جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تیرا تسویہ کیا (ہر عضو کو صحیح صحیح جگہ درست طور پر لگا دیا) پھر تیری تعدیل کی (اعتدال و توازن بخشا) پھر تجھے جس صورت میں چاہا ترکیب دیا۔''

کہیں انسان کو اس طرح یاد دہانی کرائی گئی ہے:

﴿وَمَاۤ اَدۡرٰکَ مَا الۡعَقَبَةُ ○ فَکُّ رَقَبَةٍ ○ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ ○ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ○ اَوۡمِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ○ ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ○ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَةِ ○﴾ (البلد ۹۰:۸-۱۱)

''اور تمہیں کیا معلوم کہ عقبہ (گھاٹی) کیا ہے؟ (سنو) وہ غلامی سے کسی کو رستگاری دلانا ہے یا قحط و گرانی کے ایام میں کسی رشتہ دار یتیم یا خاک بسر محتاج کو کھانا کھلانا ہے، پھر وہ اُن میں سے ہو جو صاحب ایمان ہیں اور وہ باہم صبر اور ترحّم کی ناصحانہ ہدایت کرتے ہیں، یہی لوگ اصحاب یمین و سعادت (دائیں بازو والے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عقلمند ہیں اور کامیابیوں سے ہمکنار ہونے والے) ہیں۔''

لاریب اس میں انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین شامل ہیں۔ یہ منعم علیہ گروہ اتنا سعادتمند ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہر بندۂ مومن آرزو اور تمنا رکھتا ہے اور رب کریم نے نماز کی ہر رکعت میں مسلمانوں کو یہ دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ﴾ (الفاتحه ١:٦-٧)

”(اے اللہ!) ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دکھا، ان لوگوں کی راہ جن پر آپ نے انعام کیا۔“

اس انعام یافتہ گروہ کا دوسرے مقام پر اس طرح ذکر فرمایا کہ جو لوگ احکام الٰہی کی پیروی سنت رسول ﷺ کے مطابق کرتے ہیں، انہیں بھی ان خوش بخت لوگوں کی رفاقت نصیب ہو گی، ارشاد ہوا:

﴿مَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا﴾ (النساء:٤/٦٩)

”جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے، وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق، جو کسی کو میسر آئیں۔“

اللہ سے ڈرنے والوں کا مقام:

قرآن حکیم میں اس شخص کے لیے جنت کی خوشخبری دی گئی ہے جو خواہشات نفس سے منہ موڑ کر اپنے رب کے سامنے جوابدہی کے لیے ڈر گیا اور اس نے اس کی نافرمانی کی بجائے اس کی اطاعت میں زندگی گزار دی۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰی ۝ فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِیَ الۡمَاۡوٰی﴾

(النازعات:٧٩/٤٠-٤١)

”جو اپنے رب کی بارگاہ میں پیشی سے ڈرتا رہا ہوگا (اور اس کی نافرمانی کی بجائے اس نے اطاعت کی راہ اختیار کی ہوگی) اور اپنے آپ کو ہوائے نفسانی سے روکا ہوگا، سو یقیناً اس کا ٹھکانا جنت ہی ہے۔“

بلکہ ایسے شخص پر اپنے رب کی بے پایاں رحمت ہوگی، ایسی رحمت جس کا اس زندگی میں اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (٤٦) ...... ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (٤٨) ...... فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ (٥٠) ...... فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ (٥٢) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (٥٣)﴾ (الرحمن:٥٥/٤٦-٥٣)

"اور اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا دو باغ ہیں (وہ کیسے ہیں؟) ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور ان دونوں باغوں میں چشمے رواں دواں ہیں اور (ان باغوں کی شان نرالی ہے) ہر قسم کے میووں کی دو قسمیں ہوں گی (ہر پھل اور ہر قسم اپنی لذت اور مٹھاس میں نادر و نایاب) لوگو! تم اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے۔"

اس کے علاوہ رب کریم کے ان گنت احسانات اور انعامات ان لوگوں کے لیے ہیں جو اس دنیا میں اس کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں اور اُس راستہ کو اختیار کرتے ہیں جو اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کا ہے۔

لفظ 'خوف' اور اُس کے بعض مترادفات:

'خوف' مستقبل کے خطرات سے کہ جس کا آنا یقینی ہے، اپنا بچاؤ کرنا اور ایسا راستہ اختیار کرنا ہے جو صحیح وسالم ہے، ابرار وصالحین کے بارے میں آتا ہے:

﴿وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ﴾ (الرعد:١٣/٢١)

"وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں (اور اس کے احکام کی پیروی کرتے ہیں) اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔"

"تقویٰ" یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ

تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقوٰی اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن حکیم کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکانِ حج کے بیان کے موقع پر ہے:

﴿وَ مَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ﴾ (حج:۲۲/۳۲)

''اور اللہ کی نشانیوں کی جو عزت وحرمت کرے، تو یہ اس کے دل کی پرہیز گاری کی وجہ سے ہے۔'' (بحواله سیرت النبی جلد۵)

'تقوٰی' اور خوف کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ''تقوٰی'' بندۂ مومن کے دل کو ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے سرشار رکھتا ہے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے وہ ایسا راستہ اختیار کر لیتا ہے جو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا ہوتا ہے اور اس میں اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس بھی بیدار رہتا ہے، گویا ہم تقوٰی اور خوف کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ تقوٰی سے نیکی کا شعور دل میں ابھرتا ہے اور خوف اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کے احساس کو بیدار کر کے عمل کی شاہراہ پر گامزن کر دیتا ہے۔

﴿رَهَبَ﴾ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

الرَّهۡبَة ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو۔

(مفردات القرآن، ص:۵۸۹)

﴿وَ اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ﴾ (البقرہ ۲:۴۰)

''(رب کریم کا ارشاد ہے) اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔''

اسی خوف سے عبادت گزاری میں غلو کرنے کو ''رَهۡبَانِيَّةٌ'' کہا جاتا ہے جس کی شریعت اسلامیہ نے اجازت نہیں دی ہے، بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ رَهۡبَانِیَّةَۨ ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَیۡهِمۡ﴾ (الحدید:۵۷/۲۷)

''اور رہبانیت (ترکِ دنیا) تو ان لوگوں نے از خود ایجاد کر لی تھی، ہم نے ان پر اسے واجب نہیں کیا تھا۔''

﴿خَشَعَ﴾ ایسے ڈر کو کہتے ہیں جس کے اثرات دل کے علاوہ اعضا و جوارح پر بھی نمایاں ہوں۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ (المومنون:۲۳/۱-۲)

''یقیناً فلاح پائی ایمان والوں نے، جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع اختیار کرتے ہیں۔''

اس پر حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''خشوع سے مراد، قلب اور جوارح کی یکسوئی اور انہماک ہے۔قلبی یکسوئی یہ ہے کہ نماز کی حالت میں بہ قصد خیالات و وساوس کے ہجوم سے دل کو محفوظ رکھے اور اللہ کی عظمت وجلالت کا نقش اپنے دل میں بٹھانے کی سعی کرے، اعضاو جوارح کی یکسوئی یہ ہے کہ اِدھر اُدھر نہ دیکھے، کھیل کود نہ کرے، بالوں اور کپڑوں کو سنوارنے میں نہ لگا رہے بلکہ خوف وخشیت اور عاجزی وفروتنی کی کیفیت طاری ہو۔'' (احسن البیان)

﴿وَجِلَ﴾ کے معنی دل ہی دل میں خوف محسوس کرنے کے ہیں۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ﴾ (الانفال:۸/۲)

''سچے اہل ایمان تو وہ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔''

خشیت الٰہی کیونکر پیدا ہوتی ہے؟

(ا) اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں پیدا ہو اور یہ عظمت اس کے اَن گنت احسانات سے پیدا ہوتی ہے۔

(ب) صوم وصلوٰۃ کی پابندی سے دلوں میں تقوٰی وطہارت پیدا ہوتا ہے، یہی بات انسان کو رب کی اطاعت کی طرف مائل کرتی ہے اور اس کی نافرمانی سے بچاتی ہے۔

(ج) اللہ تعالیٰ کے حضور آخرت میں جوابدہی کا احساس انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے۔

(د) قرآن حکیم کا تدبر و تفکر سے مطالعہ اور گزشتہ قوموں کے واقعات اور ان کا انجام دعوتِ فکر عطا

کرتا ہے۔

(ر) اللہ تعالیٰ کے حضور مسلسل اور پیہم گریہ و زاری سے دعا کرنا کہ وہ ہمارے دلوں میں خشیت پیدا فرمائے۔

اَفْصَحُ العَرَبُ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر میدان تبوک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں یہ بھی تھا:

- ((وَخیرُ مَا وَقَرَ فِی القُلُوبِ الیَقِینُ))

''اورسب سے باعزت بات قلب میں یقین وایمان کا ہونا ہے۔''

﴿اَلْاِیْمَان﴾ اس کا مادہ (ا م ن) ہے، گویا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد ایمان لانے والا شخص اَمْن میں آجاتا ہے، جیسا کہ رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾

(الانعام:٦/٨٢)

''حقیقت میں تو امن انہی کے لیے ہے اور راہ راست پر وہی ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (یعنی شرک) کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔''

﴿اَلْیَقِیْن﴾ اس کا مادہ (ی ق ن) ہے، یقین ہر شک کی ضد ہے، یعنی شک کا زائل ہو کر علم و تحقیق کے ساتھ کسی امر کا پایۂ ثبوت تک پہنچ جانا ہے۔

ایمان اور یقین کا گہرا رابطہ ہے، ایمان خود یقین ہی کا نام ہے اور یقین ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ سورۃ البقرہ کے آغاز میں ارشاد ہوا:

﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ○ اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (البقرة:٢/٣-٧)

(متقین وہ لوگ ہیں) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں (اَنْفُس و آفاق میں نظام ربوبیت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں) جو رزق ہم نے ان کو دیا، اس میں سے خرچ کرتے

ہیں، جو کتاب آپ پر نازل کی گئی (یعنی قرآن) اور جو کتابیں آپ سے پہلے (دوسرے انبیاء پر) نازل کی گئی تھیں، ان سب پر یقین رکھتے ہیں، ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ ایمان کا ثمرہ ہی یقین ہے اور جس طرح جسم میں روح کا تعلق ہے اسی طرح ایمان کے ساتھ یقین کا ہونا لازمی امر ہے اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے لسانِ صدق سے یہی بات ارشاد فرمائی کہ سب سے باعظمت بات دل میں یقین و ایمان کا ہونا ہے جو کامیابی کی دلیل ہے۔

- ((والِارْتِیابُ مِنَ الْکُفرِ)) (الدرّ المنثور، امام سیوطی:۲/۲۲۵)

"اور شک کرنا ازقبیل کفر ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ کی کتاب "قرآن حکیم" ہر شک وشبہ سے بالا ہے۔

﴿ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ﴾

"اس کتاب میں قطعی کوئی شک نہیں ہے۔"

اور اہل ایمان کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ کسی شک وشبہ کا شکار نہیں ہوتے۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾

"مومن تو وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر (پکا) ایمان لائیں پھر شک وشبہ نہ کریں۔"

- ((وَالنِّیاحَةُ مِنْ عَمَلِ الْجاهِلِیَّةِ)) (سنن الکبری، امام بیهقی، حدیث:۱۵۸۱)

"اور واویلا (بین کرنا) جاہلیت کے کاموں میں ہے۔"

اسلام نے غم اور مصیبت کے وقت بین کرنا نہیں سکھایا بلکہ صبر واستقامت کی راہ بتائی ہے۔

﴿الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۵۶،۱۵۷)

"جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ 'ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے' انہیں خوشخبری دے دو، اُن پر اُن کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی۔ اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔"

● ((وَالْغُلُوْلُ مِنْ جُثَا جَهَنَّمَ)) (دلائل النبوۃ، امام بیہقی:۵/۳۱۹)

''اور خیانت و بددیانتی کا انجام جہنم ہے۔''

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمان داری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور اُس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو، تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسا کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اس طرح جو کام کسی کے سپرد ہو، اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔

علیٰ ہذا القیاس عام مسلمانوں، ائمۂ وقت اور اپنے متفقہ قومی اور ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نبھانا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے، اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں۔ (سیرت النبیؐ، جلد ششم)

پھر درجہ بدرجہ ان خیانتوں کی سزا بھی مختلف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴾ (ال عمران:۳/۱۶۱)

''اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔''

کلمہ طیبہ ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ کا سچے دل سے اقرار کرنے کے بعد ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم احکام الٰہی کی پیروی خلوصِ دل سے سنت نبویؐ کے مطابق کریں۔ ہماری معاشرتی، معاشی، سیاسی، انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام کے صاف ستھرے نظام کے مطابق ڈھل جائے۔ رب کریم کا حکم ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ

اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ﴿ (البقرہ:۲/۲۰۸)

''اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

یہ حکم سننے کے بعد اب کوئی شخص یا کوئی حکومت (جو اسلامی حکومت ہونے کا دعویٰ کرے) بلکہ اس شخص یا اس حکومت کے تمام اصول وضوابط اپنی مرضی کے مطابق ہوں تو یقیناً یہ خیانت ہو گی اور وہ اللہ کے حضور جوابدہ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَخُوۡنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ وَ تَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِكُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴿ (الانفال:۸/۲۷)

''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول (کے حقوق) میں جانتے ہوئے خیانت مت کرو اور اپنی قابل حفاظت چیزوں میں خیانت مت کرو۔''

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اللہ اور اس کے رسولؐ کے حقوق میں خیانت یہ ہے کہ جلوت میں اللہ اور رسول ﷺ کا تابع دار بن کر رہے اور خلوت میں اس کے برعکس معصیت کار، اسی طرح یہ بھی خیانت ہے کہ فرائض میں سے کسی فرض کا ترک اور نواہی میں سے کسی بات کا ارتکاب کیا جائے۔'' (احسن البیان)

گویا کہ رب چاہی زندگی گزارنے کی بجائے من چاہی زندگی گزاری جائے، کتاب کے بعض حصوں کو مان لیا جائے اور بعض کا انکار کر دیا جائے۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَ تَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ﴿ (البقرہ:۲/۸۵)

''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی

میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔''

احکامِ الٰہی میں خیانت کے بعد لوگوں پر خیانت سے حکومت کرنا اور خزانۂ عامرہ کا ناجائز استعمال کرنا ہے۔ان احادیث مبارکہ پر غور کیجیے:

سیدنا معقل بن یسار کہتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: ''اللہ تعالیٰ جس بندے کے سپرد کسی رعیت کو کرے اور وہ اُس رعیت کو دھوکے میں رکھتے ہوئے مر جائے تو اللہ تعالیٰ اُس پر جنت حرام کر دے گا۔'' (بخاری، مسلم بحواله رياض الصالحين، باب ولاة الأمور بالرِّفق بِرعايَاهُم)

اور مسلم کی ایک روایت ہے:

''کسی امیر کے سپرد مسلمانوں کا کوئی کام ہو اور وہ ان کی فلاح و بہبودی کی فکر نہ کرے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گا۔'' (حواله ایضاً)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''میں نے نبی ﷺ سے اپنے اسی گھر میں سنا ہے۔آپ ﷺ فرماتے تھے: ''اے اللہ! جو میری امت کے کسی کام پر حاکم ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو بھی اس پر سختی فرما اور جو میری امت کے کسی کام پر حاکم ہو اور ان سے نرمی سے پیش آئے تو بھی نرمی سے پیش آ۔''

(حواله ایضاً)

سیدنا ابو مریم اَلازدی رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے سپرد مسلمانوں کا کام کرے اور وہ ان کی ضرورتوں، حاجتوں اور اُن کے فقر پر مطلع نہ ہو، اُن سے چھپتا رہے، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی حاجتوں، ضرورتوں اور اس کے فقر پر مطلع نہ ہوگا۔''

یہ سن کر سیدنا معاویہؓ نے دو آدمی، لوگوں کی ضرورتیں معلوم کرنے کے لیے مقرر کر دیئے۔ (حواله ایضاً)

قرآن حکیم نے عدل اور دیانت داری کو حکومت کے لیے لازمی ٹھہرایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى﴾ (المائدہ:۵/۸)

''عدل کیا کرو، جو پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے۔''

پاکستان تاریخ کے آئینے میں:

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے، جو آج سے کوئی ساٹھ برس قبل معرض وجود میں آئی، اس کے لیے مسلمانوں نے ان گنت جانی اور مالی قربانیاں دیں، صرف اور صرف اس لیے کہ اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ کا نظام جاری و ساری کریں گے۔ مگر افسوس کہ اہل پاکستان نے اپنے مولا و مالک سے جو عہد و پیمان کیے وہ سب فراموش کر دیے گئے، بلکہ امن اور سلامتی کی بجائے، بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کی گئی جس کے نتیجہ میں آدھا ملک ہم سے الگ ہو گیا۔ بقیہ حصے کے لیے بھی سیاست دانوں میں جوڑ توڑ ہوتا رہتا ہے، عدلیہ بے بس ہو کر رہ گئی ہے، آج تک اس ملک میں کوئی مضبوط ضابطہ اور قانون نہ بن سکا۔ جس کی وجہ سے ملک افراتفری اور انارکی کا شکار ہے، غربا اور مساکین کے لیے جینا دوبھر ہو چکا ہے، یہاں کے حکمرانوں نے قومی خزانے کا بے دریغ استعمال کر کے پبلک کا استحصال کیا ہے۔ ان حالات میں عاجز و ناتواں بندے رب کے حضور صرف دعا ہی کر سکتے ہیں:

﴿رَبِّ اغۡفِرۡ وَ ارۡحَمۡ وَ اَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰحِمِيۡنَ﴾

خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر میدانِ تبوک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ فصاحت و بلاغت کا شاہکار اور امت کے لیے ایسی ہدایات اور نصیحتیں لیے ہوئے ہے جو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل اور مسلمانوں کے لیے حرز جاں بنانے کے لائق ہیں، آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

- ((وَالسُّكۡرُ كَيٌّ مِنَ النَّارِ)) (دلائل النبوّہ، امام بیہقی:۵/۳۱۹)

''اور نشہ آگ کا داغ ہے۔''

اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

- ((وَالۡخَمۡرُ جِمَاعُ الۡاِثۡمِ)) (مشکوۃ المصابیح، حدیث:۵۲۱۲)

''اور شراب گناہوں کو جمع کرنے کا سبب ہے۔''

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ان الفاظ سے خطاب کیا ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ (المائدہ:٥/٩٠-٩١)

''اے ایمان والو! یقیناً یہ شراب اور جوا، بت (پرستش گاہیں) اور فال نکالنے کے تیر، یہ سب باتیں اعمالِ قبیحہ اور شیطانی کام ہیں۔ ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فوز و فلاح سے ہمکنار ہو جاؤ، شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے سے تم میں بغض و عناد کے شعلے بھڑکانا چاہتا ہے (تاکہ تمہاری پر امن اور عافیت کی زندگی جل کر بھسم ہو جائے) تاکہ اس طرح وہ تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے پھر کیا تم (ان افعالِ ناپسندیدہ سے) سے باز رہو گے؟''

(لوگو!) شیطان تمہارا ازلی اور ابدی دشمن ہے، لہٰذا تم بھی اس سے دشمنی رکھو، اس بات کو اس طرح سمجھایا گیا:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ (فاطر:٣٥/٦)

درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو، وہ تو اپنے گروہ کو اس لیے بلا رہا ہے کہ وہ اہل دوزخ میں شامل ہو جائیں (کیا تم بھی اس کے گروہ میں شامل ہو کر اپنی عاقبت برباد کرنا چاہتے ہو؟)

جوئے اور شراب سے اجتناب کرو:

سید قطب شہیدؒ اس پر لکھتے ہیں:

بتایا یہ جا رہا ہے کہ اس گندگی کو جاری رکھ کر شیطان اپنے کیا مقاصد پورے کرنا چاہتا ہے۔

''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے روک دے۔'' یہ ہے شیطان کا اصلی منصوبہ اور یہ ہیں شیطان کے مقاصد جو وہ ان ناپاکیوں اور بداخلاقیوں کے ذریعے بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی صفوں کے درمیان بغض و عداوت پھیل جائے اور یہ کام وہ شراب اور جوئے بازی کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کہ اہل ایمان کو یادِ الٰہی اور صلوٰۃ سے روکتا ہے، اس سے بڑی سازش اور کیا ہوسکتی ہے؟

یہ شیطانی مقاصد جو قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں، یہ تو وہ واقعی امور ہیں جنہیں مسلمان اپنی تاریخ میں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں جبکہ قرآن حکیم بذات خود سچا ہے اور اسے کسی تاریخی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے، اس مسئلے پر کسی بحث اور تفتیش کی ضرورت نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان کا یہ منصوبہ کس طرح کام کرتا ہے۔ شراب نوشی سے انسان کا فہم و ادراک ختم ہو جاتا ہے، گوشت اور خون کا نقصان، جذبات اور میلانات کا ہیجان اس کے فوری اثرات ہیں اور جوئے کی وجہ سے لوگوں کو جو مالی نقصان ہوتا ہے، اس کی وجہ سے دلی بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جوئے میں جو ہارتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ جیتنے والا اس کی دولت کو اس کی آنکھوں کے سامنے بطور مالِ غنیمت لے کر جا رہا ہے جبکہ وہ شکست خوردہ اور دولت بریدہ ہے، یہ ایسی باتیں جن کے نتیجے میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے، اگرچہ شرابی اور جوئے باز بظاہر یار اور دوست نظر آتے ہیں اور ایک ہی مجلس میں خوش و خرم نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کے دوست اور ہم نشین ہیں۔

دوسری برائی یہ ہے کہ یہی دونوں چیزیں ذکر اللہ اور نماز سے روکنے والی ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ شراب اگر بے ہوش کرتی اور دماغ ماؤف ہو جاتا ہے تو جُوا مدہوش اور سراسیمہ بنا دیتا ہے (ہارنے والا سٹپٹا جاتا ہے اور اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے) جوئے باز کی دنیا اور شراب خور کی دنیا ایک ہی دنیا ہے اور یہ شراب و کباب اور جام و سبو سے آگے نہیں ہے۔

جب بات یہاں تک آ پہنچتی ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ اس گندگی کے پھیلانے سے شیطان کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ تو ایک مومن کا دل جاگ اٹھتا ہے اور اس کا احساس تیز ہو جاتا ہے، وہ فیصلہ کن اقدام کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے اور جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تم اس سے باز آنے والے ہو؟ تو ہر مومن کے دل میں وہی جواب تیار ہو چکا ہوتا ہے جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا کہ ''ہاں! بے شک ہم باز آ گئے۔''

اب بات مزید آگے بڑھتی ہے اور ایک آخری چوٹ لگائی جاتی ہے:

﴿وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ (المائدہ:۵/۹۲)

''اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آ جاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔''

یہ وہ اصول ہے جس کی طرف تمام معاملات لوٹتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم کی اطاعت اور یہی ہے اسلام۔ اسلام کے اندر اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی بے قید اطاعت کے علاوہ کسی اور چیز کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اگر کوئی اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے روگردانی کرے گا تو اس کے نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہو گا۔ (ظلال القرآن)

- ((وَالشِّعْرُ مِنْ اِبْلِیْسَ)) (دلائل النبوّۃ، امام بیہقی:۵/۳۱۹)

''اور (برے) شعر ابلیس کی طرف سے ہیں۔''

ابلیس کا کام کیا ہے؟ ہر برائی اور بے حیائی کی طرف دعوت دینا ہے۔ وہ شعراء کو بھی ہر وادی میں دھکیلتا ہے۔ دانائی کے شعروں کو سراہا گیا ہے جبکہ برے شعروں کو رد کر دیا گیا ہے۔ برے اشعار کہنے پر شیطان ہی اکساتا ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ○ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ﴾

(الشعراء:۲۶/۲۲۴،۲۲۵)

''رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ فکرِ سخن

میں وادی وادی بھٹکتے پھرتے ہیں۔“

- ((وَشَرُّ المأْكَلِ مَالُ الْيَتِيْمِ)) (جامع الصغیر)

”یتیم کا مال کھانا بدترین خوراک ہے۔“

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوشِ محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اُس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، عقل وشعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی کی مناسب فکر کرے یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم اپنے ساتھ لایا۔ (سیرت النبیؐ) ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

قرآن وسنت میں یتامیٰ کی خدمت، ان کی دیکھ بھال، ان کے ساتھ احسان و مروّت حتیٰ کہ اُن کے سر پر دستِ شفقت رکھنے پر بھی اجر عظیم کی بشارت دی گئی ہے جبکہ ان کے مال میں سے خرد برد کرنے پر سخت عذاب اور وعید سنائی گئی ہے۔

یتامیٰ کی خبر گیری کرنے والے:

یہی لوگ جنت میں شاداں وفرحاں رہنے والے ہیں۔ مساکین اور یتامیٰ کے ساتھ لطف ومحبت سے پیش آنے والے صحابۂ کرامؓ کا وصف اس طرح بیان کیا گیا:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ (الدھر:۹/۷۶)

''اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان کے دل کی صدا ہوتی ہے) ''ہم تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔''

حقوق اللہ اور حقوق العباد:

اسلام نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں پر توجہ دلائی ہے۔ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ غربا و مساکین، بیوگان اور یتامیٰ کی سرپرستی کی جائے، اسلام کی یہی خوبی اسے دنیا کے تمام مذاہب پر فوقیت عطا کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ﴾ (البقرہ:۲/۱۷۷)

''حقیقت میں نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو اور یومِ آخر کو، ملائکہ کو اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابوں نیز نبیوں کو دل سے مانے اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلاموں (ایسے مظلوم جو دشمن کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہے ہیں) کی رہائی پر خرچ کرے۔

اور مال خرچ کرنے کی بہترین راہیں کونسی ہیں؟ قرآن کتنی نفاست سے اس کا جواب دیتا ہے:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾

(البقرہ:۲/۲۱۵)

''(اے رسول ﷺ!) لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) کیا

خرچ کریں؟ انہیں کہہ دیجیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔"

اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لے کر دنیا میں آیا، وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اس کو خطاب کر کے یاد دلا دیا:

﴿اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی .... فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡھَرۡ﴾ (الضحیٰ:۹۳/۶-۹)

"کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟............سو آپ یتیم کو مت جھڑکیے۔"

لہٰذا (شکرانِ نعمت کے طور پر) آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیجیے پھر تاریخ نے دیکھا کہ یتامیٰ اور بیوگان کی، غربا اور مساکین کی، آپ نے کس طرح سرپرستی فرمائی، صدقہ و خیرات کے لیے آپ کا دستِ مبارک ہمیشہ فراخ اور کشادہ رہا، نیز آپ نے یتامیٰ کی خدمت کے صلہ میں امت کو خوشخبریاں عطا فرمائیں۔

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے، آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا اور دونوں کے درمیان فاصلہ رکھا۔"

(بخاری شریف بحوالہ المُتَّجر الرَّابح)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

"مسلمانوں کا بہترین گھر وہ ہے جس میں یتیم سے حسنِ سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں کا بدترین گھر وہ ہے جس میں یتیم سے بدسلوکی کی جاتی ہو۔" (حوالہ ایضاً)

یتامیٰ کے حقوق پامال کرنے پر وعید:

قرآن حکیم کی متعدد آیات میں یتامیٰ کے اموال بدلنے یا مالِ مفت سمجھ کر کھانے کی سخت تہدید آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَہُمۡ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَہُمۡ اِلٰۤی اَمۡوَالِکُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حُوۡبًا کَبِیۡرًا﴾ (النساء:۴/۲)

''اور یتیموں کے مال اُن کو واپس دے ڈالو، اور اُن کے اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لیا کرو اور نہ اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھا جاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے (جس کا تمہیں روزِ قیامت حساب دینا ہوگا)۔''

اس سے بھی بڑی وعید مندرجہ ذیل آیت مبارکہ میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡكُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا﴾ (النساء:٤/ ١٠)

''جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔''

- ((وَالسَّعِیۡدُ مَنۡ وُعِظَ بِغَیۡرِہٖ)) (مصنف ابن ابی شیبه: ۸/۱۶۳)

''اور سعادت مند انسان وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے۔''

قرآن حکیم میں گزشتہ قوموں کے واقعات بیان ہوئے ہیں وہ لوگ جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور خواہشاتِ نفس کے پجاری بن گئے، بالآخر اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں آگھیرا، تباہی و بربادی ان کا مقدّر ٹھہرا۔ بعض قومیں پانی کی موجوں میں بہہ گئیں اور بعض کو طوفانی ہواؤں نے تباہ کر دیا۔ بعض کو زلزلوں نے پیوندِ زمین کر دیا اور بعض زور دار گرج سے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، یہ سزائیں عقلمندوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں کہ وہ احکامِ الٰہی کی مخالفت سے بچیں۔

- ((وَالشَّقِیُّ مَنۡ شَقِیَ فِیۡ بَطۡنِ أُمِّہٖ)) (الابانة الکبری، ابن بطة:۳/۴۳۳)

''اور بدنصیب انسان وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں ہی برا لکھ دیا گیا ہو۔''

جناب رسول اللہ ﷺ نے اس بدبختی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کی دعا سکھا دی ہے۔

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُبِكَ مِنۡ جَهۡدِ الۡبَلَآءِ، وَ دَرۡكِ الشِّقَآءِ وَ سُوۡٓءِ الۡقَضَآءِ وَ شَمَاتَةِ الۡاَعۡدَآءِ)) (بخاری، مسلم بحواله اسلامی وظائف)

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں بلا (مصیبت) کی مَشقت سے اور بدبختی کے ملنے سے اور برے فیصلے سے اور دشمنوں کی خوشی سے۔''

حدیث میں آتا ہے:

((لا یَرُدُّ القَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ)) (سنن الترمذی، حدیث:۲۲۸۹)

''تقدیر کو دعا بدل دیتی ہے۔''

اس لیے اللہ کے احکام کی پیروی اور مسلسل دعا ہی عافیت کا راستہ ہے۔

- ((وَ اِنَّمَا یَصِیرُ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَوْضِعِ أَرْبَعَةِ أَذْرُعٍ وَ الْاَمْرُ اِلَی الْآخِرَةِ))

(شعب الایمان، امام بیہقی: ۱۰/۳۰۵)

''تم میں سے ہر ایک کو چار ہاتھ کے گڑھے (قبر) میں جانا ہے اور معاملہ آخرت پر منحصر ہو گا۔''

کوئی اس دنیا میں بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب، محلات میں رہنے والا ہو یا کٹیا میں زندگی گزارنے والا، مرد ہو یا عورت اسے بالآخر چار ہاتھ کا گڑھا (قبر) ہی نصیب میں آتا ہے، اس لیے یہ دنیا فخر و غرور کی نہیں بلکہ عجز و انکساری کی جگہ ہے ؎

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

پس اچھا وہی شخص ہے جو چند روزہ زندگی اعمالِ حسنہ سے آراستہ کرے، اس لیے کہ یہ عارضی دنیا ﴿مَزْرَعَةُ الْآخِرَة﴾ ''آخرت کی کھیتی ہے''، جو یہاں بوئیں گے، آخرت میں اس کا پھل ملے گا، عقلمند وہی ہیں جو زندگی کی ہر گھڑی کو ربِ کائنات کی یاد میں بسر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد تو یہ دنیا کا مال و دولت اور عزیز و اقارب چھن جاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ ہی ساتھ رہ جاتے ہیں ؎

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب دوست
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

- ((وَ مَلَاكُ الْعَمَلِ خَوَاتِمُهُ)) (مسند الشهاب، امام قضاعی:١/٦٢)

''اور عمل کا مداوا انجامِ کار پر ہوگا۔''

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (آل عمران:٣/١٨٥)

''اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتشِ دوزخ سے بچ نکلا اور جنت میں داخل کر دیا گیا۔''

- ((وَ شَرُّ الرُّؤْيَا رُؤْيَا الْكَذِبِ)) (شعب الایمان، امام بیہقی:٤/٢٠١)

''اور سب سے برے خواب جھوٹے خواب ہیں۔''

حدیث میں آتا ہے کہ اچھے خواب دیکھ کر بندہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے اور برے خواب دیکھ کر شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہے اور یہ دعا پڑھے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ وَ سَيِّئَاتِ الْاَحْلَامِ فَاِنَّهَا لَا تَكُوْنُ شَيْئًا))

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں، شیطان کے عمل اور برے خواب سے، کیونکہ اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔'' (اسلامی وظائف، عبدالسلام بستوی)

- ((وَ كُلُّ مَا هُوَ آتٍ قَرِيْبٌ)) (السنن الکبری، امام بیہقی:٨/٢٩٠)

''اور جو بات ہونے والی ہے (یعنی قیامت) اس کا وقت قریب ہے۔''

جب زندگی کو کوئی ثبات وقرار نہیں اور کسی کو کوئی خبر نہیں ہے کہ اسے اس دنیا سے کوچ کرنے کا بلاوا کب آجائے تو ظاہر ہے اُس شخص کے لیے تو قیامت قائم ہوگئی۔

قرآن اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (الانبیاء:٢١/١)

''قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔''

- ((وَ سِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوْقٌ وَ قِتَالُهُ كُفْرٌ)) (صحیح بخاری، کتاب الایمان)

''مومن کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔''

﴿فِسق﴾ سرکشی، نافرمانی، دائرۂ شریعت سے نکل جانا، احکامِ الٰہی کو توڑنا، جیسا کہ ابلیس کے بارے میں آتا ہے:

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ (الكهف:١٨/٥٠)

''وہ جنوں میں سے تھا، اس لیے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔''

﴿كُفر﴾ شریعت کا انکار، احکامِ الٰہی کا منکر ہونا۔ کفار اور فاسقین کے لیے قرآن حکیم میں سخت سزائیں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے:

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (التوبة:٩/٨٠)

''اور اللہ فاسق لوگوں کو راہِ نجات نہیں دیتا۔''

ارشاد ربّانی ہے:

﴿فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (الملك:٦٧/٢٨)

''کافروں کو عذابِ الیم سے کوئی پناہ نہیں دے گا۔''

اس لیے مسلمانوں کو گالی دینے اور ان سے لڑنے بھڑنے سے بچنا چاہیے۔

- ((وَ أَكْلُ لَحْمِهٖ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَ حُرْمَةُ مَالِهٖ كَحُرْمَةِ دَمِهٖ))

''مومن کا گوشت کھانا (یعنی اس کی غیبت کرنا) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور اس کے مال کی حرمت اُس کے خون کی حرمت کی طرح ہے۔''

قرآن حکیم کی پاکیزہ اور مصفّٰی تعلیمات میں سے یہ بھی ہے:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (الحجرات:٤٩/١٢)

''اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ تم دیکھو! تم خود اس سے گھن کھاتے ہو، تو پھر (ایسا کرنے سے یعنی غیبت کرنے سے) اللہ سے ڈرتے رہو۔''

حافظ صلاح الدین یوسف حفظ اللہ لکھتے ہیں:

''غیبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے سامنے کسی کی برائیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کیا جائے جسے وہ برا سمجھے، اگر اس کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو اس کے اندر موجود ہی نہیں ہیں تو وہ بہتان ہے (تو وہ اس سے بھی بری بات ہے) اپنی اپنی جگہ دونوں ہی بڑے جرم ہیں۔'' (احسن البیان)

اسی طرح اس کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے۔

اور مسلمان تو نہ صرف اپنے بھائیوں کے جان و مال کا محافظ ہوتا ہے بلکہ نسل انسانیت اس سے امن پاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اَلْمُسْلِمُ مَن سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسانِهٖ وَ يَدِهٖ)) (صحیح بخاری، کتاب الایمان)

''مسلمان وہ ہے جس سے دوسرے مسلمان اس کی زبان درازی اور دست درازی سے محفوظ رہیں۔''

اور مومن کی تعریف اس سے بھی بڑھ کر ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلَى اَمْوَالِهِمْ وَدِمَائِهِمْ))

''اور مومن وہ ہے کہ جس سے نسلِ انسانیت کے جان و مال محفوظ ہو جائیں۔''

(معارف الحدیث منظور نعمانی)

- ((وَمَنْ يَّتَأَلَّ عَلَى اللّٰهِ يُكَذِّبْهُ، وَ مَنْ يَّغْفِرْ يُغْفَرْلَهٗ)) (الدرالمنثور، علامہ سیوطی:۲/۲۲۵)

''جو شخص اللہ کی جھوٹی قسم کھاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے جھٹلاتا ہے۔ (اس بات سے جھوٹی قسم کھانے والے کو رسوا کرتا ہے) اور جو (دوسروں کو) بخش دیتا ہے، اللہ بھی اسے بخش دیتا ہے۔''

- ((وَمَنْ يَّعْفُ، يَعْفُ اللّٰهُ عَنْهُ، وَمَنْ يَّكْظِمِ الْغَيْظَ يَأْجُرْهُ اللّٰهُ)) (حوالہ ایضاً)

''اور جو معاف کرتا ہے اللہ بھی اسے معاف کرتا ہے، اور جو غصہ پی جاتا ہے، اللہ اسے اجر سے نوازتا ہے۔''

دراصل ایک دوسرے کی رنجشوں اور زیادتیوں کو معاف کر دینے میں جو مزا آتا ہے وہ روٹھے رہنے میں نہیں آتا ہے، قرآن حکیم ایسے لوگوں کے متعلق اعلان کرتا ہے:

﴿وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(آل عمران:۳/۱۳٤)

''جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں (یہ محسنین کے رتبہ پر فائز ہو جاتے ہیں)۔''

- ((وَ مَنْ يَّصْبِرُ عَلَى الرَّزِيَةِ يُعَوِّضُهُ اللّٰهُ)) (الدرالمنثور، علامہ سیوطی:۲/۲۲۵)

''جو مصیبت پر صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بہتر بدلہ عطا فرماتا ہے۔''

ایک تو یہ کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شامل حال رہتی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾ (البقرہ:٥/۱٥۳)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

دوسرے روزِ جزا انہیں لازوال اجر سے نوازا جاتا ہے:

﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر:۳۹/۱۰)

''بلاشبہ صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''

پھر لسانِ نبوتؐ سے یہ بھی ارشاد ہوا:

- ((وَ مَنْ يَتَصَبَّرْ، يُضْعِفِ اللّٰهُ لَهٗ))

''اور جو صبر کرے گا اُسے اللہ بڑھا چڑھا کر اجر سے نوازے گا۔''

- ((وَ مَنْ يَبْتَغِ السُّمْعَةَ، يُسَمِّعُ اللّٰهُ بِهٖ))

''اور جو کسی (کا بھید اور راز) سننے کے لیے کان لگا دیتا ہے، اللہ بھی اس کے لیے کان لگا دیتا ہے۔''

ایسے سننے والوں کا قرآن اس طرح اعلان کرتا ہے:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ (المائدہ:٥/٤۲)

''یہ کان لگا لگا کر جھوٹ سننے والے اور جی بھر بھر کر حرام کھانے والے ہیں۔''

یہ معاشرتی زندگی میں اضطراب اور پریشانی پھیلانے کا سامان ہے، یعنی کسی مجلس کی باتوں کو کان لگا کر سننا، پھر اس میں سچ جھوٹ ملا کر ادھر اُدھر پھیلانا، اسے اردو زبان میں ''بے پر کی اڑانا'' کہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نہ کسی شکل میں سزا مل ہی جاتی ہے۔

- ((وَ مَنْ یَعْصِ اللّٰہَ یُعَذِّبُہُ اللّٰہُ))

''جو اللہ کی نافرمانی کرے، اللہ اسے عذاب دے گا۔''

ظاہر ہے کہ یہ جان و مال، تمام نعمتیں اور راحتیں اسی کے انعامات ہیں وہی خالق و مالک ہے، اگر ان پر اس کے شکر گزار رہیں گے تو اس کی جانب سے اس کا اجر ملے گا اور اگر نافرمانی کریں گے تو اس کی سزا ملے گی۔

((ثُمَّ استَغْفَرَ ثَـلَاثاً))

پھر آپ ﷺ نے اس خطبہ کے بعد تین بار اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہی (اِستغفار کیا)۔

(زاد المعاد۔ حافظ ابن قیمؒ)

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ [بخاری]

''تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو کم سے کم یہ خیال ضرور رہے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔''

اتباعِ رسول ﷺ اور حبّ الٰہی

﴿قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ وَ یَغۡفِرۡلَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴾

''(اے نبیؐ!) لوگوں سے کہہ دیجیے کہ ''اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہوتو میری اتباع کرو (سیرت طیبہ کو اختیار کرو) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔'' (آل عمران:۳/۳۱)

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں بعض صحابہؓ نے پوچھا تو بی بی صاحبہ نے فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟

((اِنّ خُلُقَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ صَلی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ کَانَ الۡقُرۡآن))

''آپؐ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔''

یعنی آپ کی حیاتِ طیبہ قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر تھی تو اس میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی رضامندی تھی، تو ظاہر ہے آپ ﷺ کی پاکیزہ زندگی کو اپنے لیے مشعل راہ بنانے والے بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پالیں گے۔ آیئے سیرتِ نبوی کے بعض حصوں کو قرآن کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہیں۔

خدمتِ خلق:

ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ۲۵ برس تک آپ ﷺ کی خدمتِ زوجیت میں رہی تھیں۔ زمانۂ آغازِ وحی میں آپ ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی تھیں:

”ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! وہ (اللہ) آپ ﷺ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، اور مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔“

اُم المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جو چیز آپ ﷺ کے پاس آتی، جب تک صرف نہ ہو جاتی آپ کو چین نہ آتا، بے قراری سی رہتی، ایک دفعہ آپ ﷺ گھر تشریف لائے تو چہرۂ اقدس متغیر تھا، ام سلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! خیر ہے؟ فرمایا ”کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہوگئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے۔“

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شب وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک راستہ سے گزر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ابوذر! اگر اُحد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جائے، لیکن ہاں وہ دینار جن کو میں ادائے قرض کے لیے چھوڑ دوں۔“

اکثر یہاں تک معمول تھا کہ گھر میں نقد کی قسم سے کوئی چیز موجود ہوتی تو جب تک کل خیرات نہ کر دی جاتی گھر میں آرام نہ فرماتے۔ رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلّہ بار کر کے خدمتِ نبوی میں بھیجا، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے بازار میں غلّہ فروخت کر کے ایک یہودی کا قرض تھا، وہ ادا کیا، پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر اطلاع کی، آپ ﷺ نے پوچھا کہ بچ تو نہیں رہا، بولے کچھ بچ بھی رہا ہے، فرمایا کہ ”جب تک کچھ باقی رہے گا میں نہیں جا سکتا۔“ سیدنا بلالؓ نے کہا میں کیا کروں؟ کوئی سائل نہیں، جناب رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں رات بسر کی، دوسرے دن سیدنا بلالؓ نے آ کر کہا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سبکدوش کر دیا، یعنی جو کچھ تھا، وہ بھی تقسیم کر دیا گیا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔

اسی طرح ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلافِ معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے اور پھر فوراً نکل آئے، لوگوں کو تعجب ہوا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ کو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے۔ گمان ہوا کہ

کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے، اس لیے جا کر اس کو خیرات کر دینے کو کہہ آیا۔

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور اس قدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دارالاسلام میں نہیں آئی تھی، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو صحن مسجد میں ڈلوا دو، اس کے بعد جب آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو اس پر مڑ کر بھی نظر نہ ڈالی، نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے اس کی تقسیم کی، جو سامنے آتا، اس کو دیتے چلے جاتے، سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو جو غزوۂ بدر کے بعد دولت مند نہیں رہے تھے اتنا دیا کہ اٹھ کر چل نہیں سکتے تھے، اس طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے جاتے تھے، جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

لوگوں کو عام حکم تھا کہ جو مسلمان فوت ہو جائے اور اپنے ذمہ قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو، میں اس کو ادا کر دوں گا اور جو ترکہ چھوڑ جائے، وہ وارثوں کا حق ہے، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔

گویا کہ جود و سخا آپ ﷺ کی فطرت تھی، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان کے مہینے میں آپ ﷺ اور زیادہ سخاوت کرتے تھے، تمام عمر کسی کے سوال پر "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا اور عجز کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَخَازِنٌ، وَ اللّٰهُ يُعْطِيْ)) (سیرت النبی جلد دوم)

"میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا تو اللہ تعالیٰ ہے۔"

اور یہ بات دراصل قرآن حکیم کی پاکیزہ تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویر تھی جس میں رب کریم نے اپنے بندوں کو متعدد مقامات میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ﴾ (الحدید:۵۷/۷)

"جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور مال خرچ کرتے ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ (فاطر:۳۵/۲۹)

''جولوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے، اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں۔ یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا (اور اللہ تعالیٰ کے ہاں لازوال اجر کے مستحق ہوں گے)۔''

نیز ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (المعارج:۲۴/۷۰)

''(ابرار و صالحین وہ ہیں) جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔''

عرضیکہ قرآن حکیم میں رب کریم نے مختلف آیات میں غربا و مساکین کی، بیوگان اور یتامیٰ کی اعانت اور مدد پر اجرِ عظیم کی بشارت دی ہے اور جناب خاتم النبیین کو اِس طرح خطاب فرمایا ہے:

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ○ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ○ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ○ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ○ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (الضحیٰ:۹۳/۶-۱۱)

''(اے محمدؐ!) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اُس (رب العالمین) نے آپ کو یتیم پایا تو ٹھکانا بخشا اور آپ کو پریشان حال پایا تو سیدھا راستہ بتلا دیا اور نادار پایا تو غنی کر دیا، لہٰذا کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے اور نہ کسی سائل کو جھڑکیے اور اپنے رب کے احسانات کو بیان کرتے رہیے۔''

اس دُرِ یتیم نے اپنے رب کی باتوں کو حرزِ جاں بنایا اور تاریخ نے اس بات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا کہ اس نیلگوں آسمان کے نیچے آپ سے بڑھ کر غربا و مساکین کا، یتامیٰ اور بیوگان کا کوئی ہمدرد اور غم خوار نہیں ہے۔ اپنی جوانی میں جو تجارتی سفر کیے اور حق حلال کی روزی کمائی اور پھر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد جو مال انہوں نے آپ کے حوالے کیا، وہ سب کا سب اپنے رب کی رضا کے لیے غریبوں اور مسکینوں ہی پر خرچ کر ڈالا اور خود فقر و فاقہ کی زندگی بسر فرمائی، رب کریم نے بھی آپ اور آپ کے صحابۂ کرامؓ کے بارے میں فرمایا:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ (الدھر:۷٦/۸-۹)

''اور اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان کے دل کی صدا ہوتی ہے) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں، نہ شکریہ۔''

اللہ تعالیٰ کو یقیناً وہ بندے بہت پسند ہیں جو غربت اور تنگدسی کے باوجود ایمان اور شکرگزاری سے زندگی گزارتے ہیں، کاشانۂ نبوت کی بھی اس نہج پر تربیت کی گئی، ان آیات پر غور کیجیے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ○ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۷،۲۹)

''اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہیے، اگر تم دنیا اور اُس کی زینت چاہتی ہو تو آوٴ، میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔''

ان آیات پر حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''فتوحات کے نتیجے میں جب مسلمانوں کی حالت پہلے کی نسبت کچھ بہتر ہو گئی تو انصار و مہاجرین کی عورتوں کو دیکھ کر ازواجِ مطہرات نے بھی نان و نفقہ میں اضافے کا مطالبہ کر دیا، نبی ﷺ چونکہ نہایت سادگی پسند تھے اس لیے ازواجِ مطہرات کے اس مطالبے پر سخت کبیدہ خاطر ہوئے اور بیویوں سے علیحدگی اختیار کر لی جو ایک مہینے تک جاری رہی، بالآخر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما دیں، اس کے بعد سب سے پہلے آپ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ آیات سنا کر انہیں اختیار دیا، تاہم انہیں کہا کہ اپنے طور پر فیصلہ کرنے کی بجائے اپنے والدین سے مشورہ کے بعد کوئی اقدام کرنا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

نے فرمایا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں آپ ﷺ کے بارے میں مشورہ کروں؟ بلکہ میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو پسند کرتی ہوں۔ یہی بات دیگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنھن نے بھی کہی اور کسی نے بھی رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر دنیا کی عیش و آرام کو ترجیح نہیں دی۔" (احسن البیان بحوالہ صحیح بخاری)

مسلمانو! مندرجہ بالا سطور میں آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی، درویشی، غربا و مساکین سے محبت کا حال پڑھا، ہم رسول اللہ ؐ کی محبت کے دعوے دار ہیں، مگر کہاں کھڑے ہیں؟

● ایثار

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

"الایثار" بروزن افعال، کے معنی (ایک چیز کو اس کے افضل ہونے کی وجہ سے) ترجیح دینا اور پسند کرنا۔ (مفردات القرآن)

جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ عاجز و خاکسار تھے اور اپنی ضرورت پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے، خود بھوک اور پیاس برداشت کر لیتے اور دوسروں کو کھانا کھلا دیتے تھے، یہ جذبہ صرف ان ہی لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن کے دل 'تقویٰ' سے لبریز ہوں اور انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری ان کا شعار ہو، یہی اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہیں جن کا قرآن اس طرح ذکر کرتا ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الحشر:۹/۵۹)

"اور یہ (ابرار و صالحین) اپنے اوپر (دوسروں) کو ترجیح دیتے ہیں گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو (بات یہ ہے) کہ جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب (اور بامراد) ہے۔"

اور یہ خوبی رسول اللہ ﷺ میں بدرجہ اتم موجود تھی اور "رحمۃ للعالمینؐ" کا یہ وصف دیکھ کر صحابہ کرامؓ میں بھی یہی جذبہ پیدا ہوا، حالت امن میں تو کجا ٹھیک میدان جنگ میں زخموں سے چور مجاہدین جان بلب ہیں مگر ایثار و قربانی کے جذبہ سے سرشار، اپنی جان سے اپنے بھائی کی جان زیادہ

پیاری اور عزیز ہے، شاعر کی زبانی یہ واقعہ سنیے ؎

ترے اسلاف میں یہ باہمی اُلفت کا عالَم تھا
کہ کچھ زخمی پڑے تھے اک جگہ اسلام کے شیدا
نزع کی پیاس تھی، پانی کوئی لے کر جو جا پہنچا
وہ پہلے ایک کو دینے لگا پانی کا جب کوزا
کہا اس نے کہ پہلے دوسرا پی لے تو بہتر ہے
کہ میرا قوتِ بازو ہے، اسلامی برادر ہے
وہ پانی دوسرے کے پاس لے کر جس گھڑی آیا
کہا اس نے کہ میں پانی پیوں مجھ کو نہیں زیبا
کہ تڑپے پیاس سے بھائی، کلیجہ ہو میرا ٹھنڈا
غرض وہ جس کو دیتا تھا، جواب اس نے یہی پایا
پیا ہر ایک نے الختصر جامِ شہادت کو
کہ جاں ایثار کر کے اپنی دکھلا، محبت کو

اب خاندانوں میں الفت و محبت غائب ہے، حرص و ہوس کے گہرے سائے چھا چکے ہیں۔ کہاں گئی ہماری مسلمانی اور کہاں عشقِ رسول ہے؟

آپ ﷺ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپ ﷺ کو بے انتہا محبت تھی۔ سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عسرت اور تنگدستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں، خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں، چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑ گئے تھے، ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں خود تو پاس حیا سے عرضِ حال نہ کر سکیں۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف سے یہ حال عرض کیا اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں

سے ایک کنیز مل جائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ابھی اصحابِ صفہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہولے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر لا کر پیش کی، آپ ﷺ کو ضرورت تھی، آپ ﷺ نے لے لی۔ ایک صاحب حاضرِ خدمت ہوئے۔ انہوں نے کہا کیا اچھی چادر ہے؟ آپ ﷺ نے اتار کر ان کو دے دی۔ جب اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ کو چادر کی ضرورت تھی، یہ بھی جانتے ہو کہ آپ ﷺ کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا ہاں! لیکن میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ مجھ کو اسی چادر کا کفن دیا جائے۔

ایک صحابی نے شادی کی، سامانِ ولیمہ کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ سیدہ عائشہؓ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جا کر لے آئے حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرے کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔

ایک دفعہ ایک غفاری آ کر مہمان ہوا، رات کو کھانے کے لیے صرف بکری کا دودھ تھا، وہ آپ ﷺ نے اس کی نذر کر دیا، یہ تمام رات خانۂ نبوت میں فاقہ سے گزری، حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا۔ (سیرت النبی، شبلی نعمانی)

• حسنِ معاملہ

نبوت ملنے سے پہلے بھی جن لوگوں سے آپ ﷺ کے تاجرانہ تعلقات تھے۔ انہوں نے ہمیشہ آپ ﷺ کی دیانت اور حسنِ معاملہ کا اعتراف کیا ہے، اسی لیے قریش مکہ نے آپ ﷺ کو امین کا خطاب دیا تھا۔ نبوت کے بعد بھی گو قریش بغض و کینہ کے جوش سے لبریز تھے تاہم اُن کی دولت کے لیے مامون مقام آپ ﷺ ہی کا کاشانہ تھا، عرب میں سائبؓ نام کے ایک تاجر تھے، وہ مسلمان ہو کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، لوگوں نے مدحیہ الفاظ میں آپ ﷺ سے ان کا تعارف کرایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔''

سائبؓ نے کہا: ''میرے ماں باپ فدا، آپ ﷺ میرے (کاروبار میں) ساجھی تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔''

ایک دفعہ آپ ﷺ نے کسی سے اونٹ قرض لیا، جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ واپس کیا اور فرمایا سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ مدینہ کے باہر ایک مختصر سا قافلہ آ کر فروکش ہوا، ایک سرخ رنگ کا اونٹ اس کے ساتھ تھا، اتفاقاً اُدھر سے آپؐ کا گزر ہوا آپ ﷺ نے اونٹ کی قیمت پوچھی، لوگوں نے قیمت بتائی، بے مول تول کیے رسول اللہ ﷺ نے وہی قیمت منظور کر لی، اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے، بعد میں لوگوں کو خیال آیا کہ بغیر جان پہچان ہم نے جانور کیوں حوالہ کر دیا اور اس حماقت پر اب پورے قافلہ کو ندامت تھی، قافلہ کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی اس نے کہا مطمئن رہو ہم نے کسی شخص کا چہرہ ایسا روشن نہیں دیکھا یعنی ایسے شخص سے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے، رات ہوئی تو آپ ﷺ نے نہ صرف اونٹ کی قیمت بھجوا دی بلکہ ان کو کھانا بھی بھجوایا۔

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرضہ رسول اللہ ﷺ پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اُس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پر اُس کو ڈانٹا اور کہا کہ تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہم کلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے (قرض خواہ کو مطالبہ کا حق ہے) اس کے بعد صحابہ کو اس کا قرض ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا اور زیادہ دلوایا۔ (سیرت النبی، شبلی نعمانی)

ایسے ہی ابرار و صالحین کے بارے میں قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ (المؤمنون:۲۳/۸)

"وہ جو اپنی امانتوں اور وعدے کی حفاظت کرنے والے ہیں (یہی تو فردوس کے وارث ہوں گے)"

• حُسنِ خلق

سیدنا علی، سیدنا انس، سیدنا ہند بن ابی ہالہ اور ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو مدتوں آپ کی خدمت میں رہے ہیں ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ آپ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نیک سیرت تھے، آپ کا چہرہ مبارک ہمیشہ خندہ رہتا، وقار اور متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر

شکنی نہ کرتے تھے۔

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملتے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام و مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا، تو اُس وقت اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹالے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اُس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں تشریف فرماتے تو آپ ﷺ کے زانو ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے (گویا کہ خاکساری کی نشست ہوتی)۔ (سیرت النبی، شبلی نعمانی)

رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ، اوصافِ کریمہ اور خصائلِ شریفہ کا ذکر ھند بن ابی ہالہؓ نے (جو ام المومنین سیدہ خدیجہؓ کے فرزند اور سیدنا حسنؓ اور حسینؓ کے ماموں ہیں) بہت جامع اور بلیغ انداز میں کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''رسول اللہ ﷺ ہر وقت آخرت کی فکر میں اور امورِ آخرت کی سوچ میں رہتے، اس کا ایک تسلسل قائم تھا کہ کسی وقت آپ ﷺ کو چین نہیں ہوتا تھا، اکثر طویل سکوت اختیار فرماتے، بلاضرورت کلام نہ فرماتے، گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہنِ مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے اور اسی طرح اختتام فرماتے، آپ کی گفتگو آسان اور بیان بہت صاف، واضح اور روشن ہوتا، نہ اُس میں غیر ضروری طوالت ہوتی نہ زیادہ اختصار، آپ ﷺ نرم مزاج و نرم گفتگو تھے، درشت خو اور بے مروّت نہ تھے، نہ کسی کی اہانت کرتے تھے اور نہ اپنے لیے اہانت پسند کرتے تھے، نعمت کی بڑی قدر کرتے اور اس کو بہت زیادہ جانتے، خواہ کتنی ہی قلیل ہو، آپ ﷺ نے کبھی بھی کھانے میں عیب جوئی نہیں کی۔ پسند ہوتا تو کھا لیتے اور اگر پسند نہ آتا تو چھوڑ دیتے، دنیا اور دنیا سے متعلق جو بھی چیز ہوتی اُس پر آپ ﷺ کو کبھی غصہ نہ آتا لیکن جب اللہ تعالیٰ کے کسی حق کو پامال کیا جاتا تو اُس وقت آپ ﷺ کے جلال کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکتی تھی یہاں تک کہ آپ حدود اللہ کو قائم فرماتے، آپ کو اپنی ذات کے لیے نہ غصہ آتا نہ اُس کے لیے انتقام لیتے، غصہ اور ناگواری کی بات ہوتی تو روئے انور اس طرف سے پھیر لیتے اور اعراض فرما لیتے، خوش

تھے، ظاہر ہوتے۔''
ہوتے تو نظریں جھکا لیتے، آپ جس سے صرف آپ ﷺ کے
دندان مبارک جو بارش کے اولوں کی طرح پاک وشفاف

(نبی رحمتؐ، سید ابوالحسن علی ندوی)

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ جو فردِ خاندان تھے اور جن کو علم و واقفیت کے بہترین ذرائع اور مواقع حاصل تھے اور جن کی نظر نفسیاتِ انسانی اور اخلاق کی باریکیوں پر بہت گہری تھی، قریب ترین اشخاص میں سے تھے اور اسی کے ساتھ وصف نگاری اور منظر کشی میں بھی ان کو سب سے زیادہ قدرت تھی، آپ ﷺ کے 'خلق عظیم' کے متعلق یہ کہتے ہیں:

''آپ ﷺ طبعاً بدکلامی، بے حیائی سے دور تھے اور تکلفاً بھی ایسی کوئی بات آپ ﷺ سے سرزد نہیں ہوتی تھی، بازاروں میں آپ ﷺ کبھی آواز بلند نہ فرماتے، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے، بلکہ عفو و درگزر کا معاملہ فرماتے اور یہی بات قرآن حکیم کے بلند اوصاف میں سے ہے:

لِ تِ یْ ھِ یَ اَ حْ سَ نُ فَ اِ ذَا الَّ ذِ یْ بَ یْ نَ کَ
سْ تَوِی الْ حَ سَنَ ةُ وَلَا السَّ یِّ ئَ ةُ اِدْ فَ عْ بِا
وَلَا تَ
اِلَّا الَّ ذِ یْ نَ صَ بَ رُوْا وَمَا یُ لَقّٰ ھَآ اِلَّا ذُوْ
ہٗ عَ دَا وَةٌ كَ اَنَّ ہٗ وَ لِیٌّ حَ مِ یْمٌ ۝ وَمَا یُ لَقّٰ ھَآ
وَ بَ یْ نَ
عَ ظِ یْ مٍ ۝ (حٰمٓ السجدہ: ٣٤/١٤-٣٥)
حَ ظٍّ

''(اے نبیؐ!) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، آپ بدی کو اس نیکی سے دفع کیجیے جو بہترین ہو، آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔''

رب کریم نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو ۳۱ نعت یعنی ''عفو و درگزر'' کا وافر حصہ عطا فرمایا

سیرت طیبہ کو پڑھ جائیے کہ لوگوں کی سختیوں اور تکلیفوں کا جواب آپ ﷺ نے دعائیہ کلمات

آپ ﷺ نے کسی پر کبھی دست درازی نہ فرمائی، سوائے اس کے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا موقع ہو، کسی خادم یا عورت پر آپ نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، میں نے آپ ﷺ کو کسی ظلم و زیادتی کا انتقام لیتے ہوئے بھی نہیں دیکھا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی نہ ہو اور اُس کی حرمت و ناموس پر آنچ نہ آئے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو پامال کیا جاتا اور اُس کے ناموس پر حرف آتا تو آپ ﷺ اُس کے لیے ہر شخص سے زیادہ غصہ ہوتے۔

دو چیزیں سامنے ہوتیں تو ہمیشہ آسان چیز کا آپ ﷺ انتخاب فرماتے، جب آپ دولت خانہ پر تشریف لاتے تو عام انسانوں کی طرح نظر آتے، اپنے کپڑوں کو صاف کرتے، بکری کا دودھ دوہتے اور اپنی سب ضرورتیں خود انجام دیتے، اپنی زبان مبارک محفوظ رکھتے اور صرف اسی چیز کے لیے کھولتے جس سے آپ ﷺ کو کچھ سروکار ہوتا، قرآن حکیم کی بھی یہی تعلیم ہے:

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/۳۶)

''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی بازپُرس ہوگی۔''

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان کے بجائے ''علم'' کی پیروی کریں۔'' (مختصر حواشی)

اور حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام علم و یقین پر مبنی ہے نہ کہ ظن و تخمین پر، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے صرف وہی بات نکلتی جو صداقت پر مبنی ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہوتی۔

آپ ﷺ لوگوں کی دلداری فرماتے اور اُن کو متنفر نہ کرتے، رب کریم نے بھی یہی نصیحت فرمائی ہے:

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (البقرہ:۲/۸۳)

''اور لوگوں سے بھلی بات کیا کرو۔''

کسی قوم و برادری کا معزز شخص اعزاز کا معاملہ فرماتے (اور حسنِ اَخلاق کا یہ لازمی تقاضا ہے)۔

لوگوں کے بارے میں محتاط تبصرہ کرتے بغیر اس کے کہ اپنی بشاشت اور اخلاق سے اُن کو محروم فرمائیں، اپنے اصحاب کے حالات کی برابر خبر رکھتے، لوگوں سے لوگوں کے معاملات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے اور شانِ نبوت تو درجہ احسان سے ہمکنار ہے اور یہی اہل ایمان کی شان ہے:

لُوا الَّتِ يْ هِ يَ اَ حْ سَ نُ ﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/۵۳)

﴿ وَ قُ لْ لِ عِ بَا دِ يْ يَ قُ وْ

''اور (اے نبیؐ!) میرے بندوں (یعنی مومن بندوں) سے کہہ دیجیے کہ زبان سے وہ باجھی نبات لیں کی حواچھائی نیاہو کرتے اور اُس کو قوت پہنچاتے، بُری بات کی برائی کرتے اور اسے کمزور کرتے، اس میں تغیرّ و تبدّل نہیں ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کا معاملہ معتدل تھا اور یکساں تھا اور غور کیجیے قرآن حکیم کی روشن تعلیمات اس بات کی غمازی کرتی ہیں اور یہی بات اُس کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (المائدہ:۵/۲)

''نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہو جبکہ گناہ اور ظلم و زیادتی میں مدد نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔''

اسلام کی حقانیت پر غور کرو کہ زندگی کو کتنا کھرا اصول بتا دیا گیا، اس میں ذاتی عناد اور دشمنی کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اگر دشمن بھی کوئی اچھی بات کرتا ہے تو اسے سچ کہو اور اگر اپنا ہی کوئی غلط بات کرتا ہے تو اسے برا کہو۔

آپ کے قریب جو لوگ رہتے تھے، وہ سب سے اچھے اور منتخب ہوتے تھے، آپ ﷺ کی نگاہ میں سب سے افضل وہ تھا، جس کی خیر خواہی اور اخلاق عام ہو، سب سے زیادہ قدر و منزلت اس کی تھی، جو غمخواری و ہمدردی اور دوسروں کی مدد اور معاونت میں سب سے آگے ہو، ان لوگوں کا قرآن

اس طرح ذکر کرتا ہے:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ (الدھر:۷۶/۸-۹)

”(اور یہ ابرار و صالحین) اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور اُن کے دل کی یہ صدا ہوتی ہے) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔“

ایسے ہی پاکیزہ نفس کو آخرت کے عذاب اور تکلیف سے دور رکھا جائے گا:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ (اللیل:۹۲/۱۷-۲۱)

”(اور آتشِ جہنم سے دور رکھا جائے گا) وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال (غربا و مساکین) کو دیتا ہے، اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو، وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے اور ضرور (وہ محسن رب قدیر) اس سے خوش ہوگا۔“

پھر روزِ جزا وہ محسن رب اس طرح اعلان فرمائے گا:

﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

(المائدہ:۵/۱۱۹)

”محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔“

(اے رب کریم! آج کل کے مسلمانوں کو ویسا ہی بنا دے، آمین!)

آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے کھڑے ہوتے اور اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بیٹھتے قرآن نے اللہ کے بندوں کی یہی صفت بیان کی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ

السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿﴾

(ال عمران:۳/۱۹۱)

(اہلِ عقل و دانش کون ہیں؟ وہ) جو اٹھتے بیٹھتے (چلتے پھرتے) اور (جب آرام کرنے کے لیے) لیٹتے ہیں گویا ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمانوں کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں (وہ غور کرتے ہوئے بے اختیار بول اٹھتے ہیں) ''اے ہمارے رب! یہ سب کچھ آپ نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، آپ پاک ہیں، اس سے کہ آپ بیکار بنائیں، پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے (آمین)''

جب کہیں تشریف لے جاتے تو جہاں مجلس ختم ہوتی اُسی جگہ تشریف رکھتے اور اس کا حکم بھی فرماتے، اپنے حاضرینِ مجلس اور ہم نشینوں میں ہر شخص کو (اپنی توجہ اور التفات میں) پورا حصہ دیتے، آپ کا شریکِ مجلس یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر آپ ﷺ کی نگاہ میں کوئی اور نہیں ہے، اگر کوئی شخص آپ کو کسی غرض کے لیے بٹھا لیتا یا کسی ضرورت میں آپؐ سے گفتگو کرتا تو نہایت صبر وسکون سے اُس کی پوری بات سنتے، یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنی بات پوری کر کے رخصت ہوتا، اگر کوئی شخص آپ ﷺ سے کچھ سوال کرتا اور کچھ مدد چاہتا تو اس کی ضرورت پوری کیے بغیر واپس نہ فرماتے یا کم از کم نرم وشریں لہجہ میں جواب دیتے، آپ ﷺ کا حسنِ اخلاق تمام لوگوں کے لیے وسیع اور عام تھا اور تمام لوگ حق کے معاملے میں آپ ﷺ کی نظر میں برابر تھے۔

آپ ﷺ کی مجلس، علم ومعرفت، شرم وحیا اور صبر و امانت کی مجلس تھی۔ نہ اس میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، نہ کسی کے عیب بیان کیے جاتے تھے، نہ کسی کی عزت و ناموس پر حملہ ہوتا تھا، نہ کمزوریوں کی تشہیر کی جاتی تھی، سب ایک دوسرے کے مساوی تھے اور صرف تقوٰی کے لحاظ سے ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی تھی، اس میں لوگ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ رحمدلی و شفقت کا معاملہ کرتے تھے، حاجتمند کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، مسافر اور نو وارد کی حفاظت کرتے اور اس کا خیال رکھتے تھے۔

قرآن حکیم کی پاکیزہ تعلیمات میں اہل ایمان کو اسی بات کی تعلیم و تربیت دی گئی ہے کہ چھپے اور

ظاہر ان کی مجالس میں لوگوں کی صلاح وفلاح کی گفتگو ہونی چاہیے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾

(المجادلہ:۹/۵۸)

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں پوشیدہ (یا کھلے) بات کروتو گناہ، زیادتی اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ نیکی اور تقوٰی کی باتیں کرو اور اُس اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور تمہیں حشر میں پیش ہونا ہے۔''

پھر فضیلت اور برتری کا معیار حسب ونسب نہیں بلکہ تقوٰی اور طہارت رکھا گیا ہے جس کا حصول غریب سے غریب شخص کے لیے بھی ممکن ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات:۱۳/۴۹)

''(رب کریم کا ارشاد ہے) لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا (تمام انسانوں کے جدِ امجد، سیدنا آدم علیہ السلام اور سیدہ بی بی حوا علیہا السلام ہیں) اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

سیدنا علیؓ کہتے ہیں:

''آپ ﷺ ہمہ وقت کشادہ رو اور انبساط و بشاشت کے ساتھ رہتے تھے، بہت نرم اخلاق اور نرم طبیعت تھے۔ گفتگو شگفتہ اور مٹھاس سے لبریز۔ نہ آواز میں تلخی اور نہ سختی، نہ کسی کو عیب لگانے والے، نہ تنگ دل اور بخیل، جو بات آپ ﷺ کو پسند نہ ہوتی، اس سے تغافل فرماتے (یعنی اس کو نظر انداز کر دیتے اور گرفت نہ فرماتے) اور صراحتاً اس سے مایوسی بھی نہ فرماتے اور اس کا جواب بھی نہ دیتے (البتہ حدود اللہ کے معاملہ میں کسی رو رعایت کی قطعی کوئی گنجائش نہ تھی)۔

رسول اللہ ﷺ نے تین باتوں سے اپنے آپ کو بالکل بچا کر رکھا، ایک جھگڑا، دوسرے تکبر اور تیسرے غیر ضروری اور لایعنی کام، اور لوگوں کو بھی تین باتوں میں آپ ﷺ نے بچا رکھا تھا۔ نہ کسی کی برائی کرتے تھے، نہ اُس کو عیب لگاتے تھے اور نہ اُس کی کمزوریاں اور پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑتے تھے اور صرف وہ کلام فرماتے تھے جس پر ثواب کی امید ہوتی تھی۔

جب گفتگو کرتے تھے تو شرکائے مجلس ادب سے اس طرح سر جھکا لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سب کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں، جب آپ ﷺ خاموش ہوتے تب یہ لوگ بات کرتے، آپ ﷺ کے سامنے کبھی نزاع نہ کرتے، اگر آپ ﷺ کی مجلس میں کوئی شخص گفتگو کرتا تو بقیہ سب لوگ خاموشی سے سنتے یہاں تک کہ وہ اپنی بات ختم کر لیتا، آپ ﷺ کے سامنے ہر شخص کی گفتگو کا وہی درجہ ہوتا جو اُن کے پہلے آدمی کا ہوتا (ہر شخص کو پورے اطمینان سے اپنی بات کہنے کا موقع ملتا اور ہر شخص کی گفتگو کو پوری قدر دانی اور اطمینان کے ساتھ سنا جاتا تھا)۔

قرآن حکیم نے رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھنے کے جو آداب سکھائے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اُسے پوری طرح ملحوظ رکھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ (الحجرات:۴۹/۲،۳)

”اے ایمان والو! اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی ﷺ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو، جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے (تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں) اور تمہیں خبر بھی نہ ہو، جو لوگ رسول اللہ کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے، ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔“

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ وہ ادب ہے جو رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والوں کو سکھایا گیا تھا، اس کا منشا یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملاقات اور بات چیت میں اہل ایمان آپ ﷺ کا انتہائی احترام ملحوظ رکھیں، کسی شخص کی آواز آپ کی آواز سے بلند تر نہ ہو۔ آپ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے لوگ یہ بھول نہ جائیں کہ وہ کسی عام آدمی یا اپنے برابر والے سے نہیں بلکہ اللہ کے رسول سے مخاطب ہیں، اس لیے عام آدمیوں کے ساتھ گفتگو اور آپ ﷺ کے ساتھ گفتگو میں نمایاں فرق ہونا چاہیے اور کسی کو آپ سے اونچی آواز میں کلام نہ کرنا چاہیے۔

یہ ادب اگرچہ نبی ﷺ کی مجلس کے لیے سکھایا گیا تھا اور اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھے مگر بعد کے لوگوں کو بھی ایسے تمام مواقع پر یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جب آپ ﷺ کا ذکر ہو رہا ہو یا آپ ﷺ کا کوئی حکم سنایا جائے، یا آپ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ بیان کی جائیں، اس کے علاوہ اس آیت سے یہ ایما بھی نکلتا ہے کہ لوگوں کو اپنے سے بزرگ تر اشخاص کے ساتھ گفتگو میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے، کسی شخص کا اپنے بزرگوں کے سامنے اس طرح بولنا جس طرح وہ اپنے دوستوں یا عام آدمیوں کے ساتھ بولتا ہے، دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اُس کے دل میں اُن کے لیے کوئی احترام موجود نہیں ہے اور وہ اُن میں اور عام آدمی میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔

﴿أَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین میں ذاتِ رسول ﷺ کی عظمت کا کیا مقام ہے، رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی شخص، خواہ بجائے خود کتنا ہی قابل احترام ہو، بہرحال یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ اُس کے ساتھ بے ادبی اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس سزا کی مستحق ہو جو حقیقت میں کفر کی سزا ہے، وہ زیادہ سے زیادہ ایک بدتمیزی ہے، خلافِ تہذیب حرکت ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے احترام میں ذرا

سی کمی بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اُس سے آدمی کی عمر بھر کی کمائی غارت ہو سکتی ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ کا احترام دراصل اُس اللہ کا احترام ہے جس نے آپ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپ ﷺ کے احترام میں کمی کے معنی اللہ تعالیٰ کے احترام میں کمی کے ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَھُمۡ لِلتَّقۡوٰی﴾ یعنی جو لوگ اللہ تعالی کی آزمائشوں میں پورے اترتے ہیں اور اُن آزمائشوں سے گزر کر جنہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اُن کے دلوں میں فی الواقع 'تقوٰی' موجود ہے، وہی لوگ اللہ کے رسول ﷺ کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہیں، اس ارشاد سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ جو دل رسول اللہ ﷺ کے احترام سے خالی ہے وہ درحقیقت تقوٰی سے خالی ہے اور رسول کے مقابلے میں کسی کی آواز کا بلند ہونا محض ایک ظاہری بدتہذیبی نہیں ہے، بلکہ باطن میں تقوٰی نہ ہونے کی علامت ہے (یہ جاننا چاہیے کہ ﴿والعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ﴾ کہ عاقبت کی کامیابی تو صرف اہل تقوٰی کے لیے ہے)'' (تفہیم القرآن، ج٥)

جس بات پر سب لوگ ہنستے اس پر آپ ﷺ بھی تبسم فرماتے، جس سے سب تعجب کا اظہار کرتے آپ بھی تعجب فرماتے (صحابۂ کرام کے ساتھ روکھا پھیکا انداز نہ رکھتے) مسافر اور پردیسی کی بدتمیزی اور سوال کو صبر وتحمل کے ساتھ سنتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے صحابہؓ ایسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے (تاکہ آپ ﷺ پر کوئی بار نہ ہو)۔

یہی قرآن حکیم کی بلند تعلیمات ہیں اور آپ ﷺ اس کی جیتی جاگتی تصویر تھے:

﴿وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴾

(اٰل عمران ٣:١٣٤)

''جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں۔''

آپ ﷺ فرمایا کرتے: ''تم کسی حاجتمند کو پاؤ تو اس کی مدد کیا کرو، آپ مدح وتعریف اُسی شخص کی کرتے جو حدِّ اعتدال میں رہتا، کسی کی گفتگو کے دوران کلام نہ فرماتے اور

اُس کی بات کبھی نہ کاٹتے، ہاں اگر وہ حد سے بڑھنے لگتا تو اُس کو منع فرما دیتے یا مجلس سے اٹھ کر اُس کی بات قطع فرما دیتے۔

آپ ﷺ سب سے زیادہ فراخ دِل، راست گفتار، نرم طبیعت اور معاشرت و معاملات میں نہایت درجہ کریم تھے، جو پہلی بار آپ کو دیکھتا وہ مرعوب ہو جاتا آپ ﷺ کی صحبت میں رہتا اور جان پہچان حاصل ہوتی تو آپ ﷺ کا فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتا، آپ ﷺ کا ذکرِ خیر کرنے والا کہتا کہ نہ آپ ﷺ سے قبل میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی شخص دیکھا نہ آپ ﷺ کے بعد۔ (ﷺ) (شمائل ترمذی بحواله نبی رحمتﷺ)

اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہی کو اپنی رضامندی کی علامت قرار دیا ہے۔

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (آل عمران:۳/۳۱)

”(اے نبی!) لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“

ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد ہوا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:٤/٨٠)

”جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔“

یہ اتباع اور یہ اطاعت زندگی کے ہر معاملے میں ہو گی۔ عبادات، معاملات، معاشیات، سیاسیات، اخلاق و عادات وغیرہ وغیرہ اور گلستانِ محمدیؐ اس قدر سرسبز و شاداب، تروتازہ وسیع اور سدابہار ہے کہ اس سے فیض یاب ہونے والے زندگی کی سعادتوں کو اپنے دامن میں چنتے ہیں اور انہیں دنیا اور آخرت کی کامیابیاں ملتی ہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان علمائے کرام کو، سیرت نگار احباب کو جنہوں نے محنت شاقہ فرما کر دنیا کی مختلف زبانوں میں حیاتِ طیبہ کے پھولوں کو جمع کیا ہے،

عاجز نے بھی ان میں سے چند پھول آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے:

کھانے پینے کے انداز

رسول اللہ ﷺ ٹیک لگا کر کھانا تناول نہ فرماتے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے ''میں بندہ ہوں اور بندوں کی مانند بیٹھتا ہوں اور ایسے ہی کھاتا ہوں جیسے بندے کھاتے ہیں (آپ ﷺ کی نشست اس قسم کی تھی کہ گویا گھٹنوں کے بل ابھی کھڑے ہو جائیں گے) یعنی اکڑوں بیٹھ کر۔

(زاد المعاد بحوالہ اُسوۂ رسول اکرم ﷺ- ڈاکٹر عبدالحی)

کھانے پینے میں سنتِ نبوی یہ تھی کہ جو کھانا موجود ہوتا، اسی پر اکتفا کرتے، نہ موجود کو رد کرتے نہ غیر موجود کے لیے اہتمام فرماتے، طیبّات میں سے جو کچھ بھی پیش کر دیا جاتا، تناول فرما لیتے، اِلّا یہ کہ طبیعت کراہت کرتی تو ہاتھ اٹھا لیتے، مگر اس کی مذمّت نہ فرماتے، جو مرغوب ہوا کھا لیا ورنہ خاموشی کے ساتھ چھوڑ دیا۔

بارہا ایسا ہوا کہ گھر میں بالکل کھانا نہ رہا، مگر آپ ﷺ نے نہ تو کسی سے مانگا، نہ شکایت کی، بلکہ صبر وشکر کیے رہے بسا اوقات بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر تک باندھ لیے ہیں، اور تین تین دن بغیر غذا کے بھوکے رہے مگر اف تک نہ کی (بلکہ ایسا بھی ہوا کہ کاشانۂ نبوت میں کئی کئی دن چولہا گرم نہ ہوا، تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا تو پھر آپ لوگ کیسے گزارا کرتے، فرماتیں کہ صرف کھجوروں اور پانی پر)

پانی ہمیشہ بیٹھ کر پیتے، لیکن کھڑے کھڑے پینا بھی ثابت ہے چنانچہ ایک مرتبہ چاہِ زمزم پر تشریف لائے، لوگ پانی پی رہے تھے، آپ ﷺ نے بھی طلب فرمایا، ڈول بڑھا دیا گیا اور آپ ﷺ نے بے تکلفی سے کھڑے کھڑے ہی پی لیا، ایک سانس میں پانی پینے یا برتن کے اندر سانس لینے سے منع کیا ہے، فرمایا ''پانی پیو تو چوس کر پیو'' اور فرمایا ''پانی پیتے ہوئے برتن میں سانس مت لو، بلکہ پیالہ ہٹا کر سانس لے لو۔ (غور کیجیے اس میں بے شمار طبی فوائد ہیں)

صحیح مسلم میں ہے کہ جب پانی پیتے تو پیالہ ہٹا کے تین مرتبہ سانس لیتے اور فرماتے ''اس طرح پینا زیادہ خوشگوار اور مفید ہے۔'' ترمذی میں ہے کہ فرمایا:

''ایک سانس میں پانی نہ پیو، بلکہ دو اور تین دفعہ ٹھہر کر پیو، بسم اللہ سے شروع کرو اور جب پی چکو تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرو۔'' کھانے میں بھی یہی دستور تھا کہ بسم اللہ سے شروع کرتے اور الحمدللہ پر ختم کرتے۔ (زاد المعاد، ابن قیمؒ)

آپ ﷺ کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے اور سیدھے ہاتھ سے اپنے سامنے سے کھانا شروع کرتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانے کے بیچ میں برکت اُترتی ہے، تو کھانا ہر طرف سے کھاؤ، بیچ سے مت کھاؤ۔ (ابوداؤد، بحواله رياض الصالحين)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو درمیان میں یاد آنے پر اس طرح پڑھ لیا کرے ﴿بِسۡمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَ آخِرَهٗ﴾ یعنی یہ کھانا شروع بھی اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے ہوا اور آخر میں بھی اسی کے نام کی برکت سے ختم ہوا۔ (حواله ايضاً)

مہمان میزبان کے لیے دعائیہ کلمات سے رخصت ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے میزبان کے لیے یہ دعا ارشاد فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ بَارِكۡ لَهُمۡ فِيۡمَا رَزَقۡتَهُمۡ وَاغۡفِرۡلَهُمۡ وَارۡحَمۡهُمۡ)) (مسلم، بحواله حِصنُ المُسلِم)

''اے اللہ! آپ نے انہیں جو کچھ دیا ہے، اس میں ان کے لیے برکت فرما، انہیں بخش دے اور ان پر رحم فرما۔''

اسلام کی بلند تعلیمات پر غور کیجیے کہ کوئی شخص اگر کسی کے ہاں مہمان بننے کا شرف حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے میزبان کو دعائیہ کلمات سے نواز دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کے لیے ان کلمات سے دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ اَطۡعِمۡ مَنۡ اَطۡعَمَنِيۡ وَاسۡقِ مَنۡ سَقَانِيۡ)) (مسلم، بحواله حِصنُ المُسلِم)

''اے اللہ! جو مجھے کھلائے آپ اسے کھلائیے اور جو مجھے پلائے آپ اسے سیراب کیجیے۔''

یہ قرآن حکیم کی روشن اور پاکیزہ تعلیمات کے ثمرات ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ وَ اشۡکُرُوۡا لِلّٰهِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاهُ

تَعۡبُدُوۡنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۷۲)

''اے ایمان والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعۡمَلُوۡا صَالِحًا اِنِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِیۡمٌ﴾

(المؤمنون: ۲۳/۵۱)

''اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال سرانجام دو اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو، میں اس کو خوب جانتا ہوں۔''

ان آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ نیک اعمال اور شکر کی توفیق انہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو رزقِ طیب کھاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وہی رزق ہو سکتا ہے جو حق حلال کی روزی ہو اور خوراک میں وہ چیزیں ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال ٹھہرایا ہو، مثلاً پانی حلال ہے جبکہ شراب حرام ہے۔

کھانے میں آسودگی کیسے ہو؟

رسول اللہ ﷺ سے صحابہٴ کرام نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! ہم کھانا کھاتے ہیں اور سیر نہیں ہوتے (تشنگی رہ جاتی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: شاید تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو، لوگوں نے عرض کیا ہاں! ایسا ہی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا مل کر کھایا کرو اور بسم اللہ کہہ کر شروع کرو، تو اس میں برکت ہوگی۔ (ابوداؤد، بحوالہ ریاض الصالحین)

اور اسی برکت کو حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''(مل کر کھانے سے) ایک شخص کا کھانا دو کو اور دو کا چار کو اور چار کا کھانا آٹھ لوگوں کو کافی ہو جاتا ہے۔

(مسلم،بحوالہ ریاض الصالحین)

پھر آپ ﷺ نے کھانے کے بعد (خاص طور پر ہاتھ سے چاول کھانے کے بعد) انگلیوں کے چاٹنے اور برتن کو صاف کرنے کا حکم دیا اور فرمایا تم نہیں جانتے ہو کہ تمہارے کس کھانے میں برکت ہے؟ مزید یہ ارشاد ہوا کہ جب کسی کا نوالہ گر جائے تو وہ اُس کو اٹھا کر صاف کر کے کھالے، (جبکہ وہ

سیال چیز نہ ہو) اس کو شیطان کے ٹنے سے پہلے رومال سے ہاتھ نہ پونچھے، اس لیے کہ اُس کو کیا معلوم کہ اُس کے کس کھانے میں برکت ہے؟ (مسلم، بحوالہ ایضاً)

اس برکت کے حصول کے لیے اگر اہلِ خانہ فرش پر چٹائی بچھالیں اور اس پر چھوٹے بڑے مل کر کھانا کھائیں تو اس سے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں نازل ہوں بلکہ تھوڑا کھانا بھی سب کے لیے کافی ہو جائے اور مہنگائی کے اس دور میں غریبوں اور مسکینوں کے لیے یہ بات تو بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

مہمان کی رعایت کو پیش نظر رکھنا

کسی مجمع میں کھانا تناول فرمانے کا اگر اتفاق ہوتا تو سب سے آخر میں آپ ﷺ ہی اٹھتے، کیونکہ بعض آدمی دیر تک کھاتے رہنے کے عادی ہوتے ہیں (یا بڑھاپے کی وجہ سے جلد نہیں کھا سکتے) ایسے لوگ جب دوسروں کو کھانے سے اٹھتا دیکھتے ہیں تو شرم کی وجہ سے خود بھی اٹھ جاتے ہیں، لہٰذا ایسے لوگوں کا لحاظ فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ بھی بہ تکلف تھوڑا تھوڑا کھاتے ہی رہتے (تاکہ دوسرے سیر ہو جائیں)۔ (زاد المعاد، بحوالہ اسوۂ رسول اکرم ﷺ ڈاکٹر عبدالحی)

اس روایت پر بھی غور کر لیجیے:

سیدنا جبلۃ بن سحیم رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ قحط کا زمانہ تھا، ہم سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، ہم کو کھانے کے لیے کھجوریں دی گئیں، ہم اس کو کھا رہے تھے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا اُدھر سے گزرنا ہوا، وہ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ دو دو کھجوریں ملا کر نہ کھاؤ، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، پھر کہا کہ اگر آدمی اپنے بھائی یعنی ساتھ کھانے والے سے اجازت لے لے تو پھر کچھ مضائقہ نہیں۔ (بخاری بحوالہ ریاض الصالحین)

آپ قرآن وسنت کی بلند تعلیمات پر غور کرتے جایئے وہ کھانے پر حریصانہ نگاہ کی بجائے سیر چشمی کی خوبی پیدا کرتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر جذبۂ ایثار سے سرشار کرتا ہے اور یہی بندۂ مومن کی عمدہ صفات ہیں جس سے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور رضا مندی حاصل کرتا ہے، اور آخرت کی فوز و فلاح بھی انہی لوگوں کے لیے ہے۔

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الحشر:۵۹/۹)

''یہ لوگ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچا لیے گئے وہی (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں۔''

کھانا کھانے کی بعض مفید ہدایات

یاد رکھیے یہ زندگی محض کھانے پینے کے لیے نہیں ہے بلکہ کھاتے پیتے اس لیے ہیں تاکہ ربِ کائنات کی بندگی کرسکیں اور اسے حسنِ اعمال سے آراستہ کرسکیں۔

الشیخ ابوبکر جابر الجزائریؒ نے کیا عمدہ بات لکھی ہے:

''مسلمان کی نظر میں سامان خورد ونوش اصل مقصود نہیں، وہ اس لیے کھاتا پیتا ہے کہ بدن کو زندہ رکھ سکے اور اللہ کی عبادت کا فریضہ سرانجام دے سکے اور یہی عبادت اسے دارِ آخرت کی عزت وسعادت کا اہل بنائے گی۔

اُس کا کھانا پینا کسی دنیاوی غرض کے لیے نہیں ہوتا اور نہ محض لذت اور شوق کے لیے، یہی وجہ ہے کہ جب بھوک لگتی ہے تو کھاتا ہے، پیاس لگتی ہے تو وہ پانی سے اپنی پیاس بجھا لیتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((نَحْنُ قَوْمٌ لَا نَأْكُلُ حتّٰى نَجُوْعَ، وَاِذَا أَكَلْنَا فَلَا نَشْبَعُ))

''ہم بھوک کے بغیر نہیں کھاتے اور جب کھاتے ہیں تو خوب جی بھر کر نہیں کھاتے (بلکہ کچھ بھوک رکھ کر کھانا چھوڑ دیتے ہیں)۔'' (منهاج المسلم)

طبی نقطۂ نظر سے صحت کو بحال رکھنے کا یہ وہ نادر نسخہ ہے جس سے کوئی شخص بیماریوں اور کڑوی کسیلی ادویات اور ڈاکٹر حضرات کی لمبی چوڑی فیسوں سے نجات پاسکتا ہے۔

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس گرم کھانا لایا جاتا تو آپ ﷺ اس کو اس وقت تک ڈھانپ کر رکھتے جب تک اس کا جوش ختم نہ ہو جاتا اور فرمایا کہ میں نے رسول

اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ سرد کھانے میں عظیم برکت ہے۔ اور کھانے پینے کے برتنوں کو ڈھانپنے کی تو آپ بہت زیادہ تاکید فرمایا کرتے تھے۔ (دارمی، بحوالہ اسوۂ رسول اکرم ﷺ، ڈاکٹر عبدالحی)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب کھانا سامنے رکھ دیا جائے تو جوتے اتار ڈالو اس لیے کہ جوتوں کے اتار ڈالنے سے قدموں کو بہت آرام ملتا ہے۔ (ابن ماجه، حواله ایضاً)

طبی نقطۂ نظر سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کھانا کھاتے وقت دل و دماغ کی آسودگی ضروری ہے اور انتہائی سکون اور دلجمعی سے کھانا تن پیٹ کو لگتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کھانے کے فوری بعد پانی نوش نہ فرماتے کیونکہ یہ مضِر ہضم ہے، جب تک کھانا ہضم کے قریب نہ ہو پانی نہ پینا چاہئے۔ (مدارج النبوه، بحواله اسوۂ رسول اکرم ﷺ، ڈاکٹر عبدالحی)

آپ ﷺ رات کا کھانا بھی تناول فرمایا کرتے تھے، اگرچہ کھجور کے چند دانے ہی کیوں نہ ہوں، فرمایا کرتے تھے کہ عشاء کا کھانا چھوڑ دینا بڑھاپا لاتا ہے۔ (جامع ترمذی، حواله ایضاً)

آپ ﷺ کھانا کھاتے ہی سو جانے کو منع فرماتے تھے۔ (یہ دل میں ثقالت پیدا کرتا ہے)۔

(زاد المعاد، حواله ایضاً)

آپ ﷺ دودھ اور مچھلی ایک ساتھ استعمال نہیں فرماتے اور نہ دودھ اور کھٹی چیز اور نہ ہی دو گرم غذاؤں کو یا سرد غذاؤں کو جمع فرماتے تھے، اسی طرح نہ دو قابض غذاؤں کو اور نہ دو اسہال لانے والی غذاؤں کو جمع فرماتے (کہ اس سے معدہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے)۔ (زاد المعاد)

آپ ﷺ سرد پانی کے ساتھ شہد ملا کر نوش فرماتے حفظانِ صحت کے لیے یہ ایک ایسا اصول ہے جس کی صرف فاضل اطباء ہی معرفت رکھتے ہیں۔ (حواله ایضاً)

رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی خالص صورت میں اور کبھی کبھی پانی ملا کر دودھ نوش فرماتے (گرم ممالک میں دودھ اور پانی کا استعمال نفع بخش ہے) اور دودھ پیتے وقت آپ ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

﴿اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَ زِدْنَا مِنْهُ﴾ (جامع ترمذی، حدیث:۳۷۸۹)

''اے اللہ! ہمارے لیے اس میں برکت دے اور ہمیں زیادہ عطا فرما۔''

بات یہ ہے کہ دودھ اتنی قیمتی نعمت ہے کہ خورد و نوش دونوں کا قائم مقام صرف یہی نعمت ہو سکتی

ہے۔ (زاد المعاد)

سیدہ عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ آپؐ تربوز خُرما (کھجور) کے ساتھ کھاتے اور فرماتے کہ اُس کی گرمی کا اُس کی سردی سے تدارُک ہو جاتا ہے۔ (اسوۂ رسول ﷺ - ڈاکٹر محمد عبدالحی)

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ طعام میں اگر چار باتیں جمع ہو جائیں تو وہ کامل طعام ہے:

۱- جب اس کی ابتدا میں بسم اللہ پڑھی جائے۔

۲- اور آخر میں الحمدللہ کہا جائے۔

۳- اور کھانا اجتماعی طور پر کھایا جائے۔

۴- کھانا حلال کمائی کا ہو۔ (زاد المعاد)

ناجائز ذرائع آمدنی اور حرام غذا سے تو دعا و مناجات اور صوم وصلوٰۃ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوتیں۔

سیدنا ابوھریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (سورۃ المؤمنون کی آیت ۵۱/ اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۲ جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے) تلاوت فرمائیں۔ پھر ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرتا ہے اور جس کے بال (اس سفر کے سبب) پراگندہ اور غبار آلود ہو رہے ہیں (اور اس حال میں) وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کرتا ہے: ''اے میرے رب! اے میرے رب! بھلا اس کی دعا کیسے قبول ہو جبکہ اس کا کھانا پینا اور اوڑھنا بچھونا حرام کا ہے اور وہ حرام کھا کر ہی پلا بڑھا ہے۔ (مسلم، کتاب الزکوٰۃ)

معلوم ہوا کہ شرفِ انسانیت کا لازمی تقاضا ہے کہ اس کا کھانا پینا اوڑھنا بچھونا، رہنا سہنا، چلنا پھرنا، اور دوسروں سے ملنا جلنا صاف ستھرا، حیا اور شرافت پر مبنی ہو، جس خالق نے اسے پیدا کیا ہے، اسی نے اس کے لیے شفاف اور پاکیزہ نظامِ حیات بھی عطا کیا ہے جس کا نام ﴿الدِّین﴾ رکھا ہے۔

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا﴾ (المائدہ:۵/۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے

اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔“

اس آیت پر سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”دین کو مکمل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظامِ تہذیب و تمدّن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ نعمت تمام کرنے سے مراد نعمتِ ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے، اور اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے میری اطاعت و بندگی اختیار کرنے کا جو اقرار کیا تھا، اس کو چونکہ تم اپنی سعی و عمل سے سچا اور مخلصانہ اقرار ثابت کر چکے ہو، اس لیے میں نے اسے درجۂ قبولیت عطا فرمایا ہے اور تمہیں عملاً اس حالت کو پہنچا دیا ہے کہ اب فی الواقع میرے سوا کسی کی اطاعت و بندگی کا طوق تمہاری گردنوں پر باقی نہیں رہا، اب جس طرح اعتقاد میں تم میرے فرمانبردار ہو، اُسی طرح عملی زندگی میں بھی میرے سوا کسی اور کے مطیع بن کر رہنے کے لیے کوئی مجبوری تمہیں لاحق نہیں رہی ہے۔

(تفھیم القرآن، جلد ۱)

پھر اس دین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ قرآن حکیم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے ﴿كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن﴾ آپ کے اخلاقِ حسنہ تو قرآن کا عملی نمونہ ہیں، اس لیے مسلمانوں کو آپ ﷺ کا اتباع کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہے، اور آپ ﷺ کی اتباع ہی میں دنیا اور آخرت میں کامیابی ہے۔

ہماری حالت:

آج کا مسلمان اپنی شاندار اور بے مثال تہذیب و ثقافت کو بھلا چکا ہے اور بے ہودہ مغربی تہذیب و ثقافت اسے پسند آ گئی ہے۔ شادی بیاہ کے ”ہالز“ میں اس کا مشاہدہ کیجیے، بے حیائی اور بے حجابی تو الگ رہی، کھڑے کھڑے کھانا کھا رہے ہیں اور بائیں ہاتھ سے بوتلیں نوش کر رہے ہیں، مرد تو مرد رہے، بے پردہ خواتین بھی اس نقالی میں شامل ہیں، حرص و ہوس کا کیا کہنا، کھانے پر اس

طرح لپکتے ہیں گویا کہ وہ کئی دن سے بھوکے ہیں اور گھومتے پھرتے کھا رہے ہیں اور اس میں دائیں بائیں ہاتھ کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ پھر مزید ستم یہ کہ مرد و خواتین حضرات کی مووی بن رہی ہے اور شرم وحیا کی تمیز اٹھ چکی ہے، پھر کھانا کھانے کے اوقات کی بھی پابندی نہیں ہے، اگر رات 9 بجے کھانے کا وقت دیا گیا ہے، وہ تو دعوتی کارڈ پر وقت چھپا ہے، آپ بروقت پہنچتے ہیں تو ہال خالی پڑا ہوتا ہے، لوگ دس گیارہ بجے پہنچنے شروع ہوتے ہیں اور پھر آ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں، وقت پر آنے والے شرفاء تھک جاتے ہیں اور وقت پر سونے والے اونگھنے لگتے ہیں، اِدھر انہیں بھوک ستا رہی ہوتی ہے اُدھر گھر واپس ہونے کی فکر! پھر فجر کی نماز کے لیے بھی پریشانی، گھر واپس ہوئے تو شب کے، ایک ڈیڑھ بج چکے تھے، تھکے ماندے آئے تھے، آنکھ لگ گئی، صبح جو آنکھ کھلی تو دن روشن تھا، آہ! فجر کی نماز باجماعت نہ پڑھی جا سکی کتنا بڑا نقصان ہوا، اَسْتَغْفِرُ اللّٰه، اَستَغْفِرُ اللّٰه.

یہ حال دنیا دار لوگوں کا نہیں بڑے بڑے دیندار گھرانوں کا دیکھا ہے:

ذرائعِ آمدنی

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں آپ نے پڑھا کہ ''طیب رزق'' سے ہی عبادات قبول ہوتی ہیں مگر افسوس ہمارے یہاں اس کی تمیز بھی رخصت ہو چکی ہے۔

دھوکہ اور فریب سے کمانا، رشوت اور سودی کاروبار معمولی باتیں سمجھی جاتی ہیں، یتامیٰ کا مال کھانا بڑا آسان بن گیا ہے، کم تولنا اور ملاوٹ کرنا کاروباری ہنر خیال کیا جاتا ہے، جوا یعنی شرط لگا کر کمانا (لکی کمیٹی، پرائز بانڈ وغیرہ جوا کھیلنے کی مہذّب شکلیں ہیں) یہ سب ناجائز راہیں ہیں۔

اسلام نے صرف اور صرف امانت و دیانت سے تجارت کو اور حق حلال کی روزی کو جائز قرار دیا ہے، اسی میں خیر و برکت ہے اور اسی سے عبادت و ریاضت میں حلاوت ہے۔

رب کریم! ہمیں صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی عطا فرمائے آمین!!

سونے جاگنے کے آداب

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ ہے، آپ ﷺ کی اتباع ہی میں ان کے لئے دنیا اور آخرت کی فوز و فلاح ہے۔

مسلمان نیند کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتا ہے اس لئے کہ سارے دن کی مسلسل جدوجہد اور حرکت کے بعد رات کے اوقات میں انسان کا نیند لینا جسم کی زندگی، نشونما اور تندرستی کے لیے ضروری ہے تاکہ انسان وہ ذمہ داری پوری کر سکے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے، رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَ مِنۡ رَّحۡمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴾ (القصص:۲۸/۷۳)

’’اور اس نے تمہارے لئے اپنے فضل وکرم سے دن رات مقرر کر دیئے کہ تم رات میں آرام کرو اور دن میں (تازہ دم ہو کر) اس کی بھیجی ہوئی روزی تلاش کرو تاکہ (اس طرح کے بے پایاں احسانات کا) تم میں شکرگذاری کا جذبہ پیدا ہو۔‘‘

سونے سے قبل رسول اللہ ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ اور اسوۂ حسنہ کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

۱- نماز عشا کے بعد سونے میں تاخیر نہ کی جائے اِلّا یہ کہ کوئی ضرورت ہو۔ مثلاً کوئی علمی مذاکرہ، مسلمان کے ساتھ کوئی بات چیت اور افرادِ خانہ کے ساتھ انس ومحبت کی باتیں (یا طالبِ علم کا اپنے اسباق دہرانا)۔ سیدنا ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عشا سے پہلے سونا اور بعد میں باتیں کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ (بخاری و مسلم، بحواله منهاج المسلم، ابوبکر جابر الجزائری)

۲- کوشش کی جائے کہ باوضو ہو کر سونا چاہیے کیونکہ رسول ﷺ نے براء بن عازبؓ کو حکم دیا:

((اِذَا أَتَیۡتَ مَضۡجِعَكَ فَتَوَضَّأۡ وُضُوئَكَ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ اضۡطَجِعۡ عَلٰی شِقِّكَ الۡاَیۡمَنِ))

(صحیح مسلم، بحواله منهاج المسلم)

’’جب تم (سونے کے لئے) اپنے بستر پر آؤ تو وضو کرو جس طرح تم نماز کے لئے کرتے ہو، پھر اپنے دائیں جانب لیٹ جاؤ۔‘‘

آپ ﷺ کبھی بستر پر سوتے، کبھی چٹائی پر، کبھی زمین پر۔ بستر کے اندر کھجور کے ریشے بھرے ہوتے تھے (زادالماد، حافظ ابن قیمؒ) آپ ﷺ دائیں کروٹ پر لیٹتے، دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رکھتے، پھر فرماتے:

((بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ أَمُوْتُ وَ أَحْيَا)) (صحیح بخاری: کتاب الدعوات)

''الٰہی آپ ہی کے نام سے میرا جینا اور مرنا ہے۔''

اور یہ دعا بھی ارشاد فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ قِنِىْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ)) (سنن ابوداؤد)

''الٰہی جس دن بندے اٹھائے جائیں، مجھے عذاب سے بچائیو۔''

اس کے علاوہ آپ ﷺ نے مندرجہ ذیل مناجات واذکار کی بھی نصیحت فرمائی:

سیدنا علی اور سیدہ فاطمہؓ نے گھریلو کام کاج میں تعاون کے لئے رسول ﷺ سے ایک خادم مانگا۔اس پر آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاتا ہوں جب بستر پر آرام کے لئے آؤ تو 33 بار تسبیح (سُبْحَانَ الله)، 33 بار حَمدُ (اَلْحَمْدُلِلّٰهِ)اور 34بار تکبیر (اَللّٰهُ اَكْبَر) کہو' یہ تمہارے لئے خادم سے بہتر ہے۔ (صحیح مسلم بحوالہ منہاج المسلم)

حدیث مبارکہ میں یہ بھی آتا ہے کہ صاف ستھرے بستر پر داہنا قدم رکھ کر بیٹھ جاؤ، اس کے بعد سورة قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْن، قُلْ هُوَ اللّٰه احد، قُل اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقْ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پوری پوری سورتوں کو پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دم کر کے ان دونوں ہاتھوں کو تمام بدن پر پھیرو، اس طرح تین بار کرو، آیۃ الکرسی اور سورہ بقرہ کی آخری آیات ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ -سے لے کر- اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ تک ان کے پڑھنے سے رات بھر شیطان کے شر اور اس کے وسوسے سے محفوظ رہو گے۔ (دعائیں التجائیں، مولانا محمد داؤد راز)

یہ آیاتِ قرآنی اور دعائیں ایسی ہیں جو ہر شخص کو زبانی یاد ہوتی ہیں جن کا بستر پر پڑھنا مشکل نہیں ہے بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کو پڑھتے پڑھتے بندۂ مومن اللہ کی رحمت سے نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے اور ذاکرین کی صف میں شامل ہو جاتا ہے، جن کے متعلق اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(ال عمران:۳/۱۹۱)

”(اہل بصیرت اور عقلمند کون لوگ ہیں؟) جو اُٹھتے بیٹھتے (چلتے پھرتے) اور (پہلو کے بل) لیٹتے، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (اور ان کی زبانوں پر بے اختیار یہ کلمات جاری و ساری ہو جاتے ہیں) اے ہمارے رب! آپ نے یہ سب کچھ فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، آپ پاک ہیں اس سے کہ آپ کی طرف سے کوئی بے فائدہ بات ہو۔ پس اے رب، ہمیں عذابِ جہنم سے بچا لیجیے۔“

اس کے علاوہ سونے سے پہلے بعض سورتوں کا پڑھنا بھی باعثِ فضیلت و اجر ہے:

۱- حٰمٓ السّجدہ (سورت نمبر ۴۱) اس کے پڑھنے سے عذابِ قبر سے نجات ملتی ہے۔

۲- المُلْکُ (سورت نمبر ۶۷) اس کے پڑھنے سے عذابِ قبر سے نجات ملتی ہے۔

۳- الدُخانُ (سورت نمبر ۴۴) اس کے پڑھنے والے کے لیے ستر ہزار فرشتے صبح تک اس کے حق میں دعا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے بخشش کے طلبگار ہوتے ہیں۔

۴- الواقعۃُ (سورت نمبر ۵۶) اس کے پڑھنے سے رزق میں کشادگی آتی ہے۔

(دیکھئے اسلامی وظائف، مولانا عبدالسلام بستوی)

جب نیند نہ آئے:

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص بستر پر کروٹیں لیتا ہے، مگر نیند آنکھوں میں نہیں سماتی اس وقت وہ پریشان ہو جاتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے اُس وقت کیلئے یہ کلمات سکھائے ہیں:

((اَللّٰھُمَّ غَارَتِ النُّجُوْمُ وَھَدَأَتِ الْعُیُوْنُ وَ اَنْتَ حَیٌّ قَیُّوْمٌ، لَا تَأْخُذُکَ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ اَھْدِئْ لَیْلِیْ و أَنِمْ عَیْنِیْ)) (عمل الیوم واللیلۃ، ابن سنی: حدیث:۷۴۷)

”یا اللہ! ستارے چھپ گئے اور آنکھیں آرام لینے لگیں، آپ تو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والے ہیں، آپ کو نیند اور اُونگھ نہیں (آپ کی ذات ان باتوں سے مبرّا ہے) اے ہمیشہ زندہ رہنے والے اور سب کے سہارے، مجھے آرام دیجیے اور میری آنکھ کو سلا دیجیے“۔

ڈرنے اور برے خواب دیکھنے پر:

اچھا خواب دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرے اور بُرا خواب دیکھ کر شیطان کے شر سے پناہ

مانگے اور ان کلمات کو ادا کرے۔

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ وَ سَیِّئَاتِ الْاَحْلَامِ فَاِنَّھَا لَا تَکُوْنُ شَیْئًا))

(الموطاء، امام مالك باب الرؤيا)

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان کے عمل سے اور برے خواب سے کیونکہ اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔''

جب نیند میں کوئی شخص ڈرے یا پریشان خواب دیکھ کر خوف زدہ ہو تو اس کو چاہیے کہ بائیں جانب تھک کر کروٹ بدل دے اور تین مرتبہ شیطان کے شر سے پناہ مانگے یعنی ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ پڑھ کر اس دُعا کو پڑھ لے:

((اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَ عِقَابِهٖ وَ شَرِّ عِبَادِهٖ وَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّیٰطِیْنِ وَ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ)) (ترمذی، ابوداؤد بحوالہ اسلامی وظائف، عبدالسلام بستوی)

''اللہ تعالیٰ کے پورے کلمات کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں اس کے غصہ اور اس کے عذاب اور اس کے بندوں کی برائی سے اور شیطانوں کے وسوسوں سے اور ان کے میرے پاس حاضر ہونے سے۔''

نمازِ تہجد اور اللہ کے حضور فریاد

رات کا پچھلا حصہ بہت مبارک اور مقبول حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((یَنْزِلُ رَبُّنَا کُلَّ لَیْلَةٍ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا حِیْنَ یَبْقٰی ثُلُثُ اللَّیْلِ الْاٰخِرُ، فَیَقُوْلُ مَنْ یَّدْ عُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبَ لَهٗ مَنْ یَّسْئَلُنِیْ فَاُعْطِیَهٗ، مَنْ یَّسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرَلَهٗ)) (بخاری، مسلم، بحوالہ اسلامی وظائف)

''رات کے پچھلے تہائی حصہ میں اللہ تعالیٰ ہر رات کو آسمانِ دنیا پر نزولِ اِجلال فرما کر ارشاد فرماتے ہیں، کوئی دعا کرنے والا ہے جو مجھ سے دعا مانگے اور میں اس کی دعا قبول کروں۔ (کوئی تنگ دست، بیمار، لاچار اور کمزور ہے) کہ میں اس کی تنگ دستی اور بیماری کو دور کر دوں، کوئی معافی کا خواستگار ہے، جو معافی چاہے اور میں اُس کو معاف کر دوں۔''

گویا کہ لیل و نہار میں یہ وہ قیمتی لمحات ہیں جب ربِ کریم کی رحمتیں برس رہی ہوتی ہیں اور اس کی جانب سے پکار لگ رہی ہوتی ہے۔ اور ان سے فیض یاب ہونے والے یقیناً خوش بخت لوگ ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرما دے۔ (بحوالہ اسلامی وظائف)

تہجّد کے لیے اٹھے تو آسمان کی طرف دیکھے اور سورۂ آلِ عمران کی آخری دس آیاتِ مبارکہ کی تلاوت کرے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ...... سے لے کر ...... وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تک﴾ (آیت: ۱۹۰-۲۰۰)

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”میں ایک رات اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر سویا تھا کہ رسول اللہ ﷺ آدھی رات کے وقت (یا اس سے پہلے یا اُس کے بعد اٹھے) اپنے چہرے پر نیند زائل کرنے کے لیے ہاتھ پھیرا، پھر سورۂ آلِ عمران کی آخری دس آیات تلاوت کیں اور پھر پرانے مشکیزے کی طرف آئے اور اچھی طرح وضو کیا اور کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔“ (منهاج الْمُسْلِمْ)

یہ تو بڑی ہمت کی بات ہے، اور آپ ﷺ نے رب کی رحمت اور اُس کے فضل سے پُر مشقّت زندگی گزاری۔ دعوت و تبلیغ کے فرائض، رب کی ریاضت اور عبادت کی لگن، غربا و مساکین، بیواؤں اور یتامیٰ کی خدمت، جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی دوڑ دھوپ، گویا کہ حیاتِ طیبہ کیا ہے؟ مسلسل اور پیہم دن رات جدوجہد اور کوشش کا نام ہے، زندگی پھولوں کا ایک مہکتا ہوا گلدستہ ہے ؎

یقین محکم، عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

رات کو آنکھ کھلے تو کم از کم وضو کر کے دو رکعت نماز ادا ہی کر لی جائے اور ربِ کریم کے حضور اپنی جھولی پھیلا دی جائے یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے بستر پر ”استغفار“ کو وردِ زبان بنا لیجیے۔ متقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الذاریات: ۵۱/۱۸)

”وہ رات کے پچھلے اوقات میں (اپنے رب سے گریہ وزاری کے ساتھ بخشش کے طلبگار

ہوتے۔“

اور اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ، اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ کے الفاظ ان کی زبانوں پر جاری و ساری ہو جاتے ہیں اور پھر بروقت باجماعت فجر کی نماز ادا کرتے ہیں۔

جاگنے کے بعد اور بستر سے اٹھنے سے پہلے یہ پڑھیے:

((اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ اَحۡیَانَا بَعۡدَ مَا أَمَاتَنَا وَ اِلَیۡہِ النُّشُوۡرُ)) (منهاج المسلم، بحواله صحيح بخاری)

”ہر تعریف اور ہر شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندگی دی ہے اور بالآخر اس کی طرف اٹھنا ہے۔“

یعنی انسان یہ خیال کرے کہ نیند کی حالت میں ہی وہ ربِ قدیر میری روح قبض کر سکتا ہے، اس نے بیداری کے ساتھ میرے سانس کو بحال رکھا ہے، نیند لینے کے بعد میں تازہ دم ہو گیا ہوں، جس نے مجھے زندگی عطا کی ہے، میں اُسی کی فرمانبرداری میں اس کو گزار کر اس سے انعام کا حقدار بن سکتا ہوں۔

● آدابِ لباس:

جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے، آپؐ کی پاکیزہ زندگی یقیناً احکامِ الٰہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، اس لیے رب کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَن یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ (النساء:٤/ ٨٠)

”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی (رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے والا حقیقت میں احکامِ الٰہی کو ماننے والا ہے)۔“

انسان کا تمام تر شرف تہذیب و اخلاق میں مُضمر ہے اور صرف اسلام ہی وہ پاکیزہ دین ہے جس میں انسانوں کو شرم و حیا کی اَقدار سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ذٰلِکَ خَیۡرٌ﴾ (الاعراف:٧/ ٢٦)

”(رب کریم کا ارشاد ہے) اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس بنایا ہے، جو

تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور تقویٰ کا لباس، یہ اس سے بڑھ کر ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیتِ مبارکہ کی تشریح میں کیا خوب لکھا ہے:

''ریش'' کا لفظ چڑیوں کے پروں کے لیے بھی آتا ہے اور اس سے زیب و زینت کا لباس بھی مراد ہوتا ہے، لباس کا اولین مقصد تو ستر پوشی لیکن زیب و زینت بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی بنائی ہے، اس میں مختلف پہلو ملحوظ رکھے ہیں اور یہ سارے ہی پہلو ہماری فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں، ستر پوشی کے لیے تو لنگوٹ بھی کافی تھا لیکن رب کریم نے اِتمام نعمت کے طور پر ہمارے لیے ایسے لباس کا انتظام فرمایا جو ستر پوش بھی ہو، سردی اور گرمی سے بھی ہماری حفاظت کرے اور اس سے ہماری شخصیت، ہمارے وقار ہمارے حسن اور ہماری شان میں بھی اضافہ ہو، ان میں سے کوئی مقصد بھی بجائے خود معیوب نہیں ہے، البتہ افراط یا تفریط سے جس طرح ہر چیز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح اس میں بھی خرابی ہوسکتی ہے قرآن نے زینت کو مقاصدِ لباس میں داخل کر کے اس جوگیانہ تصور کی نفی کر دی ہے جو لباس کو ایک آلائش اور عریانی یا نیم عریانی کو مذہبی تقدس کا درجہ دیتا ہے۔

﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ یعنی ظاہری لباس کے ساتھ ساتھ ایک باطنی لباس بھی انسان کو عطا ہوا ہے اور وہ تقویٰ کا لباس ہے جو اس ظاہری لباس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے کہ درحقیقت یہ تقویٰ کا لباس ہی ہے جو ظاہری لباس کی بھی حقیقی افادیت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ سچ پوچھیے، تو آدمی اس ظاہری لباس کو اختیار کرتا ہی ہے اپنے اُسی باطنی لباس کی تحریک سے، اگر یہ نہ ہو تو آدمی کپڑے پہن کر بھی ننگا ہی رہتا ہے اور اس کے لباس سے اس کے وقار میں اضافہ ہونے کے بجائے یا تو اس کی رعونت میں اضافہ ہوتا ہے یا وہ حیا سے تہی دامن ہو جاتا ہے جبکہ ''لباس تقویٰ'' حیا، شرافت، خشیتِ الٰہی اور احساسِ عبدیت سے بنتا ہے اور جس کے قامت پر اللہ اپنی عنایت کی یہ رِدا ڈال دیتا ہے،

دیکھنے کے قابل وقار و جمال اُسی کا ہوتا ہے، یہ انسانوں کے لباس میں مقدس فرشتہ ہوتا ہے، جو بھی اُسے دیکھتا ہے بے تحاشا ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا، اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ یہ شخص انسان نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، پکار اٹھتا ہے۔ (تدبرِ قرآن، ج:۳)

اسلام نے لباس کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل ہدایات دی ہیں جن کو اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱- لباس ساتر ہو یعنی وہ جسم کو ڈھانپتا ہو، مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے۔

۲- مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لیے مردوں کا سا لباس پہننا جائز نہیں ہے۔

۳- ایسا لباس پہننا جو زمین پر گھسٹتا رہے تکبر اور غرور کی علامت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر و غرور کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی طرف نظر نہیں اٹھائے گا، مردوں کا لباس ٹخنوں سے اونچا اور عورتوں کا ٹخنوں سے نیچا رہے۔

۴- ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں، پہننا ٹھیک نہیں، خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں، یا مولویوں کا نمائشی عَبا، جبّہ یا صوفیوں کی گیروا رنگ، کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے اور یہ تفوّق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

۵- مردوں کے لیے عام طور سے سفید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

۶- آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہیے۔

۷- سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کی تمام خوبیوں میں لباس کا ستھرا رکھنا اور کم پر راضی ہونا پسند ہے، رسول ﷺ میلے اور گندے کپڑوں کو مکروہ اور ناپسند جانتے تھے۔ (اسوۂ رسول ﷺ، ڈاکٹر عبدالحی)

۸- رسول اللہ ﷺ تکبر و غرور کی مذمت فرماتے تو صحابہ عرض کرتے یا رسول اللہ! آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کی جوتیاں عمدہ ہوں، اس پر رسول اللہ ﷺ فرماتے:

﴿اِنّ اللّٰہ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الجَمَالَ﴾ ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔“

”اَلْکِبْرُ بَطَرُ الحقِ“ تکبر و غرور تو اصل میں سچائی کو حقارت سے دیکھنا ہے۔ (اُسوۂ رسولؐ)

مندرجہ بالا گفتگو سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ لباس صاف ستھرا ہو خواہ وہ کھدر ہی کا کیوں نہ ہو، اگر وہ عمدہ کپڑے کا ہو تو اس میں غرور و عجب کا اظہار نہ ہو، بلکہ شرافت اور حیا نمایاں ہو۔

ایک صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس حال میں دیکھا کہ میرے جسم پر کم قیمت کے کپڑے تھے تو فرمایا کہ کیا تیرے پاس از قسم مال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں! اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے مال و دولت سے نوازا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اُس کی بخشش کو تمہارے جسم سے ظاہر ہونا چاہئے، مطلب یہ ہے کہ تونگری کی حالت کے مناسب کپڑے پہنو اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

اور ایک اُلجھے ہوئے بالوں والے، پریشان حال سے فرمایا کہ کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس سے اپنے سر کو تسکین دے۔ (یعنی بالوں کو کنگھا کرے اور انہیں سنوار کر رکھے)۔

اور ایسے شخص کو دیکھا جس پر میلے اور غلیظ کپڑے تھے، فرمایا کہ یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس سے اپنے کپڑوں کو دھولے (یعنی صابن وغیرہ) (مدارج النبوۃ، بحوالہ اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ)

آپ ﷺ اچھے سے اچھا کپڑا بھی استعمال کرتے اور معمولی سے معمولی بھی، حتیٰ کہ پیوند تک لگا لیتے، سنن ابو داؤد میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارک پر بہتر لباس دیکھا ہے۔ (زاد المعاد)

اس پر امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

”پس جو لوگ زہد و عبادت کے خیال سے اچھے کپڑے اور اچھے کھانے کو منع کرتے ہیں یا جو لوگ موٹے جھوٹے کھانے اور سادہ کپڑے کو غرور سے ناپسند کرتے ہیں دونوں کے دونوں سنّتِ نبویؐ سے منحرف ہیں، سنّتِ نبویؐ میں ہر بات اعتدال پر مبنی ہے، افراط و تفریط کا وہاں گزر نہیں، اسی بنا پر علمائے سلف نے حد سے زیادہ قیمتی اور حد سے زیادہ معمولی کپڑے کے استعمال کو ناپسند کیا ہے۔ (کیونکہ دونوں لباس شہرت میں داخل ہیں)

اس بارے میں کوئی خاص اصول بنایا نہیں جا سکتا، مختلف حالات میں مختلف لباس مناسب ہوتا ہے، چنانچہ شہرت و تکبر کے خیال سے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا لباس بھی مذموم ہوتا ہے اور عمدہ سے عمدہ لباس بھی حمد و شکر کی نیّت سے محمود ہو جاتا ہے، سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور سعد بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کپڑا پہنتے تو یوں ارشاد فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ مِنۡ خَيۡرِهٖ وَ خيۡرِ مَا صُنِعَ لَهٗ وَ اَعُوۡذُبِكَ مِنۡ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهٗ))

(ابو داؤد، بحواله دعائیں التجائیں، مولانا محمود اؤد راز دهلوی)

''اے اللہ! میں آپ سے اس کی خیر اور جس کے لیے بنایا گیا ہے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور میں آپ سے اس کے شر اور جس کے لیے یہ بنایا گیا اُس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

سیدنا معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس آدمی نے نیا لباس پہن کر کہا:

((اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِی كَسَانِیۡ هٰذَا وَ رَزَقَنِيۡهِ مِنۡ غَيۡرِ حَوۡلٍ مِنِّیۡ وَ لَا قُوَّةٍ)) (حواله ایضا)

''تمام حمد و ثنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے مجھے یہ لباس پہنایا اور میری محنت و قوت کے بغیر مجھے عطا کیا۔ (یعنی جو کچھ عطا اور بخشش ہے، سب کچھ اُسی کا انعام ہے) اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

صفائی اور دائیں جانب

آپ ﷺ کو ہر کام میں یہی پسند تھا کہ داہنی جانب سے شروع ہو، جوتا پہننا، کنگھی کرنا، غسل کرنا، دینا لینا وغیرہ۔

- **آدابِ گفتگو:**

ربِ کریم نے انسان کو بہترین شکل و صورت سے نوازا ہے:

﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ﴾ (اَلتّین:۹۵/٤)

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔''

علم وعقل سے بھی اسے ہی آراستہ فرمایا ہے اور پڑھنے لکھنے کی ترغیب دی گئی اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی اس میں اسی شرف کا ذکر فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴾ (اَلْعَلَق:۹۶/۱-۵)

''(اے نبیؐ) پڑھیے اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھیے اور آپ کا رب تو بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ (اللہ تعالیٰ کی معرفت کا اور زندگی گزارنے کا سلیقہ اور قرینہ عطا فرمایا)۔

جس کا نام دین ''اسلام'' ہے۔

پھر انسان ہی کو قوتِ بیان کی نعمت سے بھی نوازا گیا:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ﴾(الرحمٰن:۵۵/۱-۴)

''(اللہ) رحمٰن نے قرآن سکھایا، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اور اسے بولنا سکھایا۔''

پھر اس نے حسنِ کلام کے آداب سے بھی شرف بخشا اور ارشاد ہوا:

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (البقرہ:۲/۸۳)

''اور (دیکھو!) لوگوں کے ساتھ اپنی گفتگو میں 'حسن' پیدا کرو۔

عربی زبان کے لفظ ''حسن'' میں بڑی گہرائی ہے، اس سے مراد نرمی اور مٹھاس سے بولنا، سچی اور اچھی بات کہنا، کسی کے فائدے اور نفع کی بات کرنا، اس کے ساتھ ساتھ بُری اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرنا، دوسروں کو برا بھلا کہنے اور گالی گلوچ سے رک جانا، غیبت اور چغلی کھانے سے باز رہنا، یہ سب باتیں ''حسن'' میں شامل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَدَّ بَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَأْدِیْبِیْ))

''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہترین تربیت سے آراستہ فرمایا۔''

یہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم وتربیت کا سروسامان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔
آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا جس رخ سے بھی مطالعہ کریں وہاں جمال اور کمال ہی نظر آتا ہے اور زندگی کا ہر پہلو قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔

● **نرمی سے بولنا:**

دیکھیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ مصر کے بادشاہ 'فرعون' کے دربار میں جائیں اور اُس ظالم بادشاہ کو دعوتِ حق پہنچائیں، مگر اپنا لب ولہجہ نرم رکھیں:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (طٰہٰ:۲۰/۴۴)

"(موسیٰؑ اور ہارونؑ) تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بڑی سرکشی کی ہے مگر اسے نرمی سے سمجھاؤ کہ شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے۔"

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"یہ وصف بھی داعیانِ حق کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ سختی سے لوگ بدکتے اور دور بھاگتے ہیں اور نرمی سے قریب آتے اور متاثر ہوتے ہیں۔" (احسن البیان)

جناب رسول اللہ ﷺ کی نرم دلی، حسنِ لطافت، کمالِ شفقت، بلندیٔ اَخلاق پر قرآن گواہی دیتا ہے اور رب العالمین کی شہادت سے بڑھ کر اور کس کی شہادت ہوسکتی ہے؟ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران:۳/۱۵۹)

"(اے نبیؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ ان لوگوں کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہیں ورنہ اگر کہیں آپ تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب آپ کے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔"

پھر قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم:۶۸/۴)

"اور بلاشبہ آپ اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں۔"

قاضی محمد سلیمانؒ منصور پوریؒ لکھتے ہیں:

”سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے دس برس تک آپ ﷺ کی خدمت کی اس تمام عرصے میں آپ نے انہیں کبھی اُف (ہونھ) تک نہ کہا، زبانِ مبارک پر کبھی کوئی ناروا بات یا گالی نہیں آئی اور نہ کسی پر لعنت کیا کرتے، بلکہ دوسروں کی اذیت اور تکلیف پر صبر کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ نہایت نرمی کا معاملہ فرماتے ہاتھ یا زبانِ مبارک سے کبھی کسی کو دکھ نہ دیا، کنبہ کی اصلاح اور قوم کی درستی پر نہایت توجہ فرماتے، ہر شخص اور ہر چیز کی قدر و منزلت سے آگاہ تھے، رب کریم کی طرف ہمیشہ نظر لگائے رکھتے تھے۔

(حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولیؒ اللہ، بحوالہ رحمۃ للعالمین)

اس زبانِ مبارک سے انتہائی کرب اور تکلیف کی حالت میں بھی لوگوں کے لیے دعائے خیر نکلی، وادیٔ طائف میں وعظ اور تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے، وہاں کے باشندوں نے (نعوذ باللہ) آپ ﷺ پر پتھر برسائے کہ جسدِ اطہر زخموں سے چور چور تھا، مگر لب مبارک پر اُن کے لیے ہدایت و رحمت کے کلمات جاری تھے، آخر آپ کی دعا کے اثرات ظاہر ہوئے اور وہ لوگ نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے اور تاریخِ اسلام میں کتنے ہی واقعات ہیں کہ لوگ آپ ﷺ کے حسنِ اخلاق اور خوش کلامی سے مسلمان ہو گئے، فتح مکہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لسانِ صدق سے قریش مکہ کے لیے معافی کا جونہی اعلان ہوا، آپ ﷺ کے حسنِ اخلاق سے فوج در فوج لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ قرآن اس کا منظر اس طرح کھینچتا ہے:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ (النصر: ۱۱۰)

”جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی، تو آپ نے لوگوں کو فوج در فوج اسلام میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔ پس آپ بھی اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے اور اس کی مغفرت کے طلب گار رہیے، بلاشبہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ حق کو پھیلاتے ہوئے اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیا جاتا، بلکہ تیزی اور تندی کے مقابلے میں ہر وقت نرمی اور لطافت کو سامنے رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اور یہی بات رب

کریم کی پاکیزہ ہدایات کا اعجاز ہے، اس کے ثمرات و اثرات کیا نکلتے ہیں، قرآن اس کا اعلان اس طرح کرتا ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ (حٰمٓ السجدہ: ۴۱/۳۴)

’’اور (اے نبیؐ) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، آپ بدی کو اس نیکی سے دفع کیجیے جو بہترین ہو، آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔‘‘

قرآن حکیم اور حیاتِ طیبہ

قرآنِ حکیم کے پاکیزہ احکام کی عملی صورت حیاتِ طیبہ میں نمایاں جھلکتی ہے، یا قرآنی احکام کی جو تشریح و توضیح آپ نے فرمائی ان احادیثِ مبارکہ کو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ آیئے اس سلسلہ میں آیاتِ قرآنی کو احادیثِ نبوی کے ذیل میں مطالعہ کرتے ہیں۔

● **استقامت:**

رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (حٰمٓ السجدہ: ۴۱/۳۰)

’’جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور پھر وہ اُس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ ایک صحابی کو اس طرح نصیحت فرماتے ہیں:

سفیان بن عبداللہ الثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے اسلام کی کوئی ایسی جامع بات بتا دیجئے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((قُلْ آمَنْتُ بِا اللّٰهِ فَاسْتَقِمْ)) (مسلم، رقم الحدیث:۳۸)

کہو، میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ثابت قدم رہو۔

● اِخلاص:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

(المؤمن:۴۰/۶۵)

''(اللہ تعالیٰ) زندہ ہے جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، پس تم خالص اُسی کی عبادت کرتے ہوئے اُسے پکارو، تمام خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ فرض نماز سے سلام پھیرتے تو یہ کلمات بھی ارشاد فرماتے:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ))

(ابو داؤد، رقم الحدث ۱۵۰۶)

''اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، وہ یکتا ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں ہے (پوری کائنات میں) بادشاہت اسی ہی کی قائم ہے اور ہر حمد وثنا کا صرف وہی مستحق ہے اور اسے ہر چیز پر کلی اختیار ہے۔

● صبر وشکر

صبر کرنے پر قرآن حکیم اس طرح خوشخبری دیتا ہے:

﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (الرعد:۱۳/۲۴)

''تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا، اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو۔''

پس کیا ہی خوب ہے، یہ آخرت کا گھر!

شکر پر یہ مژدۂ جانفزا سناتا ہے:

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (ابراھیم:۱۴/۷)

''اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ

نوازوں گا۔"

رسول اللہ ﷺ صبر وشکر کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

صہیب بن سنان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَ لَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، اِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْراً لَهٗ، وَاِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَفَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ))

(صحیح مسلم، ریاض الصالحین، رقم الحدیث:۲۸)

یعنی مومن کا معاملہ بھی خوب ہے، یہ مومن ہی کی خصوصیت ہے جب اُس کو خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے پس اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور جب مصیبت پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو پڑھ جایئے کہ وہ ''صبر وشکر'' سے آراستہ نظر آتی ہے۔

مثلاً جب کھانا مل جاتا تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے ہوئے تناول فرما لیتے اور ایسا بھی ہوا کہ گھر میں کھانا نہ ہوتا تو صبر فرماتے اور بسا اوقات کا شانۂ نبوت ﷺ میں پیہم کئی روز تک چولہا گرم نہ ہوتا۔ اُمُّ المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا تو پھر آپ لوگ کیسے گزر بسر کرتے تھے؟ ارشاد فرماتی تھیں کہ پانی اور کھجور سے یہ دن گزرتے۔" (دیکھئے سیرت النبی، شبلی نعمانی)

پھر غور کیجیے کہ دعوت وتبلیغ میں جن مشکلات اور مصائب کا آپؐ نے اور آپ کے صحابہؓ نے مقابلہ کیا وہ صبر وآزمائش کی طویل داستان ہے اور اس کے علاوہ غزوات و جہاد میں جس دلیری اور پامردی سے استقامت کی راہ دکھائی وہ صبر وثبات کی لازوال تاریخ ہے، آخر صبر کرنے والوں کے لیے رب کریم نے اجرِ عظیم کی نوید دی ہے۔

﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر:۳۹/۱۰)

''صبر کرنے والوں ہی کو ان کا پورا پورا اجر بے شمار دیا جاتا ہے۔"

قارئینِ محترم! قرآن کی آیات کو غور سے پڑھیئے، اُس مضمون کے مطابق احادیثِ مبارکہ آپ کو مل جائیں گی پھر سیرت النبیؐ اور سیرتِ اصحابِ رسول ﷺ کی پاکیزہ زندگیوں میں انہی اوصاف کی

جھلک نظر آئے گی۔

غصے پر ضبط کرنا:

قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

(آل عمران:۳/۱۳٤)

”جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے ہی نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں۔“

رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں کتنی عمدہ بات ارشاد فرمائی ہے جو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِی یَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ))

(متفق علیه، ریاض الصالحین، رقم الحدیث ٤٦)

”بہادر وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ دے (حقیقت میں) بہادر وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔“

ان تعلیمات کی روشنی میں ”اسوہ حسنہ“ کو پڑھ جایئے آپ کو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ضبط و حلم کے عظیم رتبے پر فائز کیا تھا، آپ ﷺ کی اس حلم اور برد باری سے بے شمار لوگ دائرہ اسلام میں آئے۔

مسلمانوں کے درمیان صلح وصفائی رکھنا

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ﴾ (الحجرات:٤٩/١٠)

”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست رکھو۔“

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی اخوت اور بھائی چارے کو کتنی عمدہ مثال سے بیان فرمایا ہے۔

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی تَوَادِّھِمْ وَتَرَا حُمِھِمْ وَ تَعَا طُفِھِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَکٰی مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰی لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّھَرِ وَالْحُمّٰی))

(متفق علیه، ریاض الصالحین، رقم الحدیث:۲۲۹)

''مومنوں کی مثال ان کے آپس کی محبت، رحمدلی اور مہربانی میں جسم کی طرح ہے، جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم جاگتا ہے اور اس کو بخار آجاتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے انصار و مہاجرین میں جو بھائی چارہ ''مواخاۃ'' قائم فرمایا اس کا نمونہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ہوگیا، کاش کہ مسلمان اس سے فیض حاصل کریں۔

رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ﴾

(یونس:۱۰/۵۸)

''(اے رسول ﷺ!) فرما دیجیے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (یہ کتابِ شفا آپ پر نازل کی گئی ہے) تو اس پر انہیں (مسلمانوں) کو خوش ہونا چاہیے کیونکہ یہ (روحانی عظمتوں کا گنجینۂ لازوال) ان تمام مادی وسائل سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔

قرآن حکیم کی پاکیزہ تعلیمات نے لوگوں کو نئی زندگی عطا کی...... ان کے عقائد کو سنوارا، اعمال کو نکھارا، جینے کا سلیقہ اور قرینہ عطا کیا، دنیا اور آخرت میں کامیابی کا مژدہ جانفزا سنایا اس طرح انہیں طہارت روح و عمل سے آراستہ کر کے کامیاب زندگی کا حسین تصور دیا، جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن'' اس لیے قرآنی تعلیمات کو سمجھنا آسان ہوگیا، آیئے قرآن حکیم کی چند تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں:

قرآنِ حکیم اور دعوت تعلیم و تعلّم

قرآن حکیم کے لامحدود احسان میں سے سرفہرست یہ احسان عظیم بھی ہے کہ وہ ہر انسان کو علم حاصل کرنے کی تاکید کرتا ہے اور حصول علم کی فضیلت و عظمت میں اپنے کلام معجز کی اس آیۂ کریمہ کو

بطور دلیل پیش کرتا ہے جو محسن انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عرش معلیٰ کے رب کی طرف سے غار حرا میں سب سے پہلے نازل ہوئی تھی:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ (العلق:۹۶/۱-۵)

"(اے نبیؐ) پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے (اس پوری کائنات کو) پیدا کیا، اور جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے انسان کی (بہترین شکل وصورت) میں تخلیق کی، پڑھیے، آپ کا رب بڑے ہی کرم والا ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا جس نے انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

مندرجہ بالا آیات پر غور کیجیے:

- انسان کو تعلیم وتعلّم کی روزِ اول ہی سے ترغیب دی گئی ہے اس کے بغیر وہ شرف انسانیت کو نہیں پا سکتا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حق صرف اور صرف حصول علم کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔
- قلم کی مدح سرائی فرما کر پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، قلم وقرطاس دعوتِ حق کو پھیلانے کا موثر ذریعہ بن سکتا ہے، لکھی ہوئی چیز محفوظ ہو جاتی ہے اور تذکیر ونصیحت کا ذریعہ بنتی رہتی ہے، قرآن کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿کَلَّآ اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ ○ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَهٗ ○ فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ ○ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ○ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ○ کِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ (عبس:۸۰/۱۱-۱۶)

"یاد رکھیے! یہ (قرآن تو) ایک (لوگوں کے لیے) یاد دہانی ہے (کہ اس کے احکام کو حرزِ جان بنا کر فوز وفلاح سے ہمکنار ہو جائیں) لہٰذا جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے، یہ تو بڑے ہی تکریم والے بلند مرتبہ اور پاکیزہ صحیفوں میں ہے اور ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے جو بزرگ اور نیکوکار ہیں۔

"کِرَامٍ بَرَرَةٍ" یہ لکھنے والے فرشتے بزرگ اور نیکوکار ہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

''خلق کے اعتبار سے وہ کریم یعنی شریف اور بزرگ ہیں اور افعال کے اعتبار سے وہ نیکوکار اور پاکباز ہیں، یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حاملِ قرآن (حفاظ اور علماء) کو بھی اخلاق و کردار اور افعال و اطوار میں کِرَامٍ بَرَرَۃ کا مصداق ہونا چاہیے۔

(تفسیر ابن کثیر، بحوالہ احسن البیان)

حدیث میں بھی سَفَرَۃٍ کا لفظ فرشتوں کے لیے استعمال ہوا ہے:

نبی ﷺ نے فرمایا ''جو قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس کا ماہر ہے، وہ ''السَّفَرَۃُ الْکِرَامُ الْبَرَرَۃُ'' (فرشتوں) کے ساتھ ہوگا، اور جو قرآن پڑھتا ہے، لیکن مشقت کے ساتھ (یعنی ماہرین کی طرح سہولت اور روانی سے نہیں پڑھتا) اس کے لیے دوگنا اجر ہے۔

(مسلم، کتاب الصلوٰۃ، بحوالہ احسن البیان)

- 'اقرأ' کا لفظ دوبارہ لا کر تعلیم حاصل کرنے کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نیز اس میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ہمارا رب بڑے ہی فضل و کرم والا ہے کہ جس نے انسان کو پڑھنے لکھنے سے آراستہ فرمایا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے بشارت دی ہے:

((خَیْرُکُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَہٗ))

''تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔

قلم کی عظمت

''سورۃ القلم'' میں رب کریم نے قلم کی قسم کھا کر حصولِ علم کے اس ذریعہ 'قلم' کو کتنی اہمیت و عظمت سے نوازا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ (القلم:٦٨/١)

''ن، قسم ہے قلم کی اور قسم ہے (ان فرشتوں کی) جو (اعمالنامے) لکھتے ہیں۔''

قرآن حکیم اور علماء کی فضیلت

قرآن حکیم علم ہی کی بنا پر تمام علمائے حق کو خصوصی عزت و تکریم کے بلند مرتبہ کا مستحق قرار دیتا

ہے اور اپنی آیاتِ کریمہ میں ''ایمان'' کے متوازی اہل علم کو مقامِ عظمت عطا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہل علم کے مقام و مرتبہ کا تذکرہ اس طرح آتا ہے:

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ (المجادلہ:۵۸/۱۱)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند کرے گا۔

گویا ایمان کے ساتھ علم سے بہرہ ور ہونا بلندی درجات کا ذریعہ ہے۔

ایک اور مقام پر اس طرح اہل علم کا تذکرہ ہے۔

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الروم:۳۰/۵۶)

''اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا (وہ مجرموں کو کہیں گے) کہ اللہ کی کتاب کے مطابق تم قیامت تک قبروں ہی میں رہے ہو اور یہی قیامت کا دن ہے، لیکن تمہیں اس دن کی آمد کا علم نہیں تھا۔''

مندرجہ بالا آیات پر ڈاکٹر محمد عثمان مصری اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''قرآن حکیم کی مذکورہ آیات پر غور فرمائیے، اللہ تعالیٰ نے پہلی آیتِ مبارکہ میں تو ''ایمان والوں کے عالی مرتبہ ہونے کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی علماء کے بلند مرتبہ ہونے کا اعلان بھی فرمایا اور دوسری آیتِ مبارکہ میں پہلے اہل علم کا ذکر کیا گیا ہے اور بعد میں ایمان والوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس تقابلی جائزہ میں علماء کی فضیلت و عظمت واضح ہوتی ہے (یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسوخ فی العلم سے ایمان کی روشنی مہیا ہوتی ہے)۔''

(قرآن اور علم النفس)

اس لیے ایک اور مقام پر اہل علم کے ساتھ ہی ملائکہ کو اقرارِ توحید اور اللہ تعالیٰ کے عدلِ قدرت اور عظمت کے گواہوں میں علماء اور فرشتوں کی ہم نوائی کا ذکر فرما کر علمائے حق کو بہت ہی بلند مرتبہ عطا کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (آل عمران:۳/۱۸)

”اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے (یاد رکھو!) اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔“

حافظ صلاح الدین یوسف اس آیت پر لکھتے ہیں:

”شہادت کے معنی بیان کرنے اور آگاہ کرنے کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا اور بیان کیا، اس کے ذریعے سے اس نے اپنی وحدانیت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی (اور رب العزت سے بڑھ کر بھلا کس کی شہادت ہو سکتی ہے؟) فرشتے اور اہل علم بھی اس کی توحید کی گواہی دیتے ہیں تاہم اس سے مراد صرف وہ اہل علم ہیں جو کتاب وسنت کے علم سے بہرہ ور رہیں۔ (فتح القدیر، امام شوکانیؒ، بحوالہ احسن البیان)

علماء کی یہی وہ جماعت ہے جن کے دلوں میں ہمہ وقت اللہ جل جلالہ کا خوف سمایا رہتا ہے:

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر:۲۵/۲۸)

”اللہ سے اُس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔“

اس آیتِ مبارکہ سے اگلی آیت میں ایسے اہل علم کی مزید صفات کا کچھ اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ (فاطر:۳۵/۲۹)

”جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں (تلاوت کے ساتھ ساتھ آیات پر غور وفکر کرتے ہیں) اور نماز کی پابندی کرتے ہیں (سنتِ نبویؐ کے مطابق ہر نماز کو باجماعت ادا کرتے ہیں) اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے رہتے ہیں (غربا ومساکین، بیواؤں اور یتیموں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں) وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی خسارہ میں نہ ہوگی (یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا یقینی طور

پر اجر ثبت ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ)''

علم میں ہمہ وقت زیادتی کی تمنا

علم ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے، غور کیجیے کہ خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وافر علم سے بہرہ ور فرمایا مگر مزید کے حصول کی طلب اور تڑپ کا جذبہ بھی عطا فرمایا اور یہ دعا سکھا دی:

﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ:۲۰/۱۱۴)

(اے نبیؐ) اپنے رب کے حضور یہ دعا کیا کیجیے ''رب کریم! میرے علم میں اضافہ فرماتے رہیے۔''

اور یقیناً یہ علمِ نافع کی تمنا اور آرزو تھی، اس لیے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَ عَلِّمْنِیْ مَا یَنْفَعُنِیْ وَزِدْنِیْ عِلْمًا)) (بحوالہ احسن البیان)

اے اللہ! جو کچھ آپ نے مجھے سکھایا ہے وہ میرے لیے نفع کا باعث بنایئے اور مجھے وہ سکھایئے جو مجھے نفع دے اور میرے علم میں اضافہ فرماتے رہیے۔

اور ایسا علم جو نقصان دہ ہے اس سے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ، وَ مِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا یُسْتَجَابُ لَھَا))

اے اللہ! میں آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے، ایسے دل سے جس میں خشوع وخضوع پیدا نہ ہو، ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو (یعنی لالچی اور حریص نفس) اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو۔

- **علم وحکمت:**

رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ (ابراھیم:۱۴/۱)

الٓرا، (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ایک (پرنور) کتاب ہے، اس کو ہم نے آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو (کفر کے) اندھیروں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی کی

طرف لیجائیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر یہ کتاب عظیم نازل ہوئی، جس سے کفر و شرک کے اندھیرے چھٹ گئے اسلام اور ایمان کا نور پھیلا، ظلم و ستم کی تاریکیاں دور ہوئیں اور عدل و انصاف کی کرنیں بکھرنے لگیں، جہالت اور گمراہی کی فضا رخصت ہوئی اور علم و حکمت کے موتی چمکنے لگے گویا کہ انسان نے اپنی عزت و عظمت کو پہچانا، جس سے دنیا اور آخرت کی فوز و فلاح کے راستے ہموار ہوئے۔

ڈاکٹر محمد عثمان نجاتی مصری لکھتے ہیں:

''قرآنِ حکیم کے ارشاد کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہے کہ ربِ کریم کی طرف سے انسان کو عطا کردہ نعمتوں میں سے سرفہرست دو ہی نعمتیں ہیں...... ''علم اور حکمت'' لیکن یہ دونوں عظیم نعمتیں نسلِ انسانی میں صرف ان ہی کو نصیب ہوتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ عطا کرنا چاہتا ہے، جس کی شرط واضح طور پر بیان کر دی گئی کہ علم و حکمت جیسی عظیم نعمتوں کے مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا ایمان غیر متزلزل ہو، مضبوط ہو، راسخ اور پختہ ہو اور وہ اعمالِ صالحہ کے مالک ہوں۔

اس کی وضاحت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ أُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (البقرہ:۲/۲۶۹)

وہ جسے چاہتا ہے حکمت سے نوازتا ہے اور جسے ''حکمت'' مل گئی بلاشبہ اسے بہت بڑی نعمت مل گئی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوتے ہیں۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علم و حکمت کی دو اہم ترین نعمتوں کے خصوصی مستحق اصفیا، انبیا اور رسل ہی کو قرار دیتا ہے، جن کا ذکر قرآن حکیم کی بہت سی آیات میں موجود ہے۔

مثلاً سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۴۷ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ

الْمُلْکُ عَلَیْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْهُ وَ لَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَیْکُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ وَ اللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْکَهٗ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ (البقرہ:۲/۲۴۷)

(بنی اسرائیل کے ایک نبی نے قوم سے فرمایا) اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنایا ہے، تو کہنے لگے بھلا اسے ہم پر کیسے حکومت کا حق ہو سکتا ہے، اس سے تو زیادہ حکومت کے حقدار ہم ہیں اور اس کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی، نبی نے (جواب میں) کہا۔ اللہ تعالیٰ نے تم سب پر اسے برگزیدہ کیا اور اسے علمی اور جسمانی برتری عطا فرمائی ہے (بات یہ ہے کہ) اللہ جسے چاہے ملک وحکومت دیتا ہے اللہ تعالیٰ انتہائی وسعتوں کا مالک اور علم والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّ عِلْمًا وَ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ﴾

(یوسف:۱۲/۲۲)

''اور جب (سیدنا یوسف علیہ السلام) جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو دانائی اور علم بخشا، اور نیکوکاروں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

سیدنا لوط علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (الانبیاء:۲۱/۷۴)

(رب کریم نے فرمایا) ہم نے لوط (علیہ السلام) کو بھی علم وحکمت سے نوازا۔

سیدنا داؤد علیہ السلام اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کی حکمت ونبوت کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

﴿وَ کُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (الانبیاء:۲۱/۷۹)

اور ہم نے دونوں کو (یعنی حکمت ونبوت) اور علم سے بہرہ ور فرمایا۔

ان عظیم نعمتوں کے ملنے پر ان کی زبانیں شکر گزاری کے جذبات سے لبریز ہو گئیں۔

﴿وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (النمل:۲۷/۱۵)

اور انہوں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی۔

مردِ صالح سیدنا لقمان علیہ السلام کی حکمت اور شکر گزاری کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ﴾ (لقمان:۱۲/۳۱)

(رب کریم نے فرمایا) اور ہم نے لقمان کو 'حکمت' سے نوازا تا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے۔

(قرآن کریم اور علم النفس)

معلوم ہوا کہ جسے اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرمائے، اس میں لازماً شکر گزاری کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور اس کے اثرات اس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے نمایاں ہوتے ہیں۔

اور خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اس نعمت عظیمہ کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا:

﴿وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (النساء:۱۱۳/۴)

اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت کو نازل فرمایا۔

اور مسلمانوں کو ان عظیم نعمتوں کو پانے کے بعد شکر گزاری کی تلقین کی جا رہی ہے۔

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (البقرہ:۲۳۱/۲)

"(مسلمانو!) اللہ تعالیٰ نے تم کو جو نعمتیں بخشی ہیں اور تم پر جو کتاب وحکمت کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے، ان کو یاد کرو (اور انہیں حرزِ جاں بناؤ)۔

اے رب کریم! ہمیں بھی اپنی رحمت سے بہرہ ور فرمائیے۔ آمین!

- **قرآن اور غور وفکر:**

قرآن حکیم کی دعوت تدبر وتفکر پر مبنی ہے وہ زبردستی اپنی بات نہیں منواتا بلکہ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عقل وشعور کی دولت سے نوازا، لہٰذا تم اس پر پوری طرح سے کام لو۔ کہیں اس نے کہا ہے "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ہو اور کہیں ارشاد ہوا "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ" کیا وہ غور وفکر نہیں کرتے؟

لیل ونہار کی آمد ورفت پر اس طرح متوجہ کرتا ہے:

﴿وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (المؤمنون:۲۳/۸۰)

اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اس (خالق کائنات) کا تصرف ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ہو؟

انسان کو اپنے وجود پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ آنکھیں، یہ کان، یہ ہاتھ پاؤں، یہ دل ودماغ کس نے عطا کیے ہیں؟

﴿وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الذاریات:۵۱/۲۱)

اور خود تمہارے نفوس میں (رب کائنات کی قدرت ہویدا ہے) تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

قرآن حکیم کے نزدیک عقلمند لوگ ہی اس کائنات پر غور وفکر کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۶۴)

”بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں اور جہازوں میں جو دریاؤں (اور سمندروں) میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں دواں ہیں اور بارش جسے اللہ تعالیٰ آسمان سے برساتا ہے اور اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے (خشک اور بنجر زمین کو سرسبز وشاداب بنا دیتا ہے) پھر اس زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھیرے رہتے ہیں، ان میں عقلمندوں کے لیے (رب عظیم و برتر) کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔“

یہ تو اَنْفُس وآفاق کی نشانیاں ہیں اور قرآن حکیم کی آیات کی حکمت وبصیرت بھی ان ہی لوگوں پر روشن ہوتی ہے جو ان پر غور وفکر کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد:۴۷/۲۴)

بھلا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے یا (اُن کے) دلوں میں قفل لگ رہے ہیں۔

گویا کہ قرآن حکیم کے معنی و مفاہیم سے وہی فیضیاب ہوتے ہیں جو اس کی آیات پر غور وفکر کرتے ہیں اور جو اپنے دلوں پر قفل لگا کر رکھتے ہیں (عقل وفکر کو پس پشت ڈال دیتے ہیں) وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ یہ کتابِ ہدایت اہل بصیرت کے لیے ہے نہ کہ ان کے لیے جنہوں نے بصارت رکھنے کے باوجود اپنی بصیرت کو گم کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر محمد عثمان نجاتی مصری اس پر بڑی مفید گفتگو کرتے ہیں:

"انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل کی ایسی صفت سے آراستہ کیا ہے جو اس کو حیوان سے ممتاز بناتی ہے۔ غور وفکر کی قدرت ہی نے انسان کو عبادات کا مکلّف بننے اور ارادہ و اختیار کی ذمہ داری اٹھانے کے لائق بنایا اور اسی امتیازی وصف کی وجہ سے زمین میں بارِ خلافت اس کے دوش پر ڈالا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات میں غور وفکر، مختلف کائناتی مظاہر کے مشاہدہ، اس کی کرشمہ سازیوں اور نظامِ محکم پر تدبّر کی ہدایت دی ہے، اسی طرح مختلف علوم کے تمام میدانوں میں اللہ تعالیٰ کے سُنَن وقوانین کی معرفت اور تحصیلِ علم کی ترغیب دی ہے، قرآن حکیم میں کئی مقامات پر غور وفکر، بحث وتحقیق اور حصولِ علم کی دعوت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ﴾ (العنکبوت:۲۰/۲۹)

کہہ دیجیے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔

(قرآن کریم اور علم النفس)

یعنی آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیاں دیکھو، زمین پر غور کرو، کس طرح اسے بچھایا، اس میں پہاڑ، وادیاں، نہریں اور سمندر بنائے، اسی سے انواع واقسام کی روزیاں اور پھل پیدا کیے، کیا یہ سب چیزیں اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ انہیں بنایا گیا ہے اور اس کا کوئی بنانے والا ہے۔

(تفسیر احسن البیان)

قرآن حکیم انسان کی قوتِ عقل اور قوت سماعت کو اس طرح بیدار کرتا ہے:

﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَ لٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ (الحج:۲۲/۴۶)

''کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تا کہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ اُن سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں (یعنی بصارت تو ہے مگر بصیرت سے محروم ہیں)۔''

جب افراد اور قوموں کے دل اندھے ہو جائیں تو وہ گمراہی اور ضلالت کے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ عبرت پذیری کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتے ہیں اور ہدایت کی بجائے گزشتہ قوموں کی طرح تباہی و بربادی ان کا مقدر بن کر رہتی ہے، پھر یہ لوگ شرفِ انسانیت کو ضائع کر دیتے ہیں اور اپنے مرتبہ و مقام سے گر جاتے ہیں اور حیوانات سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَ لَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَ لَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ (الاعراف:۷/۱۸۹)

''(جہنم میں جانے والے انسانوں اور جنوں کا حال یہ ہے) کہ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں، اُن کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں، یہ لوگ بالکل چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے، یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

قرآن حکیم نے انسانی وجدان کو روز مرہ کے مشاہدات سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کو حقائق معلوم کرنے کے لیے دلائل سے بات کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر زمین و آسمان کو دیکھو تمہارے لیے رب کائنات کی قدرت کی کرشمہ سازیاں نمایاں ہوں گی:

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (یونس:۱۰/۱۰۱)

''بھلا غور تو کرو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔''

کبھی وہ لوگوں کے ذہن وفکر اس طرح متوجہ کرتا ہے:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ○ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ○ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ○ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ﴾ (الغاشیہ:۸۸/۱۷-۲۰)

کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھا دی گئی ہے۔

اونٹ عرب میں عام تھے اور عرب لوگوں کی غالب سواری یہی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی کا ذکر فرمایا کہ اس کی خِلقت پر غور کرو، اللہ نے اسے کتنا بڑا وجود عطا کیا ہے اور کتنی قوت و طاقت اس کے اندر رکھی ہے، اس کے باوجود وہ تمہارے لیے نرم اور تابع ہے، تم اس پر جتنا چاہو بوجھ لاد دو، وہ انکار نہیں کرے گا، تمہارا ماتحت ہو کر رہے گا (پانی اور چارہ کھائے بغیر میلوں سفر طے کرتا ہے، بھوک اور پیاس کی قوتِ برداشت اس کے اندر رکھی گئی ہے) علاوہ ازیں اس کا گوشت تمہارے کھانے کے، اس کا دودھ تمہارے پینے کے اور اس کی اُون (سردی میں) گرمی حاصل کرنے کے کام آتی ہے۔ (احسن البیان)

﴿وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ﴾

یعنی آسمان کتنی بلندی پر ہے اور بغیر ستونوں کے وہ کھڑا ہے، اِس میں کوئی شگاف اور رخنہ نہیں ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے آفتاب و ماہتاب ستاروں اور سیاروں سے سجا دیا ہے، اور یہ سب اپنے اپنے محور میں گردش کر رہے ہیں، اُن میں کوئی تصادم نہیں ہوتا اور ان کا طلوع وغروب اپنے اپنے وقت پر ہوتا ہے اور سال بھر میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں پڑتا، آخر یہ کس کے حکم کے پابند ہیں؟

﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ﴾

﴿وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ﴾

یعنی بلند و بالا پہاڑوں کو رب کائنات نے اس طرح گاڑ دیا ہے کہ زمین کا توازن برقرار رہے اور ان پہاڑوں میں جو معدنیات کی دولت ہے وہ انسان کے لیے انتہائی مفید اور کارآمد ہے اور اس کی

معاشیات کو سدھارنے اور بہتر بنانے میں سازگار ہے۔

﴿وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ﴾

اللہ تعالیٰ نے زمین کو بچھا دیا ہے کہ اس پر شاہراہیں، مکانات تعمیر کرتا ہے، نیز کھیتی باڑی کرتا ہے پیدل اور گاڑیوں پر سیر وسفر کرتا ہے یہ تمام باتیں انسان کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

﴿فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ کُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ۝ وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ﴾ (الحجر:۱۵/۹۸-۹۹)

"(اے نبیؐ) آپ اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کرتے رہیں اور سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں اور رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ اس (عارضی دنیا) سے رخصت ہو جائیں۔"

کفار اور مشرکین کی ایذا رسانیوں پر آپ ﷺ کو اور پھر ہر بندہ مومن کو رب کریم کی طرف سے تسلی اور تشفی دی جا رہی ہے کہ وہ کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ اپنے رب کی حمد وثنا میں مصروف رہیں اور عبادت (یعنی ہر لمحہ اس کی اطاعت گزاری میں زندگی گزاریں) اس سے آپ کو قلبی سکون بھی ملے گا اور اللہ کی مدد بھی حاصل ہو گی، سجدے سے یہاں نماز اور یقین سے مراد موت ہے۔

عبادت پر امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

"اَلۡعُبُوۡدِیَّۃُ" کے معنی کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا مگر "اَلۡعِبَادَۃ" کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکساری ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ معنوی اعتبار سے "اَلۡعِبَادَۃ" کا لفظ "اَلۡعُبُوۡدِیَّۃ" سے زیادہ بلیغ ہے، لہٰذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے جو بے حد صاحبِ افضال وانعام ہو اور ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ کی ہے، اسی لیے ارشاد ہوا۔

﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ، اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ﴾

(اس پوری کائنات میں) اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے، اُسی نے ارشاد فرمایا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔"

'عبادت' کے معنی یقیناً احکامِ الٰہی کی پابندی ہے، اطاعت اور فرمانبرداری ہے، انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس اطاعت میں پیش پیش رہے اس لیے کہ ربِ کائنات نے اسے مندرجہ ذیل صفات سے آراستہ فرمایا ہے:

ا) تمام علوم سے بہرہ ور فرمایا ہے:

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرہ:۲/۳۱)

''اور رب نے (آدم کو سب چیزوں کے) نام سکھائے۔''

ب) پڑھنے لکھنے کی تعلیم دی، جو یقیناً انسان ہی کا خاصا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (اَلْعلق:۹۶/۱-۴)

(اے محمد) اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے (کائنات کی ہر چیز کو بنایا اور) پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھیے اور آپ کا رب تو بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

ج) قوت بیان سے نوازا جو مخلوقات میں صرف اسی کے حصے میں یہ نعمت آئی:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ (الرحمن:۵۵/۱-۴)

''(اللہ جو) نہایت مہربان، اسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی اس نے انسان کو پیدا کیا، اُسی نے اس کو بولنا سکھایا۔''

د) اگر عقل وفہم سے زینت عطا فرمائی تو شکل وصورت میں بھی ممتاز بنایا، یہ بھی خصوصیت اسی کے حصہ میں آئی:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین:۹۵/۴)

''(رب کریم کا ارشاد ہے) یقیناً ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا۔''

ر) قوتِ بصارت عطا فرمائی تو قوت بصیرت سے بھی بہرہ ور فرمایا، یہ نعمت بھی صرف انسان ہی کو ملی ہے:

﴿يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ (البقرہ:۲/۲۶۹)

(رب کریم) جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی اسے بہت بڑی نعمت ملی۔

ز) خلافت فی الارض یعنی زمین پر احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے کی ذمہ داری بھی انسان کے حصے میں آتی ہے، جو یقیناً بہت بڑا اعزاز ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ (البقرہ:۲/۳۰)

اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں (جو احکامِ الٰہی کو زمین پر نافذ کرے)۔

س) اور یہی خلافت لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے کام آتی ہے۔

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (ص:۳۸/۲۶)

(اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے) اے داوٗد ہم نے آپ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کیجیے؟

گویا کہ عدل و انصاف کا قیام احکامِ الٰہی کی پیروی ہے اور یہی مقصود عبادت ہے اور ان احکام کو نافذ کرنے میں راستے میں جو مشکلات اور مصائب آئیں انہیں پوری قوت اور طاقت سے دور کرنے کا نام 'جہاد' ہے۔

﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۸/۳۹)

اور اُن لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔

اقامتِ دین کے لیے ہر قسم کی سعی اور دوڑ دھوپ یقیناً عبادت ہے اور انسان کو پیدا کرنے کا یہی مقصد ہے۔

﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ (الشوریٰ:۴۲/۱۳)

اس دین کو قائم رکھو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔

یاد رکھو! اللہ کا دین اتفاق و اتحاد کی راہ پر چلاتا ہے اور یہی بات اقامتِ دین کا راستہ ہموار کرتی ہے جس سے مسلمانوں کو دنیا اور آخرت میں کامیابی مل سکتی ہے، اس کے برعکس پھوٹ ڈالنے والے

اور فرقوں میں بٹنے والے نقصان اٹھاتے ہیں اور روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُہُمۡ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ﴾ (الانعام:٦/١٥٩)

جنہوں نے اپنے دین میں (بہت سے) رستے نکالے (جبکہ اللہ کا دین ہمیشہ صاف ستھرا رہا ہے اور فرقہ بندی سے روکتا ہے) اور کئی کئی فرقے ہو گئے (اے نبیؐ) آپ کا اُن سے کوئی تعلق نہیں، بس ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے، پھر جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں (روزِ قیامت) وہ اُن کو سب بتائے گا (فرقہ بندیوں کی سزا بھگتیں گے)۔

اسلام کی دعوت عالمگیر ہے، وہ نسلِ انسانیت کو جوڑتا ہے اور یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت، دین اسلام کی طرف بلانا تھا، سب نے توحید کا درس دیا اور ربِ کائنات کی عبادت کی طرف بلایا یہ فرقہ بندیاں محض تمہاری خواہشات اور شیاطین کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں ہیں۔

﴿اِنَّ ہٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۫ۖ وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ﴾ (الانبیاء:٢١/٩٢)

(لوگو!) یہ تمہاری امت ہے جو حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں، پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔(احکام الٰہی کو حرز جاں بنا کر ان کا نفاذ کرو)

وہ اب بھی دعوت دیتا ہے کہ ہمارا اتفاق صرف اور صرف ایک ہی بات پر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اسی کے نظام کو اس دنیا میں جاری و ساری کریں اور ایک ہی دین کو اختیار کریں یعنی دین اسلام کو جو کھرا اور سچا طریقہ بندگی ہے اور یہی بات دنیا اور آخرت میں فوز و فلاح کا باعث ہے:

﴿قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡہَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ﴾ (آل عمران:٣/٦٤)

”(اے نبیؐ) آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو

شریک بنائیں اور نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی رب بنائیں، پس اگر وہ منہ پھیرلیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں (ہمارا طریقِ زندگی اسلام ہے)۔

ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ربِ کائنات نے انسان کو اس دنیا میں اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے اور اس کے معنی اس کے احکام کو عاجزی وخاکساری سے تسلیم کرنا اور پھر دنیا بھر میں اس کے نفاذ کے لیے مقدور بھر جدوجہد کرنا، مالی اور جانی قربانی دینا اور کفر و طاغوت سے نبردآزما ہونا اور اپنے مولا وآقا کی رضا کے لئے ہر دکھ اور تکلیف سہنا اور کلمۃ الحق کو بلند کرنا، یہی زندگی کے ارفع و اعلیٰ مقاصد ہیں، جہاں تک صوم وصلوٰۃ حج اور زکوٰۃ کا تعلق ہے تو یہ بھی بندگیٔ رب کا عملی اظہار ہے اور اس سے جڑنے اور رابطے کا ذریعہ ہے، اور اس سے وہ تربیت بھی مقصود ہے جو اقامتِ دین کے لیے اہلِ ایمان کو تیار کرتی ہے۔

﴿وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل: ۱۶/۸۹)

''(اے نبیؐ) ہم نے آپ پر (ایسی) کتاب نازل فرمائی ہے کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصّل ہے) اور مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔''

گزشتہ درس میں یہ بیان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر لحاظ سے اس دنیا میں فضیلت اور شرف سے نوازا ہے اور اسے خلافت فی الارض اور نیابتِ الٰہی سے بہرہ ور فرمایا ہے تاکہ وہ اس کے احکام کو نافذ کر کے اس زمین پر عدل وانصاف کا سکہ رواں کرے اور ہر شعبۂ حیات میں احکم الحاکمین کا قانون جاری وساری ہو جائے اور یہی عبادت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنا ہے اور اس راہ میں جو بھی مشکلات آئیں انہیں 'جہاد' سے دور کیا جائے۔

﴿وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: ۸/۳۹)

''اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔''

صوم وصلوٰۃ، حج اور زکوٰۃ یقیناً رب کی بندگی ہے مگر یہ عبادات اقامتِ دین کے لیے تربیت کا

سامان فراہم کرتی ہیں، آیئے غور کریں کہ کس طرح اہل ایمان کی ان سے تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عثمان نجاتی لکھتے ہیں:

''قرآن میں لوگوں کی شخصیات اور کردار و سلوک میں جو تبدیلی مطلوب تھی، اسے برپا کرنے کے لیے عشق و تکرار کا اسلوب اپنایا اور اسی لیے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسی مختلف عبادات فرض فرمائیں، مخصوص اوقات میں ان عبادات کی ادائیگی مومن کو اللہ کی اطاعت، اُس کے احکام کی تعمیل اور اس کی جانب توجہ اور دائمی سرافگندگی کی تعلیم دیتی ہے، اسے صبر، مصائب انگیزی، مجاہدۂ نفس اور خواہشات و شہوات پر ضبط سکھاتی ہے، لوگوں سے محبت اور حسنِ سلوک کی صفت پیدا کرتی ہے اور باہمی تعاون و ہمدردی کی روح بیدار کرتی ہے۔

یہ ساری صفات انتہائی اعلیٰ و ستُودہ ہیں جو مکمل و متوازن شخصیت کو آراستہ کرتی ہیں، جب مومن پورے اِخلاص اور کمال کے ساتھ ان عبادات کو بجالاتا ہے تو مذکورہ خِصالِ حمیدہ پیدا ہوتی ہیں جو نفسیاتی امراض سے تحفُّظ عطا کرتی ہیں۔ (قرآن کریم اور علم النفس)

عبادات اور تقویٰ

''تقویٰ'' دل کی اس کیفیت کا نام کہ انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور اس سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو جو خالق و مالک کی ناراضگی کا سبب بنے، صوم وصلوٰۃ یا حج وزکوٰۃ کے فرائض کی ادائیگی سے اس بات کی زبردست تربیت ملتی ہے اور یہ بندہ مومن کا زادِ سفر ہے جو اسے اقامتِ دین میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ نماز کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ (العنکبوت:۴۵/۲۹)

''اور نماز کو قائم کرو، کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔''

اس آیت پر صاحبِ احسن البیان لکھتے ہیں:

''یعنی نماز برائی اور بے حیائی کے روکنے کا سبب بنتی ہے۔ جس طرح دواؤں کی مختلف تاثیرات ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فلاں دوا فلاں بیماری کو روکتی ہے اور واقعتاً ایسا ہوتا ہے

لیکن کب؟ جب دو باتوں کا التزام کیا جائے، ایک دوائی کو پابندی کے ساتھ اس طریقے اور شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے جو حکیم اور ڈاکٹر بتائے، دوسرا پرہیز یعنی ایسی چیزوں سے اجتناب کیا جائے جو اس دوائی کے اثرات کو زائل کرنے والی ہوں، اس طرح نماز کے اندر بھی یقیناً اللہ نے ایسی روحانی تاثیر رکھی ہے کہ یہ انسان کو بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، لیکن اسی وقت، جب نماز کو سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق ان آداب و شرائط کے ساتھ پڑھا جائے جو اس کی صحت وقبولیت کے لیے ضروری ہیں مثلاً اس کے لیے پہلی چیز اخلاص ہے، ثانیاً طہارتِ قلب، یعنی نماز میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف التفات نہ ہو، ثالثاً باجماعت اوقاتِ مقررہ پر اس کا اہتمام، رابعاً ارکانِ صلوٰۃ (قرأت، رکوع، قومہ، سجدہ وغیرہ) میں اعتدال و اطمینان، خامساً خشوع وخضوع اور رقّت کی کیفت، سادساً مواظبت یعنی پابندی کے ساتھ اس کا التزام، سابعاً رزقِ حلال کا اہتمام (کہ اس کے بغیر کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی ہے) ہماری نمازیں ان آداب و شرائط سے عاری ہیں، اس لیے ان کے وہ اثرات بھی ہماری زندگی میں ظاہر نہیں ہو رہے ہیں جو قرآنِ کریم میں بتائے گئے ہیں۔ (احسن البیان)

ایک اور مقام پر اس طرح فرمایا:

﴿اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّقُوْہُ وَ ھُوَ الَّذِیْٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ﴾ (الانعام:٦/٧٢)

''(مسلمانو) نماز کو قائم کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور وہی تو ہے جس کے پاس تم جمع کیے جاؤ گے۔''

اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے تقوٰی کی صفت لازماً پیدا ہوگی اور یہی بات صاف ستھری زندگی گزارنے میں معاون بنتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

اقامتِ صلوٰۃ

''قرآن کریم میں 'صلوٰۃ' کا لفظ جہاں کہیں آیا ہے اقامت کے صیغوں کے ساتھ آیا ہے،

عربی میں اقامت کے معنی یہ ہیں کہ کسی کام کو اس کی تمام وکمال شرائط و حدود کے ساتھ انجام دیا جائے، روایات میں ہے:

((اِقَامَةُ الصَّلٰوةِ تَمَامُ الرُّکُوعِ وَالسُّجُوْدِ وَالتِّلَاوَةِ وَالْخُشُوْعِ وَالْاِقْبَالِ عَلَیْھَا فِیْھَا))

''نماز قائم کرنے کے معنی رکوع و سجود اور تلاوت و خشوع کے حق سے نہایت مکمل طریق پر سبکدوش ہونے اور نماز کی غایت اچھی طرح توجہ کرنے کے ہیں۔''

ایک مسلمان کے لیے صرف نماز پڑھنا ہی کافی نہیں، نماز کے اغراض و غایات کی تکمیل بھی ضروری ہے، قرآن کہیں بھی رسمی نماز ادا کرنے کا حکم نہیں دیتا، وہ تکمیلِ حدود کا خواستگار ہے اور صاف کہہ رہا ہے کہ بغیر اس تکمیل کے نماز، نماز ہی نہیں۔

قرآن حکیم میں نماز کے بارے میں ہدایات:

قرآن حکیم میں نماز سے متعلق بعض ہدایات دی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے اس کے فوائد و ثمرات مرتب ہوتے ہیں:

ا) اجتماعیت: حکم ہوتا ہے:

﴿وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ﴾ (البقرہ:۲/۴۳)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

یعنی مسلمانوں کو باہم مل کر نماز پڑھنے کا حکم مل رہا ہے۔ اس سے نہ صرف ان میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کا اجر و ثواب بھی بڑھ جاتا ہے۔

''سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((صَلٰوةُ الجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلٰوةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّ عِشْرِیْنَ دَرَجَةً))

(بخاری، مسلم، بحوالہ معارف الحدیث)

''یعنی باجماعت نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے کے مقابلے میں ستائیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔''

اجتماعیت کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ نماز کے بعد مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں، ایک

دوسرے کے حالات سے باخبر رہتے ہیں اور آپس کے دکھ سکھ میں کام آتے ہیں، ان میں بھائی چارہ اور محبت بڑھتی اور قائم رہتی ہے۔

اجتماعیت کا یہ دائرہ جامع مساجد میں اور وسیع ہو جاتا ہے جس میں دور و نزدیک کے لوگ نماز جمعہ کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں، جبکہ عیدین کی نماز میں یہ حلقہ وسیع تر ہو جاتا ہے جس میں شہروں اور گردونواح کے لوگوں کو کھلے میدانوں میں جمع ہو کر ربِ کائنات کے حضور عاجزانہ پیشانیوں کو جھکانے کا موقع ملتا ہے اور اختتامِ نماز پر آپس میں ملنے سے یہ فضا سلامتیوں اور خوشیوں سے معمور ہو جاتی ہے اور حج کے موقع پر اَقصائے عالَم کے مسلمانوں کا یہ حلقہ وسیع ترین ہو جاتا ہے۔ جو مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف لباس پہنتے ہیں جن کے رنگ اور بود و باش کے طریقوں میں فرق ہے مگر اسلامی اُخوّت اور بھائی چارے نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا ہے اور ایامِ حج میں ان سب کے لباس بھی یکساں ہو گئے ہیں اور سب کی زبانوں پر ربِ کائنات کی عظمت و کبریائی کا ایک ہی ترانہ جاری و ساری ہے:

﴿لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ، لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ، وَالْمُلْكَ لَا شَرِیْكَ لَك﴾

”اے اللہ میں حاضر ہوتا ہوں، آپ ہی کی پکار پر حاضر ہوں، حاضر ہوں (دل و جان کی اس آواز کے ساتھ کہ) آپ کا کوئی شریک نہیں اور اسی صدا کے ساتھ آپ کے پاس حاضر ہوں، بلاشبہ ہر تعریف اور ہر نعمت اور یہ ملک (کائنات اور اس کی بادشاہت) پر صرف آپ ہی کا قبضہ ہے اور (میں گواہ ہوں اور صدقِ دل سے گواہ ہوں) کہ آپ کا ہرگز کوئی شریک نہیں۔

وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور تعارف نہ ہونے کے باوجود اسلام کے عطا کردہ سلامتی کا پیغام پیش کرتے ہیں۔

﴿السلام علیکم ورحمة اللّٰه و برکاتهٗ﴾

میرے بھائی! اللہ تعالیٰ کی تم پر سلامتی، اس کی رحمت اور برکت نازل ہو، وہ بھی جواب میں انہی پاکیزہ اور دعائیہ کلمات کا اعادہ کرتا ہے۔

﴿وَ عَلَیْکم السلام وَ رحمة اللّٰه وَ برکاتهٗ﴾

پھر اگر اسے اپنے اس بھائی کی زبان سے واقفیت ہے تو تعارف مزید بڑھتا ہے اور یہ بات مٹھاس اور محبت کا باعث بنتی ہے اور بعض اوقات فریقین میں مستقل دوستی قائم ہو جاتی ہے۔

حرمین شریفین کے قیام کے دوران کوئی اجنبیت اور مغایرت نظر نہیں آتی، یوں محسوس ہوتا ہے کہ عالَمِ اسلام کے مسلمانوں کے دل آپس میں جڑ گئے ہیں، ہر نماز میں عید کا سماں ہوتا ہے، جونہی موذِن کی صدائے دلنواز کانوں میں پڑتی ہے، لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر اپنے رب کے در پر حاضری کے لیے رواں دواں ہوتے ہیں اور چند منٹوں میں حرمِ مکی ہو یا حرمِ مدنی بھر جاتے ہیں ان کے وسیع و عریض صحن کا بھی کوئی کونہ خالی نظر نہیں آتا، ''عباد الرحمٰن'' اپنے آقا و مولا کے حضور اپنی جبینِ نیاز اس کی چوکھٹ پر جھکا دیتے ہیں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

غور کیجیے کہ اسلام کا عطا کردہ نظام کتنا مضبوط اور مربوط صاف اور شفاف ہے، اسلامی عبادات مسلمانوں میں ایک طرف تقویٰ و طہارت کی صِفات پیدا کرتی ہیں تو دوسری طرف اتحاد و اتفاق کا درس دیتی ہیں۔

نماز کے متعلق اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ کا حق ادا کرنے سے اہلِ ایمان میں ''تقویٰ'' کی صفت پیدا ہوتی ہے، سفر حج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اسے ہدایات سے نوازا جا رہا ہے۔

﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی وَ اتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (البقرہ:۲/۱۹۷)

''اور زادِ راہ (یعنی راستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ (یاد رکھو!) سب سے بہتر توشہ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو۔''

یہ عبادات انسان کو عظیم فریضہ یعنی اقامت دین کے لیے تیار کرتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ﴾ (الحج:۲۲/۴۱)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں (کسی خطۂ زمین میں اقتدار دیں) تو یہ صلوٰۃ و زکوٰۃ (کا مضبوط نظام) قائم کریں۔اور (ہر) نیک کام کرنے کا حکم دیں اور (ہر) برے کام سے منع کریں اور تمام معاملات کا انجام اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔''

'صلوٰۃ' سے تمام معاشرتی مسائل حل ہوں گے۔یعنی معاشرہ صاف ستھرا ہو جائے گا اور 'زکوٰۃ' سے تمام معاشی مسائل کا حل نکلے گا اور وہ تنگدستی اور زبوں حالی سے نجات پا جائے گا، ہر سو نیکیوں کو پھیلایا جائے گا جبکہ بدیوں کو بیخ بن سے اکھاڑ پھینکا جائے گا، اسے فلاحی ریاست کہتے ہیں۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ یَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَاماً وَّیَضَعُ بِهٖ اٰخَرِیْنَ

[رواہ مسلم]

''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ''اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن مجید) کی بدولت بہت سے لوگوں کو بلند فرمائے گا اور بہت سے لوگوں کو نیچے گرائے گا (اس کی تعلیمات پر عمل کرنے والے سرفراز ہوں گے جبکہ اس سے منہ موڑنے والے نامراد ہوں گے)''